ارمغانِ
ڈاکٹر سیّد عبداللہ

مرتّبین

ڈاکٹر تحسین فراقی

ڈاکٹر ضیاء الحسن

اورینٹل کالج لاہور

UNIVERSITY OF THE PUNJAB

شعبۂ اردو

پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور

ذخیرۂ پروفیسر محمد اقبال مجددی

جو 2014ء میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو

ہدیہ کیا گیا۔
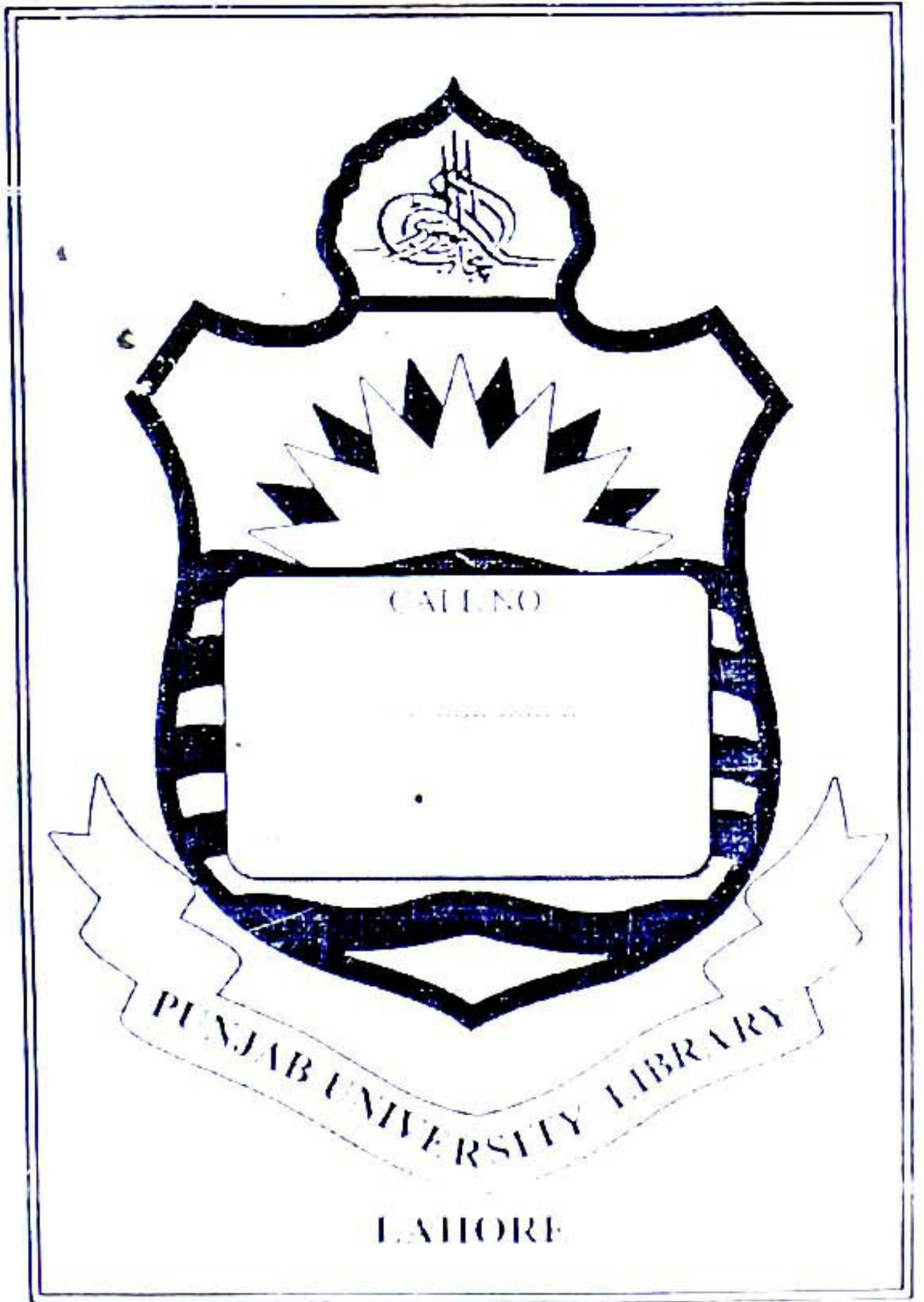
ڈاکٹر سیّد عبداللہ (مرحوم)

۵-اپریل ۱۹۰۶ء تا ۱۴-اگست ۱۹۸۶ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ارمغانِ سیّد عبداللہ

بے حد محترم محمد اقبال مجددی
کی خدمت میں

ضیاء الحسن
۱۴ جون ۰۶

شعبۂ اُردو

پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور

کے

مرحوم اساتذہ کی یاد میں — ۲

زیرِ ترتیب کتابیں

(۱) ارمغانِ سیّد وقار عظیم

(۲) ارمغانِ عبادت بریلوی

(۳) ارمغانِ افتخار صدیقی

(۴) ارمغانِ سجاد باقر رضوی

ارمغانِ سیّد عبداللہ

مرتّبین: ڈاکٹر تحسین فراقی
ڈاکٹر ضیاء الحسن

UNIVERSITY OF THE PUNJAB

شعبۂ اردو
اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
۲۰۰۵ء

اشاعت اوّل : اکتوبر ۲۰۰۵ء
مطبع : پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور
قیمت : ۴۰۰ روپے

Armaghan-e-Syed Abdullah

A Commemoration Volume
in honour of
Late Dr. Syed Abdullah
(1906 - 1986)

Compiled by :

Dr. Tehsin Firaqi
&
Dr. Zia-ul-Hassan

October, 2005
Published by: Department of Urdu,
Oriental College, Punjab University, Lahore, PAKISTAN
Price: Rs.400/-

فہرست

سخنے چند

دنیا بھر کی قومیں اپنے بڑے لوگوں کے لیے ارمغان علمی یا یادگار نامے شائع کرتی رہتی ہیں۔ ادب کی نسبت سے بھی یہ روایت عالمی سطح پر مروّج رہی ہے۔ اردو کے اہم ادیبوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اس نوعیت کے علمی کام پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں میں بھی ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی اس میں شخصی کاوشیں کارفرما نظر آتی ہیں اور کبھی علمی ادارے یہ کام انجام دیتے ہیں۔ علمی اداروں کے حوالے سے دیکھا جائے تو پنجاب یونیورسٹی لاہور کو یہ تفوق حاصل ہے کہ یہاں چند برس پہلے ایسے اہم ادیبوں کو خراج تحسین پیش کرنے کا ایک منصوبہ بنایا گیا جو عمر بھر اس عظیم علمی درس گاہ سے بطور استاد وابستہ رہے۔ ان میں حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، پروفیسر وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اور ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے نام شامل ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب ''ارمغانِ شیرانی'' مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر زاہد منیر عامر شائع ہو چکی ہے۔ دوسری کتاب ''ارمغانِ سیّد عبداللہ'' اس وقت آپ کے زیر مطالعہ ہے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا نام اردو ادب کی تدریس، تفہیم، تنقید اور تحقیق کے باب میں سند کا درجہ رکھتا ہے۔ سیّد صاحب بے نظیر استاد تھے۔ انھوں نے کئی نسلوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیا۔ وہ بیک وقت کئی زبانوں کے ماہر تھے اور عالمی ادب و فکر پر ان کی نگاہ تھی، خصوصاً فارسی اور اردو ادبیات کا جیسا مطالعہ اور تفہیم ان کے ہاں نظر آتی ہے وہ انھی سے مخصوص ہے۔ تنقید ان کا خاص میدان تھی۔ انھوں نے مشرق و مغرب کے تنقیدی کارناموں کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ ان کی تصانیف کا ایک حصہ طلبہ کی تعلیم و تربیت کے

مقاصد پورا کرتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر ایسے کام کو تحقیر سے ''درسی تنقید'' کہہ کر رد کر دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ سیّد عبداللہ کے علمی کام کے کلّی مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جہاں انھوں نے ایسی کتابیں شائع کیں جو طلبہ کی درسی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں وہیں ان کی متعدد ایسی علمی تصانیف بھی ہیں جنھیں بے خوف تردید تنقید و تحقیق کے اعلیٰ کارنامے قرار دیا جا سکتا ہے۔ کتابی صورت میں شائع ہونے والے ان کے سلسلۂ درسیات کے علاوہ ''ولی سے اقبال تک''، وجہی سے عبدالحق تک''، ''سر سیّد اور ان کے نام ور رفقا کی نثر کا فکری وفنی جائزہ'' اور ''اشاراتِ تنقید'' ایسی باقاعدہ کتابیں ہیں جو طلبہ کی تعلیمی ضرورتوں کو بھی پورا کرتی ہیں اور سیّد صاحب کی مخصوص تنقیدی فکر کی بھی عکاس ہیں۔ یہ کتابیں لگ بھگ نصف صدی سے طلبہ کی ذہنی و ادبی تربیت کا کام کر رہی ہیں اور آج بھی اتنی ہی مؤثر اور مقبول ہیں۔

تذکرہ نگاری پر ان کی کتاب ''شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' اختصار کے باوجود اپنے موضوع پر ایک اہم دستاویز ہے اور سند کا درجہ رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں فارسی زبان و ادب پر ان کی علمی کاوشیں بھی لایق داد ہیں۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مدیر کی حیثیت سے بھی ان کی خدمات تا دیر یاد رکھی جائیں گی۔ ان کی ایک قابلِ قدر کتاب ''فارسی ادب کی ترویج میں ہندوؤں کا حصہ'' فارسی میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ اردو زبان کے عاشقِ صادق ہونے کی حیثیت سے ان کی عملی جدوجہد بھی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ علاوہ ازیں ان کے تدوینی کارنامے بھی نظر انداز کیے جانے کی چیز نہیں۔

یاد نامہ/ارمغان، شخصیت اور فن کے جائزے سے مختلف کتاب ہوتی ہے۔ شخصیت اور فن کی تعیین و تحسین کسی ایک محقق/نقاد کا کام بھی ہو سکتی ہے اور متعدد اہلِ علم کے مضامین کو یکجا کر کے بھی مرتب کی جا سکتی ہے۔ شخصیت اور فن میں ایک حصہ سوانح اور شخصیت کا اور دوسرا حصہ زیر بحث شخصیت کے علمی و ادبی کام کے جائزے پر مشتمل ہوتا ہے۔ یاد نامہ/ارمغان میں بھی زیر نظر شخصیت کے بارے میں، چند مضامین شامل ہوتے

ہیں لیکن مرتب کے پیش نظر شخصیت کے خدو خال اجاگر کرنے سے زیادہ خراج تحسین پیش کرنے کی ذمہ داری ہوتی ہے، اس لیے وہ شخصیت اور فن کے حوالے سے زیادہ مواد اکٹھا نہیں کرتا۔ ایسی کتاب میں اہلِ علم حضرات سے بیشتر مضامین ان موضوعات پر لکھوائے جاتے ہیں، جن میں کسی نہ کسی درجے میں اس شخصیت کو اختصاص حاصل ہوتا ہے۔ ارمغانِ سیّد عبداللہ میں تین مضامین شخصیت سے متعلق اور بارہ مضامین ان موضوعات پر ہیں جن سے سیّد صاحب کو دلچسپی رہی ہے۔ پہلا مضمون ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے تصنیفی و تالیفی کام کے جائزے پر مشتمل ہے۔ یہ کتابیات سیّد جمیل احمد رضوی نے مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے لیے ایک عرصہ پہلے ترتیب دی تھی۔ اب ۲۰۰۵ء میں اس پر نظر ثانی کر کے اضافوں کے ساتھ اسے شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے تاکہ اختصار کے ساتھ سیّد عبداللہ کے علمی کارناموں کی تفصیل اہلِ علم تک پہنچ جائے۔ اس کتابیات کی اضافہ شدہ اشاعتِ نو اہلِ علم حضرات کے لیے مفید ثابت ہوگی اور آئندہ سیّد صاحب پر تحقیقی کام کی بنیاد بنے گی۔

شخصیت کے حوالے سے دوسرا مضمون عطیہ سیّد کا ہے۔ عطیہ سیّد، ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی صاحبزادی ہیں، فلسفے کی استاد اور افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنے والد کو آ جی کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ اس مضمون کا عنوان بھی ''آ جی'' ہے۔ اس مضمون کو انھوں نے افسانوی اسلوب میں لکھا ہے۔ سیّد صاحب کی شخصیت کے جن گوشوں تک اُن کی رسائی ہو سکی ہے، وہ کسی اور کے لیے ممکن نہ تھی۔ اس مضمون میں سیّد صاحب کی گھریلو زندگی کی جھلک بھی ملتی ہے اور اولاد کا اپنے عظیم باپ سے تعلق بھی واضح ہوتا ہے۔ اس مضمون سے ان کا شفیق ہمدرد، غم گسار، حلیم الطبع، درد مند اور درویش صفت انسان کا تصور ابھرتا ہے۔

مکتوب نگاری کو اب باقاعدہ صنف ادب کا درجہ حاصل ہے۔ بڑے ادیبوں کے خطوط ان کے علمی و ادبی کارناموں کی تفہیم کا براہِ راست ذریعہ ہیں اور ان کے اسلوب زندگی اور اسلوب تحریر دونوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ مختار الدین احمد کا شمار اردو کے اہم محققین میں ہوتا ہے، ارمغانِ سیّد عبداللہ کے لیے انھوں نے سیّد صاحب کے خطوط کا

تحفہ بھیجا ہے جس پر انھوں نے ایک بھرپور تعارف بھی تحریر کیا ہے۔

''قاضی صاحب کی تحقیق نگاری — محاسن اور کمزوریاں'' ایک بڑے محقق کا دوسرے بڑے محقق کی تحقیق نگاری کے جائزے پر مشتمل مضمون ہے۔ بلاشبہ قاضی عبدالودود کا شمار اردو کے اہم ترین محققین میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے اس مضمون میں جہاں ان کی علمی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے، وہاں بطور محقق ان کی لغزشوں پر گرفت بھی کی ہے۔ یوں یہ ایک ایسا مضمون بن گیا ہے جو متوازن بھی ہے اور خاصا مفصل بھی ہے۔ اگر قاضی صاحب پر گرفت کرنے کا محرک شخصی حوالہ ہوتا تو یہ مضمون زیادہ وقعت کا حامل نہ ہوتا۔ اگرچہ کہیں کہیں شخصی حوالہ بھی موجود ہے لیکن مجموعی طور پر معروضی انداز مضمون نگار کی علمی غیر جانبداری کو ثابت کرتا ہے۔

ڈاکٹر انصار اللہ کا مضمون بجائے خود ایک الگ کتاب ہے جس میں انھوں نے رشک کے شاگردوں کا بھرپور تذکرہ تحریر کیا ہے۔ اس تذکرے میں انھوں نے شاگردانِ رشک کی تاریخ ولادت، تاریخ وفات اور دیگر حالات کی فراہمی میں اپنی محققانہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے اور اہم مآخذ سے یہ تذکرہ مرتب کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیقی کاوش سے اردو ادب کے ایک فراموش شدہ گوشے کو منور کیا ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل کا مضمون ''ملیشیا میں غالب کے نوادر'' غالبیات کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے اور غالب کے فکر وفن سے دلچسپی رکھنے والے دانشوروں کے لیے تحقیق کے نئے در وا کرتا ہے۔ اسی طرح محمد عالم مختار حق کا مضمون ''نقدِ غالب'' بھی غالبیات کی فہرست میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ یہ مضمون ان اختلافی شذروں پر استوار کیا گیا ہے جو مولانا غلام رسول مہر نے غالب پر شائع ہونے والی کتابوں اور رسائل پر تحریر کیے۔ آخر میں مضمون نگار نے مولانا کے غالب پر وقتاً فوقتاً مضامین اور کتابوں کی تفصیل مہیا کر کے مہر یا غالب پر کام کرنے والے ناقدین اور محققین کے لیے سہولت پیدا کر دی ہے۔

''سردار جعفری کے تنقیدی رویے'' ابو الکلام القاسمی کا خالصتاً تنقیدی مضمون ہے

جس میں انھوں نے سردار جعفری کی تنقیدی فکر میں عہد بہ عہد آنے والی تبدیلیوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ علی سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' جب شائع ہوئی تو اپنے تیکھے مزاج اور تند اسلوب کے ناتے بہت معروف ہوئی، خاص طور پر علامہ اقبال کے حوالے سے ان کا نقطۂ نظر کٹر ترقی پسندانہ اور تُند و تیز تھا لیکن ''اقبال شناسی'' تک آتے آتے اس میں توازن اور اعتدال پیدا ہوا۔ قاسمی صاحب نے غیر جانبدارانہ تجزیے سے سردار جعفری کی تنقیدی فکر کو سمجھنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

''وزیر/وزیری —— گیارہویں صدی ہجری کے ایک تاتاری نژاد چینی شاعر کے حالات اور شاعری'' قارئینِ ادب کے لیے ڈاکٹر عارف نوشاہی کی ایک اہم بازیافت ہے۔ وزیر خاں نام اور وزیر/وزیری تخلص کے حامل، گیارھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں رہ کر شاعری کرنے والے اس شاعر نے خمسہ، چار دیوان، مختصر مثنویاں اور قصے لکھے۔ جس کلیات کا تعارف ڈاکٹر موصوف نے کرایا ہے، مختصر مثنویوں، غزلوں، قصیدوں اور رباعیوں پر مشتمل ہے۔ خمسہ اور دواوین اربعہ ہنوز پردۂ خِفا میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تعارف نامہ نہایت عرق ریزی سے نو دریافت کلیات سے مرتب کیا ہے۔

اہلِ علم سے مخفی نہیں کہ علامہ سیّد مرتضٰی بلگرامی الزبیدی نے علم الحدیث اور لغت کے حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ تاج العروس اور شرح احیاء العلوم ان کے شہرۂ آفاق کارنامے ہیں۔ عیدروسیہ سلسلہ سے منسلک اس بزرگ کی حیات اور علمی کارناموں کا یہ ایک تحقیقی تعارف ہے اور سیّد تقی رضا بلگرامی کی محنت و کاوش کا عمدہ نمونہ ہے۔ افسوس کہ کوشش کے باوجود ہمیں سیّد تقی رضا صاحب کے کوائف نہیں مل سکے جس کا مرتبین کو افسوس ہے۔

پروفیسر لطیف اللہ کا مضمون ''حضرت سلطان المشائخ نظام الدین محبوب الٰہی کے سال ولادت کا تعین'' داخلی و خارجی شہادتوں سے مزین تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی حیات مبارکہ پر ہونے والے بیشتر کام کو پیش نظر رکھا ہے اور ایک ایسے نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں جس پر بھروسہ کیا جا

سکتا ہے۔

اکرام چغتائی اور جی آر ملک کے مضامین انگریزی زبان میں تحریر کیے گئے ہیں۔ چغتائی صاحب نے اشپرینگر Dr. Aloys Sprenger کی دہلی کالج کے لیے خدمات کے حوالے سے مضمون قلم بند کیا ہے۔ چغتائی صاحب کا شمار پاکستان کے اہم محققین میں ہوتا ہے۔ یہ مضمون بھی انھوں نے اُسی احتیاط سے تحریر کیا ہے جو ان کے کام کا خاصہ ہے۔ جی آر ملک کا مضمون Post-Modernism کے موضوع سے بحث کرتا ہے۔ مابعد جدید تنقید ہمارے زمانے کا سب سے زیادہ جالبِ توجہ مبحث ہے۔ اس ضمن زیادہ کام مغرب میں ہوا ہے۔ ملک صاحب انگریزی تنقید سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے موضوع کا احاطہ بہت مہارت سے کیا ہے اور ایک مشکل موضوع کو آسان کر کے قارئینِ ادب تک پہنچایا ہے۔

تذکرہ نگاری اور ترجمہ نگاری ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے علمی کارناموں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ مرتبین کے مضامین ان ہی دو حوالوں سے ہیں۔ چند برس پہلے جب ''ارمغانِ سیّد عبداللہ'' کا ڈول ڈالا گیا، اردو کے نامور محقق اور صاحبِ اسلوب ادیب مشفق خواجہ حیات تھے۔ انھوں نے نہ صرف ''ارمغان'' کے اس سلسلے پر پسندیدگی کا اظہار کیا بلکہ اس کے لیے بعض عمدہ مضامین بھی فراہم فرمائے۔ خواجہ صاحب حیات ہوتے تو اس مجموعہ مقالات کو دیکھ کر یقیناً مسرور ہوتے۔ ان کا اچانک رخصت ہو جانا صرف ایک قومی نقصان ہی نہیں، مرتبین کے لیے ایک ذاتی سانحہ بھی ہے۔ ہمارا سرِ تشکر ان کی یاد کے حضور خم ہے۔ ہم ان تمام اہلِ قلم کے بھی ممنون ہیں جنھوں نے اپنے قلمی افادات سے اس مجموعہ کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا۔

تحسین فراقی

ضیاء الحسن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

ڈاکٹر سیّد عبداللہ سے میری واقفیت، آج سے نصف صدی پہلے، ان کے اُن مضامین کے ذریعہ ہوئی جو اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوتے رہے۔ ان سے تعلقات ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے جو ان کی زندگی کے آخری دنوں تک قائم رہے۔ ان سے میری دلچسپی کی تین وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ عام اردو اساتذہ کے برخلاف عربی فارسی کے بھی عالم تھے اور اسلامیات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ دوسری وجہ یہ کہ وہ میرے خواجہ تاش بھی تھے۔ یعنی علامہ عبدالعزیز المیمنی کی صحبت کے فیض اٹھانے والے اور ان کے علمی کمالات کے معترفین میں تھے۔ متعدد فہرستیں مرتب کر کے شائع کی تھیں جو علمی حلقوں میں قدر کی نظر سے دیکھی گئیں۔

سیّد عبداللہ صاحب سے ملاقات پوری زندگی میں صرف ایک بار ہوئی۔ دوسری بار انھیں دیکھنے اور ان سے ملنے کی حسرت رہ گئی۔ تقسیم ہند کے کوئی پینتیس سال بعد ۱۹۸۲ء میں پہلی بار لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بین القومی کانفرنس میں شرکت کے بعد جدہ، کراچی ہوتا ہوا ۲۱/اپریل کو لاہور پہنچا تھا اور محبّ گرامی ڈاکٹر وحید قریشی کا مہمان ہوا تھا۔ ۲۴/اپریل ۱۹۸۲ء کو اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے دفتر میں سیّد صاحب سے بہت مفصل ملاقات ہوئی۔ یہ تاریخ مجھے اس خط سے معلوم ہوئی جو انھوں نے ۲۲/اپریل کو مجھے لکھا تھا۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں :

''ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ لاہور تشریف لا رہے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ۲۴/اپریل کو دائرۂ معارف اسلامیہ کے دفتر میں ۱۱ بجے تشریف لا کر مدیرانِ ادارہ کو شرفِ ملاقات بخشیں، ہم ممنون ہوں گے۔''

ایک طالب علم کے لیے ایسے محبت بھرے الفاظ پڑھ کر متاثر ہوا اور امتثال امر میں پروفیسر محمد اسلم (استاد شعبۂ تاریخ) کی معیت میں دفتر پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں ٹہل رہے ہیں۔ کہنے لگے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ بہت گرم جوشی سے ملے۔ شعبوں کے بارے میں استفسار کرتے رہے۔ میں نے کچھ دیر کے بعد گفتگو کا رخ پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی طرف پھیرا۔ انداز ہوا کہ نسبتاً نامناسب حالات میں بھی بڑی جفاکشی، تن دہی اور علمی انہماک سے انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب کا کام کر رہے ہیں۔ وہی شکایت تھی، جو کم و بیش سارے اہل علم کو ہوا کرتی ہے کہ ارباب حل و عقد، عالموں اور محققوں کے علمی کاموں کی وہ قدر نہیں کرتے جس کے وہ مستحق ہیں۔ وہ سہولتیں فراہم نہیں کرتے جن کی اہل علم کو ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد انھوں نے چائے منگوائی اور اپنے ادارے کے رفقائے کار کو بلوایا۔ ان کا تعارف کرایا۔ میں ان کے نام اور کام سے واقف تھا۔ جہاں تک یاد آتا ہے سیّد امجد الطاف، پروفیسر عبدالقیوم، شیخ نذر حسین اور ڈاکٹر عبدالغنی تھے۔ حافظ محمود الحسن عارف صاحب کے بارے میں صحیح طور پر یاد نہیں کہ وہ بھی اس دن تشریف رکھتے تھے یا نہیں۔ اول الذکر دونوں اسکالروں سے میں پہلے سے واقف تھا، عبدالغنی صاحب کی کتاب بیدل پر دیکھ چکا تھا، شیخ صاحب سے پہلی بار اس دن ملا اور ان کی سادگی اور ان کے علمی انکسار سے بہت متاثر ہوا۔

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک بہت پر لطف صحبت رہی۔ گفتگو زیادہ تر سیّد صاحب کرتے رہے۔ روانگی کے وقت انھوں نے ''سخن ور'' (لاہور ۱۹۷۶ء، ۱۹۸۱ء) کے دونوں حصے ''بخدمت شریف فاضل محترم جناب ڈاکٹر مختار الدین آرزو مدظلہ'' لکھ کر اور دستخط کر کے

مرحمت فرمائے جو آج تک میرے کتب خانے کی زینت ہیں۔ پروفیسر عبدالقیوم صاحب نے ''لسان العرب'' کی فہرستِ شعرا و فہرستِ قوافی عنایت کی جو اورینٹل کالج میگزین میں برسوں مسلسل چھپتی رہی تھی اور جس کی عرصے سے مجھے تلاش تھی۔

سیّد صاحب سے خط و کتابت کا سلسلہ ۱۹۴۷ء سے شروع ہوا اور پینتیس سال تک جاری رہا۔ ان کا پہلا خط ۲۳/اکتوبر ۱۹۴۷ء کا لکھا ہوا ہے اور آخری خط جو محفوظ رہ سکا وہ ۲۲/اپریل ۱۹۸۲ء کا تحریر کردہ ہے۔ اب پہلے خط کی بابت کچھ معروضات۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد دونوں ملکوں کے حالات غیر مستقیم تھے۔ علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد ایم اے عربی کی جماعت میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ شعبے کی حالت یہ تھی کہ مولوی قمرالدین حنان پاکستان چلے گئے اور ڈاکٹر سیّد محمد یوسف قاہرہ یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ ڈاکٹر سیّد عابد احمد علی تعطیلات گرما میں جو لاہور تشریف لے گئے تو فسادات شروع ہو جانے کی وجہ سے واپس نہیں آئے تھے۔ شعبے میں اب صرف علامہ عبدالعزیز میمن اور مولانا سیّد بدر الدین علوی رہ گئے تھے۔ میمن صاحب کچھ دل برداشتہ تھے اور ذہنی طور پر انتقال مکانی کے لیے آمادہ نظر آتے تھے۔ صرف علوی صاحب ایم اے سال اوّل و سال آخر کی ساری کلاسیں کسی طرح لیتے۔ ہندوستان میں ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کی وجہ سے کلکتہ یونیورسٹی جا سکتا تھا لیکن وہ علاقہ اس وقت غیر محفوظ تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں صرف ڈاکٹر معظم حسین سے قدرے واقف تھا کسی اور استاد سے قطعاً نہیں۔ خیال پنجاب یونیورسٹی کی طرف گیا لیکن وہاں مستقل قیام و تعلیم کی کیا شکل پیدا ہو گی معلوم نہ تھا۔ میں نے بغیر کسی سابق تعارف کے شاید ایک ہی دن ڈاکٹر برکت علی قریشی، ڈاکٹر پروفیسر محمد اقبال اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ کو خطوط لکھ کر وہاں کی صورت حال دریافت کی اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ تینوں اصحاب نے کرم فرمایا اور تینوں کے تشفی بخش اور مثبت جواب آ گئے۔ سب سے مفصل خط ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا تھا۔ اگر اس وقت میں لاہور چلا جاتا تو میں اورینٹل کالج کا طالب علم ہوتا اور گمان غالب ہے کہ یہ سطریں علی گڑھ کے بجائے لاہور میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوتا۔ لیکن ہوا یہ کہ چار سال کے عرصے میں علی گڑھ کی سرزمین

سے ایک خاص تعلق پیدا ہو گیا تھا، مجھ سے علی گڑھ نہ چھوٹ سکا اور نامناسب حالات میں بھی زندگی بسر کرنے کا جو ہنر علی گڑھ نے سکھایا تھا وہ کام آیا۔

اب روئے سخن پھر جناب ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی طرف۔ ۱۹۸۲ء کے بعد پھر ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ دو سال کے بعد ۱۹۸۴ء میں لاہور گیا تو ان سے ملنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر ذوالفقار حسین صاحب کی معیت میں ''المأمن'' اردو نگر ملتان روڈ پہنچا لیکن ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ دو سال کے بعد مشرق اوسط کی کانفرنس سے مراجعت کے وقت ان کے یہاں حاضر ہونا چاہا تو دائرۂ معارف اسلامیہ کے احباب نے بتایا کہ وہ آج کل سخت علیل ہیں اور شفاخانے میں داخل ہیں۔ جب حالات کچھ بہتر ہوں تو ملیے۔ اس کی نوبت نہیں آئی اور میں علی گڑھ واپس آ گیا۔ یہیں اطلاع ملی کہ ۱۴/اگست ۱۹۸۶ء کو اردو کا یہ مجاہد اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملا۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

سیّد صاحب مرحوم و مغفور سے خط و کتابت کی مدت ۳۵ برسوں کو محیط ہے۔ ان کا پہلا خط ۲۳/اکتوبر ۴۷ء کا لکھا ہوا ہے اور یہ یقیناً پہلا خط ہے۔ آخری خط جو میرے پاس محفوظ ہے وہ ۲۲/اپریل ۱۹۸۲ء کا نوشتہ ہے۔ لیکن یہ آخری نہیں۔ کچھ خطوط ایک علیحدہ لفافہ میں رکھ دیے تھے وہ اب نہیں ملتے۔ ان کے لکھے ہوئے کچھ پوسٹ کارڈ کئی سال پہلے نظر آتے تھے وہ بھی آج کل گم ہیں۔ جو کچھ موجود ہیں وہ پیش کیے جا رہے ہیں۔ کہیں کہیں میں نے وضاحت کے لیے ضروری حواشی لکھ دیے ہیں۔ امید ہے سیّد صاحب کے یہ خطوط علمی و ادبی حلقوں میں دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

مختار الدین احمد

ناظم منزل، ۴/۱۲۸۶ میر نشان روڈ علی گڑھ

۲۶/اگست، ۲۰۰۲ء

(۱)

اورینٹل کالج

۲۳/اکتوبر ۴۷ء

مکرمی۔ تسلیم۔ خط ملا۔ شکریہ

آپ کے استفسارات کا جواب درج ذیل ہے:

(۱) ایم۔ اے عربی کی تعلیم گورنمنٹ کالج، اسلامیہ کالج اور اورینٹل کالج میں ہے۔ آپ ان میں سے کسی کالج میں داخل ہو جائیے۔ کلاس سب کالجوں کی مشترک ہوتی ہے۔

(۲) آپ کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ آپ اورینٹل کالج میں داخل ہو جائیں۔ اس کی وجہ سے آپ کو ہوسٹل کی سہولت میسر آ جائے گی۔

(۳) داخلہ آج کل ہو رہا ہے۔ آپ نومبر کے وسط تک داخل ہو سکیں گے۔ مگر بہتر یہ رہے گا کہ آپ ابھی سے ایک درخواست پرنسپل اورینٹل کالج کے نام یا ڈاکٹر برکت علی قریشی ایم اے، پی ایچ ڈی پروفیسر عربی اورینٹل کالج لاہور کے نام ارسال فرما دیں تا کہ آپ کی درخواست پر ابھی سے غور ہو جائے۔

(۴) ہوسٹل میں جگہ مل جائے گی بشرطیکہ آپ بروقت آ جائیں۔ ہوسٹل کا خرچ ۴۰ اور ۵۰ روپے کے درمیان۔

(۵) اگر آپ پرپویس کر کے آئیں گے تو آپ کو ایک سال میں امتحان میں جانے کی اجازت ہوگی مگر نفع نقصان آپ کا اپنا، کیونکہ دونوں یونیورسٹیوں کا کورس مختلف ہے۔

میں نے آپ کے سب سوالات کا جواب دے دیا ہے۔ اگر کچھ مزید مطلوب ہو تو وہ بھی لکھیے۔

احقر

سیّد عبداللہ

(۲)

۲۶/ دسمبر [۱]

مخدومی سلام مسنون

تلطف نامہ موصول ہو کر باصرہ افروز ہوا۔ ممنون التفات ہوں۔

غالب نمبر مجھے مل گیا تھا رسمی شکریہ ادا کرنے کی ہوس افسوس کہ پوری نہ ہوئی

ع ناخن پہ قرض ہے گرہ نیم باز کا

کی وجہ سے اس عنایت فرمائی کی یاد تازہ رہتی ہے۔ غالب نمبر کی اشاعت جدید کے لیے ضرور کچھ لکھنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ مجھے معقول مہلت دیں۔ خاکہ ذہن میں موجود ہے۔ فی الحال لکھنا بھی شروع کر دوں گا مگر لکھنے میں کچھ وقت لگے گا۔ بجواب لکھیے کہ آپ مجھے زیادہ سے زیادہ کتنا وقت دے سکیں گے۔ تدریس کا زمانہ ہے، وقت کی تنگی کا خاص لحاظ رہے۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ مخدومی رشیدؔ صاحب کی خدمت اقدس میں سلام مسنون۔

نیاز مند

سیّد عبداللہ

(۳)

اورینٹل کالج لاہور

۲/جنوری ۵۱ء

مکرمی، سلام مسنون

آپ کا کارڈ ملا ''غالب نمبر'' کے لیے ایک مقالہ بہ عنوان ''غالب — معتقد میر؟'' فروری کے شروع تک بھیج سکوں گا۔

مزید امور جن پر اب گفتگو فرمانا چاہتے ہیں بے تکلف لکھیے۔ والسلام

مخلص

سیّد عبداللہ

(۴)

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

۱۶/فروری ۵۲ء

محترم و مکرم۔ سلام مسنون

میرا مضمون ''غالب — معتقد میر'' بالکل تیار ہوگیا ہے۔ اب صرف صاف کرنا باقی ہے۔

ان شاء اللہ بہت جلد آپ کی خدمت میں ارسال کر دیا جائے گا۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام

نیاز مند

سیّد عبداللہ

(۵)

۱۲/مارچ ۵۲ء

مکرمی محترمی سلام مسنون

آپ کے سب عنایت نامے یکے بعد دیگرے موصول ہوئے۔

مضمون ''غالب معتقد میر'' ارسال ہے۔[۲] از راہ کرم اس کے پروف کی تصحیح کسی ذی علم آدمی سے کرائیے۔ موجوب مبیضہ بھی زیادہ صاف نہیں۔ میں نے اپنے شاگرد سے لکھوایا ہے جس کا خط کچھ اچھا نہیں مگر واضح اور صاف ہے۔ پروف میں اگر احتیاط نہ ہوئی تو غلطیاں رہ جائیں گی۔

عکسوں (۳) کے سلسلے میں عرض ہے کہ آپ اس کی مزید تفصیلات سے آگاہ کیجیے تاکہ قیمت کا صحیح اندازہ ہو سکے، اس کے بعد رائے دے سکوں گا۔ امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔

اورینٹل کالج میگزین شائع ہوتا ہے، مگر کسی قدر بے قاعدگی کے ساتھ۔ مخدومی رشید صاحب کی خدمت میں سلام و نیاز۔

مخلص

سیّد عبداللہ

(۶)

یکم اپریل ۵۲ء

مکرمی مشفقی!

سلام مسنون! آپ کا پوسٹ کارڈ ملا۔ تعجب ہے کہ آپ کو میرا مضمون ابھی تک نہیں ملا۔ مضمون دو ہفتے ہوئے علی گڑھ کے پتہ پر بھیجا جا چکا ہے۔

خدا کرے کہیں نقل و حرکت میں گم نہ ہو گیا ہو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے آپ نے اس سے قبل دہلی کا پتہ نہیں لکھا تھا۔ بہرصورت آپ علی گڑھ کے ڈاک خانہ سے استفسار کیجیے۔ مجموعے کا نام کچھ دنوں کے بعد تجویز کر کے آپ کو لکھوں گا۔ (۴)

سلام و نیاز

سیّد عبداللہ

بخدمت شریف

جناب مختار الدین احمد

ایس ایس ویسٹ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۷)

۱۹/اپریل ۵۲ء

آپ کا خط ملا جس سے معلوم ہوا کہ مضمون آپ تک پہنچ گیا ہے۔ مضمون کے بارے میں آپ نے جو اظہار خیال فرمایا اس کا شکریہ۔ آپ نے جو دو کتب طلب فرمائی ہیں ان میں سے ایک ''نکات و رقعات غالب'' لائبریری میں موجود ہے، دوسری کتاب ''سوالات عبدالکریم''[۵] باوجود بڑی تلاش لائبریری میں نہیں مل سکی۔ آپ کو کہاں سے اطلاع ملی کہ یہ دوسری کتاب یہاں لائبریری میں موجود ہے۔ مرتضٰی حسن بلگرامی صاحب کے مضمون ''غالب کی تصانیف'' کا بھی کچھ پتہ نہیں لگتا۔[۶] کیا آپ بتا سکیں گے کہ یہ مضمون کب شائع ہوا۔ آپ نے کتاب کے عکسی نقل کے لیے بھی لکھا ہے۔ کیا آپ عکسی نقول کے لیے اس کی اجرت پاکستان بھیجنے کا انتظام کر سکتے ہیں؟

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ والسلام

نیاز مند

سیّد عبداللہ

بخدمت شریف جناب مختار الدین احمد

ایس ایس ویسٹ۔ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ (یو پی)۔ انڈیا

(۸)

مانسہرہ ضلع ہزارہ

یکم اگست ۵۲ء

مشفق عنایت فرما۔ عرصہ ہوا ایک مضمون ''غالب — معتقد میر'' کے عنوان سے لکھ کر آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا کہ غالب نامہ کی اشاعت ثانی میں چھپے۔ توقع تھی کہ مضمون اپریل مئی تک چھپ جائے گا مگر آج یکم اگست ہے اس پر بھی کوئی اطلاع

غالب نمبر کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں موصول نہیں ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ آپ نے اس نمبر کی طباعت و اشاعت کا ارادہ ترک نہیں کیا ہے اور یہ تاخیر عارضی ہے اور یہ بھی کہ غالب نمبر ضرور چھپے گا لیکن اگر کسی وجہ سے ارادہ ترک کر دیا ہو تو اس صورت میں میرا مضمون مجھے واپس بھیج دیجیے تا کہ اس کی اشاعت کا کوئی اور انتظام کیا جا سکے۔ ایک گزارش اور ہے۔ اگر غالب نمبر چھپ رہا ہے اور میرا مضمون چھپ نہیں چکا تو التماس ہے کہ اس کی کم از کم دس کاپیاں مجھے قیمتاً عنایت ہوں۔ کاغذ کی قیمت میں ادا کر دوں گا۔

امید ہے آپ بالکل بخیریت ہوں گے۔ والسلام

نیاز مند

سیّد عبداللہ

(۹)

مانسہرہ ضلع ہزارہ

۲۱/اگست ۱۹۵۲ء

مکرمی سلامت باشید۔ پوسٹ کارڈ کا شکریہ۔ نوادر الالفاظ انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس وقت اس کا کوئی نسخہ میرے پاس موجود نہیں۔ اعزازی نسخے ختم ہو چکے ہیں۔ میں شیخ مبارک علی صاحب تاجر لاہور کو لکھتا ہوں کہ آپ کے ساتھ کسی کتاب کا تبادلہ کر لیں۔ (۷) افسوس ہے کہ تدوین کے وقت علی گڑھ والے نسخوں کا مجھے علم نہ ہوا ورنہ میں ان سے فائدہ اٹھاتا۔ (۸) مگر جن نسخوں سے فائدہ اٹھایا ہے ان میں سے ایک بہت قدیم نسخہ ہے۔

مطالعۂ غالب (۹) کی کیفیت معلوم ہوئی۔ میری خواہش کہ یہ مجموعہ جلد چھپ جائے یا کم از کم میرا مضمون جلد چھپ جائے تا کہ میں اس کی زائد نقلیں لے سکوں۔ مجھے ان کی خاص سلسلے میں ضرورت ہے۔ اگر ستمبر کے وسط تک یہ کام ہو سکے تو بہت اچھا ہو ورنہ خیر۔

آذر صاحب (۱۰) کا کتب خانہ کراچی میں ان کے فرزند شیخ ظہیر الدین صاحب پی

اے ایس ڈپٹی سیکرٹری فنانس کے پاس ہے۔ نفائس المآثر شاید ابھی تک اس کتب خانے میں ہے۔ آپ شیخ صاحب سے دریافت کر لیجیے ممکن ہے وہ آپ کی مدد کرسکیں، ہمارے پاس (یعنی یونیورسٹی میں) دیوان غالب [۱۱] اردو کا ایک خاصا اہم نسخہ ہے جو حال ہی میں خریدا گیا ہے۔ اکرام صاحب اور عرشی صاحب دونوں متفق ہیں کہ یہ نسخہ ۱۸۴۷ء سے پہلے کا ہے۔ میں اس پر ایک مضمون لکھ رہا ہوں جو ان شاء اللہ مولوی محمد شفیع کے اعزاز میں شائع ہونے والے مجموعہ ارمغان علمی میں چھپے گا۔ [۱۲] اکرام صاحب نے جن غزلیات کو ۱۸۴۷ء کے بعد کا قرار دیا ہے، ان میں سے بعض اس نسخے میں موجود ہیں۔ سہرا اس نسخے میں موجود نہیں، مگر سہرے سے متعلق قطعہ، منظور ہے گزارش احوال واقعی اس میں ہے۔ اس سے آزاد کی بیان کردہ کہانی بہت حد تک مشکوک ہو جاتی ہے۔ بہرحال ابھی کوئی بات یقینی نہیں، ممکن ہے چھان بین سے کچھ نئی باتیں معلوم ہوسکیں۔ والسلام

نیاز مند

سیّد عبداللہ

(۱۰)

۲۵/ستمبر ۵۲ء

محترم و محترم سلامت با کرامت باشید۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ کو جولائی یا اگست میں ایک خط لکھا تھا، جس میں خواہش کی تھی کہ میرے مضمون ''غالب ــــ معتقد میر'' کو جلد چھاپا جائے۔ اس کے جواب میں آپ نے لکھا تھا کہ مجموعہ (مطالعۂ غالب) کی طباعت شروع ہوگئی ہے اور یہ کہ میرا مضمون بھی بہت جلد چھپ جائے گا۔

اس کے بعد تقریباً دو مہینے گزر چکے ہیں۔ اور مجھے توقع ہے کہ میرا مضمون چھپ گیا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ پوری کتاب جب چاہے چھپے مجھے میرے مضمون کی کچھ زائد کاپیاں پیشگی ہی مل جائیں۔ اس وقت مجھے اس مضمون کی (یعنی مطبوعہ مضمون) کی بے حد ضرورت ہے۔ کیا آپ اس کے لیے کچھ انتظام کر سکتے ہیں۔ میں آپ کی اس مہربانی کے لیے آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔ امید ہے کہ آپ دریغ نہ فرمائیں گے۔

امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

نیاز مند

سیّد عبداللہ

(۱۱)

مانسہرہ ضلع ہزارہ

۲۷/اگست ۱۹۵۳ء

مخدومی مکرمی۔ سلامت باشید۔ آپ کا عید نامہ موصول ہوا، شکریہ۔ اس سے قبل آپ کا ایک خط احوال غالب کے ہمراہ موصول ہوا تھا۔ میں نے اس کا جواب لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا تھا۔ خدا کرے آپ کو ملا ہو۔ اس کا پتہ البتہ مختلف تھا یعنی معرفت انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ۔ ممکن ہے بے راہ ہوگیا ہو۔ بہرحال پہلے خطوں کی رسید کی اطلاع اب دے رہا ہوں۔

احوال غالب کا بے حد شکریہ۔ میں مطالعہ میں مصروف ہوں۔ ان شاء اللہ اورینٹل کالج میگزین میں اس پر تبصرہ لکھوں گا۔ غالب کے جدید قلمی نسخے [۱۳] پر بھی مضمون لکھ دوں گا مگر بہت جلد ممکن نہیں۔ اکتوبر تک آپ کو مل سکے گا۔ میں اس وجہ سے کچھ ناراض تھا اور ہوں کہ مضمون کی اشاعت میں بے حد تاخیر ہوگئی ہے اگرچہ آپ کی مجبوریاں اپنی جگہ ضرور قابل لحاظ ہوں گی۔ والسلام

نیاز مند

سیّد عبداللہ

(۱۲)

۸/دسمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی سلام مسنون

گرامی نامہ موصول ہوا۔ یاد فرمائی کا بے حد شکریہ۔ میں انشاء اللہ جلد ہی احوال

غالب پر تبصرہ لکھوں گا جو اورینٹل کالج میگزین میں شائع کر دیا جائے گا۔ضمیمہ کا تازہ شمارہ پریس سے آ گیا ہے۔

میں اپنی عدیم الفرصتی کے باعث دیوان غالب کے قلمی نسخے پر مضمون ابھی تک نہیں لکھ سکا۔آپ نے بہت اچھا کیا یاد دہانی کرا دی۔ میں اب انشاء اللہ جلد ہی اس کام سے سبکدوش ہونے کی سعی کروں گا۔(۱۴)

بصری کی کتاب التنبیہات(۱۵) کے متعلق آپ نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں ان کا بہت بہت شکریہ۔(۱۶) باڈلین کے کسی مخطوطے کی ضرورت ہوئی آپ کو تکلیف دوں گا۔

حال نامہ بایزید انصاری(۱۷) کے آخری اجزا کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی میں ابھی نہیں پہنچے۔

پروفیسر محمد شفیع صاحب سے جب ملاقات ہوگی، آپ کا سلام پہنچا دوں گا۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ فقط والسلام

نیاز مند

سیّد عبداللہ

بخدمت شریف جناب

ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔

9-Pembrook Street, St. Ablater, Oxford

(۱۳)

۱۰/اکتوبر ۱۹۵۶ء

محترم ومکرم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ موصول ہوا۔

شکریہ قبول کیجیے۔ اس کے بعد میری طرف سے مبارک باد قبول کیجیے اپنی تازہ علمی فتوحات اور علمی سند پر جو آپ یورپ سے لائے ہیں۔(۱۸) آپ کے حالات کچھ کچھ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے ذریعے معلوم ہوتے رہے۔ مضمون کے سلسلے میں کچھ دیر تو ناراضگی

رہی مگر آپ کی مشکلات کا جب معلوم ہوا سب شکوے جاتے رہے۔ میں ان کاموں کی تکلیفوں سے بے خبر نہ تھا اس لیے مطمئن سا ہوگیا تھا۔ تا آنکہ جناب خلیل اعظمی کے خط سے ''نقدِ غالب'' کی طباعت و اشاعت کی اطلاع موصول ہوئی۔ پھر ایک نسخہ بھی ملا جو غالباً ان کا بھجوایا ہوا ہوگا۔ (۱۹) یہ مجموعہ بھی ''احوالِ غالب'' کی طرح غالبیات میں قابل قدر اضافہ ہے۔ اگر پہلا نسخہ اعظمی صاحب کا ارسال کردہ تھا تو آپ میرے نام کا نسخہ میری طرف سے انھی کی خدمت میں پیش کر دیجیے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے مطلع بھی کیا اور کتاب سے بھی مشرف کیا۔

میگزین کے پرانے نسخے آپ کو بھجوائے جا سکتے ہیں البتہ چند نمبر طباعت ثانی کے محتاج ہیں۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۶۴ء تک ۲۷ پرچے اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک کے ۳۴ پرچے سٹاک میں موجود ہیں۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۶ء تک ۲ روپیہ فی کاپی اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک ایک روپیہ فی کاپی کے حساب سے یہ رسالے مل سکتے ہیں۔

آپ جو مضمون ہمارے رسالے کے لیے بھیجیں گے ہم اس کو ارمغان خیال کریں گے اور ضرور چھاپیں گے۔

آپ نے میرے جدید ترین موضوعوں کا حال دریافت کیا ہے سو عرض ہے کہ میں اب لکھتا کم ہوں پڑھتا زیادہ ہوں کیونکہ مجھے محسوس ہوا ہے کہ اس سے قبل میں مناسب مطالعہ کیے بغیر ہی قلم فرسائی کرتا رہا۔ میر تقی میرؔ میرا مضمون خاص ہے مگر اس پر میرے معاصرین اس قدر لکھ رہے ہیں اور لکھ چکے ہیں کہ میں سوچتا ہوں میرے لیے کچھ رہ بھی گیا ہے یا نہیں؟ اس معاملے میں بھی مجھے پھر وہی احساس ہوتا ہے کہ پڑھنا اور بات کو خود سمجھ لینا بے کار لکھنے پر ترجیح رکھتا ہے۔ اب میری توجہ تحقیق محض کے مقابلے میں تنقید مع تحقیق کی طرف ہے۔ مگر ابھی تک کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اب میری منزل کہاں ہے۔ والسلام

نیاز مند

سیّد عبداللہ

(۱۴)

۱۰/نومبر ۵۶ء

مکرمی سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ اس سے قبل ایک خط آپ کی خدمت میں ارسال کیا جا چکا ہے جس میں میگزین کے ان پرچوں کی تفصیل درج تھی جو آپ کو کالج کے دفتر سے مل سکیں گے۔ رقم کی ترسیل کے سلسلے میں گزارش ہے کہ آپ مبلغ ایک سو اسّی روپے محمد بلال صدیقی صاحب منیجر کتب خانہ نعیمیہ۔ دیو بند، ضلع سہارنپور کو ارسال فرما دیں۔ رسالے یہاں سے آپ کی خدمت میں بھیج دیئے جائیں گے۔

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ فقط والسلام

نیاز مند

سیّد عبداللہ

بخدمت شریف جناب

ڈاکٹر مختار الدین صاحب۔ ایم اے۔ ڈی فل۔ (آکسن)

شعبۂ عربی و اسلامیات۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ (انڈیا)

(۱۵)

۲۱/دسمبر ۵۷ء

مخدومی مکرمی۔ سلام مسنون۔ آپ کا مفصل خط ملا۔ مشکور و ممنون ہوں۔

مسعودی کے متعلق لٹریچر ملا۔ میں اس یادگار کے سلسلے میں تحریری حصہ لوں گا۔ اور اگر ممکن ہوا تو علی گڑھ بھی حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن قطعی نہیں۔ مضمون قطعی ہے انشاء اللہ۔ [۲۰]

آپ کے دونوں تحائف مل گئے تھے [۲۱] اور جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے ان کی رسید بھی بھیجی تھی۔

ذخیرہ احسن (۲۲) کے متعلق اب میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ آپ کو آف پرنٹس بھیجے گئے یا نہیں؟ میں ان کے متعلق دفتر سے جواب لے کر آپ کو بھجوا دوں گا۔ ورنہ میگزین کا وہ نسخہ۔ (۲۳)

''تذکرہ مردم دیدہ''(۲۴) کی اشاعت میں عارضی التوا ہوگیا ہے۔ شاہد یہ بھی حکمت ربانی کے تحت ہوا۔ کیا اس نسخہ کی نقل کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ کیا یہ وہی نسخہ تو نہیں جو صدر یار جنگ مرحوم کے کتب خانے میں تھا۔

آپ ہمارے رسالے کے لیے جو کچھ لکھیں گے ہمیں منظور ہوگا بلکہ میں ذاتی طور پر ممنون ہوں گا۔ گلستان بے خزاں کے بارے میں یونیورسٹی لائبریرین سے دریافت کر کے مطلع کروں گا۔

آپ کے باقی استفسارات کا جواب دوسرے خط میں لکھوں گا۔ یہ اس لیے بھی کہ اس عرصے میں آپ کے ایک اور خط کی رسید سے مسرور و محظوظ ہوسکوں۔

نیاز مند

سیّد عبداللہ

(۱۶)

۷/جنوری ۱۹۵۸ء

مکرمی سلام مسنون۔

گرامی نامہ موصول ہوا۔ یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ۔ بوجہ مصروفیت جواب جلد ارسال نہ کرسکا جس کے لیے معذرت خواں ہوں۔ چند وجوہ کے سبب مسعودی کے جلسے میں خود شرکت نہ کرسکوں گا۔ ان شاء اللہ مضمون آپ کی خدمت میں ارسال کر دیا جائے گا۔ فرصت ملنے پر ''مردم دیدہ'' کے سلسلے میں تفصّل خط لکھوں گا، بین الاقوامی اسلامی مباحثہ آج کل لاہور میں ہو رہا ہے مجھے اس کی شرکت سے محروم رکھا گیا ہے۔(۲۵) داستان طویل ہے۔ کبھی زبانی ہی بیان کروں گا۔ مباحثہ کا لٹریچر اگر مل سکا تو ارسال خدمت کر

دوں گا۔

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ فقط والسلام

نیاز مند

سیّد عبداللہ

بخدمت شریف جناب

ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب، ایم اے۔ پی ایچ ڈی

صدر شعبۂ عربی و علوم اسلامی، مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

(۱۷)

یکم نومبر ۱۹۵۸ء

مکرم و محترم ڈاکٹر صاحب۔ سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔ شکریہ۔ جواباً تحریر ہے کہ اورینٹل کالج میگزین کی مکمل فائل ہمارے پاس موجود نہیں۔ جو پرچے مل سکتے تھے ان کی ایک فہرست آپ کو پہلے ارسال کی جا چکی ہے۔

رسالے کا سالانہ چندہ ۴ روپے ہے اور پرانے شماروں کی قیمت دو روپے فی شمارہ ہے۔

انسٹی ٹیوٹ (۲۶) کی طرف سے ہمیں کوئی خط موصول نہیں ہوا وگرنہ جواب ضرور دیا جاتا۔ دفتری مصروفیات کی وجہ سے تذکرہ مردم دیدہ کے لیے وقت نہیں ملتا۔ کوشش کر رہا ہوں کہ جلد شائع ہو جائے۔

امید ہے کہ آپ بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں گے۔

فقط والسلام

سیّد عبداللہ

بخدمت جناب ڈاکٹر مختار الدین صاحب
۵-حالی روڈ۔علی گڑھ بھارت

(۱۸)

۲۴/اپریل ۱۹۵۹ء

مکرمی سلام مسنون۔

عنایت نامہ موصول ہوا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ فارسی اور عربی کی تعلیم کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں آپ جو کام کر رہے ہیں وہ یقیناً بہت اہم ہے۔ حق تعالیٰ آپ کو اس نیک اور عظیم مقصد میں کامیاب و کامران فرمائے۔ آمین

اورینٹل کالج میگزین کی گذشتہ دو سال کی رپورٹیں ارسال خدمت ہیں۔ ان سے آپ کو مطلوبہ فہرست مل جائے گی۔ اس کے علاوہ اس ادارہ کے دیگر کوائف سے بھی آپ باخبر ہو سکیں گے۔ (۲۷)

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ فقط کالج کی رپورٹیں علیحدہ بذریعہ بک پوسٹ ارسال ہیں۔

مخلص
سیّد عبداللہ

بخدمت جناب ڈاکٹر مختار الدین صاحب
ریڈر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
مسلم یونیورسٹی۔علی گڑھ (یو۔پی)

(۱۹)

۸/مئی ۱۹۶۳ء

مکرم و محترم۔ سلام مسنون۔

مزاج شریف۔ آپ کو ایک زحمت دے رہا ہوں امید ہے آپ کرم فرمائیں گے۔
بیس بائیس سال ہوئے میری کتاب ''فارسی ادب میں ہندوؤں کا حصہ'' انجمن ترقی اردو نے طبع کی تھی۔ کچھ عرصے سے یہ کتاب نایاب ہے۔ بعض حلقوں کی طرف سے اس کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت کا تقاضا ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب اگر بھارت میں چھپے تو مناسب ہوگا۔ کیا انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ اس کا اہتمام کر سکتی ہے۔ آپ پروفیسر آل احمد سرور صاحب سے بات چیت کر کے مجھے بتایئے[۲۸] کہ اس سلسلے میں ان کی کیا رائے ہے اور وہ کس حد تک امداد کر سکتے ہیں۔
امید ہے مزاج گرامی بخیر ہو گا۔ فقط والسلام

نیاز مند
سیّد عبداللہ

بخدمت جناب ڈاکٹر مختار الدین صاحب
ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ بھارت

(۲۰)

۳۰/ دسمبر ۱۹۶۳ء

مکرمی۔ سلام مسنون!
استاد بزرگ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی یاد میں یونیورسٹی اور کالج میگزین کا ایک خاص نمبر مئی ۱۹۶۴ء میں شائع ہوگا۔ یہ شمارہ اہم تحقیقی، تنقیدی اور علمی مضامین پر مشتمل ہوگا۔
آپ سے التماس ہے کہ آپ بھی اپنی پسند کے کسی موضوع پر مقالہ لکھ کر ہمیں ممنون فرمائیں۔ پرچے کی طباعت کے لیے خاصا وقت درکار ہوگا۔ ان حالات میں آپ سے درخواست ہے کہ اپنا مقالہ فروری کے آخر تک ہمیں بھیج دیجیے تا کہ یہ خاص نمبر

بروقت شائع ہو سکے۔

آپ کے تعاون کا طالب

نیاز مند

سیّد عبداللہ

بخدمت شریف جناب ڈاکٹر مختار الدین آرزو صاحب

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ انڈیا

(۲۱)

۲۴/فروری ۱۹۶۷ء

مکرم و محترم! السلام علیکم۔

آپ کا نامہ گرامی مورخہ ۱۹۶۷-۱-۲۵ موصول ہوا۔ شکریہ

سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم جن صاحبان کے پاس اپنے کرا سے تبصرے کے لیے بھجواتے ہیں ہمیں ان کے بارے میں یہ بتانا پڑتا ہے کہ تبصرہ نگار صاحبان نے کن جرائد و رسائل میں تبصرے شائع کرائے ہیں اور ان جرائد و رسائل کے تراشے بھی دکھانا پڑتے ہیں۔

چونکہ آپ کی طرف سے کوئی مطبوعہ تبصرہ موصول نہیں ہوا تھا اس لیے دفتر کو مجبوراً کرا سے بھیجنا بند کرنا پڑے۔ بہرکیف آپ کے محوّلہ خط کے ساتھ جس تبصرے کی نقل تھی اس کے متعلق آپ نے یہ نہیں تحریر فرمایا کہ وہ کس رسالے یا اخبار میں چھپا ہے۔ براہ کرم وہ رسالہ یا اخبار ارسال فرمائیں تاکہ ہم حکام کو بھجوا سکیں۔

''اسوان'' اور ''جمال الدین محمود الاستادار'' کے مقالوں کا بل یونیورسٹی کے صدر دفتر میں بھیجا ہوا ہے، لیکن زرمبادلہ نہ ملنے کی وجہ سے اس کی ادائیگی نہیں کی جا سکی۔ ان دونوں مقالوں کے معاوضے کی رقم ۱۱۳۰۸۳ روپے بنتی ہے اگر آپ فرمائیں تو [اس رقم

کی کتابیں اور رسائل بھجوا دیئے جائیں]۔[۲۹]

نیاز مند

سیّد عبداللہ

(۲۲)

معرفت ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

۲۲/اپریل ۱۹۸۲ء

محترم و مکرم و معظّم جناب ڈاکٹر صاحب۔

السلام علیکم۔ مزاج شریف۔

جناب وحید قریشی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ لاہور تشریف لا رہے ہیں (اور لے آئے ہوں گے)۔

آپ سے درخواست ہے کہ ۲۴/اپریل ۱۹۸۲ء کو دائرۂ معارف اسلامیہ کے دفتر (نزد یونیورسٹی ہال) میں ۱۱ بجے تشریف لا کر مدیرانِ ادارہ کو شرف ملاقات بخشیں، ہم ممنون ہوں گے۔ میں آج پچھلے پہر لاہور سے باہر جا رہا ہوں اور پرسوں ہی واپسی ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ۔ ورنہ میں جلد آپ سے ملاقات کر سکتا۔ لہٰذا اب پرسوں آپ کے لیے ہم ادارے میں منتظر ہوں گے۔ باقی عندالملاقات والسلام۔

نیاز مند

سیّد عبداللہ

ضمیمہ (۱)

۲۹/دسمبر ۱۹۵۶ء

مکرمی و محترمی ڈاکٹر صاحب۔ سلام مسنون

اورینٹل کالج میگزین۔ کے ۱۰۹ پرچوں کا ایک سیٹ آپ کی خدمت میں ارسال کیا

جا رہا ہے میگزین کے پرچوں کا بل مبلغ ایک سو چوراسی روپے بھی ارسال خدمت ہے۔ چند پرچے نایاب ہونے کے سبب سیٹ مکمل نہ ہو سکا جس کا افسوس ہے۔ بہرحال جو پرچے مل سکے ارسال کیے جا رہے ہیں۔ از راہ کرم بل کی ادائیگی مینیجر صاحب کتب خانہ نعیمیہ (دیو بند) کو فرما دیں اور اس کی اطلاع ہم کو بھجوا دیں۔ اطلاع ملنے پر فوراً رسالے مختلف پیکٹوں میں آپ کی خدمت میں ارسال کر دیئے جائیں گے۔

آج کل یہاں پاکستان اورینٹل کانفرنس کے اجلاس ہو رہے ہیں جس کے سبب بے حد مصروفیت ہے۔ ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین کے پرچے بھی اورینٹل کالج میگزین کے پرچوں کے بعد آپ کی خدمت میں ارسال کر دیئے جائیں گے۔

فقط والسلام

پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

بخدمت جناب ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب

ایم اے۔ ڈی فل (آکسن)

شعبۂ عربی و اسلامیات۔ مسلم یونیورسٹی۔

علی گڑھ۔ انڈیا

ضمیمہ (۲)

۱۲/ستمبر ۱۹۶۷ء

مکرمی! السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۱۸/ جولائی ۱۹۶۷ء موصول ہوا، شکریہ۔

آپ کے مقالات کے معاوضے کا بل جو ۱۱۳ روپے ۸۳ پیسے کا ہے، بنک ڈرافٹ کے لیے سٹیٹ بنک آف پاکستان کو بھیجا ہوا ہے۔ اس کی ادائیگی آپ کو ہندوستان میں بذریعہ بنک ڈرافٹ ہوگی۔ افسوس ہے کہ مسٹر محمد اسلم صاحب[۳۰] کو جن کے متعلق آپ نے لکھا ہے، اس معاوضے کی ادائیگی نہیں ہو سکے گی۔

امید ہے آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ والسلام۔

مخلص

(نصیر احمد ناصر)

بخدمت شریف جناب مختار الدین احمد صاحب

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز،

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (بھارت)

حواشی

(۱) خط پر سالِ تحریر درج نہیں ۱۹۵۱ء کا لکھا ہوا ہونا چاہیے۔

(۲) زیر اشاعت کتاب ''نقدِ غالب'' (دہلی ۱۹۰۲ء) میں شائع ہوئی۔

(۳) تصانیف غالب کے بعض قدیم مطبوعہ نسخے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہیں، ان کے عکس مطلوب تھے، احوال غالب، نقدِ غالب کے بعد تیسری کتاب ''گنجینۂ غالب'' کے لیے۔ بعد کو ''نکات و رقعات غالب'' کی دستی نقل مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (مغل پورہ لاہور) نے بھیج دی تھی۔

(۴) غالب پر تنقیدی مضامین کے پیش نظر مجموعے کے لیے اچھے اور مناسب نام کی تلاش تھی۔ بعد کو اس کا نام ''نقدِ غالب'' تجویز ہوا۔

(۵) اس زمانے میں زیروکس کاپی کا انتظام نہیں تھا۔ ''نکات'' کسی نقل نویس سے فاضل معاصر مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (۱۹۳۳ء-۱۹۸۷ء) نے نقل کرا کے اور خود لائبریری جا کر اصل سے مقابلہ کر کے بھیج دیا تھا۔ ''سوالات عبدالکریم'' کی نقل مالک رام صاحب نے فراہم کر دی تھی۔

(۶) مرتضیٰ حسن بلگرامی نہیں، مولانا سیّد مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (د۔مغل پورہ لاہور) مراد ہیں۔ ان کا مضمون اورینٹل کالج میگزین یا رسالہ نگار میں شائع ہوا تھا۔

(۷) میں نے کتاب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے ذریعہ لاہور سے منگوا لی۔

(۸) ''نوادر الالفاظ'' کے دو ایک ایسے نسخوں کی میں نے سیّد صاحب کو اطلاع دی تھی جو ان کے پیش نظر نہیں تھے۔

(۹) اس وقت تک زیر طبع کتاب کا نام طے نہیں ہوا تھا۔ ''مطالعہ غالب'' بھی زیر تجویز ناموں میں ایک نام تھا۔

(۱۰) نادر مخطوطات و مطبوعات کے مالک پروفیسر سراج الدین آزر (م۔۔۔) مراد ہیں۔ ان کے ذخیرے کی ایک انگریزی کتاب ۲۹ ستمبر ۱۹۳۹ء کو انجمن ترقی اردو ہند کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ٹاؤن ہال دہلی کی نمائش میں دیکھی تھی۔ یہ کتاب ملکہ وکٹوریا کی ملکیت تھی جو انھوں نے اپنے استاد مولوی عبدالکریم کو تحفے کے طور پر پیش کی تھی۔ اس پر ملکہ کے ہاتھ کی حسب ذیل اردو تحریر درج تھی:

منشی عبدالکریم

یہ کتاب تمھارے واسطے ہے

ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند

یورپ جانے سے پہلے میری دلچسپی ''تذکرہ نفائس المآثر'' سے تھی۔ طے ہوا تھا کہ عرشی صاحب سے مل کر اسے ایڈٹ کروں گا۔ اسی زمانے میں معلوم ہوا تھا کہ پروفیسر آزر کے کتب خانے میں بھی اس کا نسخہ ہے۔ اس کے حصول کی کوشش ناکام رہی۔

(۱۱) یہ دیوان غالب کا وہی نسخہ جسے ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن صاحب نے مکتبۂ اعجاز لاہور سے ۱۹۹۸ء میں اور پھر بڑے اہتمام سے ''نسخہ خواجہ'' کے نام سے الوقار پبلی کیشنز لاہور سے اگست ۲۰۰۰ء میں شائع کیا ہے۔ اس نسخے کی اطلاع مجھے ۱۹۵۲ء میں ملی تھی، آج سے پچاس سال پہلے لیکن اس وقت اس کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

(۱۲) سیّد صاحب کا مضمون ارمغان علمی میں تو نہیں ہاں ماہ نو کراچی (جولائی ۱۹۵۴ء) میں اشاعت پذیر ہوا، اور پھر دوسری جگہ چھپا۔

(۱۳) وہی نسخہ مراد ہے جسے سیّد معین الرحمٰن صاحب نے لاہور سے شائع کیا۔ اس اہم قدیم نسخے پر میں سیّد صاحب کا مضمون ''گنجینۂ غالب'' کے لیے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اشاعت میرے

مقدر میں نہ تھی۔ یہ بعد کو ۱۹۵۴ء میں ''ماہ نو'' میں شائع ہوا۔

(۱۴) دیوان غالب کا وہی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا نسخہ جس کا ذکر سابق میں گزرا۔ مجھے دیوان غالب کے اس نسخے میں بے حد دلچسپی تھی۔ نہ لاہور آ کر اسے دیکھ سکتا تھا نہ اس کا عکس منگوا سکتا تھا کہ اس زمانے میں عکس برداری کی آسانیاں نہیں تھیں جو اب ہیں۔ اس لیے چاہتا تھا کہ سیّد صاحب جلد اس نسخے پر مضمون لکھیں کہ اس کے مندرجات پر آگاہی ہو۔

(۱۵) کتاب التنبیہات علی اغالیا الرواۃ، مصنفہ ابوالقاسم علی بن حمزہ البصری، ایک اہم کتاب جو اس وقت چھپ کر منظر عام میں نہیں آئی تھی۔ استاد مرحوم علامہ عبدالعزیز المیمنی کو دارالکتب المصریہ، قاہرہ میں اس کا قلمی نسخہ ملا۔ وہ ۱۹۳۹ء میں اس کی نقل اور متن کی تصحیح کے کام سے فارغ ہو چکے تھے پھر وہ دوسرے علمی کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے، کوئی چودہ پندرہ سال کے بعد پھر استاد محترم نے اس کام کو اٹھایا اور چیک و اصلاح، ترمیم و اضافے کے بعد ۱۹۵۲ء میں طباعت کے لیے اسے تیار کر دیا۔ لیکن ڈاکٹر سیّد عبداللہ اور ہندوستان، پاکستان بلکہ عرب دنیا کے علماء و محققین کو اس کی اطلاع نہ ہو سکی۔ کس واسطے کہ الاستاذ کا تیار کیا ہوا مسودہ دارالمعارف مصر میں طباعت کے انتظار میں پڑا رہا۔ آخر کتاب کی ترتیب و تصحیح و تحشیے کے کوئی ۲۸ سال بعد ''ذخائر العرب'' کے سلسلے میں یہ گراں قدر کتاب ۱۹۶۷ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔

(۱۶) کتاب التنبیہات پر سیّد صاحب کا ایک مضمون اورینٹل کالج لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اوکسفورڈ کے قیام کے چند ہی ہفتوں کے بعد میں نے باڈلین لائبریری میں اس کا نسخہ دیکھا جو سیّد صاحب کے پیش نظر نہیں تھا۔ میں نے انھیں اس کا عکس بھیجنے کی پیش کش کی تھی۔

(۱۷) میں نے ایک مضمون میں جسے مولوی محمد شفیع صاحب نے اورینٹل کالج میگزین میں شائع کیا تھا، علی گڑھ کے نادر مخطوطات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''حال نامۂ بایزید انصاری، مصنفۂ علی محمد ابوبکر قندھاری مرید و خادم خاندان بایزید انصاری۔ بایزید انصاری عہد اکبری کے مشہور بزرگ ہیں جنھیں لوگ ''پیر روشن ضمیر'' کہتے تھے اور جنھوں نے پہاڑوں میں ایک دینوی حکومت قائم کر رکھی تھی اور جن سے شاہان دہلی پریشان اور حکومت کا امن پراگندہ تھا۔ یہ کتاب روشنیہ تحریک کی بہترین تاریخ ہے۔ اس نسخے کے علاوہ دنیا میں کسی اور

نسخے کے وجود کا علم نہیں ہے۔‘‘

شفیع صاحب جنھیں اس نسخے کا علم غالباً کامل حسین کی مرتبہ فہرست سے ہوا، مجھے لکھا کہ میں اس کتاب کی نقل کا انتظام کروں۔ چنانچہ میں نے لٹن لائبریری میں اورینٹل سیکشن کے ایک مستعد باصلاحیت کارکن مولوی مشتاق حسین کو اس کی نقل پر مامور کیا جنہوں نے کچھ عرصے میں مکمل کتاب نقل کر کے شفیع صاحب کو بھیج دی۔ افسوس یہ اہم کتاب اب تک شائع نہیں ہو سکی۔

(۱۸) میں نے پروفیسر ہملٹن گب کی نگرانی میں ایک شامی مصنف و شاعر مسلم بن محمود الشیرازی (متوفی بعد از ۶۲۲ھ) کی ’’جمهرة الاسلام ذات الشر و النظام‘‘ کے منحصر بفرد نسخے پر جو لائیڈن یونیورسٹی لائبریری، ہولینڈ میں محفوظ ہے کام کیا تھا جس پر مجھے اوکسفورڈ سے ڈی۔ فل تفویض ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ انگلستان، فرانس، جرمنی، ہولینڈ کے قیام کے دوران بہت سے مخطوطات عربی و فارسی و اردو کا مطالعہ کیا تھا اور ان پر نوٹس تیار کیے تھے۔ کچھ پر مضامین بھی شائع کیے تھے۔ کچھ خاص مخطوطات کے عکس و فلم بنوا کر اپنے ساتھ لایا تھا۔ کچھ کا ذکر میں نے سیّد صاحب کے خط میں کیا ہوگا۔

(۱۹) ’’نقدِ غالب‘‘ کا مسودہ میں نے ۱۹۵۳ء کے اواخر میں انجمن کے حوالے کیا تھا۔ اس کے سیکرٹری قاضی عبدالغفار صاحب اسے قاضی معزالدین احمد کے آزاد کتاب گھر دہلی سے چھپوانا چاہتے تھے۔ لیکن قرعہ فال بنام مکتبۂ جامعہ نئی دہلی پڑا۔ کچھ قاضی صاحب کی علالت، کچھ جامعہ کے ہجوم کار اور کچھ قاضی عبدالودود صاحب کے تساہل اور پیدا کردہ مشکلات کی وجہ سے کتاب کی اشاعت میں خاصی تاخیر ہوئی۔ ’’نقدِ غالب‘‘ کے جس دن دس نسخے مجھے ملے اسی دن دو نسخے خلیل الرحمٰن اعظمی کو دیے۔ ایک انھیں جن کا اس میں ایک مضمون چھپا تھا اور دوسرا ڈاکٹر سیّد عبداللہ کو لاہور بھیجنے کے لیے۔ میں اسی دن علی گڑھ سے باہر جا رہا تھا۔

(۲۰) انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جہاں میں اس وقت ریڈر تھا ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کی نگرانی میں مشہور عرب جغرافیہ داں المسعودی پر ایک بین القومی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ سیّد صاحب اس میں شرکت فرمائیں۔

(۲۱) تحائف کیا بھیجے تھے یاد نہیں، ہندوستانی علمی مطبوعات ہوں گی۔ سیّد صاحب نے اگر رسیدی خط مجھے لکھا تھا تو وہ میرے ذخیرۂ مخطوطات میں محفوظ نہیں۔

(۲۲) میرا مضمون: فہرست مخطوطات عربی و فارسی و اردو ذخیرۂ احسن مارہردی لٹن لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو ڈاکٹر عبداللہ صاحب کی اورینٹل کالج جلد ۶۲ عدد اعدد ۱۲۳ (نومبر ۱۹۵۵ء) میں شائع ہوا تھا۔

(۲۳) آف پرنٹس شائد تیار نہیں کیا جا سکا، میگزین کا ایک نسخہ مل گیا تھا۔

(۲۴) حاکم لاہوری کا تذکرہ سیّد صاحب مرتب کر کے اورینٹل کالج میگزین میں قسط وار چھپوا رہے تھے۔ میں نے علی گڑھ کے ایک نسخے کی اطلاع دی تھی۔

(۲۵) اس اطلاع سے دکھ پہنچا۔ معلوم نہیں وہ کیا ظروف اور کیا حالات تھے جن میں ایسا ہوا۔

(۲۶) انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے سیّد صاحب کی خدمت میں ایک استفسار بھیجا گیا تھا کہ لاہور، پشاور، کراچی میں عربی و فارسی و اسلامیات پر جو کام ہوا ہے یا ہو رہا ہے اس کے بارے میں اطلاع دیں۔

(۲۷) ایسا یاد آتا ہے کہ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا سالانہ اجلاس بنارس میں ہونے والا تھا۔ عربی و فارسی اور اسلامیات کے سیکشن کا میں صدر منتخب ہوا تھا۔ خطبۂ صدارت کے لیے مواد جمع کر رہا تھا۔

(۲۸) سیّد صاحب کی یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہوئی اور اب بھی یہاں فروخت ہو رہی ہے۔

(۲۹) خط کی آخری سطر ضائع ہوگئی ہے۔ عبارت حافظے کی مدد سے مکمل کر دی گئی ہے۔

(۳۰) پروفیسر محمد اسلم استاد شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فون نمبر: ۳۱۳۸۲۱/۵۳۳۵۳

اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ

ڈاکٹر سید عبداللہ
ایم اے، ایم او ایل، ڈی لٹ
پروفیسر ایمریطس
رکن اساسی، اکادمی ادبیات پاکستان
صدر، شعبۂ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ

وولنر ہال
پنجاب یونیورسٹی (شاہراہ قائداعظم)
لاہور ۲۔ جون ۱۹۸۲ء
نمبر 223

محب عزیز تحسین فراقی صاحب ۔ السلام علیکم ۔ طالب خیریت ہوں ۔

آپ نے مجھے ادب سے غیر متعلق سمجھ کر ، اپنی تصنیف جستجو مجھے نہیں دی لیکن میں نے ایک جگہ سے چرا کر اس کا مطالعہ کیا اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ شخص جب میرے ہی دل کی باتیں لکھ رہا ہے تو دل را بدل رہے است کیوں نہیں ہوا ۔ دراصل اپنی معمولی شخصیت کے باوجود بہت سے کام میں نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں اس لیے ملاقاتوں میں کدو اور نقل و جگہ حرکت میں قاصر الطبع ہوں ، اور زیادہ نقل و حرکت چاہتا ہے پس میری محرومی ۔

آپ کی کتاب کا ایک مضمون عسکری کی جدیدیت بہت اچھا لگا (باقی بھی اچھے تھے مگر یہ بہت اچھا لگا ۔ کیا آپ عسکریت کو مزید آگے نہیں بڑھا سکتے ۔

مجھے پچھلے پہر نماز مغرب کے بعد ملاقات میں سہولت رہتی ہے کبھی پہلے فون کر کے کسی شام آ جائیں تو شام دوستاں آباد ہو جائے اور کچھ باتیں بھی ہو جائیں والسلام ۔

مخلص

(سیّد عبداللہ)

بخدمت شریف
جناب پروفیسر تحسین فراقی صاحب
گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور

گھر کا پتا: المأمن، اردو نگر، ملتان روڈ، لاہور

سید عبداللہ
ریڈر اردو
پنجاب یونیورسٹی

حال ۔ مانسہرہ ضلع ہزارہ

۲۸ جولائی

مخدومی و مکرمی سید صاحب ۔ بعد سلام مسنون

مسٹر الطاف وما تسنیم کا مقالہ بعنوان "خواجہ میر درد کا تصوف" موصول ہو گیا ہے ۔ میں بعد از مطالعہ آپ کو اور یونیورسٹی کو مطلع کر دوں گا ۔ میں آج کل انتقال گرامی کے سلسلے میں یہاں مقیم ہوں ۔ ۲۲ جون کو والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا تھا اسی کی وجہ سے اب تک (سوائے ایک دو دن کے لاہور جانا پڑا تھا) یہاں ہی ہوں ۔

میں [illegible] یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ لاہور میں ہوں گے مگر اسی مقالے کی آمد نے غلط فہمی دور کر دی ۔ فرمائیے کیا آپ مستقلاً کراچی چلے گئے ہیں یا عارضی طور پر گئے ہیں ——— !

اردو کالج کو سندھ یونیورسٹی کے قریب کے خلاف جو کامیابی حاصل ہوئی قابل فخر ہونے کے علاوہ خوشی کی بھی ہے ۔ اس کامیابی کا سہرا پھر حضرت بابائے اردو کے [illegible] سر ہے (ان کے خلوص کے طفیل) ۔

مکتوب سید عبداللہ بنام ہاشمی فرید آبادی
۲۸ جولائی ۱۹۵۰ء

عطیہ سیّد

آ.جی

مجھے معلوم نہیں کہ اوائل عمر میں اُن پر کیا گذری۔ جو کچھ سنا حدیث تھی، حکایت تھی۔ جب مجھے شعور ہوا تو اُن کی زندگی کی دوپہر ڈھل رہی تھی، اور سہ پہر کے سائے ان کی جانب بڑھ رہے تھے، لیکن ان کے نازک وجود کا ہلکا سا ارتعاش غماز تھا کہ وہ وقت کے جھکڑوں سے گذر چکے ہیں، اور اُن کے خوبصورت —— تقریباً نسائی ہاتھوں کی اُبھری ہوئی پتلی رگوں میں خود اعتمادی کا فولاد رچ چکا ہے جو صرف بادِ مخالف کے تھپیڑوں سے نبرد آزما ہونے والوں کا نصیب ہوتا ہے۔

انسان ابھی تک اُس ٹائم مشین کو ایجاد نہیں کر سکا جس کا فسانہ مدتوں پہلے ایچ۔ جی ویلز نے رقم کیا تھا۔ سو جسمانی طور پر وقت کی مختلف جہتوں میں سفر کرنا ممکن نہیں، لیکن ذہنی طور پر یاد ماضی کی جانب اور تخیل، مستقبل کی سمت پرواز کی سکت یقیناً رکھتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ بھی ماضی بن چکے ہیں لہٰذا اُن کی شخصیت کی تصویر کشی یادداشت ہی کے وسیلے سے ممکن ہے، اور یہ یادداشت دریافت سے کم نہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ اب موجود نہیں، لیکن عدم وجود سے انکشافِ وجود کی جانب سفر ممکن ہے۔ تو آیئے ماضی کی سمت دریافت کے عمل کا آغاز کرتے ہیں۔

جوئے شعور کے دھاروں کے ساتھ اگر یاد کی کشتیاں رواں ہوں تو بہت سی تصویریں فراموشی کی دھند سے ابھرتی ہیں۔ میں اس وقت ان بہت سی تصویروں کے البم

سے صرف چند ایک عکس پیش کروں گی۔

ایک شبیہہ اُبھرتی ہے۔ ایک مکان اور اس میں ایک وسیع کمرہ جس میں ایک چار پٹوں والا دریچہ جو ایک بیری کے پرانے گھنے جنگل نما سر پر کھلتا ہے، جس میں بے شمار چڑیوں کے گھونسلے ہیں اور اُن کے چہچہانے کی آواز اس وقت بھی میرے کانوں میں آ رہی ہے۔ کمرے میں بچھے بہت پرانے انداز کے پلنگ پر ایک شخص، خالص مشرقی انداز میں لوئی کو اپنے گرد لپیٹے اونی ٹوپی پہنے، تفکر میں سرتا پا غرق، بیر کی جانب نگاہیں جمائے، کتابوں کے انبار میں گھرا بیٹھا ہے۔ کبھی کبھی تخیل کی شعبدہ بازی سے وہ مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویروں میں گڈمڈ ہو جاتا ہے، جو سراسر مشرقی جبّے پہنے اپنی حیرت زدہ آنکھوں سے ماضی کے جہان گم گشتہ کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ پھر اسی شخص کی تفکر میں ڈوبی آنکھیں میری توتلی زبان سے ''آ جی'' کا لفظ سن کر فرطِ مسرت سے مسکراتی ہیں اور دور خلاؤں کے سفر سے لوٹ آتی ہیں۔

یہ شبیہہ جوئے شعور کے سیلِ رواں سے کیوں ابھرتی ہے؟ شاید اس لیے کہ یہ تصویر اُن کی لوئی (جو وہ سردیوں میں اپنے گرد یوں لپیٹتے تھے کہ وہ ان کے جسم کو سر سے پاؤں تک مکمل طور پر ڈھانپ دیتی تھی) ان کے کئی رجحانات کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ مشرقیت سے گہرا اُنس اور بے پناہ محبت ہے۔ مصورِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویروں کی طرح ان کی روح بھی مشرقی تھی اور مشرق کی اس کھوئی ہوئی تہذیب کو تلاش کرتی رہی جس کے خد و خال مسلمانوں کے تہذیبی عروج سے نکھرے تھے۔

یہ شخص جو تصویر میں نظر آتا ہے گھٹنے موڑ کر خالص مشرقی انداز میں پلنگ پر بیٹھا ہے کہ ''آ جی'' کو اس انداز سے بیٹھنا بہت مرغوب تھا۔ جب وہ لکھتے تھے، پڑھتے تھے، سوچتے تھے یا محض خاموش سکون کے لمحوں سے گذرتے تھے تو اسی انداز میں بیٹھنا انھیں محبوب تھا۔ اس انداز کو ہم درویشانہ POSTURE بھی کہہ سکتے ہیں۔ بدھ صوفیوں کا عقیدہ تھا کہ طریقت کے مختلف مقامات کا اظہار صوفی کے اندازِ نشست سے ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ بڑی حد تک حقائق پر مبنی ہے، کیونکہ اس میں شک نہیں کہ ہمارا خارجی جسمانی

اندازِ نشست ہمارے داخلی اندازِ فکر کا عکاس ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پلنگ پر بیٹھے شخص کے روحانی نقوش میں سے ایک واضح نقش درویشی کا ہے۔ آبّی اول تا آخر درویش تھے اور رہے۔ ان کی درویشی سے لوگ آشنا ہوں یا نہ ہوں، گھر والے یقیناً واقف تھے۔ فقر اُن کا مسلک اور درویشی روشِ حیات تھی۔ وہ اگرچہ دنیا میں رہے، معاشرتی مسائل کے بارے میں سوچا، اعلیٰ مناصب پر نہ صرف فائز رہے بلکہ ان کے فرائض پوری تندہی سے سرانجام دیے، تحریکیں چلائیں، جلسے کیے، جلوس نکالے، مگر ان کی روح کے نہاں خانے میں کوئی حجرہ، کوئی خانقاہ ایسی ضرور تھی جس میں دنیا کی ہاؤ ہو، گہما گہمی اور نفسا نفسی سے گریز کی سرسراہٹ سنائی دیتی تھی، جیسے کوئی رات کو پر ہجوم شہر سے نکل کر صحرا کی بسیط وسعتوں میں واقع کسی خانقاہ میں چپکے سے دیا جلا کر اکیلا جا بیٹھے۔ آبّی اکثر اپنے باطن کی اسی خانقاہ میں اتر جاتے تھے، شاید اپنے روحانی زرہ بکتر کی مرمت کے لیے۔ دنیا کو انھوں نے کبھی ترک نہیں کیا، لیکن اسے کبھی اپنی سوچ اور اپنے ضمیر پر حاوی بھی نہیں ہونے دیا۔

کتابِ ماضی کے ورق اُلٹنے سے ایک اور گہری گمبھیر ظاہری کردار کی تہہ سے سنولائی ہوئی تصویر ابھرتی ڈوبتی نظر آتی ہے۔ لوئی لپیٹے اونی ٹوپی پہنے، کتابوں کے انبار میں گھرا، بیری کی جانب نگاہیں مرکوز کیے، پرانے انداز کے پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے جو شخص بیٹھا ہے، وہ اچانک اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ایک سرو قد، نازک، دبلی پتلی خاتون کی شکل میں ڈھل جاتا ہے، جس کی آنکھوں میں مہر و محبت کی وہ مسکراہٹ ابھرتی ہے جو تلخیِ حیات کا ثمر ہے اور صدیوں کی محروم عورت کا ارتفاع (SUBLIMATION) ہے۔

یہ خاتون آبّی کی والدہ ہیں جو ہری پور ہزارہ کے گرم میدانوں سے بیاہ کر شمال کے دور دراز بلند پہاڑوں اور تند سرد ہواؤں کی زد میں واقع ایک ننھے گاؤں میں اپنے لرزتے دل اور خوابناک آنکھوں سمیت آ بستی ہے، جو ہری پور ہزارہ کے روشن مہربان دنوں کو یاد کرتی ہے اور دیے کی مدھم لَو میں نم آنکھوں سے کھدر پر ریشم کے پھولوں کا جال بچھاتے ہوئے حافظ اور سعدی کے اشعار کا ہولے ہولے ورد کرتی ہے۔ یہ خاتون اپنی دو

بیٹیوں اور ایک ہمزاد بیٹے کو جنم دینے کے بعد اس جہانِ فانی سے رخصت ہو جاتی ہے۔ یہی وہ خاتون ہے جس کی تلاش آ جی کو شاید ہمیشہ رہی، جسے پا کر بہت جلد اُنھوں نے کھو دیا۔ برسوں بعد ادھیڑ عمر میں اُن پر منکشف ہوا کہ یہ خاتون خود اُن کے باطن میں موجود ہے — جدائی کا وہ کرب جس کی رگیں ان کے وجود کے طول و عرض میں دھڑکتی تھیں، اس مثبت مہم کو پیدا کرنے کا سبب بنا جس کا پھل انسانوں اور خاص طور پر بے مہری زمانہ سے کملائے لوگوں کے لیے ایک انمٹ محبت کی شکل میں ظاہر ہوا، اور ان کی آنکھوں میں وہ شمعیں دمکنے لگیں جو اصلِ حیات کو پانے سے لَو پکڑتی اور جلتی ہیں۔ ان کی زندگی کے ابتدائی ایام کے دور ہی سے وہ شجر سایہ دار پھوٹا جو بہت سوں کے لیے کڑی دھوپ میں مہربان سائبان تھا۔ اُن کی روحانی قوت کا راز اس اعتماد میں پوشیدہ تھا کہ بے بس، جابر سے اور صبر، جبر سے عظیم تر ہے کہ ان میں برداشت کا ظرف ہے۔

انھیں اپنی والدہ کی نہ صرف درازیٔ قامت، سفید رنگ، خوبصورت ہاتھ اور نفیس انگلیاں ہی جو سرجنوں اور مصوروں کا مقدر ہیں، حاصل ہوئیں بلکہ ان کا شعری ذوق بھی GENES کے ساتھ یوں منتقل ہوا کہ زندگی اور ادب کی لطافتوں کا عشق آ جی کے رگ و پے میں مکمل طور رچ بس گیا۔ عربی سے لگاؤ، بے شک انھیں اپنے والد سے حاصل ہوا، مگر فارسی اور فارسی شعر کے حسن کا احساس انھیں اپنی والدہ ہی سے ورثہ میں ملا۔ والدہ سے بچپن ہی میں جدائی اور اُس عہد کے روایتی پدری رعب نے اُن کی حساس طبیعت کو شدید طور متاثر کیا۔ یوں ان پر یہ منکشف ہوا کہ دکھ انسانی زندگی کی ایک بنیادی حقیقت ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ انسانی دکھ ہی وہ بیج ہے جس سے بڑی حد تک تمام شاعری کی کونپل پھوٹتی ہے اور تناور درخت کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی ایام ہی میں دکھ سے آشنائی نے آ جی کی طبیعت کو شعر و ادب کی جانب یوں مائل کیا کہ شعروں کے حسن سے دنوں تک ان پر رقت طاری رہتی تھی۔ خوبصورت اشعار کا ورد کرنا ان کا معمول تھا اور وہ اسے عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ اُن کی یہ فریفتگی مرتے دم تک قائم رہی۔ اسی فریفتگی نے پہلے انھیں مختلف زبانوں کے شعری اور نثری ادب کے مطالعے پر اکسایا اور

پھر انھیں فارسی اور اردو ادب کے نقاد کے روپ میں اجاگر کیا۔

انسان اور فطرت کے حسن کا احساس، ادب کی طرف جھکاؤ، شخصیت کی نرمی، محبت کی چاشنی، انسانی رشتوں کو اعتماد کی جذباتی بنیادوں پر استوار کرنے کا رجحان، زندگی کے موسموں کے تشدد کی جانب قبولیت کا رویہ، بے بسی اور بے کسی کے تقدس اور جبر کے بجائے روحانی تسخیر پر اعتقاد، شخصیت میں اصول تانیث یعنی Feminine Principle کو نمایاں کرتا ہے۔ ان کی شخصیت میں یہ غالب رنگ اسی روحانی پس منظر سے ابھرتا ہے جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ اسی بنا پر اُن کے وجود کی تہوں میں جذباتیت کی ایک دھار بڑی خاموشی سے کاریز کی طرح رواں تھی جو کبھی کبھی منطقیت کی ٹھوس زمین سے باہر نکل آتی، جذباتیت اور منطقیت کے اسی تناقض سے انھیں یہ وجدان حاصل ہوا کہ جذبات کی اپنی منطق ہوتی ہے اور اس منطق کو انھوں نے اپنی زندگی میں اپنی تحریروں اور تقریروں میں جا بجا استعمال بھی کیا۔

فلسفیانہ رجحانات میں بھی ان کا التفات تصوف اور مثالیت (Idealism) کی جانب تھا۔ وہ ارسطو کا بہت احترام کرتے تھے، لیکن اصل یگانگت افلاطون ہی سے رکھتے تھے ــــــ افلاطون، جو تصوف اور مثالیت کے افکار کا علمبردار تھا اور جس کی اپنی شخصیت میں اصول تانیث کا غلبہ تھا۔ اردو شعراء میں بھی غالبؔ کی پرشکوہ شخصیت کو تسلیم کرنے کے باوجود انھیں دلی لگاؤ غمناک آنکھوں والے میرؔ ہی سے تھا جس کی شخصیت اور شاعری میں اصول تانیث کی جھلک بہت نمایاں ہے۔

شاید قارئین کے لیے یہ بات باعثِ حیرت ہو کہ آج بھی اپنے عہد اپنے زمانے اور اپنے طریق سے ایک Feminist تھے۔ صدیوں سے دبی ہوئی، باورچی خانے میں میکانکی تواتر سے ایک مزدور کی طرح کام کرتی ہوئی، سلائی کی مشین پر جھکی ہوئی، غمناک آنکھوں والی عورت کی نارسائی سے وہ خوب واقف تھے اور اس کی اذیت کا انھیں شدید احساس تھا، اگرچہ انھوں نے کبھی اس کا اظہار جدید مغربی محاورے میں نہیں کیا کہ اسی لیے اجنبیوں کے نزدیک اس کا ظاہری رویہ بڑی حد تک روایتی نظر آتا تھا، لیکن عورت کی

مظلومیت اور بطور انسان اس کی مساوات کا احساس ان کے باطن کی اندرونی تہوں میں اُن کے رگ و پے میں خون کی طرح رواں دواں تھا۔

اگر چہ ''آ جی'' کی شخصیت کے تانے بانے میں اصول تانیث تانے کا درجہ رکھتا تھا، لیکن اصول مذکر کا بانا بھی موجود تھا۔ آ جی کی شخصیت میں اصول مذکر کا عکس ان کے والد کی موجودگی کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے والد کے آبا و اجداد مشہدی سیّد تھے۔ ہندوستان میں اسی راستے سے داخل ہوئے جس سے بابر وارد ہوا تھا۔ پنجاب چکوال کے علاقے میں آباد ہوئے۔ آ جی کے جد امجد کے پانچ بھائی تھے جن میں ایک کی گمشدگی کی روایت ہے، باقی تین پنجاب میں ہی رہے، لیکن آ جی کے جد امجد سکھوں کے خلاف جہاد کی غرض سے شمال کی جانب روانہ ہوئے اور بعد میں شمالی جنگلوں میں ہی ہمیشہ کے لیے جا بسے۔ آ جی کے والد عالم دین بھی تھے اور طبیب بھی، مگر اپنی حکمت کو انھوں نے کبھی روپیہ کمانے کا ذریعہ نہیں بنایا۔ تنول کے وسیع علاقے میں دور دور تک خود جاتے اور لوگوں کا مفت علاج کرتے۔ اسی لیے وہ ''شاہ صاحب'' (جو سیّدوں کو عام طور کہا جاتا ہے) کے علاوہ ''طبیب میاں'' کے نام سے بھی مشہور تھے۔ انھیں عربی فارسی پر بھی دسترس حاصل تھی۔ وہ ہمیشہ سفید رنگ خلقہ ☆ اور کالی رنگ کی پگڑی باندھتے تھے۔ ان کے نقوش بڑے متناسب، رنگ سرخ و سفید او رجلد پیاز کی جھلی کی طرح نفیس تھی۔ ان کے سراپے میں جسمانی جمال اور روحانی جلال بڑا واضح تھا۔ اس کا اظہار ان کی چمکیلی آنکھوں کی گرفت تھی۔ جب بھی میں ان کی آنکھوں کا تصور کرتی ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان میں جھانکتے ہی ان کا قد تیزی سے بڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا سر چھت کو چھونے لگتا۔ میں، آ جی اور باقی سب لوگ اس ایک ستون والے برآمدے میں (جس میں وہ عموماً چارپائی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھتے تھے) بہت چھوٹے ننھے منے لگنے لگتے۔ ان کے جلال میں ایک شل کر دینے والی قوت تھی جس نے ہمیشہ ان کے خاندان کے سب افراد کو ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کیا۔ وہ اپنے عہد کی روایت کے

☆ وہ ڈھیلا قمیص نما لباس جو اب بھی عرب اور ایرانی، عبا کے نیچے پہنتے ہیں۔

پابند ہونے کے ناتے سخت نظم و ضبط کے قائل تھے۔ ان کے اصول و ضوابط ایسے کڑے تھے کہ ان میں انسانی کمزوری اور استثنا کے لیے بال برابر لچک بھی موجود نہیں تھی۔ اگر کانٹ کے اخلاقی قانون Categorical Imperative☆ کی تجسیم ممکن ہوتی تو وہ دادا جی کی شکل میں ظاہر ہوتا۔

آ جی کی شخصیت میں اصول مذکر کا نظم و ضبط اور Categorical Imperative منتقل ہوا، مگر وہ انھی کے زخم خوردہ تھے لہٰذا انھوں نے اس کا توڑ بھی تلاش کرنا تھا۔ یہ توڑ انھیں ان کی شخصیت میں موجود اصول تانث کی بدولت حاصل ہوا۔ اسی بنا پر وہ نظم و ضبط کو اہم تصور کرنے کے باوجود انسان اور اس کی کوتاہیوں سے محبت کرتے تھے اور اُس کی کمزوریوں اور خطاؤں سے درگذر کا رجحان رکھتے تھے وہ Categorical Imperative کی اخلاقیات کو قبول کرتے ہوئے کبھی سقراطی معقولیت، اور کبھی صوفیانہ ڈھیل کے رویے کو اپناتے تھے۔

اصول تانث اور اصول مذکر، نظم و ضبط اور مشفق لچک، کانٹین اخلاقیات کے ساتھ ساتھ سقراطی معقولیت اور صوفیانہ درگذر کے تضادات ان میں موجود تھے، لیکن اِن کی موجودگی اُن کی شخصیت میں انتشار اور ٹکراؤ کے بیج بونے کا سبب نہیں بن سکی۔ شاید وہ عنفوانِ شاب میں ان کیفیات سے گذرے ہوں کہ عنفوانِ شباب کشمکش کا دور ہوتا ہے مگر جب میں نے انھیں دیکھا تو ان جنگجو تضادات کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والی گرد بیٹھ چکی تھی۔ شاید وہ برسوں کی صعوبت کے بعد دو انتہاؤں (جو خود ان کے اندر موجود تھیں) کے درمیانی نقطے کو —— سنہری میانہ روی، تناسب اور توازن کو (جسے یونانی زندگی کی عظیم قدر تصور کرتے رہے) —— دریافت کر چکے تھے۔ اسی لیے زندگی کی باریک دھار پر چلتے ہوئے وہ اپنی سوچ کو متوازن رکھنے میں یوں کامیاب رہے جس طرح ایک نٹ پتلی رسّی پر اپنے ڈولتے وجود کے توازن کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہتا ہے، اگرچہ اُسے یہ کمال برسوں کی مشقت اور ریاضت سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ سٹیل مل کی بھٹی

☆ کانٹ کا اخلاقی قانون کے بارے میں تصور جس کے مطابق اس کی نوعیت غیر مشروط حکم کی سی ہے۔

کی طرح سکریپ کو سٹیل میں، مثبت کو منفی میں ڈھالنے کا ڈھنگ جانتے اور محرومیوں کے ارتفاع کا سلیقہ رکھتے تھے۔ یہی وہ فن تھا جو ان کے نازک وجود کی بے پناہ روحانی قوت کا راز تھا۔

جوئے شعور کے بہتے پانیوں کی تہہ سے ایک اور عکس ابھرتا ہے۔ ایک دھند میں ڈوبی ہوئی دنیا کا، چاندنی میں نہال کوہ و دشت، خاموش برساتی نالے، کنواری ندیاں جنھیں انسانی ہاتھوں نے نہیں چھوا تھا، گھرے گمبھیر جنگل، مٹی کے صاف شفاف لیپے پوتے گھر، پتلی دشوار پہاڑی پگڈنڈیاں تمبر☆ کی ترشاوی خوشبو دار جھاڑیاں —— اور ان کے درمیان ایک قافلہ رواں دواں —— ایک دو گھڑ سوار، چند پیدل، کچھ خچر سامان بردار۔

یہ وہ دنیا ہے جہاں آجی نے اپنی زندگی کے ابتدائی سات آٹھ برس گذارے۔ یہیں وہ گاؤں ہے جو خالص پتھر کی بلند و بالا چٹانوں کے عین کنارے پر یوں واقع ہے کہ ہر لمحے طوفانی ہواؤں کے قہر سے اُس کے نیچے گرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ سنگلاخ چٹانیں کئی سو فٹ بلند ہیں اور عموداً نیچے ایک تنگ وادی اور پُرشور پہاڑی ندی میں جا اترتی ہیں۔ چھیاسی برس قبل یعنی آجی کی زندگی کے ابتدائی ایام میں یہاں کوئی سڑک موجود نہیں تھی، البتہ پتلی خطرناک پگڈنڈیوں کا جال ان اونچے پہاڑوں کے سینے پر پھیلا ہوا تھا۔ اب سے پندرہ برس پہلے بھی آجی کے گاؤں تک پہنچنے کے لیے پیدل یا گھوڑے پر سفر کیا جاتا تھا۔

آجی چودہ برس کی عمر میں لاہور آگئے اور ہمیشہ کے لیے لاہوری ہو گئے لیکن وہ سال میں ایک مرتبہ ضرور دادا جی سے ملنے کے لیے گاؤں جاتے تھے۔ یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا حتیٰ کہ میری پیدائش کے چند سال بعد تک بھی یعنی دادا جی کی وفات تک، اس ملاقات کے لیے بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ امی کے لیے زنانہ سواریوں کی عادی گھوڑی حاصل کی جاتی۔ آجی خود پیدل چلنا پسند کرتے تھے۔ ایک دو ملازم ساتھ لیے جاتے اور کچھ عزیزوں کو اکٹھا کیا جاتا۔ پھر آدھی رات کے بعد یہ قافلہ مانسہرہ سے روانہ ہو جاتا اور

☆ ایک خاص جھاڑی جو صرف پاکستان کے شمالی علاقوں میں پائی جاتی ہے۔

ہنستا کھیلتا، خوش گپیاں کرتا، چاند کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا تا کہ صبح کے سورج اور اس کی دھوپ سے پہلے منزل مقصود پر جا پہنچے۔ رستے میں کہیں کہیں گاؤں تھے جن کی پتھریلی گلیوں سے گذرتے ہوئے اس قافلے والوں کے پاؤں کی چاپ اور گھوڑے کے سموں کی آواز اچانک رات کی خوابیدہ خاموشی میں گونجتی۔

اب بھی مجھے یاد کی آنکھ میں یہ قافلہ رواں دکھائی دیتا ہے۔ کسی سوئے گاؤں کی گلیوں سے تیزی سے نکلتے ہوئے، گھوڑے کے سموں اور بے خواب گیدڑوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں —— مگر دور، بہت دور —— یہ قافلہ شاید وقت کا ہے جو گذر گیا۔ یہ دنیا آجی کی اوائل عمر کی ہے جہاں انھوں نے ہوش سنبھالا۔ یہ دنیا جہاں زمانۂ وسطیٰ مدتوں ٹھہرا رہا، اب تیزی سے بدل رہی ہے۔ خطرناک تنگ پگڈنڈیوں کی جگہ ایک چوڑی چکلی تارکول کی سڑک نے لے لی ہے جس پر ویگنیں شور مچاتی، دندناتی دوڑی جا رہی ہیں۔ وہ قافلہ اور اس میں شامل اکثر لوگ بھی رخصت ہوگئے۔ اب صرف ان کے نقوش پا ہیں جو یادوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔

◇—◈—◇

سیّد جمیل احمد رضوی

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

(کتابیات)

مختصر سوانحی خاکہ:

اصل نام: سیّد عبداللہ

قلمی نام: ڈاکٹر سیّد عبداللہ

والد کا نام: حکیم سیّد نور احمد شاہ

تاریخِ پیدائش: ۵/اپریل ۱۹۰۶ء

مقامِ پیدائش: موضع منگلور، تحصیل و ضلع مانسہرہ، ہزارہ ڈویژن، صوبہ سرحد

تاریخِ وفات: ۴/اگست ۱۹۸۶ء، لاہور

تعلیم: ابتدائی تعلیم گھر میں اپنے والد سے، پرائمری (منگلور)، مڈل (مانسہرہ) نویں جماعت (ایبٹ آباد)، دسویں پڑھائی اسلامیہ اسکول بھاٹی دروازہ، لاہور، لیکن امتحان پرائیوٹ (۱۹۲۳ء)، منشی فاضل ۱۹۲۲ء، ایف- اے دسمبر ۱۹۲۳ء، بی- اے اپریل ۱۹۲۴ء، ایم- اے عربی ۱۹۳۲ء، لائبریری سرٹیفکیٹ ۱۹۳۴ء،

جرمن سرٹیفکیٹ ۱۹۳۲ء، ڈاکٹر آف لٹریچر ۱۹۳۵ء (۲۲-۱۹۲۱ء میں جامعہ اسلامیہ علی گڑھ میں بھی رہے)۔

مصروفیات:

۱- فہرست ساز مخطوطات، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۷ء
۲- الفرڈ پٹیالہ فارسی ریسرچ سکالر ۱۹۲۷ء تا ۱۹۲۹ء
۳- خصوصی فارسی سکالر ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۱ء
۴- مہتمم شعبۂ عربی، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۸ء
۵- جونیئر لیکچرار فارسی، اورینٹل کالج، لاہور ۱۹۳۸ء تا ۱۹۳۹ء
۶- لیکچرار اردو، اورینٹل کالج، لاہور ۱۹۴۰ء و بعد
۷- ریڈر اردو، اورینٹل کالج، لاہور ۱۹۴۵ء و بعد
۸- صدر شعبۂ اردو اورینٹل کالج، لاہور ۱۹۴۸ء و بعد
۹- یونیورسٹی پروفیسر اردو، ۱۹۵۳ء و بعد
۱۰- پرنسپل، اورینٹل کالج، لاہور ۱۹۵۴ء تا ۱۹۶۶ء
۱۱- استاد و صدر شعبۂ عربی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۲ء و بعد
۱۲- مدیر، تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند ۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء
۱۳- صدر اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۶ء تا ۱۹۸۶ء

دیگر مصروفیات اور اعزازات:

(الف) پنجاب یونیورسٹی:

۱- رکن اورینٹل فیکلٹی ۱۹۳۹ء تا ۱۹۶۶ء
۲- رکن سنڈیکیٹ (کئی سال)
۳- رکن سینٹ

۴- رکن اکیڈمک کونسل ۱۹۴۵ء تا ۱۹۶۶ء

۵- رکن بورڈ آف گورنرز (اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی)

۶- اعزازی چیف لائبریرین، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۴ء

۷- اعزازی ناظم، ادارۂ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۳ء تا ۱۹۸۶ء

(ب) دیگر اداروں کی رکنیت:

۱- رکن انٹر یونیورسٹی بورڈ ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۵ء

۲- معتمد عمومی، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۵۶ء تا ۱۹۸۶ء

۳- رکن ترقی اردو بورڈ، کراچی

۴- رکن مرکزی اردو بورڈ، لاہور

۵- ٹرسٹی انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

۶- رکن مجلس ترقی ادب، لاہور

۷- رکن مرکزی رائٹرز گلڈ

۸- رکن بزم اقبال، لاہور

۹- رکن مجلس زبان دفتری، لاہور

۱۰- اعزازی پرنسپل و بانی، اردو کالج، لاہور

۱۱- رکن ہیئت حاکم، مقتدرہ قومی زبان

۱۲- رکن اساسی اکادمی ادبیات (پاکستان)

۱۳- رکن صد سالہ جشن اقبال کمیٹی

۱۴- رکن مجلس منتظمین، ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

تعلیمی اور تنظیمی سرگرمیاں:

۱- جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم تاریخ کانفرنس پشاور ۱۹۴۵ء

۲- جنرل سیکرٹری اردو کانفرنس پنجاب یونیورسٹی ۱۹۴۸ء

۳- جنرل سیکرٹری کل پاکستان بین الاقوامی اورینٹل کانفرنس ۱۹۵۵ء

۴- جنرل سیکرٹری اردو ذریعہ تعلیم کانفرنس، لاہور ۱۹۶۰ء

۵- صدر استقبالیہ اردو تدریس کانفرنس، لاہور ۱۹۶۱ء

۶- رکن قومی زبان کانفرنس، لاہور ۱۹۶۳ء

۷- جنرل سیکرٹری، عربی کانفرنس، لاہور ۱۹۶۴ء

۸- صدر مجلس تجاویز اردو تدریس کانفرنس، کراچی ۱۹۶۴ء

۹- صدر استقبالیہ دفتری کانفرنس، لاہور ۱۹۶۵ء

۱۰- جنرل سیکرٹری، عربی و فارسی کانفرنس، لاہور ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے والد حکیم نور احمد شاہ موضع منگلور، تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ میں رہائش پذیر تھے۔ وہ عالم اور طبیب تھے۔ سیّد عبداللہ کی پیدائش اسی موضع میں ۵/اپریل ۱۹۰۶ء کو ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ قرآن مجید کے ساتھ اردو کی درسی کتابیں، حساب، خوش خطی، ابتدائی فارسی اور خطوط نویسی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ پھر مقامی سکول میں داخلہ لے کر پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ مڈل کا امتحان مانسہرہ کے ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل سکول سے پاس کیا۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول ایبٹ آباد میں داخلہ لے لیا۔ نویں جماعت پاس کرنے کے بعد دسویں جماعت میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اسلامیہ ہائی سکول نمبر ۲ (بھاٹی دروازہ) میں داخلہ لے لیا۔ ایک سال اس سکول میں پڑھتے رہے۔ جب داخلہ بھیجنے کا وقت آیا، تو معلوم ہوا کہ ان کی عمر پندرہ سال سے دو تین ماہ کم ہے، اس لیے امتحان کے لیے داخلہ نہ جا سکا۔

سکول سے فارغ ہونے کے بعد ان کے چچا نے انھیں مدرسہ نعمانیہ (لاہور) میں داخل کروا دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ صبح کے وقت مولانا احمد علی کے درس قرآن میں بھی شریک ہوتے رہے۔ بعد میں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں منشی فاضل کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ کورس کی مشکلات کے باعث تین چار ماہ کے بعد اسی کالج کی مولوی عالم کلاس میں داخل ہو گئے۔ ابھی اس کی تکمیل نہ ہونے پائی تھی کہ اسی دوران لاہور میں جمعیت

العلمائے ہند کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔ زمانہ تحریک ترک موالات کا تھا۔ اس کانفرنس سے متاثر ہوکر جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کا رخ کیا۔ وہاں ان کے اساتذہ میں مولانا محمد سورتی، خواجہ عبدالحیٔ فاروقی، ڈاکٹر ذاکر حسین، سیّد عابد حسین، ڈاکٹر محمد عالم بار ایٹ لا، ملک عبدالرؤف اور دیگر شامل تھے۔ ۱۹۲۲ء میں واپس وطن (منگلور) آگئے۔ وہاں چند روز ٹھہرنے کے بعد لاہور آگئے اور منشی فاضل کا پرائیوٹ امتحان دیا جس میں کامیابی حاصل کی۔ منشی فاضل میں کامیابی کے بعد ۱۹۳۲ء کے اپریل میں میٹرک کا امتحان پاس کیا (صرف انگریزی میں)۔ دسمبر کے مہینے میں انٹرمیڈیٹ (صرف انگریزی) کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء کے اپریل میں بی۔ اے (صرف انگریزی) کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال اکتوبر میں اسلامیہ کالج لاہور ایم۔ اے فارسی میں داخل ہوگئے۔ ۱۹۲۵ء میں ایم۔ اے فارسی کا امتحان پاس کر لیا۔ اس زمانے میں ان کے اساتذہ میں پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی، قاضی فضل حق، پروفیسر ایم۔ ایم۔ مترا اور پروفیسر اسماعیل کے نام معروف ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں ایم۔ اے فارسی کا امتحان پاس کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مخطوطات کے فہرست ساز مقرر ہوگئے۔ ۱۹۳۲ء میں ایم۔ اے عربی کا امتحان امتیاز سے پاس کیا۔ اس دوران ان کے ممتاز استاد ڈاکٹر مولوی شفیع تھے۔ ۱۹۳۲ء میں جرمن سرٹیفکیٹ اور ۱۹۳۴ء میں لائبریری سرٹیفکیٹ کے امتحان پاس کیے۔ دو سال بے کاری میں گزارے۔ ۱۹۳۴ء میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں عربی و فارسی شعبے کے مہتمم (عربک اسسٹنٹ) مقرر ہوگئے۔ ۱۹۳۵ء ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی ڈگری حاصل کی۔ تحقیق کا موضوع، ''ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' تھا۔ لائبریری میں عربک اسسٹنٹ کی حیثیت سے ۱۹۳۸ء تک کام کرتے رہے۔

۱۹۳۸ء میں شاداں بلگرامی کی جگہ یونیورسٹی اورینٹل کالج میں منشی فاضل کے استاد مقرر ہوئے۔ دو سال تک اسی اسامی پر کام کیا۔ ۱۹۴۰ء کے ستمبر میں شعبۂ اردو میں بحیثیت لیکچرار منتقل ہوگئے۔ اس کے بعد ان کے منصب میں ترقی ہوتی گئی۔ ۱۹۴۵ء میں ریڈر

شعبۂ اردو ہوگئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء میں اسی شعبے میں پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی میں ایم۔ اے اردو کی کلاس کا اجرا ہوا۔ اس وقت شعبے میں سیّد صاحب ہی ایک مستقل استاد تھے۔ باقی اساتذہ اعزازی تھے۔ اپنی تدریس کے زمانے میں سیّد مرحوم نے اس شعبے کو ہر لحاظ سے وسعت دی۔ داخلہ لینے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ تحقیقی مقالات (Thesis) لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اس سے اورینٹل کالج کی تحقیقی روایت میں نہ صرف وسعت ہوئی بلکہ اس کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے میں بھی مدد ملی۔

قومی زبان ''اردو'' کی ترویج اور فروغ کے بارے میں سیّد مرحوم کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج کے خلاف تحریک کا بڑی حوصلہ مندی اور جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ ۱۹۵۴ء میں کالج کے یوم تاسیس کا آغاز کیا۔ اس تقریب کے موقع پر سیّد عبداللہ کا خطبہ السنۂ شرقیہ کے حق میں ان کے موقف کی وضاحت کرتا تھا۔ اس میں شہر کے ادیب، عالم، وکیل اور فنونِ مشرقی سے دلچسپی رکھنے والے لوگ کثیر تعداد میں شریک ہوئے تھے۔ نتیجتاً کالج کے حق میں رائے عامہ مستحکم ہوتی گئی۔ پرنسپلی کے دور میں کئی کانفرنسیں بھی کروائیں۔ اس طرح اردو اور علوم مشرقیہ کے حق میں ان اجتماعات کو اس طرح استعمال کیا گیا کہ ان کے خلاف اٹھنے والی تحریک رائے عامہ کے سامنے دم توڑ گئی۔

۱۹۶۶ء میں پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوگئے۔ اسی سال یونیورسٹی کے شعبۂ ''اردو دائرۂ معارف اسلامیہ'' کے صدر بنا دیے گئے۔ سیّد صاحب نے اپنی پوری توجہ اس کام کی رفتار کو تیز کرنے میں لگا دی۔ وہ اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کی زندگی میں اس کی تمام جلدیں شائع ہو جائیں۔ اب تک اس کی بائیس جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کا اشاریہ بھی طبع ہو چکا

ہے۔ مختصر اردو دائرۂ تعارف اسلامیہ، کا منصوبہ بھی ان کی زندگی میں بن گیا تھا۔

۱۹۶۳ء میں یونیورسٹی میں ادارۂ تالیف و ترجمہ کے اعزازی ناظم مقرر ہوئے اور آخر تک (۱۹۸۶ء) اس منصب پر فائز رہے۔ اس ادارے نے اب تک ۳۶ کتابیں سائنسی اور معاشرتی موضوعات پر شائع کی ہیں۔ یونیورسٹی سے باہر مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے معتمد عمومی کے طور پر ۱۹۵۶ء سے کام کرتے رہے۔ اس کا بنیادی مقصد سائنسی کتب کو اردو میں لکھوانا اور شائع کرنا تھا۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے اکیڈمی کی طرف سے ۶۴ کتابیں (بشمول چند پمفلٹ) شائع ہو چکی ہیں۔ نفاذ اردو کے لیے اکیڈمی کے زیر اہتمام اور بھی بہت سی کوششیں کی گئیں۔ ان میں اردو انجمنوں کی سالانہ مجلس مشاورت، اردو انجمنوں کی سالانہ کانفرنس، قومی زبان کانفرنس ۲۸/ مارچ ۱۹۷۵ء، مذاکرہ قائد اعظم کانفرنس ۱۱/ دسمبر ۱۹۷۶ء، علامہ اقبال اردو کانفرنس ۲ تا ۹/ نومبر ۱۹۷۷ء، قومی زبان کانفرنس ۴، ۵/ اپریل ۱۹۷۷ء اور رحمٰن اردو کانفرنس جون ۱۹۷۹ء شامل ہیں۔ ان کے علاوہ فروغ اردو کے لیے وقتی مہمات بھی جاری کی گئیں مثلاً موٹر گاڑیوں کے نمبر، دکانوں کے سائن بورڈ، مکانوں کے نام، عید کارڈ، ملاقات نامے اور ہوٹلوں کا کاروبار وغیرہ اردو میں کرانے کے لیے اردو مندوبین کا جلوس ۱۹۶۵ء میں نکالا گیا۔ اردو کے نفاذ کے سلسلے میں حکومتی اعلانات سے متعلق محضر نامے چھپوا کر حکومت کو یاد دہانی کے طور پر ارسال کیے گئے۔ ۱۹۸۷ء میں نفاذ اردو کے سلسلے میں دستخطی مہم شروع کی۔

۹/ مارچ ۱۹۸۶ء کو شعبۂ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ میں اپنے دفتر میں کام کر رہے تھے کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ میو ہسپتال، لاہور میں داخل کروا دیے گئے۔ کئی روز تک سخت نگہداشت میں رکھے گئے۔ بعد میں اپنی رہائش گاہ المامن (اردو نگر، ملتان روڈ، لاہور) میں آ گئے۔ کئی ماہ تک اس مرض میں مبتلا رہے۔ آخر آزادی کے دن ۱۴/ اگست ۱۹۸۶ء کو یہ نامور استاد، ادیب، صحافی، عالم اور محسنِ اردو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ ۱۵/ اگست کو ان کے جسدِ خاکی کو گلشنِ راوی لاہور کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

ابتدائی تحریریں :

لکھنے کی ابتدا ۱۹۲۲ء کے قریب قریب ہوئی۔ تحریک خلافت میں تھوڑی مدت کے لیے قید کی صعوبت برداشت کی۔ رہائی کے بعد اپنے گاؤں منگلور میں دو تین ماہ قیام کیا۔ سہ روزہ اخبار ''جاٹ'' نکالا۔ اس میں 'زمیندار'، 'مدینہ' اور 'نجات' کی خبریں نقل کرتے اور ایک مضمون خود لکھتے۔ اس کو گاؤں کی مسجد میں رکھا جاتا۔ خواندہ لوگ فرصت کے وقت اسے پڑھ لیتے۔ گاہے گاہے اس کو خود بھی پڑھ کر سناتے۔ اخباری مضمون نگاری کا آغاز ۱۹۲۷ء میں ہوا۔ 'زمیندار' میں ''داستان گو'' اور دوسرے قلمی ناموں سے لکھتے رہے۔ 'انقلاب' میں بھی کئی مضامین لکھے۔ ''صحیفہ زندگی'' کے نام سے روزنامچہ لکھنا شروع کیا۔ جس کے کچھ اجزا بعد میں اختر شیرانی کے رسالہ 'خیالستان' اور چراغ حسن حسرت کے رسالہ 'شیرازہ' میں چھپتے رہے۔

قلمی آثار (مطبوعہ کتب بشمول پمفلٹ)

اقبالیات:

۱- 'اسلامی فقہ کی تدوین نو علامہ اقبال کی نظر میں' لاہور، شعبۂ فلسفہ، جامعہ پنجاب، ۱۹۸۱ء (سلسلہ اقبال میموریل لیکچرز (۲): یہ لیکچر جامعہ کے سینٹ ہال میں ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو دیا گیا)

۲- 'اقبال اور صوفی - اختلاف و اتفاق کی کہانی، (پمفلٹ)، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۲ء (یہ مقالہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ (پروفیسر ایمریطس) نے ۲۴ر فروری ۱۹۸۲ء کو سول سروس اکیڈمی لاہور میں پڑھا)

۳- 'اقبال کی تنقید مغرب اور اس کی معنویت'، لاہور، شعبۂ فلسفہ، جامعہ پنجاب '۱۹۸۱ء (سلسلہ اقبال میموریل لیکچرز ۱۹۸۱ء (۱): یہ لیکچر جامعہ کے سینٹ ہال میں ۱۴ر ۱۹۸۱ء کو دیا گیا)

۴- 'شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اور اقبال، (پمفلٹ)، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۹ء

۵- 'سہل اقبال' (یعنی حضرت علامہ اقبال کے تصور خودی پر 'اسرار خودی' اور 'رموز بے خودی' کے حوالے سے آسان انداز میں بحث)، مکتبہ خیابان ادب، طبع اول: ۱۹۶۹ء

۶- 'اقبال اور قومیت'، لاہور، پاکستان نیشنل سنٹر (س۔ن)

۷- ’کیا اقبال اشتراکی تھے؟‘ لاہور، ڈیموکریٹک یوتھ فورس، (س۔ن)

۸- ’طیف اقبال‘ (ڈاکٹر اقبال کے فکر و فن پر ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب کے کلاس لیکچروں کا مجموعہ)، مرتبہ ممتاز منگلوری۔ لاہور، لاہور اکیڈمی، طبع اول: ۱۹۶۴ء

۹- ’مقاصدِ اقبال‘ (فکر اقبال کے اہم موضوعات)، لاہور، علمی کتاب خانہ، طبع اول: ۱۹۸۱ء

۱۰- ’متعلقات خطبات اقبال‘، لاہور، اقبال اکادمی، طبع اول ۱۹۷۷ء
(اس کتاب میں تین مضامین سیّد عبداللہ کے ہیں، باقی دوسرے حضرات کے ہیں)

۱۱- ’مسائل اقبال‘ (اہم موضوعات اقبال)، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، طبع اول: ۱۹۷۴ء

۱۲- ’مقالات اقبال‘، لاہور، ناشرین، طبع اول: ۱۹۵۹ء (پیش لفظ از میرزا ادیب)

۱۳- ’مطالعۂ اقبال کے چند نئے رخ‘ ۱۹۸۴ء، لاہور، مجلس ترقی ادب۔

۱۴- ’اعجاز اقبال‘ (مجموعۂ مقالات متعلقہ اقبالیات) لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

تحقیق و تنقید:

۱- ’اردو ادب ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۶ء‘، لاہور، مکتبہ خیابان ادب، طبع اول، ۱۹۶۷ء
(پہلا دیباچہ از میرزا ادیب، دوسرا دیباچہ از ڈاکٹر وحید قریشی شامل کتاب ہیں)

۲- ’مباحث: ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین‘۔ لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول: ۱۹۶۵ء۔ لاہور، علمی کتب خانہ، طبع دوم: ۱۹۷۹ء۔

۳- ’اردو ادب جنگ عظیم کے بعد‘، لاہور، اردو اکیڈمی پنجاب، طبع اول: ۱۹۴۱ء

۴- ’بحث و نظر‘۔ لاہور، مکتبہ اردو، طبع اول: ۱۹۶۸ء (پیش لفظ از میرزا ادیب)

۵- ’اشاراتِ تنقید‘ لاہور، خیابان ادب، طبع اول: ۱۹۶۶ء
ایضاً، طبع دوم: ۱۹۷۲ء (بہ ترمیم و اضافہ)
ایضاً، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول: ۱۹۸۶ء
ایضاً، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، طبع اول۔

اردو شاعری - نقد و نظر:

۱- 'اطرافِ غالب'، لاہور، گلوب پبلشرز، طبع اول: ۱۹۶۸ء

۲- 'چند نئے اور پرانے شاعر'، لاہور، اردو مرکز، طبع اول: ۱۹۶۵ء

۳- سخن ور (نئے اور پرانے)، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،

طبع دوم: ۱۹۷۶ء (حصہ اوّل)

ایضاً طبع اول: ۱۹۸۰ء (حصہ دوم)

۴- 'شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن'۔

لاہور، مکتبہ جدید، طبع اول: ۱۹۵۲ء

لاہور، مکتبہ خیابان ادب، طبع دوم: ۱۹۶۸ء

(مع تعارف از مولانا صلاح الدین احمد)

۵- 'طیف غزل (ولی، میر، درد، مصحفی اور آتش کی شاعری اور فن پر ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب کے کلاس لیکچروں کا مجموعہ)'، مرتبہ ممتاز منگلوری

لاہور، نذر سنز، طبع اول: ۱۹۶۳ء

(ترمیم و اضافہ کے ساتھ) طبع چہارم: ۱۹۷۶ء

۶- 'نقد میر'، میر تقی میر کی شاعری کا تجزیہ،

لاہور، آئینہ ادب، طبع اوّل: ۱۹۵۸ء۔

لاہور، اردو مرکز، طبع دوم: ۱۹۶۴ء۔

لاہور، مکتبہ خیابان ادب، طبع سوم: ۱۹۶۸ء۔

لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۹ء۔

۷- 'ولی سے اقبال تک' (اردو کے نامور شعراء پر مضامین)'

لاہور، مکتبہ جدید، طبع اول: ۱۹۵۸ء۔

لاہور، خیابان ادب، طبع سوم: ۱۹۶۶ء۔

لاہور خیابان ادب، ۱۹۷۶ء۔

لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز۔

اردو نثر - نقد و نظر :

۱- 'سرسیّد احمد خان اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ'

لاہور، مکتبہ کارواں، طبع اول: ۱۹۶۰ء۔

لاہور، علمی کتب خانہ، طبع چہارم : ۱۹۸۱ء۔

اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع اول : ۱۹۸۶ء۔

لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز۔

۲- 'طیف نثر' (وجہی سے دور جدید تک اسالیب نثر اردو کے ارتقا پر ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے کلاس لیکچروں کا مجموعہ)، مرتبہ ممتاز منگلوری

لاہور، نذر سنز، طبع اول : ۱۹۶۴ء

لاہور، لاہور اکیڈمی، طبع دوم : ۱۹۷۶ء

(پیش لفظ از ڈاکٹر وحید قریشی)

۳- منتخباتِ نثرِ اردو، برائے بی۔ اے و بی ایس۔ سی (بہ اشتراک ابو اللیث صدیقی)

لاہور، پنجاب یونیورسٹی، طبع اول : ۱۹۶۴ء

۴- میر امن سے عبدالحق تک، (مجموعۂ مضامین)،

لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول : ۱۹۶۵ء

۵- 'وجہی سے عبدالحق تک' (مجموعۂ مضامین)،

لاہور، مکتبہ خیابان ادب، طبع دوم : ۱۹۷۷ء

لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز۔

6- The Spirit and Substance of Urdu Prose under the Influence of Sir Sayyid.
Lahore, Sh. Muhammad Ashraf, 1940.

۷- 'ادب و فن'، (مجموعۂ مضامین) لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، جون ۱۹۸۷ء

پاکستانیات/کلچر :

۱- 'پاکستان (تعبیر و تعمیر)' لاہور، مکتبہ خیابان ادب، طبع اول ۱۹۷۷ء

۲- 'پاکستان میں اردو کا مسئلہ' لاہور، مکتبہ خیابان ادب، طبع اول ۱۹۷۶ء

۳- 'قائداعظمؒ تحریک بازیابی شوکت رفتہ کے آخری رہنما' (پمفلٹ)،

لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۶ء

۴- 'کلچر کا مسئلہ' لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، طبع اول : ۱۹۷۷ء

فارسی ادب :

۱- 'ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ' دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند) طبع اول: ۱۹۴۲ء

لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع دوم : ۱۹۷۷ء

۲- 'فارسی زبان و ادب' (مجموعہ مقالات) لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول: ۱۹۷۷ء

ترجمہ :

۱- 'تعلیم کے مقاصد' (از الفریڈ نارتھ وائٹ ہیڈ) لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۵۹ء

(یہ Aims of Education کا ترجمہ ہے)

متفرق :

۱- 'درخت اور دریچے' (ہلکے پھلکے فکر انگیز مضامین) لاہور، دارالادب، ۱۹۶۷ء

۲- 'تعلیمی خطبات اور دوسرے مضامین'

لاہور، مجلس ارادت مندان سیّد، طبع اول: ۱۹۶۶ء

۳- Stray Thoughts on Education in Pakistan

لاہور، بزم اقبال، ۱۹۹۲ء

فہرست سازی مخطوطات/مطبوعات :

۱- 'اردو میں علمی اور سائنسی کتابوں کی فہرست' (جو سلسلہ نمائش علمی یونیورسٹی ہال لاہور میں رکھی گئی تھیں) لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۰ء

اس فہرست کو ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے مرتب کیا۔ یہ نمائش پاکستان سائنٹفک سوسائٹی کی سالانہ کانفرنس ۱۹۶۶ء کے سلسلے میں ہوئی تھی)

The Descriptive Catalogue of the Persian, Urdu and Arabic Manuscripts in the Punjab Univesity Library. Lahore, University of the Punjab, 1942-1948 (V.1, Fasc.I History Fasc.II Persian Poetry).

قومی زبان :

۱۔ 'اعلیٰ تعلیم میں اردو کی حیثیت'، ترجمہ از ڈاکٹر محمد اسلم قریشی

اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول: ۱۹۸۴ء

۲۔ 'اردو ذریعۂ تعلیم اور نفاذ اردو' (پمفلٹ)

اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول: ۱۹۸۶ء

۳۔ 'وضع و استناد اصطلاحات'، (پمفلٹ)

اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول: ۱۹۸۵ء

۶۔ خطبۂ استقبال (جو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے سالانہ تقسیم انعامات منعقدہ ۱۰ مئی ۱۹۶۹ء کو پڑھا گیا) (پمفلٹ) لاہور، جدید اردو ٹائپ پریس، طبع اول: ۱۹۶۹ء

ترتیب و تہذیب :

۱۔ ارمغان علمی بخدمت پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع،

لاہور، مجلس ارمغان علمی، طبع اول: ۱۹۵۵ء

(پیش لفظ از ڈاکٹر ایس۔ اے۔ رحمان)

۲۔ 'تذکرہ مردم دیدہ' (فارسی- از عبدالحکیم حاکم لاہوری)

لاہور، پنجابی ادبی اکیڈمی، طبع اول: ۱۹۶۱ء

۳- 'مثنوی نل دمن، (از احمد سراوی)' کراچی، انجمن ترقی اردو، طبع اول : ۱۹۷۸ء

۴- 'نوادر الالفاظ مع غرائب اللغات، (فارسی- از سراج الدین علی خان آرزو)،
تصحیح، تحشیہ و مقدمہ کراچی، انجمن ترقی اردو، طبع اول : ۱۹۵۱ء
ایضاً، طبع دوم : ۱۹۹۲ء

غیر مطبوعہ مسودات :

۱- 'التنبیہات' مصنفہ ابوالقاسم البصری (عربی۔ تدوین اس کتاب کا ایک حصہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی رہنمائی میں ایڈٹ کیا)

۲- 'عزیز و محترم (بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کے متعلق شخصی تاثرات۔
ان کی تعداد ۵۰ ہے)

۳- 'تعلیم کے نئے زاویے' (۱۹ مقالات کا مجموعہ ہے)

۴- 'فکریات دینی و تہذیبی بشمول سیرت، (۱۸ مقالات)

۵- 'فکریات و نظریات' (فکری و تہذیبی مسائل -۳۴ مقالات پر مشتمل ہے)

۶- 'مطالعہ اقبال-نئی پیش رفت' (اس میں ۱۶ مضامین شامل ہیں)

۷- 'جدیدیت کے چند رخ (فکر مغرب کے حوالے سے)'
(۱۵ مقالات پر مشتمل ہے)

۸- 'پاکستانیات (فکری اور تہذیبی منظر)' (۱۰ مقالات)

۹- 'اقبالیات- تازہ تر (نقد و نظر)' (۱۳ مقالات پر مشتمل ہے)

۱۰- 'اسلام اور سوشلزم'
(اس میں وہ مقالات شامل ہیں جو 'نوائے وقت' میں عارف عرفان اور 'چٹان' میں احمد کبیر کے نام سے لکھے گئے)

۱۱- 'تبصرے، دیباچے، شذرے' (ان کی تعداد ۵۸ ہے)

۱۲- شخصیے، خودنوشت اور انٹرویو' (مقالات کی تعداد ۲۲ ہے)

مقالات

اقبالیات :

۱- ''علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری کے چند موقعے''، ادبی دنیا، لاہور، فروری ۱۹۳۰ء
ایضاً، مشمولہ 'آئینہ اقبال' از محمد عبداللہ قریشی،
لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۷ء
ایضاً، ادبی دنیا، لاہور، دور ششم، اقبال نمبر

۲- ''اقبال کے محبوب فارسی شاعر''، اردو، دہلی جولائی ۱۹۴۶ء

۳- ''اقبال کی فطرت نگاری''، اردو، کراچی، جولائی - اگست ۱۹۵۱ء
''اقبال کی فطرت نگاری''، ایضاً، اگست - ستمبر ۱۹۵۱ء

۴- ''اقبال شعرائے فارسی کی صف میں''، اقبال، لاہور، اپریل ۱۹۵۴ء
ایضاً، مشمولہ : 'مطالعہ اقبال، از گوہر نوشاہی (مرتب)،
لاہور، بزم اقبال، ۱۹۷۱ء

۵- ''گلشن راز جدید - خطبات کے آئینے میں''،
'اقبال، لاہور، اپریل - جولائی ۷۷ ۱۹ء
(اقبال نمبر)

۶- ''اقبال کا مدرسہ تعلیم''، اقبال ریویو، کراچی جولائی ۱۹۶۰ء

۷- ''اقبال ایک ادبی فن کار''، ایضاً جنوری ۱۹۶۲ء

۸- ''کیا اقبال جدیدیت کے پیشرو تھے''، ایضاً نومبر - دسمبر ۱۹۷۴ء

۹- ''اقبال اور وجودیت''، اورینٹل کالج میگزین، لاہور ۱۹۷۷ء
(جشن اقبال نمبر)

۱۰- ''اقبال اور ابن خلدون''، ایضاً جلد ۵۸ ۱۹۸۲ء

۱۱- ''اقبال و تصوف''، ایضاً ۱۹۸۴ء

۱۲- ''اقبال فہمی کے بنیادی اصول''، تعلیمات، لاہور مارچ ۱۹۷۸ء

۱۳- ''اقبال اور ابو الکلام کے ذہنی فاصلے''، چٹان لاہور،
(اقبال نمبر)، ۲۴ اپریل ۱۹۶۷ء

۱۴- ''کلام اقبال کا منسوخ حصہ''، ایضاً، ۲۴ اپریل ۱۹۶۷ء

۱۵- ''کیا اقبال اشتراکی تھے؟''، ایضاً، ۲۱ تا ۲۷ اپریل ۱۹۶۹ء

ایضاً، ۱۹ اپریل ۱۹۷۶ء

ایضاً، ۲۶ اپریل ۱۹۷۶ء

ایضاً، ۱۰ مئی ۱۹۷۶ء

۱۶- ''اقبال اور ملّا'' ایضاً، ۱۱ مئی ۱۹۶۹ء

۱۷- ''اقبال کی اردو نثر'' ایضاً، ۲۱ اپریل ۱۹۷۰ء

''۴۸ مقالے بسلسلۂ سال اقبال''۔ چٹان، لاہور، نومبر ۱۹۷۴ء تا اکتوبر ۱۹۷۵ء
ان مقالات کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

۱۸- ''مکمل اور حقیقی اقبال کی تلاش''، ایضاً، ۱۹ تا ۲۵ نومبر ۱۹۷۴ء

۱۹- ''فکر اقبال کا مرکزی نکتہ، بازیافت''، ایضاً، ۲۶ نومبر تا ۲ دسمبر ۱۹۷۴ء

۲۰- ''ملّی وجود کے تین دشمن-مغربیت، امتزاجیت اور مقامیت''،
ایضاً، ۳ تا ۹ دسمبر ۱۹۷۴ء

۲۱- ''کلام اقبال میں افرنگ کی حیثیت''، ایضاً، ۱۰ تا ۱۶ دسمبر ۱۹۷۴ء

۲۲- ''غلبۂ افرنگ کے تین محاذ، (۱) فرنگی سیاست۔ (۲) فرنگی معاشرت
(۳) فرنگی فکر و حکمت''، ایضاً، ۱۷ تا ۲۳ دسمبر ۱۹۷۴ء

۲۳۔ ''فرنگی سیاست کے معنی؟ صلیبی انتقامی ردعمل کی تنظیم''، ایضاً، ۲۴ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۷۴ء

۲۴۔ ''فرنگ کے سیاسی نظریے''، ایضاً، ۳۱ دسمبر ۱۹۷۴ء تا ۶ جنوری ۱۹۷۵ء

۲۵۔ ''فرنگی معاشرت۔ اقوامِ مشرق کی موت''، ایضاً ۷ تا ۱۳ جنوری ۱۹۷۵ء

۲۶۔ ''فرنگ کا تیسرا محاذ۔فکر و حکمت'' ایضاً ۱۴ تا ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء

۲۷۔ ''کلامِ اقبال کا مصور۔عبدالرحمٰن چغتائی''، ایضاً ۲۸ جنوری تا ۳ فروری ۱۹۷۵ء

۲۸۔ حکمت افرنگ، بینائے کورو مست تماشائے رنگ و بو''،

ایضاً، ۴ تا ۱۰ فروی ۱۹۷۵ء

۲۹۔ ''فرنگ دل کی خرابی، خرد کی معموری'' ایضاً، ۲۴ فروری ۱۹۷۵ء

۳۰۔ ''ذکر و فکر اقبال کو عام کیجیے''، ایضاً، ۳ مارچ ۱۹۷۵ء

۳۱۔ ''فرنگ کی ایک اور محرومی، غلط سیاسی فلسفہ''، ایضاً، ۱۰ مارچ ۱۹۷۵ء

۳۲۔ ''مغرب کے سیاسی فکر پر اقبال کی تنقید''، ایضاً ۱۷ مارچ ۱۹۷۵ء

۳۳۔ ''پنجاب یونیورسٹی علامہ اقبالؒ کے چند عقیدت مند''، ایضاً ۳۱ مارچ ۱۹۷۵ء

۳۴۔ ''اقبال پر ایک کتاب''، ایضاً، ۷ اپریل ۱۹۷۵ء

۳۵۔ ''کلامِ اقبال بہ ترنم''، ایضاً ۷ تا ۱۳ جنوری ۱۹۷۵ء

۳۶۔ ''چند مشورے، قومی اقبال کمیٹی کی مجلس عاملہ کی خدمت میں''،

ایضاً، ۲۱ اپریل ۱۹۷۵ء

ایضاً، ۲۸ اپریل ۱۹۷۵ء

۳۷۔ ''نظریۂ خودی کی سہل ترین تشریح''، ایضاً، ۵ مئی ۱۹۷۵ء

(۲) ایضاً، ۱۲ مئی ۱۹۷۵ء

(۳) ایضاً، ۱۹ مئی ۱۹۷۵ء

۳۸۔ ''تصور خودی کی سہل ترین تشریح، خودی کا سلسلۂ عمل''،

ایضاً، ۲۶ مئی ۱۹۷۵ء

۳۹۔ ''دو دن شہر اقبال میں''، ایضاً، ۲ جون ۱۹۷۵ء

۴۰- ''خودی کا سلسلۂ عمل، پیکار اور ابلیس''،	ایضاً،	۹ جون ۱۹۷۵ء
۴۱- ''خودی کا استحکام-تعلیم و تربیت''،	ایضاً،	۱۶ جون ۱۹۷۵ء
۴۲- ''خودی کے استحکام میں عقل کا مقام''،	ایضاً،	۲۳ جون ۱۹۷۵ء
۴۳- ''رموزِ بے خودی یا اجتماعی خودی''،	ایضاً،	۳۰ جون ۱۹۷۵ء
۴۴- ''ملت اسلام میں تمدن کی بنیادیں''،	ایضاً،	۷ جولائی ۱۹۷۵ء
۴۵- ''خودی کا صنف''،	ایضاً،	۱۴ جولائی ۱۹۷۵ء
۴۶- ''اقبال کی خودی-صوفیوں کی بے خودی''،	ایضاً،	۲۱ جولائی ۱۹۷۵ء
۴۷- ''نقوش اقبال، ایک نیا نقطۂ نظر''،	ایضاً،	۴ اگست ۱۹۷۵ء
۴۸- ''فلسفہ زرد، سبز زادہ اور اقبال''،	ایضاً،	۱۱ اگست ۱۹۷۵ء
۴۹- ''اسرار معراج اقبال کی نظر میں''،	ایضاً،	۱۸ اگست ۱۹۷۵ء
۵۰- ''عجم و عجمیت اقبال کی نظر میں''،	ایضاً،	۲۵ اگست ۱۹۷۵ء
(۲)	ایضاً،	یکم ستمبر ۱۹۷۵ء
(۳)	ایضاً،	۸ ستمبر ۱۹۷۵ء
۵۱- ''اقبال درراہ مولوی''،	ایضاً،	۱۵ ستمبر ۱۹۷۵ء
۵۲- ''اقبال و تصوف''،	ایضاً،	۲۳ ستمبر ۱۹۷۵ء
۵۳- ''علامہ اقبال اور تصوف''،	ایضاً،	۲۹ ستمبر ۱۹۷۵ء
۵۴- ''اقبال کے معاشی تصورات''، (۱)	ایضاً،	۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء
(۲)	ایضاً،	۱۳ اکتوبر ۱۹۷۵ء

۵۵- ''کیا اقبال خوشہ چیں تھے؟ اقبال جامع حکما میں سے تھے''،

	ایضاً	۵ جون ۱۹۷۲ء
۵۶- ''اقبال کی ایک ترکیب''،	ایضاً،	۶ مئی ۱۹۷۵ء

۵۷- ''اقبالیات کے چند مسائل''، خیابان، پشاور (اقبال نمبر)، ایضاً، جون ۱۹۶۲ء

۵۸- ''ہماری درسیات میں اقبال کی نمائندگی''، 'سیارہ' لاہور،
(اقبال نمبر) مئی ۱۹۶۳ء
۵۹- ''اقبال اور حافظ کے ذہنی فاصلے''، صحیفہ، لاہور ستمبر ۱۹۵۷ء
۶۰- ''اقبال اور دانتے کے ذہنی فاصلے''، ایضاً، لاہور جنوری/فروری ۱۹۷۶ء
۶۱- ''اقبال کے غیر مسلم مداح اور نقاد''، 'صحیفہ'، لاہور
(اقبال نمبر) جولائی/اکتوبر ۱۹۷۷ء
۶۲- ''اقبال کے نظریۂ علم کے چند پہلو''، ایضاً، جنوری ۱۹۷۴ء
(یہ مقالہ بتقریب جشن یک صد سالہ اقبال، منعقدہ ۱۳ جنوری ۱۹۷۴ء میں پڑھا گیا)
۶۳- ''اقبال کا تصور پیکار''، 'ضیا بار' سرگودھا، (اقبال نمبر)، ۱۹۷۳ء
۶۴- ''اقبال کے تضادات''، 'قندیل' لاہور، ۱۸ اپریل ۱۹۶۵ء
۶۵- ''اقبال کے فوراً بعد''، قومی زبان، کراچی اپریل ۱۹۶۷ء
۶۶- ''اقبال کے فوراً بعد [ادب میں ان کے مخالف اثرات]''،
مشمولہ: مقالات یوم اقبال، (۱۹۶۶ء)
لاہور، مغربی پاکستان رائٹرز گلڈ، ۱۹۶۶ء
۶۷- ''اقبال اور معراج النبیؐ''، فکر و نظر، اسلام آباد جلد ۱۳
۶۸- ''اقبال کی زبان''، 'ماہِ نو' کراچی، اپریل ۱۹۵۴ء
ایضاً، (اقبال نمبر) اپریل ۱۹۷۰ء
۶۹- ''مطالعہ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام'' ایضاً، اپریل ۱۹۵۵ء
ایضاً، اپریل ۱۹۷۰ء
'ماہِ نو' لاہور، ستمبر ۱۹۷۷ء
۷۰- ''اقبال اور صوفی - خودی سے بے خودی تک''، ماہ نو، کراچی اپریل ۱۹۵۶ء
ایضاً، اپریل ۱۹۷۰ء
۷۱- ''اقبال کا ایک مداح - نظیری''، ایضاً، جون ۱۹۵۷ء

۷۲- ''کلام اقبال کی دقتیں اور ان کی تشریح کی ضرورت''،

'معارف' اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۴۴ء

ایضاً، اپریل ۱۹۴۴ء

'پیغام حق' لاہور، جنوری-مارچ ۱۹۴۶ء

۷۳- ''نوجوان اور مطالعۂ اقبال''، 'مفکر' سیالکوٹ (اقبال نمبر) ۱۹۷۵ء

۷۴- ''اقبال اور ابن عربی''، 'نقوش' لاہور (اقبال نمبر) ستمبر ۱۹۷۷ء

۷۵- ''علاقائیت اقبال کی نظر میں''، مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت،

لاہور، ۲۱ اپریل ۱۹۷۰ء

۷۶- ''اقبال اور سیاسیات''، 'ہمایوں' لاہور مئی ۱۹۳۲ء

'معارف اعظم گڑھ' مارچ ۱۹۴۶ء

ایضاً، اپریل ۱۹۴۶ء

۷۷- ''اقبال اور سیاسیات''، مشمولہ: اقبال، معاصرین کی نظر میں،

از پروفیسر سیّد وقار عظیم (مرتب)، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء

۷۸- ''اقبال دیدہ و شنیدہ''، مشمولہ: 'بیاد اقبال'،

از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء

۷۹- ''اقبال اور رومی''، مشمولہ: 'حکمت اقبال'

از غلام دستگیر رشید (مرتب)، حیدر آباد دکن، نفیس اکیڈمی، ۱۹۷۷ء

۸۰- ''اقبال کا ادبی فن''، مشمولہ: 'اقبال بحیثیتِ شاعر'

از رفیع الدین ہاشمی، (مرتب)، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء

۸۱- ''ابوریحان البیرونی کا تصور حرکت و تاریخ اقبال کی نظر میں''،

مشمولہ: مقالاتِ اقبال۔ دوسری بین الاقوامی کانگرس منعقدہ ۹ تا ۱۱ نومبر ۱۹۸۳ء

لاہور جامعہ پنجاب (س۔ن)

تنقید/تحقیق :

☆ ''شاعر کہستان کے تازہ گیت''، نیرنگ خیال، لاہور، اگست ۱۹۳۵ء

۱- ''کیا غزل ایک نیم وحشی صنف ادب ہے''، 'ادب لطیف' لاہور فروری ۱۹۴۲ء

۲- ''درد کی شاعری کا فلسفیانہ لب ولہجہ''، ایضاً، سالنامہ ۱۹۵۰ء

۳- ''غالب کی غزل''، ایضاً، سالنامہ ۱۹۵۱ء

۴- ''میر و غالب کی ہم طرح غزلیں''، ایضاً، مارچ ۱۹۵۲ء

۵- ''میر کی مثنوی نگاری''، ایضاً، اپریل-مئی ۱۹۵۲ء

۶- ''سرسیّد کے افکار وتصورات''، ایضاً، سالنامہ ۱۹۵۳ء

۷- ''شاعری-جنون یا عمد؟''، ایضاً، مارچ ۱۹۵۵ء

۸- ''انگریزی کے بیس سال اور''، ایضاً، مارچ ۱۹۵۵ء

۹- ''میر تقی میر اور نقاش کا فن''، ایضاً، اپریل ۱۹۵۶ء

۰- ''میر کا ایک نقاد-محمد حسین آزاد''، ایضاً، جون ۱۹۵۷ء

۱۱- ''غزل کی ہیئت کا سوال''، ایضاً، سالنامہ ۱۹۵۷ء

۱۲- ''تنقید (۱۹۵۷ء میں)''، ایضاً، فروری ۱۹۵۸ء

۱۳- ''حقی کی غزل - ایک نیا ذائقہ''، ایضاً، نومبر-دسمبر ۱۹۵۸ء

۱۴- ''شاعری-خرافات سے سائنس تک''، ایضاً، سالنامہ ۱۹۵۹ء

۱۵- ''اردو کی ادبی صلاحیتیں''، ایضاً، فروری ۱۹۶۰ء

۱۶- ''میں اور غالب''، ایضاً، سالنامہ ۱۹۶۰ء

۱۷- ''خیالات اکبر پر ایک تحریر''، ایضاً، فروری ۱۹۶۱ء

۱۸- ''ایک نظم گو'' (مجید امجد کی شاعری)، ایضاً، سالنامہ ۱۹۶۱ء

۱۹- افکار و مسائل''، ایضاً، فروری-مارچ ۱۹۶۲ء

۲۰- ''رومانیت''، ایضاً، جوبلی نمبر ۱۹۶۳ء

۲۱- ''میر کا احساس شہریت''، ایضاً، سالنامہ ۱۹۶۴ء

۲۲- ''مومن خان، غزل سے مسجد تک''، ایضاً، سالنامہ ۱۹۶۴ء

۲۳- ''میکدے میں میر''، ایضاً، سالنامہ ۱۹۶۶ء

۲۴- ''اردو کا ایک جرمن شاعر فرانسو''، اورینٹل کالج میگزین، لاہور مئی ۱۹۶۴ء

// // // ادبی دنیا، لاہور اگست ۱۹۴۴ء

۲۵- ''غالب کی اردو نثر''، ایضاً، جون ۱۹۵۰ء

۲۶- ''گلزار نسیم''، ایضاً، جون ۱۹۵۱ء

۲۷- ''عذرِ اکبر''، ایضاً، دور پنجم، شمارہ اول

۲۸- ''غالب کی اردو نثر''، ایضاً، جون ۱۹۸۵ء

۲۹- ''شہر آشوب- اردو کی سیاسی اور قومی شاعری کا ایک رخ''،

(۱) اردو دہلی جولائی ۱۹۴۵ء

(۲) ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین لاہور، نومبر ۱۹۴۵ء

۳۰- ''میر تقی میر کا رنگِ طبیعت''، اردو، کراچی، جولائی ۱۹۴۹ء

۳۱- ''میر کا انداز''، ایضاً، اکتوبر ۱۹۴۹ء

۳۲- ''(مقدمہ) نوادر الالفاظ (از خان آرزو)،

مطبوعہ: اردو، کراچی جنوری ۱۹۵۱ء

۳۳- ''شبلی کا اسلوب بیان: ایضاً، اپریل ۱۹۵۱ء

۳۴- ''حالی کا تصور اسلوب''، ایضاً، ۱۹۵۲ء (حالی نمبر)

۳۵- ''حالی کا اسلوب بیان''، ایضاً، جنوری ۱۹۵۴ء

۳۶- ''مولوی عبدالحق کا اسلوب تحریر''، ایضاً، ۱۹۶۲ء

(بابائے اردو نمبر)

۳۷- ''نوادر المکاتیب''، اردو نامہ، کراچی شمارہ ۴۴-۴۵ مارچ ۱۹۷۳ء

۳۸- ''ادب یا دکھوں کی تجارت''، استقلال، لاہور ۱۹۵۸ء

۳۹- ''حفیظ کی شاعری-نالہ پابند نَے''، افکار، کراچی
اگست-اکتوبر ۱۹۶۳ء (حفیظ نمبر)

۴۰- ''غالب شناسی، ایک کلچر، ایک اسلوب حیات''، ایضاً، مارچ ۱۹۶۶ء (غالب نمبر)

۴۱- ''اردو ادب-چند اصولی باتیں''، اوراق، لاہور فروری ۱۹۸۰ء

۴۲- ''عصری ادب میں یاس اور جھنجھلاہٹ کیوں؟''، ایضاً، نومبر، دسمبر ۱۹۷۴ء

۴۳- ''تنقید کا دور قدیم''، ایضاً، اپریل ۱۹۶۶ء

۴۴- ''مولانا حالی کی کتب سوانح''، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۳۷ء

ایضاً، فروری ۱۹۳۸ء

۴۵- انیسویں صدی کا ایک مصنف اور مفکر''، (سرسیّد)، ایضاً، فروری ۱۹۳۷ء

// // // ایضاً، اگست ۱۹۳۷

۴۶- ''شبلی فکرِ جدید سے کیونکر روشناس ہوئے'' ایضاً، مئی ۱۹۳۸ء

۴۷- ''نذیر احمد کے قصے''، ایضاً، اگست ۱۹۳۸ء

۴۸- ''سرسیّد کے ہم خیال علماء کے دینی نظریے''، ایضاً، نومبر ۱۹۳۸ء

۴۹- سرسیّد کے زیر اثر ادبی تنقید کی ابتدا''، ایضاً، فروری ۱۹۳۹ء

۵۰- ''عہد اسلامی کے پرانے آثار''، ایضاً، مئی ۱۹۴۰ء

۵۱- دنیائے اردو جنگ عظیم کے بعد''، ایضاً، فروری ۱۹۴۱ء

ایضاً، مئی ۱۹۴۱ء

۵۲- ''مغرب کا اثر اردو ادب پر''، (عبدالقادر) ایضاً، فروری ۱۹۴۳ء

۵۳- ''ابو القاسم البصری کی کتاب التنبیہات''، ایضاً، اگست ۱۹۴۳ء

۵۴- ''اردو کی تعمیر میں خان آرزو کا حصہ''، ایضاً، نومبر ۱۹۴۳ء

۵۵- ''قدیم عربی تصانیف میں ہندوستانی الفاظ''، ایضاً، مئی ۱۹۴۳ء

۵۶- ''مسلمان اور سنسکرت''، ایضاً، فروری ۱۹۴۶ء

ایضاً، مئی ۱۹۴۶ء

۵۷- ''ہمارے پرانے شاعروں کی علمی استعداد''، ایضاً، اگست ۱۹۴۷ء

۵۸- تخلص، ہماری شاعری کی ایک قدیم اور دلچسپ روایت''،
ایضاً، مئی ۱۹۴۷ء

۵۹- ''رسمِ تخلص کے دستور اور قاعدے''، ضمیمہ
اورینٹل کالج میگزین، لاہور مئی ۱۹۴۷ء

۶۰- ''پنجاب کا ایک اور ریختہ گو پیر قلندر شاہ''، ایضاً، اگست ۱۹۴۷ء

۶۱- صنائع و بدائع کی تقسیم جمالیاتی نقطۂ نظر سے''، ایضاً، مئی ۱۹۴۹ء

۶۲- ''میر محسن کی محاکمات الشعراء میں زبان کے متعلق مفید باتیں''،
ایضاً، نومبر ۱۹۵۰ء

۶۳- ''اردو مثنوی کا دکنی دور''، ایضاً، نومبر ۱۹۵۲ء
ایضاً، فروری ۱۹۵۳ء

۶۴- عجائب القصص شاہ عالم آفتاب''، ایضاً، فروری ۱۹۶۵ء

۶۵- ''ڈاکٹر عبدالحق کا اسلوب تحریر''، برگِ گل، کراچی ۱۹۶۰ء

۶۶- ''شبلی کے کام کی مجموعی قدر و قیمت''، البصیر، اسلامیہ کالج چنیوٹ، ۱۹۵۸ء

۶۷- ''خیال اور تخیل''، 'تخلیق' کراچی اگست ۱۹۵۶ء
ایضاً، قومی زبان، کراچی، ۱۶ جولائی ۱۹۵۸ء

۶۸- قلم کے چراغ: (۱) ادب شناسی کی منزلیں چٹان لاہور، ۲۰ ستمبر ۱۹۷۱ء

۶۹- ایضاً، شاعری کیا ہے، ایضاً، ۴ اکتوبر ۱۹۷۱ء

۷۰- ایضاً، مطالعہ ادب کا ایک طریقہ یہ بھی ہے، ایضاً، ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء

۷۱- ایضاً، ''ہم آہنگ۔ اے نالہ میں کس پردے میں آہنگ نکالوں''،
ایضاً، ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء

۷۲- ایضاً، ''ادب کے عناصر، معنی اور صورت''، ایضاً، ۸ نومبر ۱۹۷۱ء

۷۳- ایضاً، ''کیا ادب کو ادیب سے جدا کیا جا سکتا ہے؟''، ایضاً، ۲۹ نومبر ۱۹۷۱ء

۷۴- ایضاً، آواز یا دورِ شعلہ آواز''، ایضاً، یکم نومبر ۱۹۷۱ء

۷۵- ایضاً، ''گر یہ معنی نرسی جلوۂ صورت چہ کم است''، ایضاً، ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء

۷۶- ''جرمن شاعری پر اسلامی اثرات، گوئٹے خالص مشرق میں پناہ لینے کے لیے مضطرب تھے''، ایضاً، ۱۰ دسمبر ۱۹۷۳ء

۷۷- ''شاہ اسماعیل شہید کا اردو کلام''، ایضاً، ۱۳ مئی ۱۹۷۴ء

۷۸- ''ہمارے ادب میں کرب کا مسئلہ''، ایضاً، ۱۶ جولائی ۱۹۷۹ء

۷۹- ''سرسیّد کا نیچرل طرزِ بیان''، خاور، ڈھاکہ، جون ۱۹۵۲ء

۸۰- ''قصیدہ ایک فن، ایک اسلوب تحریر''، 'سات رنگ' کراچی

۸۱- ''ادبی مسائل''، ساقی، کراچی ستمبر ۱۹۶۵ء

۸۲- ''تنقید کیا ہے''، سرسیّدین، راولپنڈی جنوری ۱۹۸۲ء

۸۳- ''میں اور میر''، 'سویرا' لاہور، شمارہ ۲۳

۸۴- ''غزل، غزلیت اور تغزل''، صحیفہ، لاہور جون ۱۹۵۷ء

۸۵- ''میر اور ذہن جدید''، ایضاً، ۱۹۶۰ (شمارہ ۱۳)

۸۶- ''میر کی اہمیت ہمارے زمانے میں''، ایضاً، اگست ۱۹۶۰ء

۸۷- ''اردو ادب کا مزاج''، ایضاً، جنوری ۱۹۶۸ء

۸۸- ''غالب کی نثر''، 'عالمگیر' مارچ ۱۹۴۹ء

۸۹- ''تہذیب الاخلاق کی اہمیت''، العلم، کراچی اپریل تا جون ۱۹۷۲ء

۹۰- ''سرسیّد کا اثر اردو ادبیات پر''، علی گڑھ میگزین، سرسیّد نمبر ۱۹۵۵ء

۹۱- ''میر کے کلام میں فکر و نظر کا عنصر''، ایضاً، ۱۹۵۷ء

۹۲- ''حالی کی نثر نگاری''، فروغ اردو، لکھنؤ (حالی نمبر) ۱۹۵۹ء

۹۳- ''اردو شاعری پر ایک اور نظر''، فنون، لاہور فروری-مارچ ۱۹۶۶ء

۹۴- ''تعصب سے نیکی تک''، ایضاً، اپریل-مئی ۱۹۷۴ء

۹۵- ''حضرت بھٹائی کے ذہن و ذوق کا سرسری مطالعہ''، ایضاً، جون-جولائی ۱۹۷۹ء

۹۶- ''اردو مثنویات میں قصہ پن''، قند، افسانہ نمبر، ۱۹۵۹ء

۹۷- ''شاعر کا مجلسی مقام''، قومی زبان، کراچی مئی ۱۹۵۸ء

۹۸- ''نذیر احمد'' ایضاً، ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۸ء

(دوسری قسط) ایضاً، یکم نومبر ۱۹۵۸ء

۹۹- ''غالب کی غزل''، ایضاً، ۱۶ نومبر ۱۹۵۸ء

۱۰۰- غالب- شاعر دو زبان''، ایضاً، فروری ۱۹۶۷ء

۱۰۱- ''ہماری تعلیم میں سائنس اور سائنسیت''، لیل و نہار لاہور فروری ۱۹۶۱ء

۱۰۲- ''اردو کی مزید ترقی کے امکانات''، ماہِ نو، کراچی جون ۱۹۵۳ء

(مذاکرہ) شرکاء: ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر عبادت دہلوی

۱۰۳- ''اردو کی مزید ترقی کے امکانات'' ایضاً، جولائی ۱۹۵۳ء

۱۰۴- ''اردو سوانح نگاری سرسیّد کے زمانے میں''، ایضاً، اگست ۱۹۵۳ء

۱۰۵- ''دیوان غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ''، ایضاً، جولائی ۱۹۵۴ء

۱۰۶- ''غالب کا حاسۂ انتقاد''، ایضاً، ستمبر ۱۹۵۴ء

ایضاً، جنوری-فروری ۱۹۶۹ء

ایضاً، لاہور ستمبر ۱۹۷۷ء

۱۰۷- ''تقلید میر یا شارع عام''، ایضاً، دسمبر ۱۹۵۴ء

۱۰۸- ''میر اور نیرنگ عناصر''، ایضاً، مئی ۱۹۵۵ء

۱۰۹- ''اردو شاعری گذشتہ سال میں''، ایضاً، اگست ۱۹۵۶ء

۱۱۰- ''غالب کی تصویر آفرینی''، ایضاً، مارچ ۱۹۶۳ء

۱۱۱- ''غالب کی سوانح نگاری''، ایضاً، مئی ۱۹۶۴ء

۱۱۲- ''غالب- بیشہ و اقبال''، ایضاً، جنوری-فروری ۱۹۶۹ء

۱۱۳- ''میر تقی میر''، ایضاً، نومبر ۱۹۷۸ء

۱۱۴- ''ہمارا قومی ادب''، ایضاً، جنوری ۱۹۷۹ء

۱۱۵- ''ادبیات اردو پر سرسیّد کا اثر''، ثقافت لاہور جولائی ۱۹۵۷ء

۱۱۶- ''مرحوم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا حکیمانہ ادب''، ایضاً، مارچ ۱۹۶۰ء

۱۱۷- ''تازہ گوئی-ایک ادبی تحریک''، المعارف، لاہور، جولائی ۱۹۶۸ء

۱۱۸- ''تاریخ لاہور پر مزید دھندلی سی روشنی''، مجلّہ تحقیق، لاہور ستمبر ۱۹۷۹ء

۱۱۹- ''ادب کا قدیم تصور''، مشرب جولائی ۱۹۵۳ء

۱۲۰- ''نذیر احمد کی انفرادیت''، 'نقوش' لاہور، شمارہ ۵۵-۵۶

۱۲۱- ''اردو خطوط نگاری''، ایضاً، شمارہ ۶۵-۶۶

۱۲۲- ''حالی کی قطعہ نگاری''، ایضاً ۱۹۵۸ء

۱۲۳- ''مسلمانوں کے ادب میں مزاح کے تنوعات''، ایضاً، شمارہ ۷۷-۷۸

۱۲۴- ''میر کا رنگ طبیعت''، ایضاً، شمارہ ۱۲۶ (میر تقی میر نمبر ۲)

۱۲۵- ''ریاضی کی عربی روایت الوداع''، نوائے وقت، لاہور ۱۴ اگست ۱۹۶۲ء

۱۲۶- ''ناسخ کی منسوخ شاعری''، نئی تحریریں، لاہور ۱۹۵۷ء

۱۲۷- ''کاغذی پیراہن''، نئی قدریں، حیدر آباد، سندھ ۱۹۵۷ء

۱۲۸- ''داغ و میر کی نزاع، ایضاً، ۱۹۵۸ء

۱۲۹- ''تخلیقی عمل اور ذوق سلیم''، 'ہم قلم' کراچی ۱۹۵۹ء

۱۳۰- ''تحقیق و تنقید کے مقام اتصال''، ایضاً، مئی ۱۹۶۱ء

۱۳۱- ''پرانی سوسائٹی میں شاعری کا مجلسی مقام''، ہمایوں، لاہور جنوری ۱۹۴۷ء

۱۳۲- ''شعرائے اردو کے جلسے''، ایضاً، دسمبر ۱۹۴۷ء

۱۳۳- 'ادب، اخلاق اور آزادی''، ایضاً، مارچ ۱۹۵۶ء

۱۳۴- ''گذشتہ دس سال کا اردو ادب''، ایضاً، سالنامہ، ۱۹۵۸ء

تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں درج ذیل مضامین لکھے:

۱۳۵- ''دین، تصوف، اخلاق''، تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند،

جلد ۵، فارسی ادب (سوم)

مطبوعہ: ۱۹۷۲ء، ص: ۲۶۳-۳۱۷

۱۳۶- ''لغات، زباندانی و زبان آموزی وغیرہ''،

ایضاً، جلد ۵، فارسی ادب (سوم)

مطبوعہ: ۱۹۷۲ء، ص: ۳۸۲-۴۰۱

۱۳۷- ''لغات''، زبان آموزی و زباندانی وغیرہ''،

ایضاً، جلد ۵، فارسی ادب (سوم) حصہ دوم،

مطبوعہ: ۱۹۷۲ء، ص: ۵۷۲-۵۸۸

۱۳۸- ''دینی ادب''، ایضاً، جلد ۵، فارسی ادب (سوم) حصہ دوم

مطبوعہ: ۱۹۷۲ء، ص: ۵۸۹-۶۰۹

۱۳۹- ''میر تقی میر''، ایضاً، جلد ۷، اردو ادب، (دوم)

مطبوعہ: ۱۹۷۱ء، ص: ۱۲۶-۱۴۵

۱۴۰- ''اقبال''، ایضاً، جلد ۱۰، اردو ادب (جلد پنجم)

مطبوعہ: ۱۹۷۲ء، ص: ۵۵-۸۹

۱۴۱- ''منتخب ادبی تحریریں'' (ایک جائزہ)، قلم قبیلہ، پشاور (جلد دوم)، اپریل ۱۹۸۳ء

۱۴۲- ''جھگڑے دین و دل کے''، مجلّہ قلم قبیلہ، پشاور اگست ۱۹۸۱ء

۱۴۳- ''دو پیارے دستخط''، (فارغ بخاری)، ادبی سیریز، ابلاغ پشاور، جنوری ۱۹۸۸ء

قومی زبان:

۱- ''پاکستان میں ایک نئی جناتی زبان''، اخبار اردو، کراچی اکتوبر ۱۹۸۲ء

۲- ''مشکل اور آسان زبان کا مسئلہ''، اخبار اردو، اسلام آباد جنوری ۱۹۸۴ء

۳- ''انتخابِ خطبات ڈاکٹر سیّد عبداللہ بسلسلہ نفاذِ اردو'' ایضاً، جنوری ۱۹۷۸ء

۴- ''پنجاب یونیورسٹی اور اردو''، ادب لطیف، لاہور جون ۱۹۵۵ء

۵- ''قانون کی تعلیم اور قومی زبان اردو''، اردو نامہ، لاہور جون ۱۹۸۴ء

۶- ''سائنس کے اردگرد سائنسی برہمنوں نے حصار کھینچ رکھا ہے''،

ایضاً، ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء

(اردو اکیڈمی کے سالانہ اجلاس میں سیّد عبداللہ کا خطبہ)

۷- ''انگریزی نہیں چلے گی، مے خانے جلد ٹوٹنے والے ہیں (اردو انجمنوں کی آٹھویں سالانہ مجلس مشاورت میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا خطبۂ استقبالیہ)''،

ایضاً، ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء

۸- ''پاکستان-مسئلہ قومیت و زبان''، ایضاً، ۱۲ جون ۱۹۷۲ء

۹- ''پاکستان میں اردو کی بپتا''، ایضاً، ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء

۱۰- ''سائنسی کتابوں کی اردو میں اشاعت- بنیادی مشکلات''،

ایضاً، ۱۲ تا ۱۸ نومبر ۱۹۷۴ء

۱۱- ''گورنر صاحب پنجاب کا حکم نامہ اردو''،

دفتری صاحب بہادروں کی سمجھ میں نہیں آیا ایضاً، ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۹ء

۱۲- پاکستان کے دو مرکزی مسئلے''، ایضاً، ۲۹ مارچ ۱۹۷۶ء

(اس مقالے میں تعلیم اور اردو کے بارے میں بات کی ہے)

۱۳- ''اردو کو رائج کرنے کے لیے آرڈی ننس جاری کیا جائے''،

ایضاً، ۲۱ اپریل ۱۹۸۱ء

۱۴- ''انگرودـ پاکستان کی نئی زبان''، ایضاً، ۳ مئی ۱۹۸۲ء

۱۵- ''نسخ اور نستعلیق کی بحث''، فروزاں، لاہور جنوری تا مارچ ۱۹۸۲ء

۱۶- انگریزی اردو جائزہ کانفرنس کے مقاصد''، قومی زبان کراچی اپریل ۱۹۸۰ء

(یہ خطبہ افتتاحی اجلاس شام ہمدرد میں پڑھا گیا)

۱۷- ''اردو اپنے نئے ماحول میں''، ایضاً، یکم فروری ۱۹۴۹ء

۱۸- ''پاکستان میں انگریزی کا صحیح مقام''، ایضاً، یکم جنوری ۱۹۵۶ء

۱۹- ''اردو رسم الخط کی فلسفیانہ بنیادیں''، ایضاً، یکم مارچ ۱۹۶۱ء

محور، لاہور ۱۹۶۱ء

۲۰- ''اردو کے موجودہ اہم مسائل''، قومی زبان، کراچی نومبر ۱۹۶۲ء

۲۱- ''خطبۂ استقبالیہ''، ایضاً، نومبر ۱۹۷۰ء

(یہ خطبہ سالانہ جلسۂ انعامات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور میں بتاریخ ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۰ء پڑھا گیا)

۲۲- ''خطبۂ استقبال''، ایضاً، جنوری ۱۹۷۴ء

(مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے اٹھارویں سالانہ جلسہ منعقدہ ۳ نومبر ۱۹۷۳ء کو پڑھا گیا)

۲۳- ''خطبۂ استقبال''، ایضاً، فروری ۱۹۷۴ء

(یہ خطبہ پاکستان کی اردو انجمنوں کی دسویں سالانہ مجلس مشاورت کے افتتاحی اجلاس میں پڑھا گیا۔)

۲۴- ''خطبۂ استقبال''، ایضاً، دسمبر ۱۹۷۴ء

(یہ خطبہ پاکستان کی اردو انجمنوں کی گیارہویں سالانہ کانفرنس میں بتاریخ ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۴ء پڑھا گیا۔)

۲۵- ''قومی زبان کانفرنس راولپنڈی کے افتتاحی اجلاس کا خطبۂ استقبال''،

ایضاً، اپریل ۱۹۷۵ء

(یہ خطبۂ استقبال ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو پڑھا گیا)

۲۶- ''جستجو اہل محبت کی''، ایضاً، نومبر ۱۹۷۵ء

(سرگودھا قومی زبان کانفرنس منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں پڑھا گیا)

۲۷- ''پشاور کانفرنس کا مقاصد نامہ''، ایضاً، ۱۹۷۶ء

(قومی زبان کانفرنس پشاور منعقدہ ۴، ۵ اپریل ۱۹۷۶ء میں کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں پڑھا گیا)

۲۸- ''پاکستان میں انگریزی کا صحیح مقام''، ایضاً، اگست ۱۹۸۱ء

۲۹- ''وضع و استناد اصطلاحات''، ایضاً، اپریل ۱۹۸۵ء

۳۰- خطبۂ استقبال''، ایضاً، دسمبر ۱۹۸۱ء

(یہ خطبہ پاکستان کی اردو انجمنوں کی ۱۸ ویں سالانہ کانفرنس میں بتاریخ ۲۶ نومبر ۱۹۸۱ء پڑھا)

۳۱- ''کیا ہماری بھی کوئی زبان ہے؟'' روزنامہ نوائے وقت، کراچی، ۲ جنوری ۱۹۸۶ء

۳۲- ''کیا ہماری بھی کوئی زبان ہے''، ایضاً، فروری ۱۹۸۶ء

۳۳- ''اردو میں سائنسی ادب''، فنون، لاہور جولائی-اگست ۱۹۷۰ء

۳۴- ''اردو پنجابی کا مسئلہ''، روزنامہ نوائے وقت، لاہور ۱۲ دسمبر ۱۹۶۲ء

ایضاً، ۱۳ دسمبر ۱۹۶۲ء

(قومی زبان، کراچی، جلد ۲۲، شمارہ ۵)

۳۵- ''قومی زبانوں کے سلسلہ میں کمیشن سے سخت مایوسی ہوئی ہے''،

روزنامہ نوائے وقت، لاہور ۲۸ مارچ ۱۹۷۰ء

۳۶- ''لسانی کمیشن کا مقاطعہ کیوں؟ قائداعظم کے فرمان کی تعمیل کب ہوگی''،

ایضاً، ۲۲ مئی ۱۹۷۰ء

۳۷- ''پاکستان میں اردو کا مستقبل''، 'ہمایوں، لاہور جنوری ۱۹۴۸ء

۳۸- ''اردو اپنے نئے ماحول میں''، ایضاً، سالگرہ نمبر اگست ۱۹۴۸ء

ایضاً، جنوری ۱۹۴۹ء

۳۹-''پاکستان میں اردو کا پہلا سال''، ایضاً، سالگرہ نمبر اگست ۱۹۴۸ء

۴۰- ''اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے فیصلے''،

مشمولہ: منتخب مقالات اردو اِملا و رموز اوقاف،

مرتبہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

۴۱- ''اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں املا کے معمولات''،

مشمولہ: منتخب مقالات اردو املا و رموز اوقاف،

مرتبہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء

پاکستانیات/کلچر:

۱- ''قائد اعظم اور نیا پاکستانی مینی فسٹو''، اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۲- ''پاکستانی ثقافت کے خد و خال''، ایضاً جنوری ۱۹۸۷ء

۳- ''پاکستانی کلچر کا مسئلہ''، اقبال، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۰ء

۴- ''پاکستانی کلچر''، اوراق، لاہور، اپریل-مئی ۱۹۷۵ء

(شرکاء مباحثہ میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے بھی حصہ لیا۔ موضوع زیر بحث کلچر تھا۔ اس مناسبت سے اس مضمون کا نام پاکستانی کلچر رکھ دیا ہے)

۵- ''تحریک پاکستان کے فکری عناصر''، چٹان، لاہور، یکم اپریل ۱۹۶۸ء

۶- ''تخلیق پاکستان کے ثقافتی محرکات''، ایضاً، ۲۸ فروری ۱۹۷۲ء

(یہ خطبہ ایجوکیشن سنٹر لاہور میں ۱۸ فروری کو پڑھا گیا)

________ المعارف، لاہور، اگست ۱۹۷۲ء

۷- ''اردو اور نظریۂ پاکستان''، ایضاً، ۱۱ جنوری ۱۹۷۱ء

(یہ مقالہ ادارۂ ادبیات کے سالانہ جلسہ میں ۱۲ جون ۱۹۷۰ء کو پڑھا گیا)

۸- ''اردو ادب میں پاکستانیات کا مسئلہ''، سرسیّدین، روالپنڈی، مئی ۱۹۸۱ء

۹- ''تحریک پاکستان کے ثقافتی محرکات''، ایضاً، مئی ۱۹۸۱ء

۱۰- ''قائد اعظم-تحریک بازیافت کے آخری رہنما''،

'صحیفہ'، لاہور، ستمبر-دسمبر ۱۹۷۶ء

تعلیم:

۱- ''نور خان کی تعلیمی تجاویز''، اخبار اردو اسلام آباد، مئی ۱۹۸۶ء

۲- ''تعلیم کے متعلق ہماری غلط سوچ''، ایضاً، جنوری ۱۹۸۷ء

۳- ''اسلامی تعلیم کے چند مسائل''، اسلامی تعلیم، لاہور، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۴ء

۴- ''علوم جدید کو مسلمان بنانے کی ضرورت''، ایضاً، نومبر، دسمبر ۱۹۷۴ء

۵- ''پنجاب یونیورسٹی عربک اینڈ پرشین سوسائٹی کی روداد کارکردگی ۱۹۴۲ء-۱۹۴۳ء''، (ضمیمہ) اورینٹل کالج میگزین، لاہور نومبر ۱۹۴۳ء

۶- ''آئین نامہ پنجاب یونیورسٹی عربک اینڈ پرشین سوسائٹی''، (ضمیمہ) اورینٹل کالج میگزین، لاہور نومبر ۱۹۴۳ء

۷- ''سالانہ روداد اورینٹل کالج''، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، مئی ۱۹۵۱ء

______ ایضاً، مئی ۱۹۵۵ء

______ ایضاً، مئی ۱۹۵۶ء

______ ایضاً، اگست ۱۹۵۷ء

______ ایضاً، اگست ۱۹۵۸ء

۸- ''اورینٹل کالج کے چوراسی سال''، ایضاً، نومبر ۱۹۵۴ء

۹- ''خطبۂ استقبالیہ - یوم کالج''، ایضاً، نومبر ۱۹۵۴ء

______ ایضاً، فروری ۱۹۵۶ء

______ ایضاً، فروری ۱۹۵۷ء

______ ایضاً، فروری، مئی ۱۹۵۸ء

______ ایضاً، فروری ۱۹۶۰ء

______ ایضاً، فروری ۱۹۶۱ء

______ ایضاً، فروری ۱۹۶۳ء

______ ایضاً، نومبر ۱۹۶۰ء

۱۰- ''پاکستان میں عربی و فارسی کی تعلیم کا مستقبل، ایضاً، نومبر ۱۹۶۰ء

۱۱- ''ہماری تعلیم کے مضر عناصر قومی نقطۂ نظر سے''،

ترجمان الحدیث، لاہور جون ۱۹۷۰ء

۱۲- ''ہمارے تعلیمی مسائل''، ثقافت، لاہور جنوری ۱۹۵۸ء

۱۳- ''ہمارے تعلیمی ادارے اخلاق کے مرقد بنتے جا رہے ہیں''،

(خطبہ) چٹان، لاہور ۴ مارچ ۱۹۶۸ء

۱۴- ''نئی تعلیمی پالیسی ماہرین کی نظر میں، قومی نقطۂ نظر سے

تعلیم کی غرض و غایت کو متعین کر دیا گیا ہے''، ایضاً، ۱۴ جولائی ۱۹۶۹ء

۱۵- ''تعلیم - مسائل اور تقاضے''، ایضاً، ۲۲ دسمبر ۱۹۶۹ء

۱۶- ''قومی ارتباط تعلیم کے توسط سے''، چٹان، لاہور، ۵ جنوری ۱۹۷۰ء

۱۷- ''ایک نئی علمی روایت''، ایضاً، ۲ فروری ۱۹۷۰ء

۱۸- ''استاد اور معاشرہ''، ایضاً، ۱۶ فروری ۱۹۷۰ء

۱۹- ''اردو نثر کے نصابات''، ایضاً، ۲۶ جولائی ۱۹۷۱ء

۲۰- اورینٹل کالج کا صد سالہ میلہ، ڈاکٹر سیّد عبداللہ سے انٹرویو،

ایضاً، ۹ اپریل ۱۹۷۳ء

۲۱- ''الزرنوجی، اسلامی حکمت تعلیم کا عظیم مفکر''، ایضاً، ۲۸ مئی ۱۹۷۹ء

۲۲- ''پاکستان میں اسلامی تعلیمی انقلاب کے تقاضے،

کاغذی اعلانات سے اسلام کے لیے جذبۂ احترام

پیدا نہیں ہوسکتا، پاکیزہ اسلام ماحول پیدا کرنا اہم

ترین ضرورت ہے''، ایضاً، ۱۱ جون ۱۹۷۹ء

۲۳- ''انگریزی ذریعۂ تعلیم کو برقرار رکھنے کی ضرورت پیدا کر لی گئی ہے''،

ایضاً، ۱۸ جون ۱۹۷۹ء

۲۴- ''تعلیم میں شفقت کا مسئلہ''، ایضاً، ۶ اگست ۱۹۷۹ء

۲۵- ''یونیورسٹی نصابات کو مسلمان بنانے کا مسئلہ''، ایضاً، ۱۳ اگست ۱۹۷۹ء

۲۶- ''خواندگی اور تعلیم میں فرق چاہیے''، چٹان، لاہور ۲۰ اگست ۱۹۷۹ء

۲۷- ''بے ترتیب تعلیم کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟

بھرے ہیں خم کے خم مے سے مگر میخانہ خالی ہے''، ایضاً، ۲۷ اگست ۱۹۷۹ء

۲۸- ''تعلیم میں تربیت نفس کے معنی''، ایضاً، ۳ ستمبر ۱۹۷۹ء

۲۹- ''دینی مدارس کا نصاب تعلیم''، الحق، اکوڑہ خٹک، اکتوبر ۱۹۷۵ء

۳۰- ''مسلمانوں کا فن تعلیم-ایک اہم کتاب کا تعارف''،

فروزاں لاہور، جولائی تا ستمبر ۱۹۸۱ء

۳۱- ''پنجاب یونیورسٹی میں اردو''، قومی زبان، کراچی، ۲۲ جولائی ۱۹۴۸ء

۳۲- ''پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔اے اردو کا نصاب''، ایضاً، ۲۲ جولائی ۱۹۴۸ء

(مرسلہ: ڈاکٹر عبداللہ)

(پنجاب یونیورسٹی میں ایم-اے اردو کا پہلا امتحان ۱۹۵۰ء میں منعقد ہوگا۔)

۳۳- ''تعلیمات میں اصلاح کا مسئلہ''، ایضاً، ۲۲ جنوری ۱۹۴۹ء

۳۴- ''پنجاب میں ابتدائی تعلیم کس زبان میں دی جائے''، ایضاً، یکم جولائی ۱۹۵۱ء

(سیّد عبداللہ کا انٹرویو)

۳۵- ''پاکستان میں تعلیم''، ایضاً، یکم جنوری ۱۹۵۸ء

——— ایضاً، ۱۶ جنوری ۱۹۵۸ء

۳۶- ''ہماری تعلیم اور اس کے مقاصد''، ایضاً، ستمبر ۱۹۶۳ء

۳۷- ''ہماری تعلیم میں سائنس اور سائنسیت''، لیل و نہار، لاہور فروری ۱۹۶۱ء

۳۸- ''ترکی عالم تاش کپری زادہ کے تعلیمی تصورات''،

مجلّہ تحقیق، لاہور مارچ، جون ۱۹۷۹ء

۳۹- ''ایک نئی علمی روایت کی دعوت''، روزنامہ نوائے وقت، لاہور ۳ اپریل ۱۹۷۰ء

تاریخ / اسلامیات / سیاسیات / سماجیات :

۱- ''محکمہ آثار قدیمہ ہند کی کارکردگی اور اسلامی باقیات کے ساتھ سلوک''، اورینٹل کالج میگزین، لاہور مئی ۱۹۴۰ء

۲- ''نظریۂ ڈارون اور اس کی اصلاح'' البلاغ، کراچی، مارچ ۱۹۸۲ء

۳- ''سیرت سے متعلق ادب اور اس کی اہمیت''، پرچم، کراچی، ۱۹۵۹ء

(الف) ''تونگری دل کی''، چٹان، لاہور، ۱۹ فروری

(ب) ''فقط وعدہ حور''، ایضاً، ۲۳ جون ۱۹۶۹ء

۴- ''زندگی- بغاوت سے اعتقاد تک''، ایضاً، یکم دسمبر ۱۹۶۹ء

۵- ''تعظیم قرآن کے آداب اور تقاضے''، ایضاً، ۳۰ جولائی ۱۹۷۳ء

۶- ''ٹیلی ویژن اور فلموں میں اسلامی تہذیب اور مذہب کی تضحیک بند کی جائے''، ایضاً، ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء

۷- ''اپنے آپ کو پہچانو مگر دوسروں کو بھی تسلیم کرو (میونسپل ڈگری کالج اوکاڑہ کے کامیاب طالب علموں سے خطاب)''، ایضاً، ۵ جولائی ۱۹۷۱ء

۸- ''میں حاضر ہوں جناب''، ایضاً، ۲۳ جولائی ۱۹۷۳ء

۹- ''ھذا یومٌ عظیم'' تیرہ سو برس میں مسلم اقوام نے پہلی مرتبہ مشترک مقصد کے لیے مشترک قدم اٹھانے کی ضرورت محسوس کی''، ایضاً، ۲۹ ستمبر ۱۹۶۹ء

۱۰- ''ریشمی خطوط کی سازش، تاریخ جہاد آزادی کا ایک فراموش شدہ باب''، ایضاً، ۵ اپریل ۱۹۷۶ء

۱۱- ''فتویٰ سے تقویٰ تک''، ایضاً، ۸ جون ۱۹۷۰ء

۱۲- ''اسلامی متحدہ محاذ''، ایضاً، ۶ جولائی ۱۹۷۰ء

۱۳- ''شبلی نے پھول مارا''، ایضاً، ۳۱ جولائی ۱۹۷۲ء

۱۴- ''مسلم ممالک کی دولت مشترکہ''، ایضاً، ۴ ستمبر ۱۹۷۲ء

۱۵- ''سیاست و معاشرت کے شب و روز''، (کالم)

ایضاً، ۵ اپریل ۱۹۷۱ء تا ۲ اگست ۱۹۷۱ء

(یہ کالم بھی احمد کبیر کے قلمی نام سے چٹان میں لکھتے رہے۔ اس میں بھی سیاست و معاشرت پر تبصرہ ہوتا تھا)

۱۶- ''کوئے سیاست کے شب و روز'' (کالم) چٹان، لاہور

۱۵ جون ۱۹۷۰ء-۲۹ مارچ ۱۹۷۱ء

(سیّد مرحوم یہ ہفتہ وار کالم احمد کبیر کے قلمی نام سے لکھتے رہے۔ اس میں اس وقت کے سیاسی حالات پر تبصرہ ہوتا تھا)

۱۷- ''یقین مذہب کا دوسرا نام ہے''، (پنجاب یونیورسٹی کی انجمن ریاضی میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا خطبہ)، ایضاً، ۲۰ مارچ ۱۹۷۲ء

۱۸- ''موجودہ سائنسی دور میں اثباتِ صداقت کے تقاضے''، ایضاً، ۲۱ تا ۲۷ مارچ ۱۹۷۲ء

۱۹- ''جامعہ محمدی کی تحریک''، ایضاً، ۲۸ جنوری ۱۹۷۴ء

۲۰- ''داتا گنج بخشؒ اور ان کا عہد''، ایضاً، ۲۶ اپریل ۱۹۷۶ء

۲۱- ''مغرب کی بیسویں صدی، کجروی اور مسخ انسانیت کا دور''، ایضاً، ۶ فروری ۱۹۷۸ء

۲۲- ''ہماری جدیدیت، حدود اربعہ، مفہوم اور منزل''، ایضاً، ۲ جولائی ۱۹۷۹ء

۲۳- ''فن سیرت نگاری پر ایک نظر''، فکر و نظر، اسلام آباد، اپریل ۱۹۷۶ء

۲۴- ''اسلام اور ماڈرنزم''، ایضاً، جلد ۱۴

۲۵- ''سیرت نبویؐ کا پیغام عصرِ حاضر کے نام''، نقوش، لاہور، شمارہ: ۱۳۰ (رسولؐ نمبر جلد ۳)

۲۶- ''سیرت طیبہ حضورؐ کے اسماء و القاب کے آئینہ میں''، ایضاً،
شمارہ: ۱۳۰ (رسولؐ نمبر جلد ۹)

اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مطبوعہ جامعہ پنجاب، لاہور
میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۲۷- ''احمد خان، سرسیّد''، اردو دائرہ معارف اسلامیہ
جلد ۲، مطبوعہ: ۱۹۶۶ء، ص: ۱۱۶-۱۲۲

۲۸- ''برہمن (چندر بھان)''، ایضاً،
جلد ۴، مطبوعہ: ۱۹۶۹ء، ص: ۴۷۳

۲۹- ''تخلص''، ایضاً،
مطبوعہ: ۱۹۶۲ء، جلد ۶، ص: ۱۷۳-۱۷۸

۳۰- ''جمہوریت''، ایضاً، جلد ۷، مطبوعہ: ۱۹۷۱ء، ص: ۴۳۰-۴۳۸
مصنف کے نام پر [و ادارہ] لکھا ہے۔

۳۱- ''حدیث، اصول''، ایضاً، جلد ۷، مطبوعہ: ۱۹۷۱ء، ص: ۹۷۲-۹۸۰
(مقالہ نگار کے نام کی بجائے ادارہ لکھا ہے)

۳۲- ''حسبہ (برصغیر پاک و ہند)'' ایضاً، جلد ۸، مطبوعہ: ۱۹۷۳ء، ص: ۲۰۰-۲۰۳
(بزمی انصاری [و ادارہ])

۳۳- ''درد، خواجہ میر''، ایضاً، جلد ۹، مطبوعہ: ۱۹۷۲ء، ص: ۲۳۷-۲۳۸

۳۴- ''سبک''، (ایک حصہ) ایضاً، جلد ۱۰، مطبوعہ: ۱۹۷۳ء، ص: ۷۱۳-۷۲۳

۳۵- ''سوانحی ادب''، ایضاً، جلد ۱۴/۱، مطبوعہ: ۱۹۸۰ء، ص: ۱۷۳-۱۷۴

۳۶- ''سیاست''، ایضاً، جلد ۱۱، مطبوعہ: ۱۹۷۵ء، ص: ۴۸۳-۴۸۷
(ادارہ لکھا ہے)

۳۷- ''شبلی نعمانی''، ایضاً، جلد ۱۱، مطبوعہ: ۱۹۷۵ء، ص: ۶۵۰-۶۵۴

۳۸- ''شہر آشوب''، ایضاً، جلد ۱۱، مطبوعہ: ۱۹۷۵ء، ص:

۳۹- ''طالب آملی''، ایضاً، جلد ۱۲، مطبوعہ: ۱۹۷۳ء، ص: ۳۶۷-۳۶۹

۴۰- ''ظہوری''، ایضاً، جلد ۱۲، مطبوعہ: ۱۹۷۳ء، ص: ۶۲۹-۶۳۳

۴۱- ''علم (علوم حکمیہ)''، ایضاً، جلد ۱۴/۱، مطبوعہ: ۱۹۸۰ء، ص: ۲۳۷-۲۴۲

۴۲- ''علم بدائع و قائع''، (ایک حصہ) ایضاً،

جلد ۱۴/۱، مطبوعہ: ۱۹۸۰ء، ص: ۱۸۷-۱۸۸

۴۳- ''علم (سیرۃ)''، ایضاً، جلد ۱۴/۱، مطبوعہ: ۱۹۸۰ء، ص: ۱۸۵-۱۸۷

۴۴- ''علم عام (سوانحی ادب)''، ایضاً، جلد ۱۴/۱، مطبوعہ: ۱۹۸۰ء، ص: ۱۸۵-۱۸۷

۴۵- ''علم رمل (تعلیقہ)''، ایضاً، جلد ۱۴/۱، مطبوعہ: ۱۹۸۰ء، ص: ۳۱۹-۳۲۱

۴۶- ''علم معاشیات''، (اسلامی) [تعلیقہ]،

ایضاً، جلد ۱۴/۱، مطبوعہ: ۱۹۸۰ء، ص: ۴۷۶-۴۸۶

۴۷- ''علم الاخلاق''، ایضاً، جلد ۱۴/۱، مطبوعہ: ۱۹۸۰ء، ص: ۱۳۴-۱۴۲

۴۸- ''علم العقائد''، ایضاً، جلد ۱۴/۱، مطبوعہ: ۱۹۸۰ء، ص: ۴۲-۵۱

۴۹- ''علم تصوف''، ایضاً، جلد ۱۴/۱، مطبوعہ: ۱۹۸۰ء، ص: ۱۲۳-۱۳۴

۵۰- ''علم النفس''، ایضاً، جلد ۱۴/۱، مطبوعہ: ۱۹۸۰ء، ص: ۱۴۲-۱۷۳

۵۱- ''علم القرآن''، ایضاً، جلد ۱۴/۱، مطبوعہ: ۱۹۸۰ء، ص: ۱-۲

۵۲- ''فرقہ (تعلیقہ)''، ایضاً، جلد ۱۵، مطبوعہ: ۱۹۷۵ء، ص: ۳۰۴-۳۱۲

(مقالہ نگار کے نام کی بجائے ادارہ لکھا ہے)

۵۳- ''فقہ''، ایضاً، جلد ۱۵، مطبوعہ: ۱۹۷۵ء، ص: ۳۹۵-۴۲۰

(مقالہ نگار کے نام کی بجائے ادارہ لکھا ہے)

۵۴- ''فرمان''، ایضاً، جلد ۱۵، مطبوعہ: ۱۹۷۵ء، ص: ۳۱۳-۳۱۵

۵۵- ''فن خطاطی''، ایضاً، جلد ۱۵، مطبوعہ: ۱۹۷۵ء، ص: ۹۵۶-۱۰۰۲

۵۶- ''الفواحش''، ایضاً، جلد ۱۵، مطبوعہ: ۱۹۷۵ء، ص: ۱۰۳۱-۱۰۳۶
(بہ اشتراک عبدالقیوم)

۵۷- ''قانون (اساسی)''، (ایک حصہ)
ایضاً، جلد ۱/۱۶، مطبوعہ: ۱۹۷۸ء، ص: ۶۶ و بعد
(مقالہ نگار کی بجائے ادارہ لکھا ہے)

۵۸- ''قصہ (اردو) [تعلیقہ]''، ایضاً، جلد ۲/۱۶، مطبوعہ: ۱۹۷۸ء، ص: ۲۷۹

۵۹- ''قصیدہ''، ایضاً، جلد ۲/۱۶، مطبوعہ: ۱۹۷۸ء، ص: ۲۸۵-۲۸۶

۶۰- ''قومیہ''، (مجدد صاحب کی دعوت)
ایضاً، جلد ۲/۱۶، مطبوعہ: ۱۹۷۸ء، ص: ۵۹۰-۵۹۳

۶۱- ''کشف (تعلیقہ)''، ایضاً، جلد ۱۷، مطبوعہ: ۱۹۷۸ء، ص: ۲۸۰

۶۲- ''گل و گلزار (ادبی و تہذیبی اہمیت)''،
ایضاً، جلد ۱۷، مطبوعہ: ۱۹۷۸ء، ص: ۵۵۲-۵۵۳

۶۳- ''مادیت (تعلیقہ)''، ایضاً، جلد ۱۸، مطبوعہ: ۱۹۸۵ء، ص: ۲۹۲-۲۹۳

۶۴- ''المتعلم و المعلم''، ایضاً، جلد ۱۸، مطبوعہ: ۱۹۸۵ء، ص: ۴۶۶-۵۰۳

۶۵- ''ادب میں اسلامی اقدار کا احیا''، مجلہ آگہی، بہاول پور، دسمبر ۱۹۸۰ء

شخصیات:

۱- ''ظفر علی خاں''، ادب لطیف، لاہور سالنامہ ۱۹۶۲ء

۲- ''پروفیسر شیرانی کا علمی اور تحقیقی کام''، اردو، دہلی، اکتوبر ۱۹۴۶ء

۳- ''چند تاثرات''، (حفیظ ہوشیار پوری کے بارے میں)،
افکار، کراچی، مارچ ۱۹۷۳ء

۴- ''حمید احمد خاں - ذوق و شوق کا پیکر''، ایضاً، مئی ۱۹۷۴ء

۵- ''وہ کہ شاعر بھی ہے انسان بھی''، (احمد ندیم قاسمی)

ایضاً، جنوری-فروری ۱۹۷۵ء

۶- ''اقبال صاحب''، اورینٹل کالج میگزین، لاہور نومبر ۱۹۵۱ء

مجلّہ 'تحقیق' لاہور، جلد ۴ (۱۹۸۲ء)

۷- ''پروفیسر محمد اقبال''، قومی زبان، کراچی، ۲۲ جولائی ۱۹۴۸ء

۸- ''رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی یاد میں''، (تقریر)

چٹان لاہور، ۷ تا ۱۳ جنوری ۱۹۷۵ء

۹- ''چودھری افضل حق، ایک سپاہی ایک ادیب''، ایضاً، ۱۲ جنوری ۱۹۷۶ء

۱۰- ''استاد بزرگ میری نظر میں''، (مولوی محمد شفیع)،

اورینٹل کالج میگزین، لاہور فروری ۱۹۵۶ء

۱۱- ''استاد بزرگ میری نظر میں''، مطبوعہ ارمغان علمی، لاہور

مجلسِ ارمغان علمی، ۱۹۵۵ء

۱۲- ''استاد بزرگ''، فارسی ترجمہ از سیّد وزیر الحسن عابدی،

مطبوعہ: ارمغان علمی، لاہور، مجلس ارمغان علمی، ۱۹۵۵

۱۳- ''استاد بزرگ''، (مولوی محمد شفیع مرحوم) 'قومی زبان کراچی' یکم و ۱۶ اپریل ۱۹۶۳ء

۱۴- ''رحمٰن صاحب، ایک تاثر''،

(مشمولہ نذر رحمٰن مرتبہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مطبوعہ: ۱۹۶۶ء)

۱۵- ''پروفیسر محمود شیرانی''، نقوش، لاہور، شمارہ ۴۷-۴۸

۱۶- ''محسن الملک''، نقوش، لاہور، شمارہ ۶۹-۷۰

۱۷- ''خوش صفات، میاں بشیر احمد''، قومی زبان کراچی، مئی-جون ۱۹۷۱ء

۱۸- ''صاحب الفصیلۃ حسام الدین راشدی''، ایضاً، دسمبر ۱۹۸۲ء

۱۹- ''ابو الکلام- امام عشق و جنوں''، سویرا، لاہور جولائی ۱۹۵۹ء

۲۰- ''مولانا غلام رسول مہر بحیثیت مصنف''، فنون، لاہور اگست ۱۹۵۷ء

۲۱- ''عظیم آدمی (پروفیسر سیّد وقار عظیم)''، ماہِ نو، لاہور مئی ۱۹۷۸ء

فارسی ادب (بشمول دیگر موضوعات):

۱- راجہ نریندر ناتھ کا ایک اور مکتوب''، ادبی دنیا، لاہور مئی ۱۹۴۵ء

۲- تزوکات تیموری''، اورینٹل کالج میگزین، لاہور فروری ۱۹۲۶ء

۳- ''عہد محمد تغلق کے مصنفین''، ایضاً، مئی ۱۹۲۷ء

۴- ''مثنوی بیغم بیراگی''، ایضاً، اگست ۱۹۲۷ء

۵- ''گرونانک کی فارسی تعلیم کہاں تک تھی''، ایضاً، مئی ۱۹۲۸ء

۶- ''چندر بھان برہمن''، ایضاً، اگست ۱۹۲۸

۷- ''آنند رام مخلص''، ایضاً، فروری ۱۹۲۹ء

۸- ''سیالکوٹی مل وارستہ''، ایضاً، مئی ۱۹۲۹ء

۹- ''ہندوؤں کا فارسی لٹریچر''، ایضاً، مئی ۱۹۳۰ء

——————— ایضاً، فروری ۱۹۳۱ء

۱۰- ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت فارسی زبان کی حالت''، ایضاً، اگست ۱۹۳۱ء

۱۱- لطائف نامۂ فخری''، ایضاً، اگست ۱۹۳۱ء

——————— ایضاً، نومبر ۱۹۳۱ء

——————— ایضاً، فروری ۱۹۳۲ء

——————— ایضاً، مئی ۱۹۳۲ء

——————— ایضاً، اگست ۱۹۳۲ء

——————— ایضاً، فروری ۱۹۳۳ء

۱۲- انشائے فارسی''، ایضاً، مئی ۱۹۲۷ء

۱۳- ''عہد اکبری- ہندوؤں میں فارسی دانی کا آغاز''، ایضا، فروری ۱۹۳۰ء

۱۴- ''ہندوؤں کا فارسی لٹریچر ز ۱۲۱ تا ۱۲۴''، ایضا، اگست ۱۹۳۰ء

———— ایضاً، مئی ۱۹۳۱ء

۱۵- ''ہندوؤں کے فارسی لٹریچر پر ایک نظر بازگشت''، ایضاً، مئی ۱۹۳۱ء

۱۶- ''میر علی شیر کی بزم وسخن''، ایضاً، فروری ۱۹۳۵ء

۱۷- ''علی شیر کی ایک کتاب کا قلمی نسخہ یعنی مرغوب الفواد ترجمہ محبوب القلوب''،

ایضاً، اگست ۱۹۳۵ء

۱۸- ''ادبیاتِ ایران درعصر حاضر''، ایضاً، مئی ۱۹۳۷ء

۱۹- ''فارسی شاعری میں صداقت''، ایضاً، مئی ۱۹۳۹ء

۲۰- ''غالب کے جدید تذکروں پر ایک نظر''، ایضاً، اگست ۱۹۳۹ء

۲۱- ''میر شیر علی، حالات وتصانیف''، ایضاً، فروری ۱۹۳۴ء

———— ایضاً، فروری ۱۹۳۵ء

———— ایضاً، اگست ۱۹۴۰ء

۲۲- ''فارسی شاعری میں اصلیت اور واقعیت''، ایضاً، مئی ۱۹۳۹ء

۲۳- ''فارسی شاعری اور مسائلِ حیات''، ایضاً، اگست ۱۹۴۰ء

۲۴- فارسی کی مثالیہ شاعری''، ایضاً، نومبر ۱۹۴۰ء

۲۵- ''نظام الملک ثانی یعنی شیر علی ثانی''، ایضاً، نومبر ۱۹۴۱ء

۲۶- فارسی شاعری میں گل وگلزار کی حقیقت''، ایضاً، نومبر ۱۹۴۱ء

———— ایضاً، فروری ۱۹۴۲ء

۲۷- نل دمن احمد سراوی اور اس کی زبان''، اورینٹل کالج میگزین (ضمیمہ)

لاہور، نومبر ۱۹۴۱ء

———— ایضاً، اگست ۱۹۴۲ء

———— ایضاً، نومبر ۱۹۴۲ء

۲۸- ''ہندوستان کے چند انگریز محبان فارسی اور مصنفین''،

اورینٹل کالج میگزین، لاہور فروری ۱۹۴۳ء

۲۹- ''تذکروں کی اہمیت تنقید کے نقطۂ نظر سے''، ایضاً، فروری ۱۹۴۸ء

۳۰- ''تذکروں میں تنقیدی عنصر''، ایضاً، اگست ۱۹۴۸ء

——— ایضاً، فروری ۱۹۴۹ء

۳۱- ''غرائب اللغات میر عبدالواسع ہانسوی''، ایضاً، نومبر ۱۹۵۰ء

۳۲- ''محکمات الشعراء (از میر محسن اکبر آبادی)''، ایضاً، فروری ۱۹۵۱ء

۳۳- ''تذکرہ مردم دیدہ''، ایضاً، فروری ۱۹۵۵ء

——— ایضاً، اگست ۱۹۵۵ء

——— ایضاً، نومبر ۱۹۵۵ء

——— ایضاً، اگست ۱۹۶۵ء

——— ایضاً، فروری، مئی ۱۹۵۸ء

۳۴- ''مثمر از خان آرزو (فارسی متن)''، ایضاً، اگست ۱۹۶۱ء

۳۵- ''مرآۃ الاصطلاح (فارسی متن)''، ایضاً، اگست ۱۹۶۱ء

——— ایضاً، اگست ۱۹۶۱ء

۳۶- ''غمگین و غالب کے فارسی خطوط (تصحیح متن فارسی با شرکت سیّد وزیر الحسن عابدی)''،

ایضاً، فروری ۱۹۶۴ء

۳۷- ''فارسی کا ایک اور تذکرہ''، (مذکر الاحباب از محمد بدیع بن محمد شریف سمرقندی)''،

ایضاً، مئی، اگست ۱۹۶۴ء

۳۸- ''بیدل اور غالب کا تصور آگاہی''، ایضاً، مارچ-جون ۱۹۷۲ء

۳۹- ''امیر خسرو ایک مؤرخ''، آستانہ زکریا، ملتان، ۱۹۵۷ء

۴۰- ''ابنِ عربی اور رومی''، افکار کراچی، اپریل ۱۹۷۸ء

۴۱- ''دادِ سخن''، فنون، لطیفہ، مئی، جون ۱۹۶۷ء

۴۲- ''فارسی شاعری پر ایک نظر''، ایضاً، ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۰ء

۴۳- ''ظہوری ترشیزی''، المعارف، لاہور دسمبر ۱۹۷۱ء

۴۴- ''نظیری نیشاپوری''، ایضاً، فروری ۱۹۷۲ء
۴۵- ''صائب، روشن دل شاعر''، ایضاً، اپریل ۱۹۷۲ء
۴۶- ''ناصر علی سرہندی''، ایضاً، ستمبر ۱۹۷۲ء
۴۷- ''غالب کا نارسیدہ کلام''، نقوش، لاہور شمارہ ۱۱۶ (غالب نمبر ۳)
۴۸- ''وارداتِ سرمد''، ایضاً، شمارہ ۱۲۰
۴۹- ''یک چمن گل (گلدستۂ انتخاب)''، مشمولہ: نذر رحمٰن،
(مرتبہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مطبوعہ: ۱۹۶۹ء)

فہارس مخطوطات/مطبوعات (بشمول مسکوکات):

۱- خزائن مخطوطات پنجاب یونیورسٹی لائبریری''،
اورینٹل کالج میگزین، لاہور، مئی ۱۹۲۶ء
———— ، ایضاً، اگست ۱۹۲۶ء
———— ایضاً، نومبر ۱۹۲۶ء
———— ایضاً، فروری ۱۹۲۷ء
———— ایضاً، مئی ۱۹۲۷ء
———— ایضاً، نومبر ۱۹۲۷ء
———— ایضاً، فروری ۱۹۲۸ء
———— ایضاً، مئی ۱۹۲۸ء
———— ایضاً، نومبر ۱۹۲۸ء
———— ایضاً، اگست ۱۹۲۹ء
———— ایضاً، فروری ۱۹۳۱ء
———— ایضاً، مئی ۱۹۳۱ء
———— ایضاً، اگست ۱۹۳۱ء

________	ایضاً ،	نومبر ۱۹۳۱ء
________	ایضاً ،	فروری ۱۹۳۲ء
________	ایضاً ،	مئی ۱۹۳۲ء
________	ایضاً ،	اگست ۱۹۳۲ء
________	ایضاً ،	نومبر ۱۹۳۲ء
________	ایضاً ،	فروری ۱۹۳۳ء
________	ایضاً ،	نومبر ۱۹۳۳ء
________	ایضاً ،	مئی ۱۹۳۴ء
________	ایضاً ،	فروری ۱۹۳۵ء
________	ایضاً ،	نومبر ۱۹۳۵ء
________	ایضاً ،	اگست ۱۹۳۶ء
۲- ''کتاب خانۂ شیرانی کے نوادر''،	ایضاً ،	فروری ۱۹۴۷ء
۳- ''کتاب خانۂ شیرانی کے نوادر''،	افکار، کراچی،	اکتوبر ۱۹۸۰ء

۴- ''معجم مصادر اسلامی- ایک علمی منصوبہ''، فکر و نظر، اسلام آباد جلد ۱۳

۵- ''خط کی کہانی مخطوطات کی زبانی''،

(مشمولہ نذر رحمٰن، مرتبہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مطبوعہ: ۱۹۶۶ء)

۶- ''ادارۂ معارف اسلامیہ کے افتتاحی اجلاس میں

قلمیات و مسکوکات کی ایک شاندار نمائش''،

اورینٹل کالج میگزین، لاہور　　مئی ۱۹۳۳ء

نوادرات :

۱- ''خط، سعید احمد فارانی کے نام''، از سیّد عبداللہ،

مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد،　جنوری ۱۹۸۷ء

۲- ''اپنے معالج سے''، مطبوعہ : اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۳- ''بیماری کے دوران جوابات سیّد صاحب''،

مطبوعہ : اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

پیش لفظ، تعارف اور دیباچے :

سیّد عبداللہ نے درج ذیل کتب میں پیش لفظ، تعارف یا دیباچے لکھے :

۱- ''آبادی کی معاشریات، از ڈاکٹر چوہدری عبدالقادر، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۱ء

۲- ''آسان آب پاشی''، از عبداللہ جان، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۷۶ء

۳- ''آسان حیوانات''، از پروفیسر وہاب اختر عزیز، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۷۱ء

۴- ''آسان فولادی کنکریٹ''، از عبداللہ جان، لاہور،

ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی،

۵- ''آواز''، از ڈاکٹر عبدالبصیر پال، لاہور ۱۹۶۸ء

۶- ''ابتدائی شماریات''، از افتخار النساء حسن، لاہور

ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۱ء

۷- ''اپالو''، از محمد گلستان، لاہور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۳ء

۸- ''ارمغان علمی''، بخدمت پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع،

مرتبہ : ڈاکٹر سیّد عبداللہ، لاہور، مجلس ارمغان علمی، ۱۹۵۵ء

۹- ''اڑن مشین''، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۳ء

(اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ۱۹۶۱ء-۱۹۶۲ء میں منعقد ہونے والے انعامی مقابلے میں اڑن مشین کے عنوان پر انعام یافتہ مضمون)

۱۰- ''اصطلاحات اطلاقی نفسیات''، لاہور،
ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۲ء

۱۱- ''اصطلاحات کیمیا''، از سیّد ضیاء احمد رضوی، لاہور،
ایضاً، ۱۹۸۵ء

۱۲- ''اصطلاحات نفسیات''، لاہور ایضاً، ۱۹۷۱ء

۱۳- ''اضافیت کا نظریۂ خصوصی''، از خالد لطیف میر، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۳ء

۱۴- ''اعشاریائی تقسیم و نظام کتب خانہ''، از سیّد حسن اختر،
لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۷۳ء

۱۵- ''الیکٹرونکس کے بنیادی اصول، از اعجاز احمد خان،
ایضاً، ۱۹۷۰ء

۱۶- ''انسانی ماحولیات''، (Human Ecology)
از ڈاکٹر چوہدری عبدالقادر ایضاً، ۱۹۸۱ء

۱۷- ''ایکس ریز (X-RAYS) ایضاً، ۱۹۶۳ء

۱۸- ''ایٹم اور ایٹمی توانائی''، ایضاً، ۱۹۶۳ء

۱۹- ''بچوں کے مفکر''، از منور جہاں رشید، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۲ء

۲۰- ''بچوں کے نفسیاتی مسائل''، از منور جہاں رشید، لاہور،
ایضاً، ۱۹۷۹ء

۲۱- ''پاکستان ایک تہذیبی وحدت''، از سیّد فیضی لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۹ء

۲۲- ''بچوں میں حسد''، از منور جہاں رشید، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۰ء

۲۳- ''بچوں میں رقابت''، از منور جہاں رشید، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۲ء

۲۴- ''پاکستان کی معدنی دولت (ارضیاتی جائزہ)''، از ذوالفقار احمد، لاہور،
ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۸ء

۲۵- ''تاریخ سائنس''، از ڈاکٹر چوہدری عبدالقادر، لاہور،
ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۳ء

۲۶- ''تاریخ علم الادویہ و ادویہ سازی''، از پروفیسر ڈاکٹر محمد امین،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۲ء

۲۷- ''تعلیم بذریعہ کھیل (دو سال سے پانچ سال)''، از منور جہاں رشید،
ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۵ء

۲۸- ''تغیر اور نظریات تغیر''، از ڈاکٹر سی۔ اے۔ قادر، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۱ء

۲۹- ''جبذ'' از ایم۔ اے۔ عظیم، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۳ء

۳۰- ''جرمیات'' (CRIMINOLOGY)، از پروفیسر ڈاکٹر چوہدری ذوالفقار، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۹ء

۳۱- ''جوہری توانائی (پُر امن مقاصد کی تکمیل)''، از ایم۔ ایچ۔ مسعود بٹ، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۷ء

۳۲- ''چونچال بچے''، از منور جہاں رشید، لاہور
ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۱ء

۳۳- ''حدیث شوق (مجموعۂ نعت)''، از راجا رشید محمود، لاہور،
حامد اینڈ کمپنی، ۱۹۸۲ء

۳۴- ''حشرات الارض'' (Insects)، اور دہیل، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۴ء

(دو موضوعات پر مغربی پاکستان اور اردو اکیڈمی کے ۱۹۶۳ء-۱۹۶۲ء کے مضمون نویسی کے مقابلے میں شریک ہونے والے مضامین)

۳۵- ''حیاتیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا کے روابط''،
از ڈاکٹر محمد ظفر اقبال و حافظ عبدالاحد لاہور،
ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۵ء

۳۶- ''حیاتین'' (VITAMINS)، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۴ء

۳۷- ''حیوانات''، از محمد رمضان، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۵ء

۳۸- ''خصوصی نظریۂ اضافیت کا اشکال بابت کلاک''، از عزیز احمد، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۹ء

۳۹- ''خطوط اقبال''، علامہ اقبال کے ایک سو گیارہ غیر مدون مکاتیب مع حواشی و تعلیقات،
مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، لاہور، مکتبہ خیابان (ادب)، ۱۹۷۶ء

۴۰- ''دھاتیں اور ان کے استعمالات''، از ڈاکٹر فضل کریم، لاہور،
ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۹ء

۴۱- ''ڈیری فارمنگ''، از محمد آفتاب خان، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،
طبع اول: ۱۹۷۲ء
طبع دوم: ۱۹۸۳ء

۴۲- ''رابرٹ مالتھس اور اس کی تعلیمات''، از ڈاکٹر چوہدری عبدالقادر، لاہور،
ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۳ء

۴۳- ''رنگ نگاری''، از محمد ظفر اقبال، لاہور،
ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۲ء

۴۴- ''روسو اور ان کی تعلیمات''، از ڈاکٹر چوہدری عبدالقادر، لاہور

ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء

۴۵- ''سائنس اور زراعت''، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۸ء

۴۶- سائنسی موضوعات پر مضامین جو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، کے زیر اہتمام ۶۲-۱۹۶۱ء میں پڑھے گئے، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۲ء

(سلسلہ نمبر ۲)

۴۷- ''سائنسی موضوعات پر مضامین''، جو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کے زیر اہتمام ۶۳-۱۹۶۲ء میں پڑھے گئے۔ لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۳ء

(سلسلہ نمبر ۳)

۴۸- ''سائنسی موضوعات، منتخب مضامین''، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۰ء

(شمارہ ۴)

۴۹- ''سائنسی موضوعات پر مضامین''، جو مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۶۱ء-۱۹۶۲ء میں پڑھے گئے۔ لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۲ء

(سلسلہ مطبوعات نمبر ۴)

۵۰- ''سٹین لیس سٹیل (خواص و استعمالات پر ایک جامع کتاب)''، از ڈاکٹر فضل کریم، لاہور،

ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۸ء

۵۱- ''سرو چراغاں''، از جمیل ملک، لاہور، گوشۂ ادب، ۱۹۵۸ء

۵۲- ''سوئی گیس اور اس کا مصرف''، از محمد نذیر رومانی،
نظرثانی ڈاکٹر خواجہ صلاح الدین، لاہور،
ادارہ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۳ء

۵۳- ''سیم، اسباب اور روک تھام''، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۳ء

۵۴- ''شماریاتی میکانیات''، از عبدالبصیر پال، لاہور،
ادارہ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۴ء

۵۵- ''شمس و قمر''، از قمر میرٹھی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء

۵۶- ''صنعتی معاشریات''، از چوہدری عبدالقادر، لاہور،
ادارہ تالیف و ترجمہ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء

۵۷- ''صنعتی نفسیات''، از چوہدری عبدالقادر، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، طبع اول: ۱۹۷۳ء
طبع دوم: ۱۹۸۱ء

۵۸- ''عسکری نفسیات''، از چوہدری عبدالقادر، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۵ء

۵۹- ''علم افزائش آبادی کے تکنیکی پیمانے''، از مظہر حسین، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۷ء

۶۰- ''فلسفۂ جدید اور اس کے دبستان''، از ڈاکٹر سی- اے- قادر، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۱ء

۶۱- ''فولاد سازی''، از ڈاکٹر فضل کریم، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر محمد منشا، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۳ء

۶۲- ''فونڈری ٹیکنالوجی''، از ڈاکٹر فضل کریم، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۵ء

۶۳- ''فیضان اقبال (مرتبہ: شورش کاشمیری)''، لاہور، مکتبہ چٹان، ۱۹۶۸ء

۶۴- ''قانونی لغت''، (انگریزی - اردو)، از ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،　طبع چہارم:　۱۹۸۳ء

۶۵- ''قاموس الاصطلاحات''، از پروفیسر منہاج الدین، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،　طبع اول: ۱۹۶۵ء
طبع دوم:　۱۹۸۲ء

۶۶- ''کشاف اصطلاحات کیمیا''، (Dictionary of Chemistry)، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،　۱۹۸۶ء

۶۷- ''قاموس نباتات''، از وہاب اختر عزیز، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب،　۱۹۷۷ء

۶۸- ''کیمیاوی سامان حرب''، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،　۱۹۶۸ء

۶۹- ''کیمیائی بندو ساخت''، از محمد ظفر اقبال، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب،　۱۹۶۷ء

۷۰- ''گائے بھینسوں کا تولیدی نظام اور مصنوعی نسل کشی''، مرتبہ محمد آفتاب خان، ڈاکٹر وحید احمد، ڈاکٹر صداقت حیات اور ڈاکٹر بیدار بخت، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،　۱۹۷۹ء

۷۱- ''لسونت مادے''، ایم۔ اے۔ عظیم، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب،　۱۹۷۳ء

۷۲- ''لغاتِ طب''، از غلام نبی، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،　۱۹۶۶ء

۷۳- ''مرکزائی اشعاع اور زراعت میں ان کی اہمیت''، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب،　۱۹۷۶ء

۷۴- ''مرکزائی کیمیا''، از محمد ظفر اقبال، لاہور،

ادارۂ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۶ء

۷۵- ''مصنوعی سیارے''، (Artificial Satellites)، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۳ء

(مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ۱۹۶۱ء-۱۹۶۲ء میں منعقد ہونے والے انعامی مقابلہ کے انعام یافتہ مضامین کا مجموعہ)

۷۶- ''معاشرتی نفسیات''، از چوہدری عبدالقادر، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، طبع اول: ۱۹۷۳ء

طبع دوم: ۱۹۸۱ء

۷۷- ''معاشرتی نظریے''، از چوہدری عبدالقادر، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۶ء

۷۸- ''معاشریات''، از چوہدری عبدالقادر، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۴ء

۷۹- ''معجم مصادر اسلامی (کتاب الحوالہ) فہرست کتابیات اسلام''، از سیّد جمیل احمد رضوی، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۳ء

۸۰- ''منہاجیات''، (Methodology)، از ڈاکٹر سی- اے- قادر، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۰ء

۸۱- ''مویشیوں میں مصنوعی نسل کشی''، از ڈاکٹر سلطان علی، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۷ء

۸۲- ''نباتیات''، از پروفیسر وہاب اختر عزیز، لاہور،

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، طبع اول: ۱۹۶۴ء

طبع دوم: ۱۹۶۸ء

۸۳- ''نباتیاتی فعلیات''، از پروفیسر وہاب اختر، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۲ء

۸۴- ''نظام انہضام''، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۸ء

۸۵- ''نفسیات اطفال''، از پروفیسر ڈاکٹر عبدالقادر، لاہور
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۰ء

۸۶- ''نفسیاتِ تسویہ''، (Psychology of Adjustment)،
از چوہدری عبدالقادر، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۹ء

۸۷- ''نظام شمسی''، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۶۷ء

۸۸- ''نظریۂ گروپ''، از ایم- اے- مجید، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۳ء

۸۹- ''نموئی نفسیات''، از چوہدری عبدالقادر، لاہور،
مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۴ء

۹۰- ''ہم ربطی کیمیا''، از محمد ظفر اقبال و نصیر احمد، لاہور،
ادارۂ تالیف و ترجمہ، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۳ء

تبصرے:

۱- ''آشوب صدا''، (از اکبر حمیدی) مطبوعہ ماہ نو، لاہور اکتوبر ۱۹۷۸ء

۲- ''آتش خنداں (ایک تیموری شہزادے کا کلام)''،
ادب لطیف، ستمبر ۱۹۶۰ء

۳- ''اختلافات''، (از انور سدید)، مطبوعہ: اوراق، لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء

۴- ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، (از سلیم اختر)،
مطبوعہ: نقوش، لاہور، شمارہ ۱۲۰

۵- ''اقبال کے کلاسیکی نقوش''، (از انور سدید)،

مطبوعہ: ماہ نو، لاہور، دسمبر ۱۹۷۹ء

۶- ''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' (از حمید احمد خاں)،

مطبوعہ: صحیفہ، لاہور، نومبر-دسمبر ۱۹۷۷ء

(اقبال نمبر حصہ دوم)

۷- ''ایک فردا افروز کتاب (تاریخ اور کائنات- میرا نظریہ)''، تبصرہ،

فنون، لاہور، دسمبر ۱۹۷۴ء

۸- ''تنقیدی دبستان''، (از سلیم اختر)، مطبوعہ: نقوش، لاہور، شمارہ ۱۲۰

۹- ''تیشۂ کرب''، (از مرتضیٰ برلاس)، مطبوعہ: نیرنگ خیال، لاہور،

گولڈن جوبلی نمبر ۱۹۷۸ء

۱۰- ''ثنائے خواجہ''، (نعتیہ کلام از حافظ لدھیانوی)،

مطبوعہ: فنون، لاہور جون-جولائی ۱۹۷۲ء

۱۱- ''جائزہ مخطوطات اردو''، (از مشفق خواجہ)،

مطبوعہ: چٹان، لاہور، ۲۳ جولائی ۱۹۷۹ء

۱۲- ''جہانِ دانش''، (از احسان دانش)، مطبوعہ: چٹان، لاہور، ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۳ء

۱۳- ''حافظ لدھیانوی کے قطعات''، مطبوعہ: نقوش، لاہور، شمارہ ۱۲۹

۱۴- ''الخزائن: فہرست مفصل''، (از قاضی عبدالنبی کوکب)،

مطبوعہ: المعارف، لاہور، مارچ ۱۹۷۶ء

۱۵- ''داستان دار و رسن''، (از عبداللہ ملک)،

مطبوعہ: چٹان، لاہور، ۲۷ اگست ۱۹۷۳ء

۱۶- ''دائرہ معارف اسلامیہ''،

مطبوعہ: اورینٹل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۵۹ء

۱۷- ''سرو چراغاں'' مطبوعہ: ادب لطیف، لاہور، جون ۱۹۵۸ء

۱۸- ''شاعری اور تخیل''، (از ہادی حسین)

مطبوعہ: چٹان، لاہور، جون ۱۹۶۷ء

۱۹- ''شعر و حکمت''، (از حکیم نیر واسطی)

مطبوعہ: اورینٹل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۵۹ء

۲۰- ''عکس''، (از امجد اسلام امجد)، مطبوعہ: فنون، لاہور، مارچ، اپریل ۱۹۷۷ء

۲۱- ''غالب''، (از غلام رسول مہر)،

مطبوعہ: اورینٹل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۳۶ء

۲۲- ''کلام ثاقب سلمانی پر ایک نظر''،

مطبوعہ: چٹان، لاہور، ۲۶ نومبر تا ۲ دسمبر ۱۹۷۴ء

۲۳- ''مٹی کا دیا''، (از مرزا ادیب)، مطبوعہ: چٹان، لاہور، دسمبر ۱۹۸۴ء

۲۴- ''مسلم لیگ کا دور حکومت''، (از صفدر محمود)،

مطبوعہ: چٹان، لاہور، ۳ دسمبر ۱۹۸۴ء

۲۵- ''میزان پر ایک نظر''، مطبوعہ: فنون، لاہور، جنوری، فروری ۱۹۶۸ء

۲۶- ''محلّہ ثقافت'' مطبوعہ: ثقافت، لاہور، اپریل ۱۹۵۵ء

۲۷- ''محیط ایک مطالعہ''، مطبوعہ: افکار، کراچی، مارچ ۱۹۷۸ء

'محیط' (از احمد ندیم قاسمی)

تحقیقی کام کی نگرانی

(برائے: ایم-اے، پی ایچ-ڈی)

برائے ایم-اے (اردو):

۱- ''اردو آزاد نظم سرود نو سے استانزے تک''، از انیس ناگی،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۱ء

۲- ''اردو شاعری میں خواتین کا حصہ''، از ندرت شبنم چغتائی،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۳ء

۳- ''اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا''، از الطاف فاطمہ،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۵۳ء

۴- ''اقبال اور مناظر فطرت''، از زرینہ احمد علی،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۴ء

۵- ''تجلی، حالات، کلام، انتخاب''، از سیّد افسر حسین رضوی،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۵ء

۶- ''حافظ محمود شیرانی''، از سجاد ملک مجوکہ،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۵ء

۷- ''دیوان جرأت'' (الف تا نون)، از شوکت جہان،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور،

۸- ''سر عبدالقادر''، از اظہر محمد خان،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۵۷ء

۹- ''سودا کی قصیدہ نگاری''، از بشیر الدین احمد،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۵۴ء

۱۰- ''شیخ محمد ابراہیم ذوق''، از راحت افزا بخاری،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۰ء

۱۱- ''ظفر علی خان''، از غلام حسین ذوالفقار،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۵۵ء

۱۲- ''غزل کے اصول''، از نوشابہ اختر،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۲ء

۱۳- ''مکاتیب اقبال کا فکری وفنی پہلو''، از منور سلطانہ،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۰ء

۱۴- ''میر کی امیجری''، (دیوان چہارم تا ششم)، از ممتاز عرشی،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۲ء

۱۵- ''میر کی امیجری''، (دیوان اول تا سوم کے حوالے سے) از درشہوار،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۲ء

۱۶- ''میر کی غیر غزلیہ شاعری''، از ثریا شاہین،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۲ء

۱۷- ''میراجی، شخصیت اور فن''، از انوار انجم،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۳ء

۱۸- ''نواب مصطفیٰ خان شیفتہ''، از صفیہ عبدالحق،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، س-ن

۱۹۔ ''نذیر احمد بہ حیثیت انشاء پرداز''، از حبیب اختر،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۵۴ء

۲۰۔ ''ولی کی غزل''، از ریحانہ ناصر،
مقالہ برائے ایم-اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۴ء

برائے پی ایچ-ڈی (اردو):

۱۔ ''اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر''، از غلام حسین ذوالفقار،
مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۰ء

۲۔ ''اردو شاعری کا مذہبی اور فلسفیانہ عنصر''، از اے-ڈی-نسیم،
مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۵۹ء

۳۔ ''اردو میں شخصی، مذہبی اور قومی مرثیہ نگاری، تاریخ و تنقید''،
از ارشاد احمد ارشد
مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۰ء

۴۔ ''ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق''، از ڈاکٹر مہر عبدالحق،
مقالہ برائے پی ایچ-ڈی (اردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۵۷ء

مطبوعہ خطوط بنام ڈاکٹر سیّد عبداللہ:

۱۔ ''۸ خطوط''، (از امتیاز علی عرشی)،
مطبوعہ: اردو نامہ، کراچی، شمارہ ۴۴-۴۵، مارچ ۱۹۷۳ء

۲۔ ''۱۴ خطوط''، (از عبدالستار صدیقی)،
ایضاً، شمارہ ۴۴-۴۵ مارچ ۱۹۷۳ء

۳۔ ''ایک خط''، (از سیّد سلیمان ندوی)، مطبوعہ: نقوش، لاہور،
شمارہ: ۶۵-۶۶، نومبر ۱۹۵۷ء (مکاتیب نمبر جلد اول)

۴۔ ''۳ خطوط''، (از اختر شیرانی)، مطبوعہ : نقوش، لاہور،

شمارہ : ۶۵-۶۶، نومبر ۱۹۵۷ء (مکاتیب نمبر جلد دوم)

۵۔ ''۸ خطوط''، (از عبدالسلام ندوی)، مطبوعہ : نقوش، لاہور،

شمارہ : ۶۵-۶۶، نومبر ۱۹۵۷ء (مکاتیب نمبر جلد دوم)

۶۔ ''ایک خط''، (از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی)، مطبوعہ : نقوش، لاہور،

شمارہ : ۶۵-۶۶، نومبر ۱۹۵۷ء (مکاتیب نمبر جلد دوم)

۷۔ ''ایک خط''، (از ڈاکٹر عابد حسین)، مطبوعہ : نقوش، لاہور،

شمارہ : ۶۵-۶۶، نومبر ۱۹۵۷ء (مکاتیب نمبر جلد دوم)

۸۔ ''ایک خط''، (از سیّد مسعود حسن رضوی)، مطبوعہ : نقوش، لاہور،

شمارہ : ۶۵-۶۶، نومبر ۱۹۵۷ء (مکاتیب نمبر جلد دوم)

۹۔ ''ایک خط''، (از شیخ محمد اکرام)، مطبوعہ : نقوش، لاہور،

شمارہ : ۶۵-۶۶، نومبر ۱۹۵۷ء (مکاتیب نمبر جلد دوم)

۱۰۔ ''۶ خطوط''، (از محمود شیرانی)، مطبوعہ : نقوش، لاہور،

شمارہ : ۶۵-۶۶، نومبر ۱۹۵۷ء (مکاتیب نمبر جلد دوم)

ایضاً، مطبوعہ : مجلّہ تحقیق، لاہور شمارہ : ۲-۳ دسمبر ۱۹۸۰ء مارچ ۱۹۸۱ء

ایضاً، . مطبوعہ : مکاتیب حافظ محمود شیرانی، (مرتبہ: مظہر محمود شیرانی)، لاہور

مجلس یادگار حافظ محمود شیرانی، ۱۹۸۱ء

۱۱۔ ''ایک خط''، (از حامد علی خاں)، مطبوعہ : مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور،

کی ۲۵ سالہ روداد کارکردگی، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۰ء

۱۲۔ ''ایک خط''، (از ڈاکٹر ذاکر حسین)، مطبوعہ : نقوش، لاہور،

شمارہ : ۱۰۹، اپریل، مئی ۱۹۶۸ء (خطوط نمبر جلد سوم)

۱۳۔ ''ایک خط''، (از ڈاکٹر عابد حسین)، مطبوعہ : نقوش، لاہور،

شمارہ : ۱۰۹، اپریل، مئی ۱۹۶۸ء (خطوط نمبر جلد سوم)

۱۴- ''۴۸ خطوط''، (از مولانا عبدالحق)، مطبوعہ: نقوش، لاہور،
شمارہ: ۱۰۹، اپریل، مئی ۱۹۶۸ء (خطوط نمبر جلد دوم)

۱۵- ''چار خطوط''، (از سیّد سلیمان ندوی)، مطبوعہ: نقوش، لاہور،
شمارہ: ۱۰۹، اپریل، مئی ۱۹۶۸ء (خطوط نمبر جلد دوم)

۱۶- ''ایک عکسی خط''، (از اختر شیرانی)، مطبوعہ: نقوش، لاہور،
شمارہ: ۱۰۹، اپریل، مئی ۱۹۶۸ء (خطوط نمبر جلد اول)

۱۷- ''ایک عکسی خط''، (از سیّد سلیمان ندوی)، مطبوعہ: نقوش، لاہور،
شمارہ: ۱۰۹، اپریل، مئی ۱۹۶۸ء (خطوط نمبر جلد اول)

سیّد عبداللہ پر کتاب:

سوغات (شخصیہ): بخدمت استاد اعلیٰ مرتبت جناب ڈاکٹر سیّد عبداللہ (مرتبہ ممتاز منگلوری)، لاہور، مجلس ارادت مندان سیّد، ۱۹۶۷ء۔ یہ ان تمام مضامین اور مقالات کا مجموعہ ہے جو اپریل ۱۹۶۶ء میں سیّد صاحب کی ساٹھویں سالگرہ پر پڑھے گئے۔

سیّد عبداللہ کے متعلق پمفلٹ:

۱- ''شخصی کوائف نامہ''، از ڈاکٹر سیّد عبداللہ، لاہور، ادارۂ خیابان ادب، ۱۹۸۲ء

2- Bio-Data, Dr. S. M. Abdullha,
... Lahore, West Pakistan Urdu Academy, 1977.

3- A Biographical Note on Dr. Syed Muhammad Abdullah,
by Dr. C. A. Qadir, Lahore, West Pakistan Urdu Academy, 1982.

4- Dr. Syed Muhammad Abdullah,

... A Biographical Note, by Dr. C. A. Qadir, Lahore Maktaba Khayaban-e-Adab, 1976.

۵- ڈاکٹر سیّد عبداللہ ریڈر اردو فارسی پنجاب یونیورسٹی کے تحقیقی مقالات وتصانیف کی فہرست، گیلانی پریس، لاہور، س۔ن

(اکتوبر ۱۹۴۹ء تک کے اندراجات)

سیّد عبداللہ پر مطبوعہ مضامین

خودنوشت حالات :

۱- خودنوشت : ابتدائی حالات''، افکار کراچی، اکتوبر ۱۹۷۳ء

(دوسرا دور)، ایضاً، نومبر ۱۹۷۳ء

''تیسرا دور- عجائب البلاد لاہور میں''، ایضاً، دسمبر ۱۹۷۳ء

''علم و تعلیم کا پس منظر-علی گڑھ کی یادیں''،

(چوتھی قسط)، ایضاً، جنوری ۱۹۷۴ء

''چند ماہ جیل میں-علم و تعلیم کے مرحلے''،

(پانچواں دور)، ایضاً، فروری ۱۹۷۴ء

''کچھ اپنے اساتذہ کے بارے میں''،

(چھٹا دور)، ایضاً، مارچ ۱۹۴۸ء

''ملازمت، تحقیق اور درس و تدریس کے مرحلے''،

(ساتواں دور)، ایضاً، اپریل ۱۹۷۴ء

''پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں''،

(آٹھواں دور)، ایضاً، جون ۱۹۷۴ء

''تدریس کے مرحلے''، (نواں دور)، ایضاً، جولائی ۱۹۷۴ء

''کچھ اپنی تدریس کے بارے میں''،

(دسواں دور)، ایضاً، اگست ۱۹۷۴ء

''مناسب، اعزازات، چند محسن، خدمت اردو
اور مطالعہ ادب''، (گیارہواں دور)، ایضاً، ستمبر ۱۹۷۴ء
''تصور تعلیم، مشرب و مسلک، محسن اشعار''،
(بارہواں دور)، ایضاً، اکتوبر ۱۹۷۴ء
''تصنیفی ادبی زندگی-مختصر جائزہ''،
(تیرہویں اور آخری قسط)، ایضاً، نومبر ۱۹۷۴ء

۲- ''سیّد صاحب کی کہانی خود ان کی زبانی'' از ڈاکٹر سیّد عبداللہ،
مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۳- ''آپ بیتی''، مطبوعہ: نقوش، لاہور، شمارہ ۱۰۰

دیگر مضامین:

۴- ''ایک انسان دوست مفکر''، از طاہر مسعود،
مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۵- ''اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخِ زیبا لے کر''، از عطاالحق قاسمی،
مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۶- ''اردو زبان کا عاشقِ بے مثال''، از نسیم شاہد،
مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۷- ''استادِ مکرم''، از پروفیسر اسلم انصاری،
مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۸- ''استادِ مکرم''، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، از اسلم انصاری،
مطبوعہ: فنون، لاہور، نومبر، دسمبر ۱۹۸۶ء

۹- ''بابائے اردو ثانی''، از پروفیسر سیّد حسین شاہ فدا،
مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۱۰- ''پروفیسر ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم، منتخب کتابیات''، از سیّد جمیل احمد رضوی،

مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۱۱- ''تاثرات''، (بروفات ڈاکٹر سیّد عبداللہ)،

مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

تاثرات ان کے ہیں: ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، ڈاکٹر عبادت دہلوی،
احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد خان، پروفیسر جگن ناتھ آزاد،
انتظار حسین، ڈاکٹر صفدر محمود، بانو قدسیہ، ابصار عبدالعلی،
ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سلیم اختر، حسن رضوی،
عطا الحق قاسمی، منصور قیصر، پروفیسر حمید رضا صدیقی، خالد شریف،
پروفیسر حفیظ الرحمٰن، مہر گل محمد، عبداللطیف اختر، پروفیسر محمد امین،
پروفیسر جیلانی کامران، ابرار حسین۔

۱۲- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ''، از ڈاکٹر انور سدید،

مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۱۳- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ - ایک تعارف''،

مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۱۴- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ، تحریکی مزاج رکاوٹ بن گیا''، از پروفیسر وارث میر،

مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۱۵- ''روشنی کا مینار''، از میرزا غالب،

مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۱۶- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ''، از ملک حسن اختر، چٹان، لاہور ۱۲ فروری ۱۹۶۸ء

۱۷- ''اردو دائرۂ معارف اسلامیہ''، ایضاً، ۴ دسمبر ۱۹۷۲ء

(اس میں سیّد صاحب کے بارے میں بھی لکھا گیا ہے)

۱۸- ''عبداللہ ملک کا ایک خط ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے نام

''داستان دار و رسن کے ضمن میں''، ایضاً، ۳ ستمبر ۱۹۷۳ء
(سیّد مرحوم کے متعلق)

۱۹- ''اردو انجمنوں کا اٹھارہواں اجلاس، ڈاکٹر سیّد عبداللہ،
متحمل مزاج عاشق اردو، منفرد شخصیت''، از مقبول انور داؤدی، ۲۶ نومبر ۱۹۷۳ء

۲۰- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ''، از ملک حسن اختر، مطبوعہ: سیارہ، لاہور ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۶ء

۲۱- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ- چند باتیں''، از نعیم صدیقی، ایضاً، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۶ء

۲۲- ''آہ، ڈاکٹر سیّد عبداللہ''، از شیخ نذیر حسین، ایضاً، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۶ء

۲۳- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ، شخصیت اور کارنامے''، از ڈاکٹر ملک احسن اختر،
ماہنامہ کتاب، لاہور، مطبوعہ: اکتوبر ۱۹۸۶ء

۲۴- ''مخفی کہستانی''، از میرزا ادیب، مطبوعہ: نقوش، لاہور،
شمارہ ۴۷- ۴۸ (شخصیات نمبر)
(یہ مضمون سیّد صاحب کی شخصیت کے متعلق ہے)

منظوم خراج عقیدت:

۱- ''ہرگز نمیرد''، از شریف کنجاہی،
مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۲- ''ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ''، از عطا حسین کلیم،
مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۳- ''بیاد ڈاکٹر سیّد عبداللہ''، از عبدالعزیز خالد،
مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

قطعاتِ تاریخ:

۱- قطعہ تاریخ وفات استاد گرامی جناب ڈاکٹر سیّد عبداللہ مرحوم و مغفور''،

از ڈاکٹر گوہر نوشاہی، مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

۲- ''قطعہ تاریخ وفات محسن اردو ڈاکٹر سیّد عبداللہ اعلیٰ اللہ مقامہٗ''،

از سیّد عارف محمود مہجور رضوی، مطبوعہ: اخبار اردو، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

اخبارات میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ پر خبریں اور کالم:

۱- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ کو علمی و ادبی خدمات پر خراج عقیدت''،

مطبوعہ: روزنامہ امروز، لاہور ۲۱ جون ۱۹۸۶ء

۲- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ''،

مطبوعہ: روزنامہ پکار، اسلام آباد، ۹ اکتوبر ۱۹۸۶ء

۳- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ''، مطبوعہ: روزنامہ جسارت، کراچی، ۱۷ اگست ۱۹۸۶ء

۴- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا انتقال''، مطبوعہ روزنامہ جنگ، راولپنڈی، ۱۶ اگست ۱۹۸۶ء

۵- ''بر وفات حسرت آیات ڈاکٹر سیّد عبداللہ''، (از ہاشم رضا)

مطبوعہ: روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۷ اگست ۱۹۸۶ء

۶- ''محسن اردو ڈاکٹر سیّد عبداللہ''،

مطبوعہ: روزنامہ جنگ، لاہور، ۲۳ اگست ۱۹۸۶ء

۷- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی رحلت''، مطبوعہ روزنامہ جنگ، لاہور ۱۶ اگست ۱۹۸۶ء

۸- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی یاد میں ادبی کانفرنس''،

مطبوعہ روزنامہ حریت، کراچی، ۵ ستمبر ۱۹۸۶ء

۹- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ مسلم دنیا میں بھی عظیم سکالر کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے''، مطبوعہ: روزنامہ حریت، کراچی، ۵ ستمبر ۱۹۸۶ء

۱۰- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ کو خراج عقیدت''،

مطبوعہ: روزنامہ حریت، کراچی، ۲۱ اگست ۱۹۸۶ء

۱۱- ''علم و ادب کی روشن شمع بجھ گئی''، ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے پوری

زندگی فروغ ادب کے لیے وقف کر دی تھی، (از ڈاکٹر ابرار حسین)،

مطبوعہ: روزنامہ مشرق، لاہور، ۲۲ اگست ۱۹۸۶ء

۱۲- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ رحلت فرما گئے''،

مطبوعہ: روزنامہ مشرق، لاہور، ۱۶ اگست ۱۹۸۶ء

۱۳- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے انتقال پر اظہار تعزیت''،

مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۲۳ اگست ۱۹۸۶ء

۱۴- 'ادارۂ قومی ترقی وخوش حالی کی راہ میں رکاوٹ نہیں،

ڈاکٹر سیّد عبداللہ سکالر تھے، اردو کے لیے ان کی خدمات

ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی، مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی، ۳۰ اگست ۱۹۸۶ء

۱۵- ''مقتدرہ قومی زبان کا تعزیتی اجلاس''،

مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۲۲ اگست ۱۹۸۶ء

۱۶- ''اردو زبان میں اپنائے جانے کے لیے تمام صفحات موجود ہیں''،

مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۳۰ اگست ۱۹۸۶ء

۱۷- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی وفات پر صدر ضیاء الحق کا اظہار تعزیت''،

مطبوعہ: روزنامہ مشرق، لاہور، ۱۶ اگست ۱۹۸۶ء

۱۸- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ جن کی ذاتِ گرامی سب کے لیے

روشنی کا مینار تھی''، (از میرزا ادیب)

مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۳۱ اگست ۱۹۸۶ء

۱۹- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخِ زیبا لے کر''،

(از عطا الحق قاسمی)، مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۳۱ اگست ۱۹۸۶ء

۲۰- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ انتقال کر گئے''،

مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۱۶ اگست ۱۹۸۶ء

۲۱- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی قومی زبان کے لیے خدمات ہمیشہ

یاد رکھی جائیں گی''، مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۲۸ اگست ۱۹۸۶ء

۲۱- ''ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی یاد میں اکیڈمی قائم کی جائے''،

مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۲۳ اگست ۱۹۸۶ء

مآخذ:

۱- ''اخبار اردو''، اسلام آباد، جنوری ۱۹۸۷ء

(محسن اردو نمبر)

۲- ''اردو اصطلاحات سازی (کتابیات)، از ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری،

نظر ثانی و اضافہ از سیّد جمیل احمد رضوی،

مطبوعہ: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۴ء

۳- ''اقبال اکادمی، پاکستان کے سہ ماہی مجلّہ اقبال ریویو

(جنوری ۱۹۶۰ء تا اپریل ۱۹۶۷ء) کی وضاحتی فہرست''،

از ناہید طلعت، غیر مطبوعہ:

مقالہ برائے ایم۔اے (اردو)، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۷ء

۴- ''خودنوشت''، (از ڈاکٹر سیّد عبداللہ)،

مطبوعہ: افکار، کراچی، اکتوبر ۱۹۷۳ء تا نومبر ۱۹۷۴ء

۵- ''زندگی نامہ''، از عبدالشکور احسن،

لاہور ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۸۳ء

۶- ''سوغات (شخصیہ)''، ......(مرتبہ: ممتاز منگلوری)، لاہور،

مجلس ارادت مندان سیّد، ۱۹۶۷ء

۷- ''سویرا-تنقیدی مطالعہ''، از اسلم ملک،

غیر مطبوعہ: مقالہ ایم اے (صحافت)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۵ء

۸- ''شخصی کوائف نامہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ ...... تصانیف، مسودات، مقالات اور اہم علمی منصوبوں اور فکری و تعلیمی جدوجہد کے کوائف، لاہور،

۹- ''فکر و نظر کے پندرہ سال جولائی ۱۹۶۳ء- جون ۱۹۷۸ء ایک تفصیلی اشاریہ، مرتبہ: احمد خان،
مطبوعہ: اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۷۹ء

۱۰- ''فنون (اپریل ۱۹۶۳ء تا ستمبر ۱۹۷۶ء) تنقیدی جائزہ''،
از سیّدہ ربیعہ بخاری، غیر مطبوعہ: مقالہ برائے ایم اے (صحافت)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۶ء

۱۱- ''فہارس اورینٹل کالج میگزین، ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین مجلّہ انجمن عربی و فارسی دانش گاہ پنجاب ۱۹۲۵ء میلادی تا ۱۹۶۷ء میلادی، مرتبہ: ڈاکٹر محمد بشیر حسین،
مطبوعہ: لاہور، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۱۹۷۰ء

۱۲- ''کتابیات اردو املا اور دوسرے مسائل''،
از ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری، نظر ثانی از سیّد جمیل احمد رضوی،
مطبوعہ: اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

۱۳- ''مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کی ۲۵ سال روداد کارکردگی، جس میں گذشتہ پچیس برس کے کام کی جزئیات شامل ہیں،
(از ۱۹۵۵ء تا ۱۹۸۰ء) لاہور مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۰ء

۱۴- ''وضاحتی فہرست ادبی دنیا (اپریل ۱۹۲۹ء تا دسمبر ۱۹۴۶ء)
از رشیدہ خاتون، غیر مطبوعہ: مقالہ برائے ایم اے (اردو)
پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۸ء

۱۵- ''وضاحتی فہرست ادبی دنیا (۲) ۱۹۴۸ء کے دور ششم ۱۹۴۸ء
سے ۱۹۶۷ء تک''، از نسرین زاہدہ، غیر مطبوعہ مقالہ برائے
ایم اے (اردو)، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۸ء

۱۶- ''وضاحتی فہرست مقالات اردو، عربی، فارسی، انگریزی،
اورینٹل کالج میگزین، ۱۹۴۵ء تا ۱۹۶۴ء''، از محمد رمضان ایوبی،
غیر مطبوعہ: مقالہ برائے ایم۔اے (اردو)
پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۵ء

۱۷- ''وضاحتی فہرست مقالات اردو اور انگریزی سہ ماہی رسالہ،
'اقبال' (جنوری ۱۹۶۰ء تا اپریل ۱۹۶۷ء)'' از زرین اختر زیدی،
غیر مطبوعہ: مقالہ برائے ایم۔اے (اردو)
پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۷ء

۱۸- ''یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ادبی اور
درسی سرمایہ''، مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، مطبوعہ: لاہور،
پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۱۹۷۴ء

20- Bio-Data, Dr. S. M. Abdullah,
... Lahore, West Pakistan Urdu Academy, 1977.

21- A Biographical Note on Dr. Syed Muhammad Abdullah,
...by Dr. C. A. Qadir, Lahore, West Pakistan Urdu Academy, 1982.

22- Dr. Syed Muhammad Abdullah,
... A Biographical Note, by Dr. C. A. Qadir, Lahore Maktaba Khayaban-e-Adab, 1976

23- Publications of Punjab University Academic Staff (Upto 1981), Compiled by Dr. Khalid Hamid Sheikh, Lahore, University of the Punjab, 1982.

ڈاکٹر گیان چند جین

قاضی صاحب کی تحقیق نگاری

محاسن اور کمزوریاں

قاضی صاحب کے جملہ تصنیفی اور تالیفی کاموں کا بھرپور جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ مگر قاضی صاحب کے کام اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا سرسری تعارف بھی کرایا جائے تو کئی سو صفحات درکار ہوں گے۔ میں نے تو سرسری سے زیادہ کو اپنا مطمحِ نظر بنایا۔ ان کی آخری تحریر خدا بخش جرنل شمارہ ۹۶ بابت ۱۹۹۴ یا سفینہ شمارہ ۱۷ بابت جون ۱۹۸۵ ہو سکتی ہے جو ۱۹۸۳ء کی لکھی ہوئی ہونی چاہیے۔ ان کا انتقال ۲۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو ہوا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی تصنیفی زندگی کم و بیش ۶۵ برسوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے اپنے جائزے میں ہر تحریر کے مختلف پہلوؤں پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ یہاں ان کی تحقیقی تحریروں کو مجموعی طور پر نظر میں رکھ کر ان کے حسن و قبح پر اظہارِ خیال کرتا ہوں۔ پہلے خوبیاں جو ظاہر ہے، خامیوں سے زیادہ مضبوط اور بھرپور ہیں تبھی تو قاضی صاحب کا وہ مرتبہ ہے کہ جو ہے۔ ان میں کئی خوبیاں ایسی ہیں جن کے بارے میں انھوں نے خود کھل کر نہیں لکھا ہے لیکن جو ان کی تحقیق نگاری کو دیکھ کر اخذ کی جا سکتی ہیں۔

قاضی صاحب نے اپنی تحقیقی تحریروں کے ذریعے سب سے اہم سبق یہ دیا کہ کسی

کی شخصیت سے مرعوب نہ ہوئے۔ اپنے مضمون اصولِ تحقیق میں انھوں نے صرف یہ لکھا تھا "بعض موضوعات ایسے ہیں کہ ان پر آزادی سے کچھ لکھنا ضرر رساں ہوسکتا ہے، اگر اس کے لیے آمادہ نہیں تو ایسے موضوع پر قلم اٹھانا مناسب نہیں"۔ لیکن عملاً شخصیت پرستی پر اس جرأت سے ضربِ کلیمی لگائی کہ اپنے محترم زندہ معاصرین سے بھی مرعوب نہیں ہوئے۔ انھوں نے ایک طرف میر درد، غالب، شاد، محمد حسین آزاد جیسے مرحومین کی پوست کندہ حقیقت دکھائی تو دوسری طرف اپنے معاصر عظماء مثلاً مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد، مالک رام، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر اختر اورینوی وغیرہ پر اعتراضات کی جھڑی لگاتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ اس سلسلے میں کئی زعمائے ادب کی راست گفتاری سے بھی انکار کیا۔

اسی سے ملتی جلتی دوسری شق یہ ہے کہ لکھتے وقت کسی کے مذہب، علاقے یا منصب وغیرہ کا کوئی لحاظ نہ رکھ کر مکمل غیر جانب داری سے لکھیے۔ انھوں نے کئی امور میں غیر مسلموں کے حق میں آواز اٹھائی مثلاً یہ نہیں مانا کہ بنی نراین جہاں یا چھنو لال دلگیر تبدیلِ مذہب کر کے مسلمان ہوئے تھے۔ غالب نے فارسی کے ہندو لغت نویسوں پر اعتراض کیا تھا کہ ''سبحان اللہ ہندی بھی اور ہندو بھی'' اس پر قاضی صاحب نے ان کی صفائی پیش کی یہ زیادتی ہے محقق ہونے یا نہ ہونے کا مدار مذہب پر نہیں (کچھ غالب کے بارے میں حصہ دوم ص ۵۱۸.) مذہب کے ساتھ وہ علاقے کے علائق کا بھی خیال نہیں کرتے چنانچہ انھوں نے پٹنے میں بیٹھ کر اختر اورینوی، سیّد محمد حسنین اور ممتاز احمد کے ڈاکٹریٹ کے مقالوں پر سخت معترضانہ تبصرے کیے۔ بیدل کے لیے کہا بیدل عظیم آبادی نہیں اور ان کا صوبہ بہار کے کسی دوسرے مقام میں پیدا ہونا بھی متعین نہیں (مقالاتِ قاضی عبدالودود، متن ص۱۶)۔ قاضی صاحب نے دبستانِ عظیم آباد کے وجود سے انکار کیا ہے۔ اختر اورینوی کے لیے کہتے ہیں۔ مصنف کو دبستانِ عظیم آباد کے وجود پر اصرار ہے تو، لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ کن امور میں دہلی و لکھنو کے دبستانوں سے ممتاز ہے (ایضاً ص۹۴)

ڈاکٹر ممتاز احمد نے اردو زبان کی خدمت کے لحاظ سے عظیم آباد کو ملک کے کسی اور شہر سے فروتر نہیں مانا تھا۔ اس پر قاضی صاحب نے کہا۔ کہنے کو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ —— ''عظیم آباد کے ادبی خدمات کے پایہ کی دنیا کے کسی اور شہر سے نسبت نہیں اور اس پر داد بھی مل سکتی ہے لیکن حقیقت کا اس سے کیا تعلق ہے، یہ جدا گانہ بات ہے'' (ایضاً ص ۲۱۲) وہ مولوی عبدالحق، جنرل سیکرٹری انجمن ترقی اردو پاکستان، مولانا ابوالکلام آزاد وزیرِ تعلیم ہند، اختر اورینوی صدرِ شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدرِ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، کسی کے منصب کا لحاظ نہیں کرتے۔ خود سے عمر میں بڑے مولوی عبدالحق، پنڈت کیفی، مولانا آزاد اور سیماب اکبر آبادی کسی کو نہیں بخشتے۔ ایسی اخلاقی جرأت والے ہمارے دور میں کتنے ملتے ہیں۔

قاضی صاحب کا تیسرا درس یہ ہے کہ انھوں نے اظہار کی صحت اور الفاظ کی قطعیت پر زور دیا۔ مثلاً ریاض الفصحا میں مصحفی نے اپنی عمر قریب ہشتاد بتائی ہے۔ مولوی عبدالحق نے ۸۰ سال لکھ دی۔ قاضی صاحب نے گرفت کی کہ کیا ہشتاد اور قریب ہشتاد میں کوئی فرق نہیں۔ مالک رام نے رسالہ تحریریں کاکوری کے لیے لکھا تھا، 'علماء فضلاء کا بہت بڑا مرکز' قاضی صاحب نے گرفت کی کہ بہت بڑا محض برائے آرائش۔ صرف مرکز لکھنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے دلی کا دبستان شاعری میں جرأت کے بارے میں میر کا لفظ ''چوما چاٹی'' لکھ دیا تھا۔ قاضی صاحب نے تصحیح کی کہ قاسم نے ''چوما چاٹا'' لکھا ہے۔ اسے بدلنے کا کسی کو حق نہیں۔ اسی کتاب سے چند اور مثالیں:

ہاشمی کے بقول	قاضی صاحب کی تصحیح
صاحبِ طبقاتِ شعرائے ہند کا	کریم الدین
نام کریم الدین خاں	
ضیاء الدین	ضیاء الدین حسین
سلیمان قلی خاں وِدرد	سلیمان علی خاں وِدرد

میاں ثنا اللہ فراق	ثناء اللہ خان فراق
رائے امان	رائے مان
پریم ناتھ آرام، اُستادِ فن	اس کا صرف ایک شعر ملتا ہے۔ اسے استادِ فن نہیں کہہ سکتے
آبرو کا لقب شاہ مبارک	یہ لقب نہیں، عرف تھا
نواب سلیمان شکوہ	یہ نواب نہیں، بادشاہِ وقت کے بیٹے تھے

قاضی صاحب نے ڈاکٹر فاروقی کی کتاب ''میر تقی میر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ہدایت کی کہ اصلی مآخذ موجود ہیں تو انھی سے کام لینا چاہیے۔ مثال میں کہا کہ ریاض الفصحاء قدیم ترین کتاب ہے جس میں عرش کا حال ملتا ہے لیکن مصنف نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔ اسی طرح آبِ حیات میں منقول جرأت ومیر کی حکایت کو کریم الدین کے تذکرے سے نقل کیا ہے۔ قاسم کا حوالہ دینا چاہیے تھا (مجموعہ میر ص ۲۵۱)۔عرشی صاحب نے فرہنگِ غالب تیار کرتے ہوئے اپنے مآخذ میں اُردوئے معلّٰی، عودِ ہندی اور ادبی خطوط غالب کو بھی شامل کیا تھا۔ قاضی صاحب نے اعتراض کیا کہ پہلی دو کتابوں کے ہوتے آخری کتاب جو ہمارے دور کی ہے حشو ہے۔ اختر اورینوی نے علی ابراہیم خاں خلیل کے چار شعر درج کیے۔ حوالہ تھا ان کے دور کی کتاب تاریخِ شعرائے بہار کا۔ قاضی صاحب نے کہا کہ ان مین تین شعر سراپا سخن میں اور ایک ریاض الفصحا میں ملتا ہے۔ ان کا حوالہ دینا چاہیے تھا۔ لیکن مجھے اس طریقے کی لازماً پیروی کرنے میں تامل ہے۔ بہت بار قدیم ترین مآخذ سامنے نہیں ہوتا تو بعد کے کسی معتبر مآخذ کا حوالہ دینے میں کوئی قباحت نہیں۔ غیر ضروری طور پر ہر حوالے کا قدیم ترین مآخذ تلاش کرنے میں کیوں ضروری وقت ضائع کیا جائے۔

اب میں قاضی صاحب کی چند خصوصی معلومات اور شعبہ جاتِ علم کا ذکر کرتا ہوں:

قدیم اردو ادب کا جیسا بالا ستیعاب مطالعہ قاضی صاحب نے کیا تھا کسی دوسرے

نے نہیں کیا۔ اس میں تذکرے، بیاضیں، اور دواوین سب شامل ہیں۔ ہم ان چیزوں کو پڑھتے ہیں تو اپنے مفید مطلب مواد کو دیکھ کر کتاب کو بند کر دیتے ہیں اور الگ رکھ دیتے ہیں۔ قاضی صاحب تذکروں اور شاعروں کے دواوین کو (جن میں معمولی اور غیر اہم شعرا تک شامل ہیں) پڑھ کر جس طرح یادداشتیں نوٹ کرتے ہیں ایسے کوئی امتحان دینے والا طالبِ علم بھی نہ کرتا ہوگا۔ تحقیقاتِ ودود میں مطالعات اور یادداشت کے تحت دیکھیے تو ان کا طریقِ مطالعہ معلوم ہوتا۔ یادداشت کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

میری نظر سے جو کتابیں گزری ہیں ان میں سے سیکڑوں کے متعلق دوران مطالعہ میں لکھی ہوئی یادداشتیں ہیں اس دور میں (تحقیقاتِ ودود ص ۱۹۰)۔ میں (گ ج) کہا کرتا ہوں کہ کسی کو سزا دینی ہو تو حکم دیا جائے کہ کلیاتِ میر یا کلیاتِ شاہ نصیر، یا کلیاتِ ناسخ کو شروع سے آخر تک پڑھو۔ قاضی صاحب نے تو دیوانِ ظہور دہلوی اور دیوانِ فخر جیسے غیر اہم شعرا کے کلام کو بھی نہ صرف تفصیل سے پڑھا بلکہ صفحوں کے صفحے یادداشت کے قلم بند کر لیے۔ فہرستِ کتب نمائشِ ادارۂ تحقیقاتِ اردو ہند دیکھیے۔ معلوم ہوتا ہے نمائش میں جتنی اہم، غیر اہم الم غلم چیزیں آئیں قاضی صاحب نے سب کو چاٹ لیا، گھوٹ لیا۔ اپنے طریقِ مطالعہ کے لیے لکھتے ہیں:

یورپ کے متعدد کتب خانوں میں جو شعرائے اردو کے تذکرے اور دواوین ہیں، ان میں سے بہتوں کے متعلق میں نے یادداشتیں لکھیں جن کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ میں نے رام پور، علی گڑھ، دہلی، حیدر آباد، بمبئی، لاہور، کراچی اور ڈھاکے کتب خانوں کے اردو مخطوطات کا معتد بہ حصہ دیکھا ہے۔ میں نے ان سے متعلق جو یادداشتیں لکھی تھیں وہ کچھ ہیں، کچھ ضائع ہو گئیں (معاصر اگست ۷۶ء، ص ۱۸، ۱۹) ان کا مجموعہ ''چند اہم اخبارات و رسائل دیکھیے'' اس میں اخباروں تک کے صفحوں کے صفحے نقل کر دیے ہیں۔ یہ آدمی ہے کہ جن۔ میرے علم میں اہلِ اردو میں ایسا کوئی دوسرا فنا فی المطالعہ نہیں ہوگا۔ ان کے بعد کالی داس گپتا رضا کو دیکھا جو کتابوں کا مطالعہ کر کے ان کی یادداشتوں کی فائل تیار کرتے ہیں لیکن وہ صرف اہم مطالب نوٹ کرتے ہیں۔ قاضی صاحب کسی بھی کتاب یا

رسالے کو دیکھیں اس کی گویا تلخیص تیار کر لیتے ہیں۔

اور سونے پر سہاگا ہے ان کا بے نظیر حافظہ، میری تو یہ کیفیت ہے کہ انگریزی کے متعدد ناول اور افسانے جو بہت پہلے پڑھے تھے ان کا ایک لفظ بھی یاد نہیں۔ اردو میں قاری سرفراز حسین کا شاہدِ رعنا یا عزیز احمد کے ناول پڑھے تھے۔ ان کا صرف نام یاد ہے۔ ان کے مشمولات کا کوئی دھیان نہیں۔ پریم چند تک کے میدانِ عمل اور چوگانِ ہستی جیسے ناولوں کو تقریباً بھولے ہوئے ہوں۔ بی اے پاس کرنے کے بعد ملٹن کی کلیات (Complete works of Milton) شروع سے آخر تک پڑھ ڈالی، کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھا۔ اب فردوس گم شدہ اور فردوس بازیافتہ کا کوئی موضوع یاد نہیں لیکن قاضی صاحب کی آنکھوں کے سامنے اردو کے تذکروں اور دواوین کی ایک فلم گھومتی رہتی ہے۔ ان کی تحریروں میں دیکھیے، اردو کے مجہول الاحوال تیسرے درجے کے شعراء کے بارے میں بھی انھیں یاد ہے کہ کس تذکرے میں ان کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ اسی طرح اردو کے غیر اہم شاعروں کے غیر اہم شعروں کے بارے میں بھی نشان دہی کر دیں گے کہ کون سا شعر کس کا ہے۔ ۱۹۹۹ء میں ایک دفعہ میں نے اشعار کہے تھے:

تحقیق کے ہیں غازی عبدالودود قاضی — آئینہ جن کے آگے اردو ادب کا ماضی
گر کوئی مسئلہ ہو تاریخ و تذکرے کا — قاضی کے پاس دوڑو ہر راز کے ہیں رازی

مزید سُنیے، لکھتے ہیں:

''جب غالب سے متعلق تحقیقات کا شوق ہوا تو فارسی کی طرف توجہ ہوئی اور میں نے فارسی زبان و ادب کا باقاعدہ مطالعہ کیا (معاصر، اگست ۷۶ء ص ۱۹)۔ قاضی صاحب علم و فن کے جس شعبے میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو اس میں کمال کے درجے تک پہنچ جاتے ہیں۔ فارسی پڑھی تو اتنی کہ استاذ الاساتذہ کے منصب پر پہنچ گئے۔ مولوی عبدالحق نے ذکر میر کی تدوین کی اور اس نے بعض حصوں کا اردو ترجمہ کیا۔ قاضی صاحب نے جگہ جگہ اس کی تصحیح کی مثلاً خال کے معنی فارسی میں شوہر خالہ، خالو نہیں بلکہ ماموں ہیں (عبدالحق

بحثیت محقق، ص۲) مولوی صاحب نے نبیرۂ بہادر شاہ کا ترجمہ بہادر شاہ کا نواسہ کیا ہے۔
قاضی صاحب نے بتایا کہ فارسی میں نبیرہ و نواسہ دونوں کے معنی بیٹے یا بیٹی کی اولاد کے ہیں۔ اردو میں ایسا نہیں (ایضاً ص ۳)۔ مولوی صاحب نے یزنہ کے معنی داماد لیے ہیں لیکن ترکی اور فارسی میں اس کے معنی بہنوئی کے ہیں۔ اسی طرح ہمسر بہ معنی بیوی کے ہے۔ قاضی صاحب نے ذکر میر کے متعدد جملوں کے ترجمے کی تصحیح کی۔ نکات الشعراء میں رند باغاتی کو ارند باغاتی پڑھا۔ یہ میر کے ایک شعر میں بھی آیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی (عمر شیخ مرزا) نے اپنے ایک بے نظیر افسانے ''ان صحبتوں میں آخر'' میں لکھا ہے۔

بالآخر لبیبہ خاتوں کو جگہ ملی تو لیکن محلّہ باغات میں یعنی اس علاقے میں جہاں اصفہان کے اربابِ حسن اور اصحابِ طوب رہتے تھے —— باغات میں گھر ملنے کی دیر تھی کہ رندانِ باغاتی کا ہجوم لبیبہ کے دروازے پر صبح تا شام امنڈنا شروع ہو گیا۔ (شب خون جولائی ۱۹۹۹ء ص ۲۸)۔ اب رندِ باغاتی کے معنی واضح ہو گئے۔ قاضی صاحب کی مہارتِ فارسی کا مزید ثبوت مولانا عرشی کی فرہنگِ غالب کے تبصرے میں ملتا ہے۔ عرشی صاحب نے ہندوستانی علماء کی قواعد و بلاغت کی ۱۷ کتابوں کے نام سُن کر یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ کتابیں ایرانیوں کے لیے سنگِ میل کا کام دیتی رہی ہیں۔ قاضی صاحب کی نظر میں کیا ہندوستانیوں، کیا ایرانیوں کی جملہ علمی کتابیں ہیں۔ اپنی خود اعتمادی کے بل پر قاضی صاحب نے چیلنج کیا:

جنابِ عرشی سے استدعا ہے کہ وہ ان ایرانیوں کے نام بتائیں جنھوں نے ضوابطِ عظیم، منار الضوابط، تکملتہ الفارسی، مجمع البحرین، بحر الفوائد، مقدمہ جواہر الکلام، آمد نامہ (مصنفہ عزت) اور گلشن اکبر سے استفادہ کیا ہے (غالب بحثیت محقق ص۲۷۱)۔ عرشی صاحب نے کہا تھا کہ ایرانیوں کے پاس لے دے کے ایک فرہنگِ انجمن رائے ناصری ہے جو یکسر انھیں ہندیوں کی رہینِ منت ہے۔ قاضی صاحب نے تنبیہ کی۔

جناب عرشی فرہنگِ جہانگیری، مجمع الفرس، سراج اللغتہ کے دیباچوں کو ایک بار پھر پڑھ لیں تو عجب نہیں کہ انھیں اپنی رائے بڑی حد تک بدلنی پڑے۔

عرشی صاحب نے فرہنگ میں فارسی لغات کے جو معنی دیئے تھے قاضی صاحب نے ان میں سے کئی پر اعتراض وتصحیح کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرشی صاحب نے قاضی صاحب کے مشاہدات کی روشنی میں آٹھ صفحوں کا استدراک تیار کیا جس میں ۸۵ لغات کے اندراج ہیں، کچھ ترمیم کی اور اسے بقیہ جلدوں کے شروع میں شامل کیا۔ عرشی صاحب نے پریم کشور فراقی کی وقائع عالم شاہی کے دیباچے میں لکھا ہے جگل کشور قوم کا بھاٹ اور پیشے کے لحاظ سے شراب فروش تھا (بہ حوالہ سفر نامہ مخلص، طبقاتِ شعراے ہندو گلشنِ بے خار)۔ قاضی صاحب لکھتے کہ مخلص اور شیفتہ نے جگل کشور کی شراب فروشی کا ذکر نہیں کیا۔ کریم الدین قابلِ اعتبار نہیں۔ وکالت اور شراب فروشی ساتھ ساتھ کرتا تھا یہ بعید از قیاس ہے (تبصرے ص ۱۹-۲۰)

خواجہ احمد فاروقی نے بھی یہی بات لکھ دی ہے۔ قاضی صاحب نے تبصرہ کیا کہ بنگال کا وکیل ہونے کی وجہ سے بعض نے اسے باد فروش لکھا ہے۔ باد اضافہ ہ سے بادہ فروش ہوگیا۔ اس کے بعد کسی نے اسے بھاٹ سمجھ لیا تو تعجب کی جگہ نہیں۔ جناب عرشی کے سوا کسی نے اسے شراب فروش نہیں لکھا اور لکھا ہے تو انھیں کی طرح غلط فہمی میں مبتلا ہے (میر، ص ۳۰۱) غیاث الغات میں باد فروش کے معنی لکھے ہیں خوشامد گو و لاف زن و در ہندوستان لقب قومیت ہے کہ آنرا بھاٹ می گویند (غیاث ص ۵۵) میرے پاس غیاث اللغات کے علاوہ رام نراین لال الہ آبادی کی فارسی لغت ہے۔ اس میں بھی غیاث والے معنی دیئے ہیں، تعجب ہے کہ عرشی صاحب کو اتنی بڑی غلط فہمی ہوئی۔

مسعود حسن رضوی صاحب کے دیوانِ فائز کے مقدمے پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک کتاب ''مجموعہ گستاخ'' کا پتا دیا جس میں فائز کے نام شیخ علی حزیں کے ۳۲ خطوط ہیں۔ ان متفرق مشاہدات سے ہٹ کر قاضی صاحب کا مضمون غالب بحیثیت محقق دیکھا جائے تو ان کے فارسی علم وفضل کے بارے میں یہی کہنا پڑے گا کہ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ قاطع برہان میں غالب نے لکھا تھا کہ جس جمع کے آخر میں ''ات'' آئے وہ لازماً عربی لغت ہے۔ قاضی صاحب نے اس کی تردید میں فارسی سے تقریباً ۱۶۶ مثالیں پیش کیں (نقدِ

غالب ص ۴۳۱-۴۳۳)۔ افسوس اور افسوس کے بارے میں نقدِ غالب کے ص ۴۴۳ سے ۴۵۲ تک سیکڑوں اسناد رقم کر دیں غالب نے قدر بلگرامی کو لکھا تھا کہ ایرانیوں کی نظم و نثر میں کافِ تصغیر نہیں آتا۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ متعدد مثالوں میں کافِ تصغیر زائد بھی ملتا ہے۔ اس کے بعد ص ۵۱۶ سے ۵۲۴ تک مستند ایرانیوں کے یہاں سے اتنی مثالیں دیں کہ چار پانچ سو سے کم کیا ہوں گی۔ بحث اٹھی تھی جام کی تصغیر جامک پر۔ قاضی صاحب نے کلیاتِ طغرا سے ایک شعر تلاش کر لیا جس میں ''جامک'' کا لفظ استعمال ہوا ہے (غرض یہ ہے کہ فارسی زبان و ادب کی واقفیت میں وہ ایسے دانائے راز تھے جن سے اختلاف کرنا اپنی رسوائی کا سامان کرنا تھا)۔

(قاضی صاحب کا ایک مطالعہ اختصاصی ہندوستان کے مغل دور کی آخری صدیوں کی تاریخ سے گہری واقفیت ہے۔ مالک رام لکھتے ہیں ''شمالی ہند میں اردو ادب کے آغاز اور فروغ کا وہی زمانہ ہے جو اسلامی سلطنت کے زوال کا تھا— اس دور میں بیشتر ادیب کسی نہ کسی بادشاہ یا وزیر امیر کے دامنِ دولت سے وابستہ رہے —— اس عہد کے ادب کی تاریخ اور ادبا کی سوانح عمری اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ہم عصر سیاسی تاریخ کا بھی غائر مطالعہ نہ کیا جائے۔ اسی لیے قاضی عبدالودود صاحب نے ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ کا عمومی اور خاندانِ مغلیہ کے آخری دور کا خصوصی مطالعہ کیا جس سے وہ اس عہد کی بیشتر اہم تاریخی شخصیتوں کے نسب ناموں، سوانح حیات، نقل و حرکت اور سنین اور مختلف ادبا اور شعرا کے ان سے مراسم و تعلقات وغیرہ کے کوائف پر حاوی ہو گئے۔ (معاصر اگست ۷۶ء ص ۴۴) اردو ادب کے پس منظر میں انھیں اس سے بہت مدد ملتی ہے اور وہ بعض اوقات تاریخ کے نہایت غیر معروف اشخاص کے بارے میں جو کچھ انکشاف کرتے ہیں اسے دیکھ کر عش عش کرنا پڑتا ہے۔ میں جستہ جستہ کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں۔

نجف خاں کا صحیح سالِ وفات اس کی قبر کے کتبے سے معلوم کیا (معیار ص ۲۶۲)۔ احکاماتِ عالمگیری سے معلوم کیا کہ اورنگ زیب نے اپنے خالو کی حرم پر عاشق ہو کر خالو

سے اس کی اور اپنی حرم کا تبادلہ کیا (سودا و درد ص۵)۔ راجا ناگرمل کو مہاراجگی، نیابت اور عماد الملکی کے خطابات کی تاریخ (عبدالحق بحیثیت محقق ص۱۶)۔ صمصام الدولہ کے بیٹے کا لقب اور عہدہ بھی یہی تھا (ایضاً ص۴۸)۔ نکات الشعراء میں جعفر زٹلی کا شعر درج ہے ع۔ چہارم پسر ڈومنی کا جنا ــــ قاضی صاحب نے مآثرِ عالمگیری سے تصحیح کی کہ یہ چوتھا نہیں تیسرا بیٹا تھا اور دل رس بیگم کے بطن سے تھا اور کسی طرح ڈومنی کا بیٹا نہیں کہا جا سکتا (ایضاً ص۱۶۷)۔ بیگم سمرد المخاطب بہ زینت النساء نہیں زیب النسا چاہیے (ایضاً ص۲۲۳)۔ سرو اور زینت النسا کا بیٹا ظفر یار خاں صاحب۔ یہ زیب النسا نہیں، کسی دوسری عورت کے بطن سے تھا (ایضاً) شاہزادی خالہ جو اپنے بھتیجے عماداللہ کے محل میں اس نام سے پکاری جاتی تھی۔ قاضی صاحب نے اس بیان کی کئی غلطیوں کی تصحیح کی (ایضاً ص۲۲۵) سدا رنگ کی وفات کی تاریخ (ایضاً ص۲۴۵)۔ خواجہ صمصام الدولہ اور خواجہ باسط کی عمروں کا پتا (میر، ص۲۶۶)۔ میر کے سلسلے میں سادات خان کی تفصیل (میر، ص۴۲)۔

احمد شاہ معزولی کے برسوں بعد طبعی موت سے مرا (میر، ص۲۹۸)۔ سراج الدولہ جنگ پلاسی میں شہید نہیں ہوا۔ وہ پلاسی سے بھاگ گیا تھا۔ بعد میں گرفتار ہو کر قتل ہوا (میر، ص۲۹۸)۔ خواجہ فاروقی نے لکھا تھا کہ نادر کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی اس کے تخت پر متمکن ہوا۔ قاضی صاحب: احمد شاہ افغانستان کا بادشاہ تھا۔ مملکتِ نادری کا مرکز ایران تھا (میر، ص۳۰۳)۔ میر کے سلسلے میں بلاس رائے اور اس کے چھوٹے بھائی پلاس رائے کی شناخت کی (ص ۳۴۷)۔

۴۴ عالمگیری میں محمد یار خاں صوبہ دار دہلی تھا (کچھ ادبی تحقیق کے بارے میں ص۵۲)۔ بیدل کے لاہور جانے کا جو زمانہ بتایا گیا ہے، اس وقت وہاں عبدالصمد خاں صوبہ دار تھے (ایضا ص۶۷)۔ شاہ عالم کے عہد میں مختلف ریاستوں کے نوابوں کے نام (ایضاً ص۸۷-۸۶)۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اور سعادت خاں کا معاملہ (ایضاً ص۱۰۳)۔ نول رائے وفا کی شناخت (ایضاً ص۱۱۰)۔ فغاں کے قطعے کا تعلق رام نراین

موزوں سے نہیں رام نراین ملازم شجاع الدولہ سے ہے (مقالاتِ وددود ص ۸۲) محمد شاہ اور سادات برادران کے جھگڑے (تحقیقات وددود ص ۲۶-۱۲۵)۔ بارھویں صدی میں ناظمانِ بنگال کے نام (شعرا کے تذکرے ص ۴۳ حاشیہ)۔ گنا بیگم قزلباش خاں امید کی بیٹی نہیں، علی قلی خاں شش انگشتی متخلص بہ والہ کی بیٹی تھی (محمد حسین آزاد بحیثیت محقق ص ۷) دلہن بیگم، شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کا رشتہ (ایضاً ص ۷) آبِ حیات ص ۲۲۲ کے مطابق ظفر کی ولی عہدی کے دنوں میں ایک انگریز جان الفنسٹن شکار پور سندھ سے کابل تک معاہدہ کرنے کے لیے گئے۔ قاضی صاحب نے تصحیح کی کہ معاہدہ کرنے والے کا نام مونٹ اسٹوارٹ الفنسٹن تھا، جون الفنسٹن اس کا باپ تھا (ایضاً مشق ۱۴۵)۔ آصف الدولہ کی وزارت تھی۔ سعادت علی خاں کو شاہ عالم یا ان کے جانشین اکبر ثانی نے یہ عہدہ نہیں دیا (مصحفی اور ان کے اہم معاصرین، حاشیہ ص ۱۵۸)

اہل اردو میں اردو ادب کی پس منظری تاریخ پر کوئی دوسرا اس طرح حاوی نہ ہو سکا۔ ان کے مطالعے کی وسعت کا اندازہ گزشتہ صفحات میں جابجا ان کے بعض نادر ماٰخذ کے حوالوں سے ہوسکتا ہے۔ وہ غیر ادبی کتابوں سے کیسی کیسی مفید معلومات چن کر لاتے تھے۔ ان معلومات کے سہارے انھوں نے تحقیق میں کیا کیا معرکے کے انکشافات کیے ہیں۔ گاہے گاہے بازخواں کے طور پر میں ان کی چوٹی کی کچھ دریافتوں کا ذکر کرتا ہوں۔

۱۔ نجف خاں کی بیماری اور موت کی بنا پر میر کے لکھنو جانے کا صحیح ماہ و سال طے کیا (معیار ص ۸۰-۱۷۹)۔

۲۔ ایک مستشرق پالمر نے میر حسن کی ایک مثنوی کا سرقہ کر کے اودھ اخبار میں اپنے نام سے شائع کر دی۔ قاضی صاحب نے اپنے دو مضامین میں اس کا ذکر کیا (مجموعہ اردو شعر و ادب ص ۱۲۱ اور ص ۲۹۲ سے شروع ہونے والے مضامین)۔

۳۔ مصحفی کے دیوانِ ششم میں ایک مقطع ہے:

اور اردو کا جو واقف ہے تو اب پہنچے ہے
چند با قاف بسر شخص کی تصویر سے فیض

صغیر بلگرامی نے قاف کی جگہ نون پڑھ کے دعویٰ کیا تھا کہ مصحفی نے ناسخ کی تعریف کی ہے۔
قاضی صاحب نے دیوان کے جن مخطوطوں میں پایا کہ یہاں نون نہیں قاف ہے اور اس سے مراد مرزا حاجی عمر ہیں۔

۴۔ دیوانِ رشک اور کلیات ناسخ کی مدد سے ناسخ کی ولادت و وفات کا صحیح سنہ، یوم و ماہ دریافت کیا (تحقیقاتِ وددوص ۱۴۵)

۵۔ صغیر بلگرامی نے ایک اردو رباعی اکبر بادشاہ سے منسوب کر دی۔ قاضی صاحب نے انکشاف کیا کہ فاخر جہانگیری اور دیباچہ تزک جہاں گیری میں ساعت سے متعلق ایک فارسی رباعی ہے۔ اے جستہ زما برسم عادت ساعت۔ تزک جہانگیری کے اردو ترجمے کے دیباچہ نگار محمد ادمی نے لکھا ہے کہ اس رباعی کا اردو ترجمہ جعفر بیگ آصف خاں نے کیا ہے پوچھی جو گھڑی مجھ سے برسم عادت۔ (آوارہ گرد اشعار ص ۱۱)

۶۔ غالب نے اپنے بعض خطوں میں لکھا ہے کہ ظفر کے ولی عہد انھیں ۴۰۰ روپے ماہوار دیتے تھے لیکن ان کے مرنے پر غالب نے صرف ۱۰ روپے ماہوار کا غم کیا جو وہ عارف کے بیٹوں کو میوہ کھانے کے لیے دیا کرتے تھے (کچھ غالب کے بارے میں حصہ دوم ص ۴۹۷)

۷۔ قاضی صاحب نے پرتھوی چند کی جاگیر غالب کی مدد سے سرکاری رکارداروں کے اس خلفشار کی طرف توجہ دلائی جس میں غالب کے والد اور نصر اللہ بیگ خاں کو کہیں اخیافی بھائی (جن کی ماں ایک ہو۔ باپ مختلف) لکھا ہے، دوسری تحریروں میں کہیں سگا بھائی لکھا ہے۔ مالک رام نے علاقی بھائی (جن کا باپ ایک اور ماں الگ الگ ہو) درج کیا ہے۔ چیف سیکریٹری کہیں غالب کو نصر اللہ بیگ خاں کا بھتیجا کہیں بیٹا کہتا ہے۔ کہیں لکھا ہے کہ نصر اللہ بیگ خاں کا کوئی بھائی نہ تھا وغیرہ۔ (کچھ غالب کے بارے میں، اول ص ۳۸ تا ۴۰)

۸۔ غالب کی گم شدہ نظم و نثر کی فہرست (ایضاً ص۲۴ تا ۲۷)

۹۔ یاد گار غالب میں لکھا ہے کہ غالب نے ایک مشاعرے میں گر بستن ردیف والا قصیدہ پڑھا تو مجلسِ مشاعرہ مجلس عزا بن گئی۔ قاضی صاحب نے پتا چلایا کہ غالب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ ایک شخص اس زمین میں شیفتہ کی غزل لایا تھا۔ وہ یہیں تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ یہ اصل ہے اور باقی سب داستان (ایضاً ص۵۶)

۱۰۔ غالب نے ایک فارسی قصیدے کے بارے میں لکھا تھا کہ نصیر الدین حیدر کی مدح میں لکھا تھا اور انھوں نے پانچ ہزار روپے بھیجنے کا حکم دیا۔ یہ پوری رقم متوسطوں نے کھا لی۔ قاضی صاحب نے خدا بخش لائبریری میں کلیاتِ غالب کے مخطوطے میں یہ قصیدہ دیکھا جس کے عنوان میں صاف لکھا ہے کہ مدح بہ ممدوح (شاہِ اودھ) نارسیدہ از عالم مستی بہ بوئے بادۂ ناکشیدہ (ایضاً ص۱۰۰/۶، ص۲۳-۲۲۲ وجہانِ غالب ص۵۲-۵۰)

۱۱۔ غالب نے انتخابِ غالب میں غدر کے دنوں میں اپنے اور کرنل برون کے ایک مکالمے کا ذکر کیا ہے آدھا مسلمان والا۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ غلام حسین خاں نے اپنی فارسی کتب میں جس کا ملخص ترجمہ غدر کا نتیجہ کے نام سے ہے لکھا ہے کہ گورے انھیں گرفتار کر کے کرنل برون کے پاس لے گئے۔ غالب کے ایک دوست اتفاق سے وہاں بیٹھے تھے۔ انھوں نے ان کی سفارش کر کے رہائی دلوائی (جہانِ غالب ص۵۴)۔

۱۲۔ گلشنِ بے خار میں شیفتہ نے ذوق کے صرف ۴۱ شعر انتخاب کر کے دیے تھے۔ مطبوعہ ایڈیشن میں ان کے علاوہ ۱۶۱ شعر اور ہیں جن کے بارے میں حاشیہ ص۱۱۳ میں ہے کہ آگے کے اشعار مہتمم مطبع نے بہت کوشش سے بہم پہنچا کر جمع کیے ہیں (شعرا کے تذکرے ص۲۲۴)

۱۳۔ رئیس احمد جعفری نے اپنی کتاب ''بہادر شاہ اور ان کا عہد'' میں لکھا ہے کہ جب بہادر شاہ قید ہو کر دلی سے رنگون جا رہے تھے تو کلکتے میں ان کی واجد علی شاہ سے

ملاقات ہوئی۔ اسے بڑے ڈرامائی طریقے سے بیان کیا ہے۔ قاضی صاحب نے انکشاف کیا کہ جب بہادر شاہ کلکتہ پہنچے ہیں واجد علی شاہ قلعہ کلکتہ میں قید تھے اس لیے ملاقات کا سوال ہی نہ تھا (تبصرے ص۸۲-۷۹)۔

۱۴۔ تذکرہ گلستانِ سخن کے علاوہ صابر کی لکھی ایک سطر بھی موجود نہیں جسے ان کے ذی علم ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تذکرہ سراسر صہبائی کا لکھا ہوا ہے (شعرا کے تذکرے ص۳۲۳)۔

۱۵۔ رموزِ حمزہ کے سلسلے میں واضح رہے کہ طلسم ہوش ربا ایجادِ ہند ہے۔ کسی ایرانی روایت میں اس کا مجملاً ذکر بھی نہیں —— عجیب بات یہ ہے کہ اس میں عمرو عیار ہے لیکن اس کی زنبیل نہیں ۔ (زباں شناسی ص۹۷)

ظاہر ہے کہ قاضی صاحب نے اسی معیار کی اور متعدد تحقیقات و انکشافات کیے ہیں۔ لیکن میں اطناب کے خوف سے مزید مثالیں نہ دوں گا۔ دوسرے بڑے محققوں کے یہاں بھی قابلِ قدر تحقیقی انکشاف ملتے ہیں لیکن قاضی صاحب کے مقابلے میں بدرجہا کم کیونکہ قاضی صاحب کے تحقیقی کاموں کی مقدار تحقیق کے دوسرے ستونوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔

قاضی صاحب کی خوبیوں کا بیان بلکہ اعتراف جی بھر کے ہو چکا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ میں قاضی صاحب کا ڈفالی ہوں۔ میرے سامنے قاضی صاحب کا ایک بیان ہے۔ خطباتِ گارساں دتاسی کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

دتاسی نے اس کتاب میں نہیں لکھا ہے کہ کتاب اگر بہ حیثیت مجموعی مفید ہو تو اس کے عیوب سے چشم پوشی کرنی چاہیے۔ ممکن ہے کہ انیسویں صدی میں تبصرہ نگاروں کا اس پر عمل ہو لیکن بیسویں صدی میں تو تصویر کا صرف ایک رخ دکھانا ادبی شریعت میں گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے اور ہمارے لیے —— اس مشورے پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہے (معیار مئی ۳۶ء ص۲۳۴) میں قاضی صاحب کے اس منصفانہ اصول کی قدر کرتا ہوں۔ ان کا دوسرا درس یہ ہے کہ کسی کی شخصیت سے مرعوب نہ ہونا چاہیے۔ میں بھی انھیں کے درس پر

عمل کرتے ہوئے ان کی تصویر کے دوسرے رخ کو دیانت داری سے پیش کرتا ہوں کہ میں بھی کسی صورت میں تصویر کے محض ایک رخ کو پسند نہیں کرتا وہ خواہ روشن رخ ہو کہ تاریک۔ مجھے مکمل تصویر پیش کرنی ہے۔

قاضی صاحب کی تحقیق نگاری کی کمزوریاں:

(۱) قاضی صاحب نے قدیم اردو ادب اور اس کے پس منظری علوم مثلاً بلاغت، فارسی ادب اور مغل تاریخ کا اتنی گہرائی سے مطالعہ کیا کہ کوئی دوسرا نہ کر سکا اور امید نہیں کہ عرصے تک کوئی ان کے برابر پہنچ سکے گا لیکن بے حد مواد کے باوجود وہ اسے حسن کاری کے ساتھ ترتیب نہ دے سکے۔ ان کے پاس عمارت سازی کے سارے لوازمات سنگ و خشت، چوب و آہن، مسالوں وغیرہ کی فراوانی تھی لیکن وہ ان سے کوئی ایسا دل فریب ایوان تیار نہ کر سکے کہ ادھر سے گزرنے والے اس کے اندر کی سیر کے لیے للچائیں۔ ان کے ذہن میں نہ کوئی نقشہ تھا نہ اسے ابھارنے والی فن کاری۔ انھوں نے مغربی زبانوں میں ناول اور ڈرامے تو بہت پڑھے لیکن اصولِ تحقیق یا تدوین کی ایک کتاب بھی نہیں دیکھی۔ دیکھتے تو اس کا ذکر کرتے۔ صرف اسلوب سے متعلق ایک کتاب The reader over your shoulder مصنفہ، رابرٹ گریوفہ والین ہوج کا نام لیتے ہیں۔ انگریزی میں اصولِ تحقیق سے متعلق بہت اچھی کتابیں ملتی ہیں مثلاً:

Richerd Altic, The Art of Literary Research

F.W. Bateson, The scholar critic

George Watson, The Literary Thesis

تدوین تو آئی ہی مغرب سے ہے۔ پہلے یونانی اور لاطینی نسخوں کی تدوین سے، پھر سنسکرت متون کی تدوین سے۔ تدوین کی کلاسیکی کتابیں یہ ہیں:

F.W. Hall. Companion to Classical Text

S.M. Katre. Introduction to Indian textual Criticism

Fredson Bowlls. Principles of Biblio graphical Perscription

تفصیل میری کتاب تحقیق کا فن کی پیش گفتار، متعلقہ ابواب اور کتابیات میں دیکھیے۔ دوسروں کے تصورات اور تجربات کی رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے انھوں نے اپنے مضمون اصولِ تحقیق (آج کل اگست ۱۹۶۷ء) اور ''غالب ۔ زباں پہلوان'' (رسالہ اردو جنوری مارچ ۱۹۷۰ء) میں جو قواعد قائم کیے ہین وہ نہ جامع ہیں نہ مانع، نہ گہری سوچ کے نمائندہ۔ عابد رضا بیدار نے خدا بخش سیمنار کے کتابچے ''تدوینِ متن کے مسائل'' کے مقدمے میں نیز اپنے مضمون دو ہم آہنگ محقق (غالب نامہ دہلی جنوری ۸۷ء ص۱۰۳-۱۰۲) میں مقدمے اور حواشی میں غیر ضروری اور غیر متعلق مواد بھرنے کے خلاف لکھا ہے۔ قاضی صاحب ان دونوں خطاؤں کا ارتکاب کرتے تھے۔ تدوین میں انھوں نے ''الفاظ اور طرق استعمال'' دینے کی ایک نئی روش نکالی۔ سختی سے دیکھا جائے تو یہ تدوین کے ذیل میں نہیں آتی، علیحدہ سے کسی مضمون میں اس متن کا لسانی مطالعہ دیا جا سکتا ہے جس میں لفظیات پر جی کھول کر لکھیے۔ متن کے ساتھ بغیر تبصرے کے لفظوں کی فہرست کی افادیت محدود ہے۔

کہنے کی غرض یہ ہے کہ اگر طریق تحقیق میں قاضی صاحب نے اپنے تجربے اور خانہ زاد طریقے پر اکتفا نہ کر لی ہوتی بلکہ اس موضوع پر دوسروں کی معیاری کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہوتا تو ان کی تسوید اور ترسیل ایسی نہ ہوتیں کہ جو قاریوں کو متوجہ نہیں کر پاتیں۔ کلیم الدین احمد نے کتنی معرکے کی بات کہی ہے۔

اگر وہ پروفیسر ہوتے تو دوسرے اساتذہ سے ملتے، طالبِ علموں سے ملتے (ہر) ایک سے تبادلہ خیالات کرتے اور دوسروں کو اپنی باتیں سمجھاتے، کمیٹیوں میں کام کرنا پڑتا تو جہاں اپنی کہتے وہاں اوروں کی باتیں بھی سنی پڑتیں —— تو قاضی صاحب کی شخصیت پر اثر ضرور پڑتا۔ تنہا رہنے کی وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ جو وہ سوچتے ہیں وہی صحیح ہے اور جو اس طرح نہیں سوچتا وہ غلطی پر ہے۔ (معاصر اگست ۷۶ء ص۴۲۳)

(۲) تحقیق میں گلے گلے ڈوب جانے کی وجہ سے قاضی صاحب کا تنقیدی شعور کمزور پڑتا گیا جس کی وجہ سے وہ اپنے کام کرنے کے موضوعات کا صحیح انتخاب نہ کر سکے۔ اس کتاب کے پہلے ضمیمے سے معلوم ہوگا کہ انھوں نے عابد پیشاوری کو پی ایچ ڈی کے لیے نثریاتِ انشا کی تدوین کا موضوع سُجھایا تھا۔ میں تو ایسے ہلکے موضوع کو ایم فِل کے مقالے کے لیے بھی منظور نہ کروں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کام کے موضوع کے انتخاب میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔ تدوین کے سلسلے میں میں دکھا چکا ہوں کہ انھوں نے ان شعرا کا انتخاب کیا جو کُل ہند نقشے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ان کے کلام کی تدوین ہی نہ ہونی چاہیے۔ ان کی سوانح اور تدوین کلام پر ضرور کام ہونا چاہیے تھا لیکن یہ کام پی ایچ ڈی کے نئے ریسرچ اسکالروں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے تھا، وہ قاضی صاحب کے مرتبے کے محقق کے مستحق نہ تھے۔ میں نے اپنی کتاب قاضی عبدالودود بحیثیت مرتبِ متن میں دکھایا ہے کہ دوسرے بڑے محققین نے کیسے ہندوستان گیر موضوعات کی تدوین کی اور قاضی صاحب نے کیسے غیر اہم ناموں کا انتخاب کیا۔ ہر علاقے میں مقامی اہمیت کے استاد ہوتے ہیں مثلاً بھوپال میں معراج میر خاں کمر اور کشمیر میں غلام رسول ناز کی۔ علاقائی جائزے کو جامع بنانے کے لیے ان سب پر کتاب لکھی جانی چاہیے لیکن قاضی صاحب کو تدوین کے لیے مصحفی یا سودا کا انتخاب کرنا چاہیے تھا جن پر وہ لکھتے رہتے تھے۔

انھوں نے خالص تحقیقی کام کے لیے بڑے ادیبوں میں غالب کا انتخاب کیا لیکن اس پر ان کی نگاہ کج پڑی: غالب کی راست گفتاری، غالب کا ایک فرضی استاد، عبدالصمد، غالب بحیثیت محقق، غالب کی قاطع برہان پر اس کی اشاعت کے زمانے میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ اس کے مخالفین نے اس کے بیانات کو اچھی طرح کوٹ پیٹ کر ٹھوک بجا کر دیکھ لیا تھا۔ ہر بال کی کھال نکال لی گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا قاضی صاحب نے اس گڑے مردے کو کیوں اکھاڑا اور اس کے بوسیدہ پنجر کی جراحی تشریح پر کیوں کئی سال لگائے۔ اردو والوں کے لیے تو یہ موضوع کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ درس گاہوں کے فارسی

شعبوں میں اس تجزیے کا کتنی گہرائی سے مطالعہ کیا جاتا ہے، مجھے معلوم نہیں۔ لیکن جب وہ شاعر غالب کے لیے کہتے ہیں کہ ان کے یہاں ایسے سقم پائے جاتے ہیں جن سے ایک محقق زبان شاعر کا کلام خالی ہونا چاہیے (نقدِ غالب ص ۵۲۹) یا میر کے تصور عشق کو عیب ٹھہراتے ہیں (مجموعہ میر ص ۳۶۸ م) یا مولانا آزاد کی غبارخاطر کے لیے لکھتے ہیں غبار خاطر ابھی حال میں دیکھی اور باتوں سے قطع نظر مصنف صحیح اردو بھی نہیں لکھ سکتا۔ (مکتوب مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۴۸ء بنام مختار الدین احمد) تو ان کا نقد ونظر ان کی پرخاش سے مکدر ہو گیا معلوم ہوتا ہے۔

انھوں نے متعدد غیر اہم بیاضوں، دواوین اور اخباروں کا مطالعہ اس شرح و بسط سے کیا۔ یادداشتوں کے گڈے کے گڈے تیار کر دیے جیسے زعمائے ادب کے تیار کیے جائیں۔ پہلے اہم شعرا کا حق ادا کر دیجیے بعد میں کم رتبہ ادیبوں کو دیکھیے۔ تعین زمانہ میں بھی وہ بعض ایسے غیر اہم لوگوں کی تاریخیں دے دیتے ہیں جن کی مورخ ادب کو کبھی ضرورت نہیں پڑتی مثلاً تعین کے سلسلے میں ان اصحاب کا سنہ وفات دیا ہے: مرزا محمد صالح آشفتہ، غلام یحییٰ انصاف، میر غلام علی اظہر، محمد علی خاں انجم، محمد فاضل آزاد احمد آبادی، اعز خاں ترک جنگ دیدہ، واصل خاں کشمیری (معاصر حصہ ۱۸ بابت جولائی ۱۹۶۲ء)۔

خدا معلوم یہ کون لوگ ہیں؟ تاریخِ ادب میں ان کا کیا مقام ہے۔ ان کی تاریخِ وفات کی کس تحریر میں ضرورت پڑے گی۔ قاضی صاحب کی ایسی تحریروں کو دیکھ کر جوش ملیح آبادی کا وہ جملہ یاد آجاتا ہے جو انھوں نے کسی کی آٹوگراف ڈائری کو دیکھ کر لکھ دیا تھا کہ یہ وہ اصطبل ہے جس میں گدھے گھوڑے ایک ساتھ باندھ دیئے جاتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انھیں ایسے کام کرنے چاہئیں جو ان کا میدانِ اختصاص ہے مثلاً مصحفی، انشا یا سودا کی کلیات کی تدوین۔ اسپرنگر کے انداز پر تذکروں کو سمو کر ایک تذکرہ بزرگ مرتب کرنا یا کم از کم شعرا کی ولادت و وفات کا تذکرۂ ماہ وسال بنانا، اردو ادب کی تاریخ میں مذکور والیانِ ملک، امراء اور اعلیٰ عہدہ داروں کی قاموس بنانا۔ کتنے مفید ہوتے یہ حوالے کے کام محققوں کے لیے لیکن قاضی صاحب کے لیے منتظم، مثبت کام کرنا ممکن نہ تھا۔

(۳) اس کے ساتھ ان کی دوسری کمزوری کا ذکر آجاتا ہے۔ خطباتِ گارساں وتاسی کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔ ''بیسویں صدی میں تو تصویر کا صرف ایک رخ دکھانا ادبی شعریعت میں گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے اور ہمارے لیے اس مشورے پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہے'' یہ اصول دہرانے کے باوجود وہ مکمل تصویر پیش کرنے کے قائل نہ تھے۔ صرف ایک رخ پیش کرتے تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ان کے بین الاقوامی غالب سیمنار کے افتتاحی خطبے کو سن کر اپنا تاثر یوں بیان کرتے ہیں۔

''کیا یہ اس قسم کے افتتاحیہ خطبے کا موقع و محل تھا۔ کیا غالب صدی کے موقع پر اردو کے اس عظیم شاعر کو یاد کرنے کا یہی انداز تھا کہ اس کے جشن کا افتتاحیہ خطبہ غالب کے تنقیص نامہ کے طور پر پیش کیا جائے۔ درحقیقت قاضی صاحب کسی کی تحسین شناسی کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے۔'' (قاضی عبدالودود سیمنار کے مقالے ص۶)

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب جب کسی کی نفی کرنے پر آجائیں تو ان کا قلم خوب چلتا ہے اور مطالعے کے آفاق بھی وسیع تر ہو جاتے ہیں لیکن مثبت تحریروں میں وہ چند جملوں سے آگے نہیں جا سکتے۔'' (غالب نامہ جنوری ۱۹۸۷ء ص۱۱۹)

ان کے مقرب ڈاکٹر سیّد محمد حسنین کا قول ہے:

ان کے اس مرتفع وجود سے ہر کہ ومہ کا خفیف یا حقیر نظر آنا تعجب انگیز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی صاحب کی نظر و فکر کسی کی استقامت یا وجاہت نہ دیکھ سکی۔ واحسرتا! تحریر ہو یا تکلم، وہ آج تک کسی فرد کی تعریف و تحسین کے دو جملے بھی نہ دے سکے (معاصر اگست ۷۶ء ص۲۲۲)

ان کے مداح ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''رہے قاضی صاحب قبلہ، ان کے قلم کے لیے اشتعال واجب تھا۔ جب تک خواجہ احمد فاروقی یا اختر اورینوی (یا ابوالکلام آزاد) یا شاد عظیم آبادی سے خفگی جوش میں نہ آئے اس وقت تک ان کا قلم جو گویا تنبیہ الغافلین کا درجہ رکھتا تھا جنبش میں نہیں آتا تھا

مگر یہ تو گویا تصنیفی نہیں انتقامی کارروائی ہوئی (مکتوب مورخہ ۴ اپریل ۲۰۰۰ء)

وہ اس میدان میں کتنے دور رس ہیں اور ان کی اس نوع کی تحریریں بحرالکاہل سے کتنی زیادہ وسیع و عمیق ہیں اس کی چند مثالیں۔ مقالاتِ قاضی عبدالودود میں تین اصحاب کے مقالوں کا جائزہ لیا ہے اختر اور ینوی، حسنین اور ممتاز احمد، ان کے تبصروں میں کل ملا کر ۲۵۱ صفحے ہیں۔ پہلے صفحے کی ابتدا ڈاکٹر اختر کی اس تعریف سے کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اختر اورینوی اردو کے مشہور افسانہ نگاروں میں ہیں اور غالباً اس سے عام طور پر اتفاق کیا جائے گا کہ بہار کے اردو بولنے والوں میں ان سے بہتر افسانہ نویس پیدا نہیں ہوا۔ وہ افسانوں کے ساتھ تنقیدی مضامین لکھتے رہے ہیں۔ (متن ص ۱) آخری جائزہ ممتاز احمد کی تدوین مثنویات راسخ کا ہے جس کے متن کا خاتمہ یوں ہوا ہے۔

افسوس ہے کہ مثنویوں کا متن اطمینان بخش طور پر پیش نہیں ہوا۔ اختلافاتِ نسخ کی بحث جو مقدمے میں ہے وہ البتہ اچھی ہے (ص ۵۱-۲۵۰) بلاغت میں ایک صنعتِ معنوی ہے تاکید الذم، بمشابہ المدح، اوپر ڈاکٹر اختر اور ڈاکٹر ممتاز احمد کی تحسین میں جو جملے کہے گئے ہیں وہ اسی صنعت کی مثال ہیں۔ میں ممنون ہوں گا اگر کوئی صاحب ان ۲۵۱ صفحوں میں تینوں مصنّفین کی مدح میں اور کوئی جملہ تلاش کر دیں۔ نقدِ غالب میں کتابی مضمون ''غالب بحیثیت محقق'' ص ۳۴۵ سے ۵۷۲ تک کو محیط ہے یعنی کل ۲۲۸ صفحے۔ ان میں غالب کی تعریف میں ایک جملہ بھی نہیں۔ معاصر قاضی عبدالودود نمبر اگست ۱۹۷۶ء پر خود قاضی صاحب نے تبصرہ کیا ہے جو پہلے معاصر کے ایک نمبر میں آیا نیز اس کا تتمہ سفینہ میں۔ اب یہ تبصرہ تحقیقاتِ ودود میں ۳۷ صفحوں میں آیا ہے۔ اس میں کسی مضمون نگار کے بارے میں ایک جملہ ستائش، داد یا شکریے کا نہیں۔ کچھ نہ کچھ اختلاف ہی کیا ہے۔ بہت سے مضمون نگاروں سے اختلاف کے باوجود شکوہ نہیں لیکن محض جبین پر سب وشتم ہے۔

مندرجہ بالا تینوں تحریروں میں ۲۵۱+ ۲۲۸+ ۳۷ یعنی ۵۱۶ صفحے ہیں۔ ان میں کسی مقالہ نگار کی داد میں ایک جملہ نہ کہنے کا کمال قاضی عبدالودود ہی سے ممکن ہے۔ (میر، غالب، شاد، ابوالکلام آزاد، عبدالحق، خواجہ احمد فاروقی اور مالک رام پر جو کل ملا کر ایک

ہزار سے زیادہ صفحے لکھے ہوں گے ان میں ان عظماء کے بارے میں کوئی کلمہ خیر میری نحیف بصارت کی گرفت میں تو نہیں آیا)۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں۔

معاصروں کا کھُل کے اعتراف ان کی تعریف و توصیف (ہر اچھے کام کی تحسین اور اعتراف) قاضی صاحب اب بھی کرتے ہیں مگر لکھت میں ایسی چیزیں کم لاتے ہیں۔ نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ پہلو تو سب کے سامنے ہے ہی۔ بس وہ پہلو جو عام طور سے نظر نہیں آ سکتا اس پر روشنی ڈالنا زیادہ ضروری ہے۔ (معیار کی پیش گفتار صفحہ سات و آٹھ)

کلیم الدین احمد:

ان کا خیال ہے کہ جب لوگ تحقیق کا کام کرتے ہیں تو انھیں محنت کرنی ہے۔ یہ محنت ان کا فرض ہے اور جہاں اس فرض میں وہ کوتاہی کرتے ہیں ان کا ذکر ضروری ہے۔ (مقالاتِ قاضی عبدالودود جلد ایک۔ مقدمہ ص ۵۹)

کلیم الدین احمد اس کا یہ جواز دیتے ہیں۔ وہ Humbug (لغو، واہیات) کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں اور Humbug کو کسی صورت میں دیکھتے ہیں تو برہم ہو جاتے ہیں (معاصر ۷۶ء ص ۴۲۴)۔

کیا پیچھے میں نے جن اہل قلم کا نام لیا ہے وہ سب لغو نویس ہیں۔ کیا تصویر کے دونوں رخ پیش کرنا یہی ہے۔ کوئی قاضی صاحب کی خامیوں پر اشارہ کرتا ہے تو وہ اور ان کے بعض معتقدین کیوں جامے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ مشفق خواجہ نے لکھا ہے۔

''انھیں دوسروں کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں نظر آجاتی تھیں لیکن اپنی بڑی غلطیاں بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ علمی کاموں میں بھی ذاتی رنجشوں کا انتقام لیتے تھے اور اگر کسی سے گہرے تعلقات ہوتے تو اس کی فاش غلطیوں کو بھی نظر انداز کر دیتے۔ کلیم الدین احمد مرحوم نے جو ''تحقیقی'' کام کیا ہے وہ جس معمولی درجے کا ہے اس سے قاضی صاحب اچھی طرح واقف تھے لیکن انھوں نے کلیم صاحب کو نہیں ٹوکا۔ (میرے نام مکتوب مورخہ یکم جولائی ۱۹۸۷ء) مس میو (Mayo) کی انگریزی کتاب مدر انڈیا ہندوستان کی کمزوریوں

پر مشتمل تھی لیکن اس میں جو کچھ لکھا تھا وہ تھا صحیح۔ اس پر مہاتما گاندھی نے اسے گندی نالی کے انسپکٹر (drain inspector) کی رپورٹ قرار دیا تھا۔ کیا ضرور ہے کہ قاضی صاحب اور ان کی ہجویہ تحقیق کے مقلد تحقیق کی مس میو کا رول ادا کریں۔ اغلاط کے ساتھ ہی محاسن کو بھی پیش کر کے متوازن تصویر کیوں نہ پیش کریں۔

(۴) میں نے رسالہ شاعر (گوشہ گیان چند شمارہ ۵، ۶ ۱۹۸۱ء) میں ایک مضمون اخلاقیاتِ تحقیق لکھا تھا۔ اس وقت تک مجھے اپنے مضامین پر قاضی صاحب کے تبصرے کا علم نہ تھا۔ میرا وہ مضمون میرے مجموعے ''کھوج'' میں شامل ہے۔ میں نے اس میں دو شقیں یہ رکھی تھیں۔

۱۔ اغلاط کی نشان دہی کسی عناد کے تحت نہیں بلکہ محض صحت کی اشاعت کی خاطر ہونی چاہیے۔

۲۔ اعتراض کے لہجے میں نرمی برتیے۔ طنز و تمسخر سے پرہیز کیجیے۔ ذاتیات پر حملہ نہ کیجیے۔ غلطی کی گرفت کرتے وقت بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کی دلداری ملحوظ رکھیے۔ (مجموعہ کھوج ص ۱۳،۱۲)

''تحقیق کا فن'' میں مَیں نے ہندی کے ایک محقق کا قول نقل کیا تھا ''تحقیق کی زبان سائنسی اور غیر جذباتی ہوتی ہے'' (لکھنؤ ایڈیشن ص ۲۳) مزید لکھا تھا محقق کو غیر جذباتی انداز میں لکھنا پڑھنا چاہیے۔ اگر وہ دوسرے کی غلطی کی گرفت کرے تو احساسِ برتری سے سرشار ہو کر کسی کا استہزا نہ کرے (ص ۴۲-۴۱)۔ (قاضی صاحب کے ساتھ دقت یہ ہے کہ وہ اعتراض کرنے میں جذباتی ہو جاتے ہیں مولوی عبدالحق، مالک رام اور خواجہ احمد فاروقی کی غلطیوں کو پکڑتے وقت ایسا لہجہ اختیار کرتے ہیں جس میں عناد و پرخاش چھپائے نہیں چھپتے۔ بعض اوقات نہ صرف جھلا کر بلکہ کاٹ کھانے والے انداز میں لکھتے ہیں)۔

مولوی عبدالحق ان سے ۱۶ سال بڑے تھے۔ اکثریت کی رائے میں قاضی صاحب سے کہیں بڑے محسن اردو۔ ان پر لکھتے وقت آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیے تھے۔ مالک رام نے

تو ایک جگہ قاضی صاحب کے غیر علمی لہجے پر افسوس کیا ہے۔ ان کے دو طرف داروں کے اقوال ملاحظہ ہوں۔ مختار الدین احمد:

وہ اختلافِ رائے کو پسند کرتے ہیں بلکہ علمی معاملات میں ایسی بحث و تمحیص کو وہ ضروری مانتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مصنفین یا دوسرے ذمہ دار حضرات ان کے تبصروں سے اختلاف کریں اور ان کی غلطیوں سے انھیں مطلع کریں (معاصر ۷۶ء ص ۱۴۹)

سیّد حسن عسکری لکھتے ہیں۔

اپنی باتوں پر دوسروں کی حرف گیری کو ٹھنڈے دل سے سننا اور غور کرنا چاہتے ہیں۔ شوکت سبزواری نے جب قاضی صاحب کی کچھ فرو گذاشتوں پر انھیں ٹوکا بلکہ کچھ ناروا انداز اور غیر مناسب الفاظ کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا تو جہاں تک مجھے علم ہے، قاضی صاحب کی طرف سے کوئی گرفت یا گرفتہ خاطری عمل میں نہیں آئی (معاصر اگست ۷۶ء ص ۱۹۹) حیرت ہوتی ہے کہ ان کے اتنے قریب رہنے والے حاضر باش حضرات ان کے مزاج سے اتنے ناواقف ہوں گے۔ مالک رام نے عبدالصمد کے بارے میں ان سے اختلاف کیا۔ اپنے لیے نامحتاط مصنف کی شعوری غلط بیانی کا الزام سنا۔ شوکت سبزواری کے مضمون کو لے کر مدیرِ اردو ادب کو تحریری معذرت پر مجبور کیا۔ شوکت اگر ہندوستان میں ہوتے تو وہ ان پر مقدمہ چلانا چاہتے تھے۔ میں نے اپنے معاصر کے مضمون میں ستائش و احترام کے ساتھ ساتھ ان کی خامیوں کی نشان دہی کی تو ان سے مادر پدر کے سے الفاظ سنے۔ مختار صاحب اور حسن عسکری قاضی صاحب کا معاصر ۷۶ء پر تبصرہ دیکھنے کے بعد مضمون لکھتے تو شاید مندرجہ بالا مشاہدہ نہ کرتے۔ اب میں ان کے لہجے کو چھوڑ کر ان کی اہم تر فرو گزاشتوں کا بیان کرتا ہوں۔

(۵) ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے قاضی صاحب کے مجموعوں کے قبل جو حرفے چند لکھا ہے اس کا پہلا حصہ سب میں مشترک ہے۔ اس کے آخر میں قاضی صاحب کے لیے لکھتے ہیں۔ ''سچ دیکھنے اور سچ کہنے کی ایک بار قسم کھائی تو موت تک اس کو نبھا دیا!! سچ، صرف سچ اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں!۔'' عدالتوں میں حلف انگریزی میں لیا جاتا ہے تو اس سچ کا

نام لیا جاتا ہے (سچ، پورا سچ اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں)۔

Truth, the whole truth and nothing but truth.

بیدار نے دوسرے حصے کو ''صرف سچ'' لکھا ہے۔ یہاں پورا سچ ہونا چاہیے۔ قاضی صاحب کے بارے میں پہلے میرا بھی کچھ ایسا ہی تصور تھا لیکن ان کے مطالعے کے دوران میں مَیں نے انھیں پایا کہ وہ کسی پر اعتراض کرتے ہوئے بسا اوقات آدھا سچ بولتے ہیں اور آدھے کو چھپا لیتے ہیں تاکہ اعتراض زیادہ وزنی معلوم ہو۔ چند مثالیں:

۱۔ قاضی صاحب نے غالب اور غلام امام شہید کے معاملات کو لے کر ایک اجتماع ضدین والی بات کہی ہے۔ کلکتہ جاتے ہوئے غالب جب الہ آباد سے گزرے تو وہاں کے مختصر پڑاؤ میں انھیں کسی ہنگامے سے سابقہ ہوا۔ مالک رام نے ذکرِ غالب میں غالب کا اس موقع پر کہا ہوا فارسی شعر لکھا ہے جس کا دوسرا مصرع ہے
ع نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہ آباد۔ مالک رام نے ذکر غالب میں صرف اتنا لکھا تھا ''مجھے شبہ ہے کہ اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح سے غلام امام شہید سے تھا۔ اس کے آگے انھوں نے کچھ نہ بتایا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ غلام امام شہید کی حیدر آباد میں جو قدر ہوئی وہ غالب کو بہت ناگوار ہوئی۔ انھوں نے اسے لے کر اپنے حیدر آبادی شاگرد ذکا کو شہیدؔ کے بارے میں سخت سست کہا۔ ذکا نے یہ باتیں غالب اور شہید کے مشترک دوست غلام عزت بے خبر کو بتا دیں۔ بے خبر نے غالب سے شکایت کی تو غالب مکر گئے۔''

بے خبر کے نام کے خط میں کہا کہ میرا اور شہید کا تعارف بر بنائے محبت ہے۔ وہ جب تک دِلّی سے دکن گئے اگر میرا کبھی شہید سے بگاڑ ہوتا تو آپ صلح نہ کرا دیتے۔ ذکا سے میں کبھی ملا نہیں۔ ان کی غزلیں دیکھ کر بھیج دیتا ہوں۔ قاضی صاحب نے ۱۵ فروری ۱۹۴۸ء کو اپنا مضمون غالب کی راست گفتاری مکمل کیا تو اس میں یہ خط غالب کی دروغ گوئی کے طور پر نقل کیا۔ جب جنوری ۱۹۵۲ء میں مالک رام کے ذکرِ غالب پر تبصرہ کیا تو اسی خط کو سب سے بڑی دلیل بنا کر پیش

کیا کہ غالب اور شہید میں کبھی نزاع نہیں ہوئی۔ انھوں نے ذکا کے نام کے غالب کے ان دو خطوں کو چھپا لیا جن میں شہید شاگردِ قتیل کے بارے میں توہین آمیز الفاظ لکھے تھے۔ ایک ہی خط کو ۴۸ء میں دروغ ٹھہرا کر غالب کو دروغ گو ثابت کرتے ہیں اور اسی خط کو سچا بتا کر مالک رام پر اعتراض کرتے ہیں۔

۲۔ غالب بہ حیثیت محقق کے نقشِ ثانی کی نویں فصل توافق لسانین کی ہے۔ غالب نے قاطع برہان کے آخر میں فارسی اور سنسکرت کے مماثل الفاظ کو دے کر دونوں زبانوں کو متحد الاصل قرار دیا۔ قاضی صاحب نے نقدِ غالب میں صرف چار جوڑے دے کر لکھا کہ ان میں ایک ایک لفظ وہ معنی نہیں دیتا جو غالب نے لکھا ہے اور اس طرح طنز و استہزا کر کے نظریے کو رد کر دیا۔ غالب نے دونوں زبانوں کے ۲۳ مشترک الفاظ اور مشترک قواعد گنوائے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ دونوں زبانوں میں اصوات کے تبادلے تک کا ذکر کیا۔ کہتے ہیں۔

باید دانست کہ تبدل فامی سعفص وبائے فارسی و تا و دال باہم دگر تبدل سین سادہ و شین قرشت بایک دگر نیز انبازیست میانہ این ہر دو زبان در آیینِ گفتار (پٹنہ ۱۹۶۷ء ص ۱۷۰)

غالب نے مثالیں نہیں دیں لیکن فارسی ہفت اور سنسکرت سپت، فارسی پدر اور سنسکرت پتر، فارسی سرد اور سنسکرت شرد یا شرت اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ قاضی صاحب نے صرف چار جوڑے جن میں مماثلت اتنی واضح نہیں دیے اور بقیہ متعدد جوڑوں اور اصول کی طرف سے آنکھ موند لی۔ یہ سب شعوری طور پر کیا۔

۳۔ مولوی عبدالحق نے ذکر میر پر ۱۹۲۹ء میں مفصل مقالہ اور ۱۹۳۸ء میں اس پر مقدمہ لکھا۔ قاضی صاحب کہتے ہیں۔

مقالے اور مقدمے دونوں میں ہے کہ گل زارِ ابراہیم و گلشنِ ہند میں لکھنؤ جانے کا زمانہ ۱۱۹۷ھ مرقوم ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ گلزارِ ابراہیم میں لکھنؤ جانے کا مطلقاً ذکر نہیں۔ اس کے مصنف کا بیان ہے کہ فی الحال (۱۱۹۶ء میں) وہ مقیمِ دہلی ہیں۔

اس کتاب کے مندرجات کے متعلق یہ دوسری غلطی ہے جو ڈاکٹر عبدالحق سے سرزد ہوئی ہے (عبدالحق بحیثیت محقق ص۱۲-۱۱) قاضی صاحب نے صرف آدھا سچ کہا۔ عبدالحق کو پوری طرح نکو ثابت کرنے کے لیے یہ اہم نکتہ چھپا لیا کہ گلشنِ ہند میں لکھنؤ جانے کا سنہ ۱۱۹۷ء درج ہے۔

۴۔ اختر اورینوی کے مقالے پر تبصرے میں معترض ہیں کہ مصنفِ گلشن ہند کا نام مرزا لطف علی لکھا ہے۔ مرزا علی نام اور لطف تخلص تھا (مقالاتِ قاضی عبدالودود متن ص۶۵)۔ صورتِ حال یہ ہے کہ ص ۲۵۸ فٹ نوٹ میں مرزا لطف علی لکھا ہے لیکن متن میں مرزا علی لطف ہے۔ ص ۱۹۳ پر بھی مرزا علی لطف ہے (دِلّی ایڈیشن)۔ ص ۲۵۸ کے فٹ نوٹ میں سہوِ کتابت ہے۔ قاضی صاحب نے فٹ نوٹ کا لفظ جوڑے بغیر اعتراض کر دیا۔ متن میں صحیح اندراج کا کوئی ذکر نہ کیا۔

۵۔ ڈاکٹر حسنین پر اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے رباعی ع- تھا دل کو قرار بے قراری کے سبب، کو الم پسرِ درد کے نام سے منسوب کیا ہے جب کہ گلزارِ ابراہیمی میں درد و الم دونوں کے نام سے ہے (مقالات ص ۱۸۵)۔ قاضی صاحب نے اس کی حقیقت، دِلّی کا دبستانِ شاعری، کے سلسلے میں واضح کی ہے کہ میر حسن اور صاحبِ تذکرۂ مسرت افزا کے نزدیک الم کی ہے۔ آخر الذکر نے لکھا ہے کہ خود الم نے انھیں اپنے نام سے سنائی۔ پھر لکھتے ہیں ''یہ بات نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھی کہ بیشتر تذکرہ نگاران کے ہم نوا ہیں۔ (اردو کی ادبی تحقیق کے بارے میں ص۹۴) افسوس قاضی صاحب، ڈاکٹر حسنین پر ایک اعتراض جڑنے کی خاطر بیشتر تذکرہ نگاروں کی رائے کو پی گئے اور خود ان کا رجحان الم سے منسوب کرنے کا ہے۔

۶۔ حسنین پر مزید الزام لگانے کے لیے لکھتے ہیں۔

''عہدِ شاہ عالم کے مشہور مصنف منیر الدین احمد ص ۱۶۷۔ یہ نام صحیح نہیں'' (مقالات ص ۱۹۰)۔ ذکر ہے مصنفِ تذکرہ مسرت افزاء کے بڑے بھائی کا۔

مرتب تذکرہ نے نام ''خیر الدین احمد'' لکھا ہے۔ مقالاتِ اردو میں منیر الدین احمد چھپا ہے۔ لیکن غور سے دیکھیے تو منیر کا پہلا حرف ''خیر'' دکھائی دیتا ہے۔ حسنین کے مقالے میں بھی کتابت کی خامی سے ''خیر'' کی 'خ' دھندلا کر بے معنی ''فیر'' رہ گئی۔ قاضی صاحب نے یہ تو کہا کہ نام صحیح نہیں لیکن صحیح نام ''خیر الدین احمد'' نہیں لکھا۔ لکھ دینے سے اعتراض صرف ایک تہائی رہ جاتا۔ قاضی صاحب تو مقدمہ نگار کو جاہلِ مطلق ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے پوری حقیقت بیان نہ کی۔

۷۔ دیوانِ عزت مرتبہ عبدالرزاق قریشی کے مقدمے کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

''گلشنِ ہند میں شعر ذیل الہام شاگرد عزلت کے نام سے ہے۔ اے عندلیب ...... گل و گلزار جھڑ گئے۔ ص ۷۵ گلشنِ ہند میں اس شاعر کا نام تک نہیں آیا۔ شعر زیر بحث آوارہ کا ہے (تذکرہ گردیزی) [تبصرے ص ۵۵] میں باب ۳۰ میں اس پر تفصیل سے لکھ چکا ہوں ڈاکٹر زور نے ۱۹۳۴ء میں گلزارِ ابراہیم اور گلشنِ ہند کو ملا کر چھاپا۔ مذکورہ ایڈیشن میں شعر محولہ بالا گل زارِ ابراہیم میں الہام کے نام سے ہے۔ قاضی صاحب نے یہ تو لکھا کہ گلشن ہند میں اس شاعر کا نام تک نہیں، لیکن یہ بات چھپا لی کہ گلزارِ ابراہیم میں ہے۔ مرتب سہواً اسے گلشنِ ہند کا اندراج سمجھ بیٹھے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ شعر گلزار ابراہیم اور تذکرہ عشقی میں الہام کے نام سے ہے اور تذکرۂ گردیزی اور تذکرہ شورس میں آوارہ کے نام سے۔ دونوں کے امکانات پچاس پچاس فی صد ہیں۔ قاضی صاحب بارہا ایک سرکاری وکیل (Prosecuting inspector) کی طرح اپنی مفید مطلب دلیل دیتے ہیں۔ فریقِ ثانی کو جس بات سے تقویت ملے اسے چھپانے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے حالانکہ محقق وکیل نہیں جج ہوتا ہے۔

(۶) قاضی صاحب نے اپنے مضمون ''غالب زباں پہلوان'' میں طریقِ تحقیق کی ایک میزان پیش کی۔ اس کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''دوسروں سے استفادہ ہوا ہے تو اس کا مناسب اعتراف لازم ہے۔'' (کچھ

غالب کے بارے میں ۔ حصہ دوم ص ۲۰۴)

مالک رام کی ذکرِ غالب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''محققین کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی ایسی بات لکھتے ہیں جو عام طور پر معلوم نہیں اور کسی ہم عصر کی تحقیق ہے تو اس کا حوالہ دیتے ہیں۔ کسی ہم عصر سے لیا ہے اور اس کا حوالہ نہیں دیا تو ان پر سرقے کا الزام عائد ہو سکتا ہے'' (ایضاً ص ۳۳-۵۳۲)۔

خواجہ احمد فاروقی نے اپنی کتاب 'میر تقی میر' میں جگہ جگہ قاضی صاحب سے استفادہ کیا اور بعض جگہ ان کا حوالہ نہیں دیا۔ قاضی صاحب نے اپنے تبصرے میں ایسے مقامات کی نشان دہی کی ہے اپنے لیے ''کسی اور شخص'' کا رمزیہ فقرہ استعمال کیا ہے اور شاکی ہیں کہ اعتراف نہیں کیا (میر کے لکھنؤ جانے کے) صحیح زمانے کا علم کسی اور شخص کی تحریر کے مطالعے سے ہوا اور اس کا اعتراف کیے بغیر اس کے دلائل...... لکھے ہیں (مجموعہ میر ص ۲۶۲)۔

قاضی صاحب کے اپنے اصولوں کی روشنی میں ان کی بعض تحقیقات دیکھیے۔

۱۔ رسا ہمدانی گیاوی نے جعلی خطوط کا مجموعہ ''نادر خطوطِ غالب'' کے نام سے ۱۹۳۹ء میں شائع کیا اور یہ ظاہر کیا کہ ان کے پردادا کرامت حسین ہمدانی بہاری غالب کے مشہور شاگردوں میں تھے اور غالب نے یہ خطوط انھیں بھیجے۔ قاضی صاحب کا تبصرہ کئی سال بعد معاصر جنوری ۱۹۴۳ء میں آیا۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ مالک رام کا مضمون ''نادر خطوطِ غالب'' (مرتبہ رسا ہمدانی) پر ایک نظر رسالہ جامعہ دہلی مارچ ۱۹۴۲ء میں شائع ہو چکا تھا۔ یہ مضمون بہت مفصل اور مدلل ہے۔ مالک رام نے یہ خطوط اشاعت سے پہلے دیکھے تھے۔ ان کے خلافِ واقعہ بیانات کی طرف اشارہ کیا تھا اور ناشر کو مشورہ دیا کہ انھیں شائع نہ کریں۔ ناشر نے مالک رام کے مشاہدات کی روشنی میں خطوط کے متن میں ترمیم کی اور انھیں شائع کر دیا۔ مالک رام نے اپنے مضمون میں ۲۳ خطوں کا تجزیہ کیا ہے کہ یہ کہاں کہاں سے لیے گئے ہیں۔ مالک رام کے مضمون کے بعد قاضی صاحب کا مضمون تحصیل حاصل ہو کر رہ

گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے کہیں بھی مالک رام کے مضمون یا مالک رام کا نام کیوں نہیں لیا۔ مصر میں مالک رام کو یہ کتاب کئی سال کے بعد ملی اور انھوں نے اطمینان سے دیکھ کر مضمون لکھا۔ قاضی صاحب کتاب کی اشاعت کے بعد تین چار سال کیوں چپ بیٹھے رہے اور مالک رام کے مضمون کی اشاعت کے بعد میں لکھا۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ رسالہ جامعہ میں شائع شدہ مضمون سے واقف نہ ہوں۔ پھر کیوں اس کی سبقت کا اعتراف اور اعلان نہیں کیا۔ وہی انا کا غلط تصوّر۔

۲۔ غالب نے اپنے کئی فارسی قصیدوں کے ممدوح بدل کر کسی دوسرے کو پیش کر دیے۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب نے تین مضامین لکھے:

۱- غالب کا ایک فارسی قصیدہ — ہماری زبان ۲۲ جنوری ۱۹۶۰ء
۲- غالب کے اشعار فارسی کا ایک مجموعہ — فکر و نظر علی گڑھ اپریل ۱۹۶۰ء
۳- غالب کے ایک قصیدے کا اولین ممدوح — رسالہ صبح دہلی، پہلا حصہ ۱۹۶۲ء

ان تین مضامین میں انھوں نے تین قصیدوں کی الٹ پھیر کی اطلاع دی۔ اس کے بعد غالب انٹرنیشنل سیمینار ۱۹۶۹ء کے افتتاحی خطبے میں اس موضوع کو پونے تین صفحے دیئے۔ اس میں مندرجہ بالا تین قصیدوں سمیت کل چھ قصیدوں کے ممدوع بدلنے کی اطلاع دی (کچھ غالب کے بارے میں، حصہ اول ص ۲۸ تا ۳۱)۔ اب مالک رام کے دو مضامین ملاحظہ ہوں۔

۱- غالب کا ایک گم شدہ قصیدہ — شاعر بمبئی سالنامہ ۱۹۶۰ء
۲- غالب کے فارسی قصیدے (کچھ نیا کلام) نقوش مارچ ۱۹۶۳ء بازطباعت تحقیقی مضامین (دہلی ۱۹۸۷ء)

ان کا پہلا مضمون دوسرے طویل مضمون میں ضم کر لیا گیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے کلیاتِ فارسی کے جملہ ۵۸ قصیدوں کی فہرست دی ہے اور ان میں سے ۱۱ قصیدوں کے بارے میں تفصیل اور نمونوں کے ساتھ دکھایا کہ وہ پہلے کس کی مدح میں تھے۔ مضمون کی ابتدا ان دل گداز جملوں سے ہوتی ہے۔

''بہت دن ہوئے میں نے غالب کا فارسی دیوان مرتب کیا تھا۔ اس کے لیے میں نے گیارہ نسخے استعمال کیے تھے، نو خطی اور دو ان کی زندگی کے مطبوعہ نسخے۔ افسوس کہ ایک مرحوم مہربان کے کرم کے صدقے یہ شائع نہ ہوا۔ خیر یہ دوسرا قصہ ہے (تحقیقی مضامین ص ۱۱)

یہ مرحوم مہربان قاضی عبدالودود تھے۔ ان کے پاس مالک رام کا مخطوطہ دیوان دسیوں سال پڑا رہا۔ اس میں تمام قصیدوں میں ترمیمات کی مکمل تفصیل تھی۔ قاضی صاحب کا سیمینار کا خطبہ ۱۹۶۹ء کا ہے۔ جب مالک رام جملہ ترمیم شدہ قصیدوں کے بارے میں مارچ ۱۹۶۳ء میں لکھ چکے تھے تو قاضی صاحب نے ان میں سے کچھ کے بارے میں لکھتے ہوئے مالک رام کی تحقیق کا نام کیوں نہیں لیا۔

۳۔ قاضی صاحب نے اپنے طویل مضمون ''آزاد بحیثیت محقق'' میں آزاد کی بہت سی غلط بیانیوں کی حقیقت افشا کی ہے۔ قاضی صاحب نے پہلی قسط کے شروع میں لکھ دیا تھا۔

''یہ دعویٰ نہیں کہ کل مطالب نئے ہیں۔''

میں نے دکھایا ہے کہ قاضی صاحب کے کم از کم ۱۱ مطالب کو دوسرے ان سے پہلے لکھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر حسنین نے اپنے مقالے میں اپنے محسنین کا اظہارِ تشکر تفصیل سے نہیں کیا۔ اس پر قاضی صاحب نے اعتراض کیا۔

''قاعدہ ہے کہ ایسے اصحاب کا نام بنام ذکر کیا جائے بلکہ یہ بتایا جائے کہ کس سے کیا مدد ملی ہے۔ اس قاعدے کی خلاف ورزی کر کے ڈاکٹر محمد حسنین نے ایک اچھی مثال قائم نہیں کی۔'' (مقالاتِ قاضی عبدالودود ص ۱۶۸)

کیا قاضی صاحب کا ''آزاد بحیثیت محقق'' میں ایک عمومی بیان ''یہ دعویٰ نہیں کہ کل مطالب نئے ہیں'' اظہارِ تشکر کا مناسب اعتراف ہے؟

۴۔ مالک رام نے تلامذۂ غالب کے پہلے ایڈیشن میں خورشید احمد خورشید لکھنوی کو رؤف احمد رافت، مومن اور غالب کا شاگرد قرار دیا ہے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں

کہ انتخابِ یادگار (مولفہ ۱۲۹۰ھ) میں امیر نے رافت کی عمر ۲۵ برس بتائی ہے جس کے حساب سے یہ ۱۲۶۵ھ میں پیدا ہوئے۔ رافت کا انتقال ۱۲۴۹ھ میں ہوا۔ خورشید کیونکر ان کے شاگرد ہو سکتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ امیر مینائی نے پچیس نہیں پچپن لکھا ہوگا۔ پچیس سہوِ طباعت ہے (تحریک دہلی اپریل ۱۹۷۴ء۔ جہانِ غالب ص۲۷۶) مالک رام نے تلامذۂ غالب میں یہ ترمیم کی ہے لیکن حوالہ دیا ہے کلبِ علی خاں فائق کے مضمون شائع شدہ ماہِ نو جنوری فروری ۱۹۶۹ء کا۔ یہ مضمون رسالہ اردو جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء میں بھی شائع ہوا۔ قاضی صاحب نے دونوں رسالوں کے غالب نمبر میں یہ مضمون دیکھا ہو گا لیکن ۱۹۷۴ء میں اپنے مضمون میں فائق کی دریافت کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ میں تو کچھ نہیں کہتا قاضی صاحب نے مالک رام کو سارق کہنے کے لیے اصول بنایا تھا کہ کسی ہم عصر کی تحقیق ہے اور اس کا حوالہ نہیں دیا تو ان پر سرقے کا الزام عائد ہوسکتا ہے۔

(۷) تحقیق کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ کسی دوسرے کی تحریر کا یا اپنی کسی اور تحریر کا ذکر کیا جائے تو اس کی نشان دہی کے لیے مکمل حوالہ دیا جائے تا کہ کوئی دوسرا اسے دیکھنا چاہے تو بآسانی تلاش کر سکے۔ قاضی صاحب حوالے دینے کے معاملے میں ایسے خام کار واقع ہوئے ہیں جیسے لگتا ہے انھیں معلوم ہی نہیں کہ حوالہ کس طرح دیا جائے۔ دوسروں کی تحریر کا مکمل حوالہ تو درکنار اپنی تحریر کا بھی پورا حوالہ نہیں دے پاتے۔ یہاں صرف ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کی کتاب ''دِلّی کا دبستانِ شاعری'' کے تبصرے سے چند مثالیں۔ صفحے کا نمبر شمار ان کے مجموعے ''اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں'' کا ہے۔ شروع میں شق نمبر ہے۔

۱۹- مصحفی اور انشا شائع کردہ اردو ادب (ص ۵۷)

۳۵- میں نے اس سوال سے ڈاکٹر اختر اورینوی کی کتاب متعلق بہار ''بہار'' کے تبصرے میں بحث کی ہے۔ یہ نوائے ادب میں باقساط شائع ہو رہا ہے۔ (ص ۶۰)

۳۶- میں نے اس سوال سے مفصل بحث ''آزاد بحیثیت محقق''۔ (نوائے ادب) میں کی ہے۔ (ص ۶۰)

۹۵- (رجوع بہ عیارستان ص ۱۵۱) (ص ۷۰) اس صفحے پر یہ حوالہ نہیں ہے۔

۱۰۶- مثنوی تاباں کے استاد اور عمدۃ الملک کی مدح میں۔ مزید تقابل عبدالحق بحیثیت محقق (قسط دوم) میں ملاحظہ ہوں۔ (ص ۷۳-۷۲) کتاب میں تو قسط ۲ کا پتا چل نہ سکتا تھا، قاضی صاحب نے یہ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ''عبدالحق بحیثیت محقق'' کس رسالے کے کس شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ سلسلہ معاصر میں آیا تھا۔ قسط دوم حصہ ۱۴ میں ہے جو خوش قسمتی سے میرے پاس ہے۔ میں نے ۵۶ صفحوں کی اس قسط کو دو دفعہ کھنگالا۔ مجھے تو کہیں تاباں کی اس مثنوی کا ذکر نہ ملا۔ شمارے میں ص ۴۰ سے ص ۴۲ تک اس دور کی مثنویوں کا بیان ہے۔ ص ۴۲ پر تاباں کی ایک مثنوی ساقی نامہ تاباں کا محض نام درج ہے لیکن یہ وہ مثنوی نہیں جس کا زیرِ نظر شق ۱۰۶ میں ذکر ہے۔ (ص ۷۳-۷۲) حوالہ رہنمائی کے لیے دیا جاتا ہے، گم راہ کرنے کے لیے نہیں۔ مزید کچھ حوالے دوسری کتابوں سے۔

ا- میں نے اپنی کسی تحریر میں کسی فہرست کے حوالے سے لکھا تھا کہ مجمع الفرس ایران میں چھپ چکی ہے۔ .... فہرست نگار کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے (معاصر حصہ ۱۴، ص ۱۷۷) کسی تحریر، کسی فہرست میں غیر متعین حوالہ ہے۔ تلاش کر کے اپنی تحریر کا پتا نہیں دے سکتے۔

ب- خط کا ضروری حصہ میں نے نقوش میں شائع کر دیا تھا (معاصر-۱۳ ص ۱۰۱ حاشیہ)۔ اگر وہ بتا دیتے کہ نقوش کے کس شمارے میں شامل ہے تو تلاش کر کے دیکھ سکنا ممکن ہوتا۔

اب تین ایسے حوالے جو بے حوالگی کی معراج ہیں:

ج- ایک فرید آبادی مقالہ نگار نے مرقع عالم ہر دوئی میں لکھنؤ کے مشاعرے اور مردہ بلی کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ بے شبہ اختراعی ہے (بین الاقوامی غالب سیمینار کا خطبہ۔ کچھ غالب کے بارے میں حصہ اول ص ۶)۔ کون مقالہ نگار، رسالے کا کونسا

شمارہ ؟

د۔ ’’اور شخص کوئی جس کی طرف خط اسی تفتہ میں اشارہ ہے، کون ہیں‘‘ (ایضاً ص ۳۴)
تفتہ کے نام غالب کے ۱۲۳ خطوں میں ’’شخص کوئی‘‘ کو کیونکر پکڑا جائے۔

ہ۔ ’’ب (نسخۂ حمیدیہ کی اصل نسخۂ بھوپال) میں ۵ صفر ۳۷ھ کے قبل کا بھی کل کلام نہیں ہے۔ وہ غزل جس کا مقطع غالب کے خط میں ہے اور جو یقین ہے کہ تاریخ مذکور سے پیشتر کی ہے‘‘ (دیوانِ غالب کے دو نسخے۔ کچھ غالب کے بارے میں حصہ اول ص ۱۲۸) کونسا خط، کونسا مقطع؟ ان سے پہلے تو اس مضمون میں ان کا ذکر آیا نہیں۔

ایسے حوالوں سے کوئی ابدالِ روشن ضمیر یا صاحبِ جام جہاں نما ہی متعلقہ شخص یا تخلیق کو کھوج سکتا ہے۔

ان ناکافی یا تشنہ حوالوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ اپنے بے ترتیب کتب خانے میں کچھ بھی تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ پھر ان حوالوں کے درج کرنے کی کیا وجہ ہے:

ا۔ یا تو وہ سوچتے ہیں کہ وہ اتنے بڑے اور اہم محقق ہیں کہ ہر قاری کا فرض ہے کہ اس نے ان کی تمام تحریروں کو پڑھا ہو۔ ان کا صرف نام لینے سے وہ حوالہ مقصود تک پہنچ جائے گا۔

ب۔ یا حوالہ دینے سے ان کی غرض یہ نہیں کہ قاری اس حوالے تک پہنچ سکے بلکہ وہ چھدرّا اتار رہے ہیں کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ انھوں نے حوالہ نہیں دیا۔

ج۔ یا وہ جانتے ہی نہیں کہ حوالہ کس طرح دیا جاتا ہے۔

(۸) بیان میں بے ترتیبی: ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں۔

میرا خیال ہے قاضی صاحب کو مربوط اور مسلسل عبارت لکھنے پر قدرت نہیں تھی۔

قاضی عبدالودود۔ مینار کے مقالے ص ۵) رشید حسن خاں کی رائے ہے۔

وہ متفرق کام اعلیٰ پیانے پر انجام دیا کرتے تھے۔ منصوبہ بندی کے ساتھ کوئی مفصل اور مربوط کام کرنا یعنی کسی بڑے کینوس پر مربوط نقش کی تشکیل، ان کا مزاج اس سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتا تھا۔ بہت سے ٹکڑوں میں منقسم کام کو وہ خوب کیا کرتے تھے۔ (تدوین۔ تحقیق : روایت۔ دہلی ۱۹۹۹ء ص ۱۷۹)

نثار احمد فاروقی بھی یہی کہتے ہیں۔ ''قاضی صاحب نے کوئی مربوط اور مستقل کام نہیں کیا'' (غالب نامہ جنوری ۱۹۸۷ء ص ۱۱۸)

ان کے سب سے بڑے مضمون "غالب بحیثیت محقق" میں فارسی زبان کے عنوان کے تحت غالب کے مذکورہ ۱۰۰ الفاظ یا قواعد کی غلطی دکھائی ہے۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق قاطع برہان سے ہے۔ (نقد غالب ص ۳۹۴ تا ۵۲۴)۔ بے ترتیبی کی وجہ سے کسی مخصوص لفظ کو تلاش کرنا ہو تو بار بار سوا سو صفحوں کی ورق گردانی کیجیے۔ اسی طرح آزاد بحیثیت محقق میں آبِ حیات، سخندانِ فارس اور نگارستانِ فارس کو گڈ مڈ کر دیا ہے۔ بیشتر شقوں کا تعلق آبِ حیات سے ہے لیکن اس کے صفحوں کی ترتیب سے نہیں بلکہ مزاج کے اصول پر کچھ بھی کہیں لے لیا۔ دِلّی کا دبستانِ شاعری اور لکھنؤ کا دبستانِ شاعری کے تبصروں میں بھی کتاب کے صفحوں کے ساتھ نہیں چلے۔ اس سب کا اطلاق نہ صرف ہیئت پر ہے بلکہ موضوع پر بھی ہوتا ہے۔ اعادے کی ضرورت نہیں۔

(۹) گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم گہے بر پشتِ پائے خود نبینم

قاضی صاحب جیسے علم و فضل کے عالم بعض اوقات ایسی سامنے کی بات نہیں سمجھ پاتے کہ حیرت ہوتی ہے۔ چند مثالیں :

۱۔ اپنے مضمون ''گارساں دتاسی کا مرتبہ دیوانِ ولی'' میں لکھتے ہیں۔

دتاسی نے خود ولی محمد نام لکھا ہے۔ اس کا لقب سعد الدین تھا۔ بحوالہ شعر ۴ ص ۶۱

بیاں زلفِ بدلیں کا ہے سعد الدین کا مطلب
اجھوں لگ تم نہیں سمجھے مطوّل کے معانی کو

مطوّل سعد الدین تفتازانی کی مشہور عربی کتاب ہے۔ سعد الدین ہرگز ولی کا لقب نہیں (گارساں دتاسی ص ۱۴۷)

پہلے مصرع میں 'سعد الدین' سے مطلب مصنف شعر ولی نہیں، مصنف مطول سعد الدین تفتازانی ہے۔ شعر کا مطلب ہے تم ابھی تک کتابِ مطول کے معانی نہیں سمجھے، اس کے مصنف سعد الدین کا مطلب زلف بدلیں (یعنی محبوبہ کی انوکھی لمبی زلفوں کا) بیان کرنا ہے۔

۲۔ تذکرۂ ابنِ طوفان میں ہے۔

میر علی اوسط رشک تخلص از شاگردان معتمد حضرت شیخ عبداللہ ناسخ و از پسران میر حسن دہلوی صاحب مثنوی (متن ص ۸)

قاضی صاحب نے اس پر حاشیہ ۹۳ لکھا ہے:

رشک میر حسن کے بیٹے نہ تھے ترجمے کی عبارت میں غالباً کاتب کی غلطی ہے۔ (ص ۴۳)

جملے میں تعقید ہے لیکن اس کا مطلب ہے کہ رشک ناسخ کے شاگردوں میں تھے نیز میر حسن کے بیٹوں (میں سے کسی) کے شاگرد تھے۔ تذکرۂ خوش معرکہ زیبا کے مطابق رشک پہلے میر خلیق کے شاگرد تھے۔

۳۔ مصحفی کے ایک قصیدے میں ہاتھی کی بلندی کی تعریف میں شعر ہے۔

چلنے میں فیل مہرۂ شطرنج کی طرح
ہیں تین گھر زمانے کے اور اس کا اک قدم

قاضی صاحب کا حاشیہ: مفہوم واضح نہیں (مصحفی اور ان کے اہم معاصرین ص ۲۶)

مفہوم واضح ہے۔ شطرنج میں ایک مہرے کو فیلہ، پیلہ یا رخ کہتے ہیں۔ عام مفہوم میں اسے ہاتھی کے بجائے اونٹ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ڈھائی چال ہوتی ہیں یعنی تین خانوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ نواب کے فیل کی تیزی میں مبالغہ کرتے ہیں کہ یہ

فیل شطرنج کی طرح ایک چال میں تین گھروں یعنی ماضی، حال اور مستقبل کو طے کر ڈالتا ہے۔

۴۔ غالب کی سبد چیں ایک قطعہ تاریخ کا شعر ہے:

ششت پا چوں راحت و آرام جست
ہر دو را در گوشۂ حمام یافت

قاضی صاحب کہتے ہیں: ''یہ پہلے سے معلوم نہیں کہ غالب کو کون سے اعداد مطلوب ہیں۔ پہلے مصرع سے ۲۱۴۲ نکلتا ہے۔ اور دوسرے سے ۱۴۴۲۔ ان دونوں مصرعوں کے اعداد نہ مل کر کام دے سکتے ہیں نہ الگ الگ۔ صریحاً تعمیہ ہے۔ مگر اس وقت سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب کیا چاہتے ہیں'' (کچھ غالب کے بارے میں حصہ اول ص ۱۰۷)

قاضی صاحب نے دوسرے مصرع کے اعداد ۱۴۴۲ لکھے ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ ہمزہ کا ایک عدد لے کر ۱۵۳۲ نکلتے ہیں۔ بہرحال تاریخ واضح ہے راحت+آرام+گوشۂ حمام = ۱۳۷۸ھ ہمزہ کا صفر مانا جائے تو تاریخ ۱۲۷۷ء ہوگی۔

۵۔ در جنت رفت چوں امام الدیں خاں تاریخ وفات ہم ازاں گشت عیاں

مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ ۱۲۸۱ اس بیت کے مصرع ا، سے کس طرح متخرج ہو سکتا ہے (نادراتِ غالب پر تبصرہ۔ غالب کے بارے میں دوم، ص۹۹)

جنت + امام الدین خاں کے اعداد مل کر ۱۲۸۱ ہوتے ہیں۔

۶۔ عروض۔ قاضی صاحب کے مضمون ''غالب کا عروضی اعتراض'' سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عروض میں اچھی نظر رکھتے تھے (کچھ غالب کے بارے میں، حصہ دوم ص ۴۷۹) لیکن کم از کم دو موقعوں پر انھوں نے حیرت ناک عروض نافہمی کا مظاہرہ کیا ہے۔

۷۔ مجموعہ تحقیقاتِ وددود میں ایک مضمون ''مطالعات'' ہے جس میں وہ اپنے مطالعے

کے قابل ذکر تحقیق پارے سامنے لاتے ہیں۔ اس کی شق ۲۱ میں لکھتے ہیں۔
سنبل: عربی فارسی بر وزنِ بلبل۔ ''وزیر شاگردِ ناسخ نے سنبل کو' بای تازی موقوف کے ساتھ نہیں معلوم کس استاد کی تحقیق یا سند کے موافق باندھا یا لام گرایا ہے۔

سنبل گلشن میں کہہ رہا ہے یکتا ہے وہ زلف گو دوتا ہے

(آصفیہ)

تحقیقاتِ ودود ص ۱۹۳ میں صرف اتنا ہے لیکن فرہنگ آصفیہ میں اس شعر کے آگے 'وزیر' لکھا ہے اور اس کے نیچے یہ دو سطریں ہیں۔
''لیکن گلزار نسیم نے صاف بلبل کے وزن پر داخل کیا ہے۔

سنبل مرا تا زیانہ لانا شمشاد انھیں سولی پر چڑھانا

یہ پورا بیان لفظ سنبل کے معنی کے سلسلے میں فرہنگ جلد سوم ص ۱۰۱ پر ہے۔ میری ابتدائی تعلیمی جماعت میں مولوی صاحب نے موقوف کے یہ معنی بتائے تھے کہ ایک ساکن کے بعد دوسرا ساکن آئے تو آخر الذکر کو موقوف کہتے ہیں مثلاً خوب، میں ب موقوف ہے۔ سنبل میں ب نہ موقوف ہے نہ ساکن، نہ وزیر کے مصرع میں لام گرایا ہے۔ مندرجہ بالا دونوں شعروں میں سنبل یکساں وزن میں یکساں طور پر آیا ہے۔ بحر ہزج کے دو اوزان ہیں۔
مفعول مفاعلن فعولن / مفعولن فاعلن فعولن
دونوں کا اجتماع جائز ہے اور یہ بات عروض کا طفلِ مکتب بھی جانتا ہے۔ وزیر اور نسیم کے شعروں کے پہلے مصرعے مفعولن فاعلن فعولن کے وزن پر ہیں۔ دونوں میں سنبل کا یکساں تلفظ ہے۔ معلوم نہیں صاحبِ فرہنگ نے کیا نادانوں والی بات کہی۔ حیرت ہی نہیں عبرت ہوتی ہے کہ قاضی صاحب اس حماقت کو قابل ذکر نکتے کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔

گرتا ہے شہسوار ہی میدانِ جنگ میں

ب۔ دوسری مثال بشیر الحق کی کتاب ''اصطلاحاتِ اقبال'' کے تبصرے کے سلسلے کی ہے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اقبال ابتدا میں رجز مثمن مطوی مخبون میں بہ کثرت غلطی کیا کرتے تھے مگر بعد کو اس عمر کی کل عروضی غلطیوں کی انھوں نے تصحیح کر دی تھی۔ (معاصر حصہ ۲، مجموعہ تبصرے ص ۱۰۰)

قاضی صاحب کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ اقبال اس وزن میں غلطی کرتے تھے۔ غلطی اقبال سے نہیں قاضی صاحب سے ہوئی ہے۔ اقبال نے عروض سبقاً سبقاً پڑھا تھا۔ رجز مثمن مطوی مخبون کا وزن ہے۔

مفتعلن مفاعلن، مفتعلن مفاعلن یا مفاعلان عروض کی مستند کتابوں میں لکھا ہے کہ اس وزن میں کہیں بھی مفتعلن، مفاعلن اور مفعولن کو ادل بدل کر سکتے ہیں۔ دیکھیے زرِ کامل عیار ترجمہ معیار الاشعار ص ۶۳-۱۶۲، قدر بلگرامی کی قواعد العروض ص ۱۵۴، ۱۵۶، یاس یگانہ کی چراغ سخن ص ۹۶۔ مرزا اوج نے مقیاس الاشعار میں رکنِ مرفوع فاعلن تک سے تبادلے کی سند دی ہے۔ کیا رکن سالم مستفعلن بھی لا سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں صراحت سے کسی نے نہیں کہا لیکن اس سے مماثل بحرِ منسرح کے وزن مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن میں اجازت ہے تو رجز کے وزن میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جملہ تفصیلات میرے مجموعے 'کھوج' (۱۹۹۰ء) کے مضمون ''اقبال کے منسوخ اشعار کا وزن'' میں ص ۲۳۹ تا ۲۴۹ میں ملیں گی۔ اقبال نے شروعِ مشق میں اپنی عروضی استادی دکھانے کے لیے اردو فارسی کی کئی نظموں یا غزلوں میں ان ارکان میں تبادلے کیے۔ بعد میں انھیں احساس ہوا کہ ایسا کرنے سے شعر اہلِ اردو کے کانوں کو موزوں نہیں معلوم ہوتا تو انھوں نے اردو کی سب نظموں میں ترمیم کر دی لیکن فارسی کی دو غزلوں میں نہیں کی۔ ان مبینہ غیر موزوں مصرعوں میں ایک بھی ایسا نہیں جسے عروض کے اعتبار سے غیر موزوں کہہ سکیں۔ اقبال نے فارسی میں انھیں یوں ہی رہنے دیا۔ قاضی صاحب

اگر عروضی کتب میں رجز کے اس وزن کے غوامض کا مطالعہ کر لیتے تو اقبال کے تجربوں کو غلطی نہ کہتے۔

۷۔ قاضی صاحب کا ۱۹۵۲ء کا ایک مضمون ''اردو کا پہلا تاریخی ناول'' ان کے مجموعے اردو شعر و ادب میں شامل ہے۔ اس میں قاضی صاحب نے آغا مرزا بیگ دہلوی کے ناول نیرنگ زمانہ کو شرر کے ملک العزیز اور ورجینا پر سبقت دی ہے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے اسے تاریخی ناول اس بنا پر کہا کہ یہ تیرھویں صدی ہجری کی تصنیف ہے اور اس میں گیارھویں صدی ہجری کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ (اردو شعر و ادب ص ۲۹۰)

مصنف نے اس کے ابواب کو داستان کہا ہے۔ ڈاکٹر یوسف سرمست اپنی کتاب بیسویں صدی میں اردو ناول (حیدر آباد دسمبر ۱۹۷۳ء) میں انگریزی کی ایک کتاب کے حوالے سے کہتے ہیں کہ جوناتھن فیلڈ نے تاریخی ناول کی تعریف میں کہا ہے کہ اس میں تاریخی واقعات و شخصیات ہوں اور یہ شخصیات اور واقعات شناخت کیے جا سکیں (سرمست ص ۱۰۸)۔ نیرنگ زمانہ میں نہ کوئی کردار تاریخی ہے۔ نہ واقعہ، اس لیے یہ سرے سے تاریخی ناول ہے ہی نہیں۔ قاضی صاحب کو تاریخی ناول کا صحیح تصور نہ تھا۔

۸۔ رشک کی لغت نفس اللغہ کا نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۵۶ء برآمد ہوتا ہے۔ قاضی صاحب اسے باالالتزام ،نفس اللغتہ، لکھتے ہیں جس کے اعداد ۱۷۵۱ ہیں۔ انھوں نے ذیل کے مقامات پر نفس اللغتہ لکھا ہے۔

(۱) تذکرۂ شعرا ابن امین اللہ طوفان طبع اول ۱۹۵۴ء۔ (طبع دوم ۱۹۹۵ء ص ۴۳)

(۲) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری کا تبصرہ رسالہ ساغر مارچ ۱۹۶۵ء (اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں ص ۴۷، پہلی سطر)

(۳) خطوطِ مشاہیر بنام سیّد مسعود حسن رضوی (لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۳۰۶)

(۴) فرہنگِ آصفیہ پر تبصرہ، خدا بخش لائبریری جرنل ۱۹۷۸ء (زبان شناسی ص ۹۱)

چونکہ اتنی مختلف کتابوں میں نفس اللغتہ لکھا ہے، نفس اللغۃ ایک جگہ نہیں ، اس سے یقینی ہو جاتا ہے کہ یہ سہو کاتب نہیں، سہو قاضی صاحب ہے۔

۹۔ تاریخ جمل: قاضی صاحب نے اپنے مضامین میں کثرت سے مادوں سے تاریخیں نکالی ہیں۔ بعض اوقات مادے میں تعمیہ یا تجزیہ کا وہ پیچ ہوتا ہے کہ سنہ مقصود تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔ قاضی صاحب نے بارہا اپنی دراکی ذہن کی بدولت حل کھوج لیا ہے مثلاً

ا۔ ناسخ نے حکیم مہدی کی معزدلی کی تاریخ کہی کاشر برائے پختن شلغم گریختہ (آب حیات ص ۳۵۳) پورے مصرع سے ۴۱۹۵ نکلتا ہے۔ قاضی صاحب نے بتایا کہ مادہ تاریخ صرف لفظ ''گریختہ'' ہے جس سے ۱۲۳۵ء برآمد ہوتا ہے۔

ب۔ ناسخ کے غسلِ صحت کی تاریخ ع شود صحت ہمایون و مبارک ۱۲۳۵ھ (آبِ حیات ص ۳۹۸)

اس مصرع سے صرف ۱۱۸۹ حاصل ہوتا ہے۔ قاضی صاحب نے کلیاتِ ناسخ دیکھ کر معلوم کیا کہ مادۂ تاریخ کا پہلا لفظ ''الٰہی'' مصرع اولیٰ کے آخر میں ہے۔ اسے جوڑ کر ۱۲۳۵ھ ہو جائے گا۔ ان کی جودت ذہن کی ایسی بہت سی مثالیں ہیں جو مجموعہ تعین زمانہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات قاضی صاحب اعداد کا حساب لگانے میں غلطی کر جاتے ہیں یا صحیح اعداد کا قرینہ نہیں سمجھ پاتے۔ یہاں محض ایک طویل مثال:

ا۔ انشا کے بیٹے تعالیٰ اللہ خاں کی وفات کے کئی مادے ہیں۔ یہاں قاضی صاحب کے دو مضامین پیش نظر رہیں۔

(۱) تعالیٰ اللہ خاں خلفِ انشا رسالہ شاعر آگرہ جولائی ۱۹۵۰ء

(۲) مصحفی اور انشا (اردو ادب جنوری اپریل ۱۹۵۱ء)

یہ دونوں مضامین قاضی صاحب کے مجموعے ''مصحفی اور ان کے اہم معاصرین''

میں دیے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ ڈاکٹر عابد پیشاوری کی کتاب ''انشا اللہ خاں انشا'' بھی پیش نظر ہے۔ پہلے مضمون میں قاضی صاحب نے تعالیٰ اللہ خاں کی ولادت و وفات پر غور کیا ہے، تحقیقی نوادر کی مصنفہ ڈاکٹر آمنہ خاتون سے اختلاف کیا ہے اور کلیات انشا کے مخطوطات سے تعالیٰ اللہ کی وفات کے کئی قطعات تاریخ درج کیے ہیں۔ ان میں ان کی تاریخ وفات ۲۵ ذی حجۃ ۱۲۱۷ھ اور عمر آٹھ سال لکھی ہے۔ تاریخ کے یہ مادے کم از کم آٹھ ہیں۔ جن میں کچھ سے ۱۲۱۷ اور کچھ سے ۱۲۱۸ حاصل ہوتا ہے۔ قاضی صاحب نے شاعر کے مضمون میں ۱۲۱۷ کو مرجح قرار دیا لیکن چھ مہینے بعد جو مضمون ''مصحفی و انشا'' اردو ادب میں شائع کیا، اس میں مصحفی کی تاریخ دی۔

دریں ماتم کشیدہ مصحفی 'آہ' ہمیں گفتہ ''تعالیٰ اللہ خاں کو؟''

تعالیٰ اللہ خاں کی موت ۱۲۱۸ء میں واقع ہوئی (تعالیٰ اللہ خاں خلف انشا نوشتۂ راقم شائع کردہ شاعر آگرہ) اور یہی سنہ ''تعالیٰ اللہ خاں کو؟'' سے نکلتا ہے بشرطے کہ اللہ سے ۳۶ لیے جائیں اور آہ کا ۶ نکال دیا جائے (ص ۱۴۳)

عابد لکھتے ہیں کہ قاضی صاحب نے اپنے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے اس میں انھوں نے ۱۲۱۷ کو مرجح قرار دیا تھا۔ معلوم نہیں قاضی صاحب نے اپنی سابقہ رائے بدل دی ہے یا انھیں خیال نہیں رہا کہ اس سے پہلے وہ ۱۲۱۷ھ کو تعالیٰ اللہ خاں کی وفات کا سال کہہ چکے ہیں (انشا اللہ خاں انشا ص ۲۵۴)۔ ۱۲۱۷ اور ۱۲۱۸ء میں کون سی صحیح ہے اس کی عابد تحقیق کرتے ہیں۔ انشا کے ایک قطعے کے شعر:

پنج شنبہ اور بست و ہشتم ذی حجۃ تھا
دو گھڑی دن سے تم اپنی کر گئے منزل کو طے

یہ تمھارے کوچ کی تاریخ بابا نے کہی
''اے تعالیٰ اللہ صاحب صد ہزار افسوس ہے''

۱۲۱۸ھ

۲۸ ذی حجہ سال کا آخری سے پہلا دن ہے۔ عابد نے تقویم میں دیکھا تو ۱۲۱۷ میں ۲۸ تاریخ کو پنج شنبہ ہے جب کہ ۱۲۱۸ ھ میں یہ دوشنبہ تھا۔ انشا نے نظم ایک دو دن بعد کہی ہو گی اور سہواً نیا سال ۱۲۱۸ باندھ گئے (انشا ص ۵۵-۲۵۴)

قاضی صاحب کبھی کبھی تاریخ کے حساب میں گڑ بڑا جاتے ہیں۔ مصرع ''اے تعالیٰ اللہ صاحب صد ہزار افسوس ہے'' کے لیے لکھتے ہیں کہ اس سے ۱۲۲۸ء مستخرج ہوتا ہے حالانکہ اس سے صاف ۱۲۱۸ نکلتا ہے جب تعالیٰ کے آخری حرف کڑی مان کر ۱۰ لیے جائیں اور اللہ کی لام کو دوبار شمار کر کے اللہ کے ۶۶ لیے جائیں۔

اے تعالی اللہ صاحب صد ہزار افسوس ہے

۱۱ + ۵۱۱ + ۶۶ + ۱۰۱ + ۹۴ + ۲۱۳ + ۲۰۷ + ۱۵ = ۱۲۱۸ھ

قتیل کے مصرع آہ وصد آہ ۱۲۱۷ ز اندوہ جگر ہا بشگافت کر کہتے ہیں اگر آہ اور 'صد' کے بیچ کا 'واؤ' کاتب کا اضافہ سمجھا جائے تو باقی ماندہ حروف سے ۱۲۲۱ھ نکلتا ہے ورنہ ۱۲۲۷ (ص ۱۷۶)۔ عابد صحیح لکھتے ہیں۔

اس کے نیچے جو کچھ لکھا ہے وہی درست ہے نہ 'واؤ' کاتب کا اضافہ ہے اور نہ اس سے ۱۲۲۷ نکلتا ہے۔ قاضی صاحب کو میزان میں دس کا تسامح ہوا ہے (انشا ص ۲۵۵)۔ دیکھیے۔

آہ و صد آہ ز اندوہ جگرہا بشگافت

۶ + ۶ + ۹۴ + ۶ + ۷ + ۶۶ + ۲۲۹ + ۸۰۳ = ۱۲۱۷ء

تعالیٰ اللہ خاں کے سلسلے میں قاضی صاحب تین مصرعوں کے صحیح اعداد برآمد نہیں کر سکے۔ ایسی مثالیں اور بہت ہیں۔ اطناب کے خوف سے قطع کرتا ہوں۔ کسی کا یہ

قول کتنا صحیح ہے کہ تحقیق میں وہی غلطی نہیں کرتا جو تحقیق کرتا ہی نہ ہو۔ ایسا کوئی محقق نہیں، بعد کی تحقیق نے جس کے بعض فیصلوں اور دعووں کی تغلیط نہ کی ہو، قاضی صاحب کے بعض جذباتی عقیدت مند انھیں غلطی سے ماورا مانتے ہیں۔ انھوں نے قاضی صاحب کا گہرا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ نہیں نکالا بلکہ ان کی غیر مدلل طرف داری کے تحت۔ میں نے قاضی صاحب کے مطالعے میں پایا کہ ان کے تحقیقی نتائج میں غلطی کا فی صد امکان دوسرے ہر محقق سے کہیں کم ہے۔ اس لیے میں بغیر مطالعہ کیے قاضی صاحب کی بات کو جس اعتماد سے مان سکتا ہوں اتنا دوسروں کے قول کو نہیں لیکن میرے نزدیک قاضی صاحب کے یہاں بھی اغلاط ہیں۔

میں نے اپنی دوسری کتاب ''قاضی عبدالودود بحیثیت مرتبِ متن'' میں دکھایا ہے کہ حنیف نقوی نے آثار غالب کے قاضی صاحب کے حواشی کی کم از کم ۵۲ تصحیحات کیں جن میں سے ۲۳ کا میں نے مختصر ذکر بھی کیا ہے۔ انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی صاحب جیسے محقق کو کیا کیا غلط فہمی ہو سکتی تھی۔ زیر نظر کتاب کے نویں باب انشا کے سلسلے میں میں نے ڈاکٹر عابد پیشاوری کی بعض تحقیقات کا ذکر کیا ہے جن میں انھوں نے قاضی صاحب سے مختلف فیصلے کیے ہیں۔ ان میں سب سے اہم سعادت علی خاں کے حکم سے انشا کی معزولی کی تاریخ ہے۔ قاضی صاحب نے ۱۲۲۶ھ طے کی لیکن عابد نے ۱۲۲۹ھ۔ قاضی صاحب کے موقف کے خلاف بڑے زبردست دلائل ملتے ہیں مثلاً حویلی علی نقی خاں بہادر کا ۱۲۲۷ء والا قطعہ تاریخ۔ خود قاضی صاحب نے خدا بخش لائبریری میں ایک غیر معروف تذکرے سے یہ نقل کیا کہ جب مرزا جہانگیر ربیع الثانی ۱۲۲۷ء میں لکھنؤ آئے تو انشا نے سعادت علی خاں کے ایما پر شہزادے کے سامنے ایک غزل پڑھ کر داد لی۔ قاضی صاحب اتنے مضبوط دلائل کو بھی اپنے کمزور شبہات کی بنا پر رد کرنا چاہتے ہیں لیکن ان سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے حال میں ان کی چند اور غلطیاں یا غلط فہمیاں

دیکھیں۔ دو چار پیش کرتا ہوں۔

قاضی صاحب اپنے مضمون سبد چین میں باغِ دو در کو اس کی دوسری مطبوعہ اشاعت سمجھتے ہیں۔ مالک رام نے ۱۹۳۸ء میں سبد چین کا دوسرا ایڈیشن چھاپا تو قاضی صاحب نے طنزاً کہا۔

''ناشر اور بہ ظاہر مرتب کے نزدیک بھی ج (مالک رام کا ۱۹۳۸ء کا ایڈیشن) دوسری اشاعت ہے (کچھ غالب کے بارے میں حصہ اول۔ حاشیہ ص۱۶)۔

قاضی صاحب باغِ دو در کو سبد چین کا دوسرا ایڈیشن سمجھتے تھے حالانکہ اس وقت تک انھوں نے اس کتاب کا مخطوطہ دیکھا بھی نہ تھا۔ باغِ دو در سبد چین سے مختلف کتاب ہے۔ اول الذکر میں نثری حصہ بھی ہے جب کہ سبد چین محض شعری مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ باغِ دو در ۱۹۳۸ء تک شائع بھی نہیں ہوئی تھی۔

۲۔ امیر مینائی نے انتخاب یاد گار میں مومن کو بھی یوسف علی خاں کا استاد قرار دیا تھا جب کہ عرشی صاحب اس سے منکر تھے۔ قاضی صاحب نے دعویٰ کیا انتخاب یاد گار کا ایک ایک لفظ ان (نواب کلب علی خاں) کے ایما کے مطابق ہے (کچھ غالب کے بارے میں حصہ دوم ص۵۰۹) اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ امیر نے تذکرے میں لکھا ہے محض باقتضائے عطوفت خسروانی آغاز سے انجام تک برابر حضور نے التفات فرمایا تب یہ تذکرہ ایک سال میں تمامی پر آیا (انتخاب یادگار ص۷)

عمومی حیثیت کے یہ جملے اس انداز کے ہیں جو والیان ملک کی خوشنودی یا خوشامد میں کہہ دیے جاتے ہیں۔ ان سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ کلب علی خاں نے تذکرے کے ایک ایک لفظ کو پڑھا اور پرکھا تھا۔

۳۔ خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد کے تبصرے میں یہ جملہ کہتے ہیں۔

''مقدمے میں املا سے متعلق جو قاعدے غالب سے منسوب کیے گئے ہیں''۔ اور اس پر یہ فٹ نوٹ ہے۔

''راقم کی رائے میں املا کو مذکر استعمال کرنا چاہیے اور اس صورت میں آخر کے الف کو یاے مجہول سے بدلنا نہیں چاہیے۔'' کیوں؟ کیا ہم لڑکے سے، ڈنڈے سے نہیں کہتے۔ اور اس سے اگلے پیراگراف میں اس کے برعکس لکھتے ہیں۔

''الف اور ہائے مختفی پر ختم ہونے والے اسمائے مذکر کے الف اور ہ کو یاے مجہول سے بدلنے کا جو قاعدہ ہے اس کے بھی غالب پابند نہیں'' (ص ۴۸۶) اس کے پیش نظر یہ خیال ہوتا ہے کہ پہلے فٹ نوٹ میں ''نہیں چاہیے'' میں 'نہیں' کا شمول سہوِ کتابت ہے۔ اگر یہ بات ہے تو اس سے قبل اپنے منہ سے ''املا کو'' کے بجائے 'املے کو' کیوں نہیں لکھا۔ واضح نہیں کہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

۴۔ دِلّی کا دبستان شاعری سے یہ جملہ نقل کرتے ہیں ''ذوق بیس برس کے تھے کہ معروف انھیں اپنی غزلیں دکھانے لگے ص ۲۲۹''

اور اس پر یہ تبصرہ کرتے ہیں: معروف نے ذوق سے اصلاح لی بھی تھی تو اس کی ابتدا ذوق کی کم عمری میں نہ ہوئی ہوگی (ص ۱۰۸) اس کے معنی یہ ہیں کہ قاضی صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ معروف ذوق کے شاگرد رہے ہوں گے۔ یہ بڑی غلطی ہے۔ بوڑھے معروف کو لڑکے ذوق کا شاگرد بنا دینا آزاد کی شرارت ہے۔ اس سلسلے میں عابد پیشاوری کی کتاب ''ذوق اور محمد حسین آزاد'' (دہلی ۱۹۸۷ء ص ۱۵ تا ۲۴) کا مطالعہ مفید ہوگا۔

غرض یہ ہے کہ میں قاضی صاحب کو اغلاط سے مبرا نہیں مانتا لیکن انھوں نے تحقیق میں جو ہزاروں صفحوں کا مواد دیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ان کے یہاں اغلاط و تسامحات کی مقدار بہت کم ہے۔

(۱۰) انا۔ قاضی صاحب کی انا کا بہتوں نے ذکر کیا ہے۔

۱ مسعود حسین خاں: جو ان کی نوکِ قلم کے زخم خوردہ ہیں وہ اسے ان کی انانیت پر محمول کرتے ہیں۔ علمی انکسار ان میں نام کو بھی نہیں، اس لیے کہ وہ اسے تحقیق کی دنیا میں کمزوری گردانتے ہیں۔ (قاضی عبدالودود سیمینار کے مقالات ص ۴)

''ان کی انا کا سب احترام کرتے ہیں'' (مسعود حسین خاں، غالب نامہ جنوری ۸۷ ء ص۲۵۹)

نثار احمد فاروقی : مثبت تحریروں میں وہ چند جملوں سے آگے نہیں جا سکتے۔ دراصل وہ اپنی انا کے حصار سے باہر نہیں آسکتے ۔ ایضاً ص۱۱۹)

سیّد محمد حسنین: قاضی صاحب کی قاموسی شخصیت علم و فراست کی اس بلندی پر جا پہنچتی ہے جہاں اقوال و اعمال کو عقل نہیں، انا کنٹرول کرتی ہے (معاصر اگست ۷۶ء ص۲۲۲)

'انا' کے کیا معنی ہیں: یہ ایک مہذب لفظ ہے پندار خود بینی تکبر، غرور کے لیے۔ شاعروں میں تکبر اور پندار بہت زیادہ ہوتا ہے، نثر نگاروں میں بھی تخلیق کا روں میں کسی حد تک ہو سکتا ہے، نقادوں یا محققوں میں نہیں۔ نقادوں میں کلیم الدین احمد اس نفسیاتی مرض کا شکار رہے ہوں گے کیونکہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کو نقاد نہیں سمجھتے ہیں ۔ محققوں میں صرف قاضی عبدالودود میں نہ صرف پندار تھا بلکہ وہ اس کے ایورسٹ کی چوٹی پر صندلی نشین تھے۔

کئی سال پہلے ایک رسالے میں کسی نے قاضی صاحب سے ایک انٹرویو لے کر چھاپا تھا۔ افسوس کہ مجھے رسالے اور مضمون نگار کا نام یاد نہیں۔ کئی سے پوچھا، کوئی میری رہبری نہ کر سکا۔ اس میں قاضی صاحب نے کہا تھا۔ میں اردو کا ایک پیراگراف یونیورسٹیوں کے صدر شعبۂ اردو کو پڑھنے کے لیے دے سکتا ہوں۔ میرا دعویٰ ہے کہ کوئی بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا۔ اللہ اللہ کس غضب کی خودی ہے (میری کتاب کھوج ص ۱۲)

شاید قاضی صاحب خط میخی یا خط وردی سندھ میں لکھ کر دیں گے، اسے کون پڑھ سکتا ہے۔ کیا انھیں یقین کامل ہے۔ کہ وہ ابراہیم عادل شاہ کی اردو کتاب نورس کے یہ 'اردو' اشعار:

اک ست زندہٗ تراتر شول جگل کرا   باہن بلی دردسیت جات گسارئیں ایشورا

کاس کرت کنجر پرشٹھ چرم دیا گرا   سرپ سنگار تشٹھن پرچھائیں کلپترا

یا دکنی مثنوی ''پدم راؤ کدم راؤ'' [کذا] کے اشعار کو صحیح صحیح پڑھ سکتے ہیں۔ کم از کم میں تو نہیں پڑھ سکتا۔ دکنی نثر میں بھی ایسی عبارتیں مل سکتی ہیں جن کا ہر لفظ صحیح نہیں پڑھا جا سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ علم میں بھی نشہ ہوتا ہے۔ قاضی صاحب اس مشروب سے کچھ زیادہ ہی سرمست تھے۔ وہ احساسِ خود اہمیت کے بوجھ سے اتنے دبے ہوئے تھے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ کسی کے لیے حرفِ تحسین لبوں پر لانا ان کے مشرب میں گناہ تھا۔ جب ڈاکٹر حسنین نے اپنے مضمون میں لکھا کہ وہ آج تک کسی فرد کی تعریف و تحسین کے دو جملے بھی نہ دے سکے تو انھوں نے اس کا کیسا اکھڑا ہوا جواب دیا۔ جن کو اپنا ممدوح کہا ان میں سے زیادہ تر بنیادی حیثیت سے فارسی کے محقق تھے یا ان میں سے بعض پر انھوں نے کافی تنقید کی ہے۔ بہر حال وہ اپنے حاضر باشوں سے باہر کا نام نہ لے سکے۔

(۱۱) اپنی غلطی کو تسلیم نہ کرنا۔ ان کے قائم کردہ چند اصول یہ ہیں۔

کبھی کسی بات کی خواہ اپنی ہو یا دوسرے کی غلط تاویل نہ کی جائے۔ اپنی غلطی کی خواہ مخواہ تخفیف کی کوشش فائدہ مند نہیں، مضرت رساں ہوتی ہے (مضمون ''غالب-زبانِ پہلواں'' کچھ غالب کے بارے میں حصہ دوم ص ۴۰۴)

جو فریق غلطی پر ہے اس کا فرض ہے کہ جس وقت اسے اس کا احساس ہو جائے فوراً بے تامل اس کا اقرار کرے۔ فضول تاویلات سے اس کی اہمیت کو گھٹا کر دکھانے کی کوشش نامناسب ہے (لطائف غیبی۔ مشمولہ غالب کے بارے میں حصہ دوم ص ۳۲۶)

میں نے ابتدا میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا قول نقل کیا ہے کہ قاضی صاحب کسی کی تحسین شناسی کی صلاحیت ہی نہ رکھتے تھے۔ دراصل پورا مشاہدہ یوں ہونا چاہیے کہ قاضی صاحب کو دوسروں کی خوبیاں اور اپنی خامیاں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ وہ سوچ ہی نہ سکتے تھے کہ ان کے فرمودات میں کوئی کوتاہی، کوئی غلطی در آسکتی ہے۔ ان کے مقرب کلیم الدین احمد تک یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

''دوسرے لوگوں کی طرح انھیں بھی تنہا نہیں مل جل کر روزانہ کام کرنا پڑتا تو شاید ان میں اتنی قطعیت نہ ہوتی۔ وہ تنہا سوچتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو وہ سوچتے ہیں وہی صحیح ہے اور جو اس طرح نہیں سوچتا وہ غلطی پر ہے۔ یعنی ان کا طریقہ کچھ Dictatorial ہے''
(معاصر اگست ۷۶ء ص ۴۲۳)

مجھے ان کی جملہ تحریروں میں صرف تین جگہ غلطی کا اعتراف یا امکان نظر آیا۔

۱۔ ''معارف میں گارساں دتاسی کی تاریخِ ادبیات کے ماخذ کے متعلق خود اس کے بیان کا ترجمہ شائع ہوا۔ میں نے ایک خط میں جو بنام مدیرِ معارف تھا اس کے اغلاط کی نشان دہی کی جو میری اجازت سے مدیر نے چھاپ دیا۔ اس کا جواب معارف میں نکلا۔ (میں) اس کے کچھ ہی دن بعد انگلستان چلا گیا اور جوب الجواب نہ شائع ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں میرے معلومات زیادہ نہ تھے اور میرے بعض اعتراض غلط تھے۔ رہا دتاسی تو اس کے متعلق بعد کو میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں'' (معاصر اگست ۷۶ء ص ۱۸)

ذکر ہے محفوظ الحق کے مضمون کے جواب میں قاضی صاحب کے معارف نومبر ۱۹۲۲ء کے مضمون کا جس کی غلطی کا اعتراف ۱۹۷۶ء میں ہوا جب وہ اپنے تبصروں میں دتاسی کو بالکل نکو ثابت کر چکے تھے۔

۲۔ ''آوارہ گرد اشعار کے سلسلے میں 'ہماری شاعری' مصنفہ سیّد انھوں مسعود حسن رضوی کے ایک شعر پر اعتراض کیا کہ یہ شاد عظیم آبادی کا ہے لیکن اسے سہواً شاد لکھنوی سے منسوب کیا ہے۔ مسعود صاحب نے اسے شاد لکھنوی سے منسوب نہیں کیا تھا جس پر مسعود صاحب سے اظہارِ افسوس بھی کیا ہے اور معذرت خواہ بھی ہوئے ہیں
(مجموعہ آوارہ گرد اشعار ص ۵۰)

۳۔ ''میر ماشا اللہ خاں مصدر پر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ میں نے دیوانِ بُدا کے دیباچے کے متعلق اپنی تحریری یادداشت سے کچھ نقل کیا ہے۔ مجھ سے اگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو جن اصحاب کے پاس دیوان ہو، مجھے مطلع کریں (مصحفی اور ان کے اہم''

معاصرین ص ۱۷۲) یہ کوئی غلطی کا اعتراف نہیں، صرف اقتباس نقل کرنے میں غلطی کا ذکر کیا ہے۔ اوپر کے تین بیانات میں صرف مسعود حسن رضوی صاحب سے معذرت ہی علمی غلطی کا دلی اور بروقت اعتراف ہے۔ اس شق کی ابتدا میں میں نے ان کی جو دو ہدایات درج کی ہیں کہ اپنی غلطیوں کی تخفیف کی کوشش یا فضول تاویلات نہ کی جائیں دیکھیں انھوں نے خود ان پر کہاں تک عمل کیا۔ آثر غالب کے ایک خط میں ''ابلہ بدیہات'' آیا ہے۔ قاضی صاحب نے طبعِ اول میں حاشیہ لکھا۔

> ''جناب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی سے اس کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ اجل بدیہیات ہونا چاہیے۔ ابلہ اور بدیہات دونوں غلط ہیں'' (طبعِ ثانی ۱۹۹۵ء ص ۶۱)

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے قاضی صاحب کے مضمون ''غالب بہ حیثیت محقق'' کا جواب ''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں'' کے عنوان سے اردو ادب ۱۹۵۲ء میں دو قسطوں میں چھپوایا۔ دوسری قسط جولائی تا دسمبر ۱۹۵۲ء کے آخر میں شوکت نے آثرِ غالب سے مندرجہ حاشیہ نقل کر کے لکھا۔

قاضی صاحب نے یہ صحیح نہیں فرمایا کہ اجل بدیہیات ہونا چاہیے۔ صحیح لفظ اجلا یا اجلیٰ (بمعنی واضح) ہے۔ میں ہرگز نہیں مان سکتا کہ ڈاکٹر زبیر صدیقی نے قاضی صاحب کو اجل بتایا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو جانتا ہوں۔ وہ عربی زبان ولغت کے بڑے عالم ہیں اور بڑا ستھرا ادبی مذاق رکھتے ہیں۔ وہ کبھی ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ (غالب۔ فکر وفن ص ۱۳۴)

قاضی صاحب کے مقالے کا نقشِ ثانی نقدِ غالب میں آیا تو اس کے شروع میں لکھا:

''غالب بہ حیثیت محقق'' کے عنوان سے میرا ایک مقالہ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں اشاعت پذیر ہوا تھا، بہت عجلت میں لکھا گیا تھا اور جو اس میں اغلاطِ طباعت بھی

بہ کثرت تھے، میری استدعا ہے کہ یہ کالعدم سمجھا جائے اور مجھے اس کے متعلق ہر قسم کی ذمہ داری سے بری قرار دیا جائے، مقالہ ہذا کا عنوان وہی ہے، لیکن یہ از سرِ نو لکھا گیا ہے۔ اگر اس میں کوئی بات پہلے مقالے سے مختلف طور پر ملے، تو یہ خیال کرنا چاہیے کہ راقم کے نزدیک اسی طرح صحیح ہے لیکن کسی بات کا جو پہلے مقالے میں تھی مقالہ ہذا میں یک قلم نہ پایا جانا لازماً اس لیے نہیں کہ وہ غلط تھی'' (نقدِ غالب ص ۳۴۵) ۔متن میں لکھا:

مآثر میں ''اجلہ بدیہات ہے (ص۲۸ اور اس کا حاشیہ ص۶۸) اس سے قطعِ نظر کہ میں نے حواشی مآثر میں کیا لکھا تھا اجلائے بدیہیات چاہیے اور یہی روضہ ایں ہے:
''ایں معنی از اجلی بدیہات می نماید'' ص۶ (نقدِ غالب ص ۵۲۷)

دوسری طرف سرور صاحب پر دباؤ ڈال کر اردو ادب میں ادارے کی طرف سے معذرت چھپوائی جس کا خلاصہ دیتا ہوں "دوسری قسط کے آخر میں شوکت صاحب نے قاضی عبدالودود صاحب کے ایک بیان کو جو ڈاکٹر زبیر صدیقی سے ایک گفتگو کے متعلق ہے صحیح ماننے سے انکار کر دیا ہے اور دلیل صرف دی ہے کہ ڈاکٹر زبیر صدیقی ایسی بات کہہ ہی نہیں سکتے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے ایک غلط بات ڈاکٹر صدیقی سے منسوب کر دی۔ یہ استدلال صحیح نہیں اور اس سے قاضی عبدالودود صاحب پر خواہ مخواہ حرف آتا ہے۔ شوکت صاحب کو چاہیے تھا کہ ڈاکٹر زبیر صدیقی صاحب سے رجوع کر کے ان کی رائے نقل کرتے ۔اور جو کچھ لکھتے ان کے حوالے سے لکھتے۔ ایک کی بات بغیر ثبوت کے مان لینا اور دوسرے پر الزام ڈالنا مناسب نہیں۔ موجودہ صورت میں یہ اندراج تحقیقِ علمی کے معیار کے مطابق نہیں اور اسی لیے ہم قاضی عبدالودود صاحب سے معذرت خواہ ہیں۔

شوکت صاحب نے بڑی محنت سے مضمون لکھا تھا لیکن جوش میں آ کر وہ کہیں کہیں ایسے فقرے بھی لکھ گئے جو ایک اہل قلم کے شایانِ شان نہیں۔ (اردو ادب- جولائی ستمبر ۱۹۵۴ء)

میں یکم دسمبر ۱۹۹۹ء کو جامعہ نگر دہلی میں سرور صاحب سے ملا۔ انھوں نے مجھے بتایا

کہ قاضی صاحب نے مجھ پر کسی سے دباؤ ڈلوایا تھا، اب مجھے یاد نہیں کہ کس سے۔ قاضی صاحب سے ہمارے بہت سے کام پڑتے تھے اس لیے مجھے معذرت چھاپنی پڑی۔

مشفق خواجہ نے مجھے یکم جولائی ۱۹۸۷ء کو خط میں لکھا: ایک مرتبہ انھوں (قاضی صاحب) نے مجھے خط لکھا تھا کہ اگر شوکت سبزواری ہندوستان میں ہوتے تو میں ان پر مقدمہ دائر کر دیتا۔ اس دھمکی کو سن کر مجھے یقین ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کا دباؤ یہی رہا ہوگا کہ انھوں نے جنرل سکرٹری انجمن ترقیِ اردو اور مدیر اردو ادب کو لکھا ہوگا کہ انھوں نے معذرت نہیں چھاپی تو وہ ازالہ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کر دیں گے۔

قاضی صاحب نے شوکت کے مضمون سے استفادہ کرتے ہوئے نقدِ غالب میں اپنے مضمون کے نقشِ ثانی میں بڑے پیمانے پر ترمیم کی لیکن شوکت کا نام نہیں لیا۔

شوکت سبزواری نے جب اپنے مضمون کو اپنے مجموعے ''غالب—فکر وفن'' (کراچی ۱۹۶۱ء میں شامل کیا تو مضمون کے آخر میں ''حرفِ آخر'' کے عنوان سے اس قضیے کی پوری تفصیل دے کر لکھا۔

اس پوری عبارت میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ مقالے کی اشاعتِ اول میں جو غلطیاں تھیں اور جن کا احساس مقالہ نگار کو اس مقالے کے بعد ہوا ان کی پردہ پوشی کی جائے اور قارئین کو باور کرایا جائے کہ مقالہ عجلت میں لکھا گیا تھا۔ اس میں طباعت کی غلطیاں بھی تھیں۔ اس لیے اسے نئے سرے سے ترتیب دینے کی ضرورت پیش آئی۔ مقالے کی ترمیمات کے بارے میں قاضی صاحب یہ نہیں کہتے کہ اشاعتِ اول میں غلط تھا، اشاعت ثانی میں اس کی تصحیح کر دی گئی بلکہ یہ کہتے ہیں اشاعت ثانی میں جس طرح ہے راقم کے نزدیک اس طرح صحیح ہے۔ [غالب پر] جو اعتراضات سرے سے غلط تھے اشاعتِ ثانی میں حذف کر دیے گئے۔ ان کے بارے میں بھی جملہ اخلاقی بلندیوں کے باوجود قاضی صاحب میں اتنی جرأت نہیں کہ انھیں غلط تسلیم کر لیں۔ اس کی پردہ پوشی وہ ضروری سمجھتے ہیں اور قارئین کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ جو باتیں یک قلم چھوڑ دی گئی ہیں لازماً اس لیے نہیں کہ غلط تھیں۔ پھر کس لیے؟ کیا یہی وہ اخلاقی معیار ہے جس پر قاضی

صاحب کو ناز و افتخار ہے اور جس کی بنا پر انھوں نے غالب کے اخلاق و کردار کا جائزہ لیا۔ (غالب — فکر و فن ص ۱۳۵)

قاضی صاحب پر ''اجلہ بدیہیات'' عرصے تک چھایا رہا۔ اپنے مضمون ''غالب — جہاں پہلوان'' (اردو جنوری مارچ ۱۹۷۰ء) میں اس پر لکھنے کی ضرورت نہ تھی لیکن وہاں بھی نقدِ غالب ص ۵۲۷ والی صفائی دی ہے (کچھ غالب کے بارے میں دوم ص ۴۳۱) ان کا ایک مجموعہ زبان شناسی ہے۔ اس کے آخر میں انھیں کی تحریر میں ایک مضمون ''چند الفاظ اور طریق استعمال'' کا عکس ہے۔ وہاں پھر وہی صفائی نظر آتی ہے (زبان شناسی ص ۱۶۱)۔ مآثرِ غالب طبعِ دوم میں حنیف نقوی نے قاضی صاحب کے حاشیے پر حاشیہ لکھا ہے مولوی احمد علی کے بیان سے ظاہر ہے کہ غالب نے ''بدیہیات'' لکھا تھا۔ اس لیے اس غلطی کو سہوِ ناقل قرار دے کر نظر انداز کر دینا چاہیے۔ ''اجلہ'' کے معاملے میں احمد علی کا اعتراض درست ہے۔ یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ڈاکٹر زبیر صدیقی نے ''اجل'' کو صحیح قرار دیا ہو گا۔ یہاں قاضی صاحب سے یقیناً سہو ہوا ہے۔ ''اجل'' جلیل کا اسم تفضیل ہے اور ''اجلی'' جلی کا اور یہاں عمل ''جلی'' ضد ''خفی'' کا ہے نہ کہ جلیل کا۔ اس لیے ''اجلائے بدیہیات'' ہی درست ہے۔ (مآثرِ غالب ص ۹۴)

حنیف نے وہی خطا کی ہے جو شوکت نے کی تھی۔ اگر قاضی صاحب زندہ ہوتے تو حنیف پر بھی مقدمہ چلا دیتے۔ میں نے حنیف سے کہا کہ تم نے یہ شوکت سبزواری سے نقل کیا ہے لیکن ان کا حوالہ کیوں نہیں دیا۔ حنیف نے جواب دیا کہ میں نے سبزواری کا اعتراض نہیں دیکھا۔ یہ معاملہ اتنے سامنے کا ہے کہ عربی کا کوئی مبتدی بھی پہچان سکتا ہے۔

قاضی صاحب نے اپنی مبتدیانہ غلطی چھپانے کے لیے ڈاکٹر زبیر صدیقی کو بھی اس میں شریک قرار دینے پر زور دیا۔ واضح ہو کہ قاضی صاحب نے صرف ''اجلہ بدیہیات'' کی پردہ پوشی نہیں کی بلکہ 'غالب بہ حیثیت محقق' کے نقش ثانی میں اپنی وسیع ترمیم و تصحیح کو بھی شوکت کی گرفت کا نتیجہ نہیں قرار دیا۔ نقش ثانی میں انھوں نے نقش اول کی دو نقلیں

خارج کر دیں اور کم از کم ۲۲ ترمیمات کیں۔ ان سب کا الزام اپنی عجلت اور اغلاطِ طباعت کے سر منڈھ دیا۔ معترض کا نام بھی نہیں لیا۔ کیا ان کے وکیل اسے بھی 'سچ' صرف سچ اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں قرار دیں گے؟

قاضی صاحب نے اپنے اصولوں میں اپنی غلطی کی فضول تاویلات اور خواہ مخواہ تخفیف کی کوشش کے خلاف متنبہ کیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے متعدد مضامین میں خامیوں کے امکان کا ذکر کیا ہے اور اسے عجلت یا متعلقہ کتاب یا اپنی تحریری یاد داشت کے میسر نہ آنے کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان میں سے بیشتر صورتیں ایسی تھیں کہ اگر وہ قدرے اور رک کر مآخذ کی تلاش کرتے تو اس اعتذار کی ضرورت نہ آتی۔ رشید حسن خاں تو عجلت کے اتنے خلاف ہیں: تحقیق اور تدوین دونوں میں مدت کا تعین کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مدت کا تعین کر کے کام کیا جائے گا تو بہ طورِ عموم وہ اچھا کام نہیں ہوگا (کتاب تدوین، تحقیق۔ روایت ۱۹۹۹ء ص ۱۸۱)

میں قاضی صاحب کے اعتراف یا اعتذار کی وہ سب مثالیں دیتا ہوں جو مجھے مل سکیں۔ انھیں تقریبی تاریخی ترتیب سے درج کر رہا ہوں۔

۱۔ عجلت کا بُرا ہو کہ حوالے نہ دیے جا سکے یا دیے گئے تو نامکمل، مگر حوالہ یا اس کی تفصیل طلب کی گئی تو بخوشی حاضر کی جائے گی (غالب بہ حیثیت محقق نقشِ اول)

۲۔ دیوانِ ہذا اس وقت پیشِ نظر نہیں اور میں اس یاد داشت سے کام لے رہا ہوں جو دو برس قبل میں نے عجلت میں لکھی تھی۔ عبارتیں کچھ دیباچہ نگار کی ہیں کچھ دیباچے کی عبارتوں کا خلاصہ میرے لفظوں میں ہے۔ اس کا امکان ہے کہ کوئی بات نظر انداز ہو گئی ہو، یا کسی جگہ کی عبارت غلط نقل ہو گئی ہو (میر ماشاء اللہ خاں مصدر۔ مصحفی اور ان کے اہم معاصرین، ص ۱۷۲)

۳۔ یہ مقالہ عجلت میں لکھا گیا ہے اس لیے ترتیبِ مطالب حسبِ دل خواہ نہ ہو سکی۔ ناظرین معاف فرمائیں (اردو انڈین کرانیکل پٹنہ ۱۸۸۵ء مشمولۂ چند اہم اخبارات

و رسائل ص ۸۶)

۴۔ بعض امور کی تحقیق جیسی چاہیے نہ ہو سکی۔ اس کا ایک بڑا سبب بعض ضروری کتابوں کا نہ ملنے میں نہ ہونا ہے (غالب بہ حیثیت محقق۔ نقدِ غالب ص ۳۴۷)

۵۔ حواشی متن کے ساتھ ساتھ حوالہ قلم ہوئے تھے لیکن کسی وجہ سے ان کی کتابت الگ کرائی گئی اور وہ پلیٹ جس پر ان کی کاپی بھی تھی ضائع ہوگئی۔ موجودہ حواشی اواخر نومبر ۵۴ء میں تحریر ہوئے ہیں (ایضاً ص ۵۴۹)

۶۔ اس بحث میں یا کہیں استقصائے کامل کا [کذا] مدِ نظر نہیں (طبقاتِ شعرائے ہند۔ مشمولا شعرا کے تذکرے ص ۲۷۶)

۷۔ اس کا اقرار ہے کہ ان [آزاد بحیثیت محقق کے مطالب] کی ترتیب بہتر ہو سکتی تھی (محمد حسین آزاد بحیثیت محقق ص ۱)

۸۔ [دتاسی کی تاریخ کی] جلد اول مجھے قبل از وقت واپس کرنی پڑی۔ اس مقالے میں کوئی بات مبہم نامکمل یا غلط؟ ہے تو اس کی طرف آئندہ توجہ کی جائے گی۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ جلد نمبر ا پھر کچھ دنوں کے لیے کہیں سے مستعار لوں (تاریخِ ادبیات ہندی و ہندوستان جلد اول کی اشاعتِ اول مشمولہ گارساں دتاسی ص ۳۴)

۹ یہ مقالہ جس وقت قلم بند ہوا تھا تاریخ مذکور کی اشاعت اول کی جلد اول پیش نظر نہ تھی (تاریخِ ادبیات ہندی و ہندوستانی)

۱۰۔ [دیوانِ غالب نظامی ایڈیشن] میرے پاس ہے مگر اس وقت پیش نظر نہیں اس کے اور دوسرے قدیم نسخوں کے سنِ طبع اور ان کے اشعار کی تعداد ماخوذ از دیباچہ نسخہ مالک رام (دیوانِ غالب کے دو نسخے۔ کچھ غالب کے بارے میں، اول ص ۱۱۸)

۱۱۔ یہ تبصرہ سال دو سال قبل سپردِ قلم ہوا تھا۔ اس وقت نظرِ ثانی اور اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی تو کتاب نہ مل سکی۔ اگر احیاناً کوئی بات جو مصنف نے نہیں لکھی ان کی طرف منسوب کر دی گئی ہے تو کتاب کے پھر دیکھنے کے بعد صحیح صورتِ حال ظاہر کر دی جائے گی۔ (تبصرہ بر دلّی کا دبستان شاعری۔ اردو میں

ادبی تحقیق کے بارے میں ص ۵۱)

۱۲۔ اس مقالے میں ''بہار'' کے اغلاط و اشتباہات کے استقصائے کامل کی کوشش نہیں کی گئی۔ بعض امور مجمل طور پر درج ہیں اور کہیں کہیں اسناد ندارد ہیں۔ بشرطِ ضرورت تفصیل سے کام لیا جا سکتا ہے اور اسناد پیش کیے جا سکتے ہیں (ڈاکٹر اختر اورینوی کے مقالے بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا۔ مقالاتِ وددود جلد اول، متن ص ۵)

۱۳۔ قاضی محمد سعید صاحب نے تاریخ مظفری [کذا، تالیف محمدی ا] کے نسخہ برلن سے غلام یحییٰ کا حال نقل کر کے بھیجا تھا لیکن غائب ہوگیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس میں یہی سال وفات تھا مگر یہ بات حافظے میں نہیں کہ اس میں ان کا شاعر اور تخلص حضور ہونا درج تھا یا نہیں (ایضاً ص ۲۵)

۱۴۔ ابھی شعرا کے متعلق کچھ اور کہنا ہے۔ اس میں تقدیم و تاخر سے متعلق کسی قاعدے کی پابندی نہ ہوگی (ایضاً ص ۹۶)

۱۵۔ اس مقالے کی تحریر کی فرمائش جس وقت ہوئی۔ میں پابرکاب تھا اور علی گڑھ آنے سے پیشتر مصر سے متعلق جو یادداشت جلدی میں میں نے لکھی تھی وہ جب علی گڑھ میں مقالہ لکھنے لگا تو ناکافی اور بعض جگہ غیر واضح پائی گئی۔ ممکن ہے پٹنہ واپس پہنچنے کے بعد اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو میں اس کی تصحیح کردوں یا کوئی ضروری بات چھوٹ گئی ہو تو اسے بڑھا سکوں (غالب کے کلیاتِ فارسی کا ایک قدیم نسخہ۔ کچھ غالب کے بارے میں حصہ اول ص ۷۲)

۱۶۔ شیخ چاند مرحوم نے اپنی کتاب سودا میں جو اس وقت پیش نظر نہیں مخزن نکات مصنفہ، قائم کی بناء پر رائے قائم کی ہے کہ سودا کی ولادت ۱۱۰۵ میں یا اس سے بھی بیشتر ہوئی تھی۔ (کچھ سودا کے بارے میں سب رس حیدر آباد نومبر ۱۹۶۰ء)

۱۷۔ ان [سودا کے دیوان یا کلیات کے تیس چالیس قلمی نسخوں] میں سے بیشتر سے متعلق میری لکھی ہوئی یادداشتیں میرے پاس ہیں مگر اس مقالے کی تحریر کے وقت یہ پیش

نظر نہیں۔ (کلیاتِ سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ۔ درد و سودا ص ۸۹)

۱۸۔ (کلیاتِ سودا) نسخہ علی گڑھ سے متعلق جو یاد داشت میں نے لکھی ہے، وہ اس وقت پیش نظر نہیں، اس لیے مروجہ دیوان میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری پر تبصرہ۔ اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں ص ۳۸)

۱۹۔ ہر دعوے کا ثبوت التزاماً پیش نہیں ہوا۔ یہ طولِ کلام سے بچنے کے لیے ہے۔ کسی کی صحت میں شک ہو تو اسناد پیش کیے جا سکتے ہیں (تذکرۂ سرور۔ اشتر و سوزن ص ۵)

۲۰۔ میں نے اس سے (ولادتِ ناسخ) اپنے ایک مضمون میں جو نقوش میں شائع ہوا تھا بحث کی ہے۔ اس وقت یہ مضمون پیش نظر نہیں اتنا یاد ہے کہ ۱۱۸۵ء یا ۱۱۸۴ء ناسخ کا صحیح سال پیدائش ہے (لکھنؤ کا دبستانِ شاعری۔ اردو کی ادبی تحقیق کے بارے میں ص ۴۶)

۲۱۔ یہ مضمون محض طفیل صاحب کے اصرار پر لکھا گیا ہے اور میں نے اپنے دستور کے خلاف اسے قلم برداشتہ لکھا ہے۔ بہت سی ضروری باتیں چھوٹ گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ غیر ضروری داخل بھی ہو گئی ہوں۔ ترتیب بھی ٹھیک نہیں (آپ بیتی نمبر حصہ دوم۔ نقوش جون ۱۹۶۴ء ص ۱۰۲۱)

۲۲۔ اصولِ تحقیق پر کوئی باقاعدہ مقالہ لکھنا مدِ نظر نہیں۔ چند سرسری باتیں جس ترتیب سے ذہن میں آئیں گی، قلم بند کر دی جائیں گی۔ یہ بھی واضح کر دوں کہ میں اس وقت وطن سے باہر ہوں اور بہت کم کتابیں میرے پاس ہیں۔ (اصولِ تحقیق۔ اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں ص ۵)

۲۳۔ حوالہ بہت جگہ نہیں اور جہاں ہے۔ اطمینان بخش طور پر نہیں۔ ناظرین اگر حوالہ طلب کریں گے تو حاضر کیا جائے گا۔ (بین الاقوامی غالب سیمینار فروری ۱۹۶۹ء کا افتتاحی خطبہ۔ کچھ غالب کے بارے میں، حصہ اول ص ۵۸)

۲۴۔ یہ مضمون محض ڈاکٹر ممتاز احمد کے اصرار سے لکھا گیا ہے۔ ورنہ میں اس وقت اس

کے لکھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کے لیے بہت کچھ حافظے پر بھروسہ کرنا پڑا ہے اور ضروری کتابوں کی طرف رجوع نہ ہو سکا۔ نہ یہ دعویٰ ہے کہ یہ جامع ہے نہ یہ کہ اغلاط سے بری ہے (غالب اور بہار۔ ایضاً ص ۲۱۵)

۲۵۔ مجھے اس کا افسوس ہے یہ مقالہ حسب دلخواہ نہیں لکھ سکا۔ بیشتر خطوط سے متعلق حواشی تحریر ہی نہ ہو سکے۔ (مجموعہ دہلی اور غالب ایضاً ص ۲۱۷)

۲۶۔ فرہنگِ آصفیہ کے تبصرے کی قسط جس وقت لکھی گئی تھی میں بیمار تھا اور یہ قسط بھی جس وقت تحریر ہو رہی ہے میری کیفیت وہی ہے جو اس وقت تھی بلکہ میں پابرکاب ہوں۔ دہلی علاج کے لیے جا رہا ہوں۔ ترتیب مطالب جس طرح چاہیے نہ ہو سکی۔ میں ناظرین سے معذرت طلب ہوں (فرہنگِ آصفیہ قسط ۲۔ زبان شناسی ص ۶۳)

ان میں سے اکثر صورتوں میں مزید وقت اور محنت صرف کرنے سے کمی کا تدارک ہو سکتا تھا۔ یادداشتوں اور اپنی کتابوں کے نہ ملنے کی وجہ ان کے ذاتی ذخیرے کی انتہائی بے ترتیبی ہے جس کی ڈاکٹر مختار الدین احمد نے معاصر اگست ۷۶ء میں بہت اچھی تصویر کھینچی ہے۔ سند اور حوالے کے لیے یہ کہنا کہ اگر کوئی طلب کرے گا تو پیش کر دیئے جائیں گے بہت نامناسب ہے۔ قاری نہ گداگر ہے نہ وکیل استغاثہ کہ پوچھ گچھ کرے۔ مضمون کو مکمل بالذات ہونا چاہیے۔

(۱۲) [قاضی صاحب کی ایک انوکھی لیکن دلچسپ عادت یہ بھی ہے کہ وہ پرانی تحریروں کو رد کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے لکھنے والے اگر اپنی کتاب کا نیا ایڈیشن یا مضمون کا نقشِ ثانی شائع کرتے ہیں تو سابق نقش کو عاق نہیں کر دیتے۔ اگر کہیں بھی تو اس سے بڑا فرق نہیں پڑتا۔ محقق منسوخ کلام اور سابق ایڈیشنوں کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں۔ غالب اور اقبال کے منسوخ کلام پر کتابیں دیکھیے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ۱۹۹۵ء میں خدا بخش لائبریری سے 'غالب بہ حیثیت محقق' اور شاد کی کہانی مشمولہ کچھ شاد عظیم آبادی

کے بارے میں چھاپیں تو قاضی صاحب کے اعلان کے علی الرغم دونوں کا منسوخ نقشِ اول بھی فراہم کر دیا اور اس طرح کالعدم کا احیا کر دیا۔]

قاضی صاحب کے کچھ اعلانات :

۱۔ غالب بحیثیت محقق کے عنوان سے میرا ایک مقالہ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ میری استدعا ہے کہ یہ کالعدم سمجھا جائے اور مجھے اس کے متعلق ہر قسم کی ذمہ داری سے بری قرار دیا جائے۔ (نقدِ غالب ص ۳۴۵)

۲۔ میر کے وا سوخت: اگر میرے کسی مضمون میں تعداد ۳ سے کم درج ہے تو یہ غلط ہے۔ (فاروقی کی کتاب میر تقی میر۔ مجموعہ 'میر' حاشیہ ص ۲۷۰)

۳۔ اس مقالے میں کچھ امور ممکن ہے کہ میری کسی سابق تحریر کے مطابق نہ ہوں۔ میں نے ہر جگہ صراحتہً اس کا ذکر ضروری تصور نہیں کیا۔ (عبدالحق بحیثیت محقق ص ۱)

۴۔ ص ۱۵۳، ص ۱۵۵ کی ان عبارتوں کو جن میں نثرِ میر کی خوبصورتی اور شعریت کی طرف اشارہ ہے، کالعدم سمجھا جائے (ایضاً ص ۸۹)

۵۔ ممکن ہے کہ سابق میں میں نے کوئی بات مختلف طور پر لکھی ہو، تبدیلِ رائے کا ذکر لازماً نہیں کیا گیا۔ (مثنویاتِ ناسخ پر تبصرہ۔ (ہماری زبان ۸/نومبر ۱۹۵۸ء ص ۷).

۶۔ کہانی [شاد کی کہانی شاد کی زبانی] کا تبصرہ پہلے صبح (دہلی) میں شائع ہوا تھا۔ اسے اب کالعدم سمجھا جائے (اشتر و سوزن ملحقات ص ۱۲۹، نیز کچھ شاد کے بارے میں، پیش گفتار ص ۷)

(۱۳) تبدیلی رائے اور رجوع کرنا۔ قاضی صاحب نے اپنے مضمون ''غالب — زباں پہلوان'' میں تحقیق کے لیے جو میزان بنائی ہے اس میں کہا ہے مختلف بیانات میں تفاوتِ حقیقی تعجیل رائے کی وجہ سے ہو تو تبدیل رائے کی وجہ لکھنی چاہیے (کچھ غالب کے بارے

میں، حصہ اول ص۴۰۳)

کئی بار قاضی صاحب رائے تبدیل کرتے ہیں تو کبھی وجہ نہیں دیتے یا دیتے ہیں تو محض سرسری، شافی اور مدلل نہیں۔ چند مثالیں

۱۔ معیار مارچ ۱۹۳۶ء میں دریائے لطافت کے مرشد آبادی ایڈیشن کی تاریخِ طباعت میں ایک مصرع یوں چھپا تھا۔ بگفتا این ست دریا ے لطافت۔ چونکہ مرشد آبادی ایڈیشن میں اس مصرع میں ایں است چھپا تھا اس لیے اپریل کے شمارے میں تصحیح کی ایں ست: این است (ص۱۱۴۔ یہ دلربا کہ این است سے مصرع غیر موزوں ہو جاتا ہے۔ مئی کے شمارے میں محکمہ کے تحت پھر ایں ست پر رجوع کیا۔ دلیل، جناب (ریاض حسن خاں) خیال نے بتایا کہ الف کا اضافہ کاتبِ نسخہ مرشد آبادی غلطی ہے۔ حیرت ہے کہ قاضی صاحب نے خود سے کم علم شخص کے کہنے پر رائے تبدیل کی۔ ویسے 'ایں ست' ہی صحیح ہے۔

۲۔ سکندر وضاحک کے معاملے میں آزاد نے آبِ حیات میں لکھا تھا کہ یارب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر، دراصل سودا ہی کی تصنیف تھا۔ قاضی صاحب نے جولائی ۳۶ء کے معیار میں نہایت محققانہ اور عالمانہ مضمون سکندر اور ضاحک لکھا جس میں یہ ثابت کیا کہ یہ مخمس سکندر ہی کا ہے لیکن ۶۲-۱۹۶۱ء کے اپنے مضمون ''کلیاتِ سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ'' میں رجوع کر کے لکھا:

کسی زمانے میں میرا خیال تھا کہ یہ مخمس سکندر کا ہے، لیکن یہ کلیاتِ سودا کے بہت سے معتبر نسخوں میں ملتا ہے اور اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سودا ہی کا ہے۔ (درد و سودا ص۹۸ حاشیہ)

پہلے جو انھوں نے طرح طرح کے حساب کتاب کے ساتھ متعدد مضبوط دلیلیں جو دی تھیں اب ان کی تغلیط بھی ثابت کرنی تھی۔

۳۔ ''نادراتِ غالب'' کے تبصرے کے سلسلے کے تین بیانات ملاحظہ ہوں۔

ا) ص۱۳۵ یہ بیان کہ معیار الشعراء ہفتے میں دو بار شائع ہوتا تھا خلافِ واقعہ ہے۔

(کچھ غالب کے بارے میں دوم ص ۴۹۷)

ب۔ نادراتِ غالب ص ۱۶۵ معیار الشعرا کے بارے میں سطر ۷، ۸ میں جو کچھ ہے کالعدم سمجھا جائے (بزم خاص۔ تحقیقاتِ ودود ص ۱۳۷)

ج۔ ص ۱۶۵ سطر ۸ معیار الشعرا سے متعلق ہے جو اعتراض ہے صحیح ہے (بزمِ معاصر۔ تحقیقاتِ ودود ص ۱۳۸)

تینوں ہدایتوں میں کہیں اپنے بیان کی تائید میں کوئی دلیل نہیں دی۔

۴۔ تذکرۂ شعرا ابن امین اللہ خان طوفان 'میرے نزدیک اس کی بہ نسبت کہ خود رغمی اس کے مصنف ہیں یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ یہ ان کے کسی بھائی کے رشحاتِ قلم سے ہے (تذکرہ ۱۹۵۴ء مقدمہ صفحہ ج)

اب میرا یہ خیال ہے کہ خود رغمی اس کے مصنف ہوں (انصار اللہ نظر: انتخابِ رغمی علی گڑھ ۱۹۸۱ء ص ۳۴ پر قاضی صاحب کا بیان) تفصیلات دیکھیے میری کتاب قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن میں۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ رائے بدلنے کی ضرورت آتی ہے لیکن یہ ایک طرف قاری کے لیے باعث پریشانی ہوتا ہے دوسرے اس سے قاضی صاحب کا پایہ اعتبار کمزور ہوتا ہے۔

(۱۴) راست گفتاری:

قاضی صاحب نے بڑی اخلاقی جرأت سے قدما کے کردار کا تجزیہ کیا۔ وہ ڈاکٹر بیدار کی نصیحت ع۔ نام نیک رفتگاں ضائع مکن۔ کے قائل نہیں۔ انھوں نے فارسی اردو ادب کے کئی عظما کو راست گفتار نہیں پایا۔ چند اقوال ملاحظہ ہوں۔

۱۔ حیاتِ سعدی پڑھیے۔ سعدی بھی غلط بیانی میں کم نہ تھے۔ بوستان کی مثنوی سومنات پڑھیے۔ اس تاریخی واقعہ کو واحد متکلم میں پیش کیا ہے۔ حالانکہ تاریخی حیثیت سے سعدی کا ورودِ ہند ثابت نہیں۔ سعدی کی یہ کذب بیانی انھیں (حالی کو) نظر نہیں آتی۔ (حسنین کا مضمون۔ معاصر اگست ۷۶ء ص ۲۳۶)

۲۔ بیدل کی نثری تحریر پڑھ کر کہتے تھے اول درجے کا جھوٹا ہے (ڈاکٹر مختار الدین احمد کا مکتوب مورخہ یوم جمہوریہ ۲۰۰۰ میرے نام۔)

۳۔ میں حاتم کو صادق القول نہیں سمجھتا (نکات اشعراء پر تبصرہ۔ عبدالحق بحیثیت محقق ص ۱۲۰)

سودا کے تلمذ۔ حاتم کا ذکر عشرۂ ہفتم و ہشتم کے تذکروں میں نہیں۔ میرا خیال ہے کہ حاتم نے سودا کے دہلی چھوڑنے کے بعد اسے شہرت دی۔ میرے نزدیک یہ بھی قابل قبول نہیں (دِلّی کا دبستانِ شاعری — اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں ص ۱۰۱)

۴۔ میر نہ منصف ہیں نہ راست گفتار اور ان کا حافظہ بھی زیادہ مضبوط نہیں (میر کے حالاتِ زندگی۔ مجموعہ میر ص ۱)

میر صاحب راوی کی حیثیت سے زیادہ قابلِ اعتبار بھی نہیں (کچھ میر کے بارے میں۔ ایضاً ص ۴۴)

میں میر کے قول کا عدم و وجود برابر مانتا ہوں (فاروقی کی کتاب میر تقی میر پر تبصرہ۔ ایضاً ص ۲۶۷)

فیض میر میں میر نے شاہ ساہا کی حکایت بیان کی ہے۔ قاضی صاحب کہتے ہیں اس حکایت کے چشم دید راوی (میر) میں درویشوں کی اور صفتیں ہوں تو ہوں راست گفتاری یقیناً نہ تھی۔ (ایضاً ص ۳۰۸)

۵۔ مجھے مصنف (پریم کشور فراقی) کی راست گفتاری میں بھی شک ہے۔ (وقائع عالم شاہی۔ تبصرے ص ۱۷)

۶۔ غالب کے یہاں بالا ارادہ حقیقت سے انحراف کی اور بھی مثالیں ہیں لیکن اس مقالے کا خاتمہ غالب کے ایک بیان پر کیا جاتا ہے جس میں دروغ گوئی کا اعتراف موجود ہے۔ (غالب کی راست گفتاری۔ غالب بحیثیتِ محقق۔ صفحہ چوبیس)

میرے مقالے میں قطعی طور پر یہ بات ثابت کر دی گئی تھی کہ غالب ضرورت ہو یا نہ ہو بے تامل جھوٹ بولتے تھے (تحقیقاتِ ودود ص ۳۱)

۷۔ رہے [محمد حسین] آزاد تو ان کی شہادت کچھ وزن نہیں رکھتی (دِلّی کا دبستانِ شاعری — اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں ص ۹۳)

۸۔ شاد کی شہادت کا عدم و وجود برابر ہے (ایضاً ص ۶۷)

لیکن قولِ شاد و متبعینِ شاد کے سوا جس کا عدم و وجود برابر ہے اس کا ثبوت موجود نہیں (مقالاتِ قاضی عبدالودود ص ۲۴۰) جناب شاد سو فیصدی جھوٹ بولتے تھے۔ اور وہ بھی اس لیے کہ اس سے زیادہ بول نہیں سکتے تھے۔ (قاضی عبدالودود اور شاد عظیم آبادی۔ قاضی عبدالودود سیمینار کے مقالات ص ۳۱)

۵۶-۱۹۵۵ء میں قاضی صاحب نے مجھ سے کہا کہ شاد دروغ گویوں کے صاحب قراں تھے۔ یہ قول برحق ہے۔

۹۔ اسی ملاقات میں قاضی صاحب نے صغیر بلگرامی کے بارے میں بتایا کہ وہ سوچتے تھے کہ انھیں کوئی کتاب لکھنی ہے تو اسے واقعی لکھا ہوا مان کر اپنی تصانیف کی فہرست میں درج کر دیتے تھے۔

۱۰۔ (نصیر حسین) خیال کاذب نہیں، کذاب تھے (تحقیقاتِ ودود ص ۱۸۹)

۱۱۔ قواعد میر کا میر سے کوئی سروکار نہیں۔ خواجہ عشرت راوی کی حیثیت سے بالکل ساقط الاعتبار ہیں (میر ص ۳۳۳)

مندرجہ بالا فہرست میں بیدل اور حاتم کے بارے میں ان کی کوئی مضبوط دلیل دیکھنے میں نہیں آئی۔ بقیہ کے بارے میں ان سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ ہوائی اڈوں پر سامان کو ایکسرے مشین کے نیچے سے گزارا جاتا ہے تاکہ ان کے دروں کا حال آئینہ ہو جائے۔ شفاخانوں میں مریض انسانوں کے جسم کا Scanning کر کے اندر کی صحیح کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔ قاضی صاحب نے زعمائے ادب کا تحقیقی تجزیہ کر کے ان کی راست گفتاری یا دروغ گوئی کا فیصلہ کیا۔ چونکہ قاضی صاحب بھی ایک شعبہ ادب تحقیق میں سب

سے اونچے مقام پر فائز ہیں اس لیے مناسب ہو گا کہ ان کی تقلید میں ان کو اسی طرح آنک لیا جائے۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار ان کے لیے کہتے ہیں ''وہ بے لاگ محقق جس نے سچ کی تلاش میں، سچ سننے، سچ دیکھنے اور سچ کہنے کی ایک بار قسم کھائی تو موت تک اس کو نبھا دیا!! سچ، صرف سچ اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں! ڈاکٹر محمد حسن کہتے ہیں ''اردو تحقیق میں صداقت کا ایک نام قاضی عبدالودود ہے۔ پوری زندگی — جو کچھ کہا سچ کہا اور سچ کے سوا اور کچھ نہیں کہا'' (یادگار نامہ قاضی عبدالودود ص۸۲) لیکن مجھ عاصی پر معاصی، ننگِ محققاں کا راسخ عقیدہ ہے کہ گرہستی یعنی دنیا دار انسان کے لیے سوفی صدی راست گو ہونا ممکن نہیں۔ اگر وہ صرف سچ اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں کو اپنا شعار بنا لے گا تو ایک ہفتے کے اندر جیل کی سیر کرے گا یا زدوکوب اور دست و پاشکنی سے دوچار ہوگا یا جام شہادت نوش کر جائے گا۔ قاضی صاحب نہ فرشتہ تھے، نہ پندرھویں معصوم، وہ سماج کے بیچ رہ کر ماشما کی طرح بات چیت کرتے تھے۔

آپ نے دیکھا کہ شوکت سبزواری کے اعتراضات کی روشنی میں انھوں نے غالب بحیثیتِ محقق کے نقشِ اول کی کایا پلٹ کر دی لیکن اسے عجلت اور سہو طباعت کا ردعمل قرار دیا جس پر شوکت نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا۔ جب تک میں نے قاضی صاحب کو تفصیل سے نہیں پڑھا تھا ان کی راست گوئی کے بارے میں میرا بھی وہی تاثر تھا جو ان کے دوسرے عقیدت مندوں کا۔ لیکن ان کا بالاستیعاب تحقیقی مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بھی انسانی کمزوریوں کا شکار تھے۔ مآثرِ غالب کے اجلہ بدیہیات کے معاملے میں قاضی صاحب پھر امتحان میں فیل ہوئے۔ ان معاملات میں ان کا عذر لنگ معمولی نہیں۔ سفید جھوٹ تھا۔ مطالعے کے دوران میں مجھے متعدد مثالیں دکھائی دیں جنھیں پورا سچ نہیں کہہ سکتے۔

وہ کسی پر اعتراض کرتے وقت بارہا جو آدھی حقیقت کو قصداً چھپا لیتے ہیں کیا وہ پورا سچ ہے مثلاً مالک رام کے ذکر غالب کے تبصرے کے آخر میں کہنا "اس سے صاف ظاہر

ہے کہ غالب وشہید میں کبھی نزاع نہیں ہوئی'' جب کہ وہ یقیناً جانتے تھے کہ غالب شہید سے سخت ناراض تھے''۔ بے خبر کے نام غالب کے جس خط کو انھوں نے غالب کے دروغ کی مثال میں پیش کیا اسی کو سچ بنا کر مالک رام کے خلاف شہادت لائے۔ وہ اپنے مضامین میں جو یک رخی تصویر پیش کرتے ہیں کیا وہ سچ ہے۔ میں نے قاضی صاحب کے کسی مضمون کے شروع میں یہ لکھا نہیں دیکھا کہ وہ خوبیوں سے صرفِ نظر کر کے صرف اغلاط ہی پیش کر رہے ہیں۔ وہ غالب کو صرف دروغ گو، عیاّر قرار دیتے ہیں جب کہ میں اردو کے تمام ادیبوں میں اس کی شخصیت کو سب سے دلآویز مانتا ہوں۔ وہ میر کے پست اشعار کی بنا پر اس کے عشق کو ہوس کارانہ سمجھتے ہیں۔ جب کہ ان کی غزلوں اور مثنویوں میں بحیثیت مجموعی بڑے منزہ عشق کا بیان ہے۔

وہ دوسروں کی تحقیق کے بعد وہی تحقیق پیش کرتے ہیں تو ان کی انا اس کی اجازت نہیں دیتی کہ کسی دوسرے کی سبقت کا اعتراف کر لیں۔ آزاد بحیثیت محقق میں شیرانی، شیخ چاند وغیرہ کی بعض دریافتوں کو دہرایا۔ نادر خطوطِ غالب کے تبصرے میں اس کے جعل کی پوری کیفیت مالک رام پیش کر چکے تھے۔ قاضی صاحب کے پاس مزید اضافے کے لیے کیا بچا تھا۔ انھوں نے مالک رام کا نام کیوں نہیں لیا۔ یہی کیفیت فارسی قصیدوں کے ممدوحین بدلنے کی ہے۔ میں یہ سب لکھ چکا ہوں۔ اعادہ کیوں کروں۔ کیا قاضی صاحب کے یہ اقوال پورم پور سچے ہیں۔

۱۔ نامحتاط مصنف بالارادہ ایسی باتیں بڑھا دیا کرتے ہیں جن کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال جناب مالک رام کی یہ عبارت ہے ''عبدالصمد ــــ زردشتی مذہب کے مرید تھے'' (احوالِ غالب طبع دوم ص ۲۴۸)۔ مالک رام نے ایسا بالارادہ لکھا، سہواً نہیں، اس کا کیا ثبوت ہے؟

۲۔ مئی ۱۹۳۶ء کے معیار کے اداریے میں انھوں نے مہاتما گاندھی کو اردو رسم الخط اور مسلمانوں کا دشمن قرار دیا۔ کیا انھوں نے تحقیقی حزم و احتیاط سے کام لیا۔ ان کے لیے کہتے ہیں ''کیا آپ ایسے شخص کو قائل کر سکتے ہیں جو عالم بالا سے براہِ

راست تعلقات رکھتا ہے اور جس کا ہر قول و فعل دیوتاؤں کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ کیا انھوں نے اپنے اس بہتان کا کوئی ثبوت دیا کہ گاندھی جی نے جنگِ عظیم میں انگریزوں کے لیے رنگروٹ بھرتی کرائے تھے۔

۳۔ ''مولانا جیسی علمیت'' کون سا علم؟ جہاں تک شعریات کا تعلق ہے ابوالکلام کو محمد علی سے نسبت نہیں اسلامیات کا علم البتہ ان کا زیادہ تھا۔ مگر ایسا نہیں جس پر فخر کیا جا سکے (ابوالکلام آزاد کے بارے میں ص ۴۷)۔ مولانا محمد علی نے کم از کم اردو میں تو ایسی عالمانہ کتابیں نہیں لکھیں جیسی مولانا آزاد نے:

۴۔ ابوالکلام کی قیادت کے بارے میں سعدی کی رائے سن لیجیے۔

کس نیاید بزیر سایہ بوم ور ہما از جہاں شود معدوم

غبارِ خاطر ابھی حال میں دیکھی۔ اور باتوں سے قطعِ نظر مصنف صحیح اردو نہیں لکھ سکتا (مکتوب مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۴۸ء بنام مختار الدین احمد)۔ کیا یہ آسمانی سچ ہے کہ سعدی نے یہ شعر ابوالکلام کے بارے میں لکھا تھا۔ کیا آزاد صحیح اردو نہیں لکھ سکتے تھے۔ کیا غبارِ خاطر میں کوئی حسن نہیں۔

۵۔ بہت دنوں سے میں نے طے کر لیا ہے کہ میں اپنے کام کی نسبت خود کوئی رائے ظاہر نہ کروں (کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں ص ۴۹)۔ یہ جو معاصر قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء پر معاصر ۳۷ میں ۳۵ صفحوں پر تنقید کی ہے کیا وہ اپنے کام کے بارے میں رائے نہیں ہے۔ کیا معاصر کے ۳۷ کے یہ بیانات بڑے تابناک سچ کے نمونے ہیں:

۶۔ ان (گیان چند) کے مضامین میں لغو باتیں بہت ہوتی ہیں (ایضاً ص ۳۸)

۷۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صائب الرائے نہ تھے (ایضاً ص ۴۱)

۸۔ پیروی کے فن میں کم لوگ ان (ڈاکٹر حسنین) کا مقابلہ کر سکتے ہیں (ص ۴۹)

جو حضرات مندرجہ بالا طریق پر چلنے والے فاضل کو صرف سچ پر عمل پیرا قرار دیں

ان کا اور میرا سچ کا تصور مختلف ہے۔

(۱۵) قاضی صاحب نے انگریزی کی ایک کتاب سے لے کر وضاحتِ بیان کے عنوان سے ۲۵ اصول پیش کیے۔ ان میں نمبر ۱۵ یہ ہے۔

کسی فقرے سے ایسی توقع پیدا نہیں ہونی چاہیے جو پوری نہ ہو سکے (رسالہ تحقیق ص ۳، نیز تحقیقاتِ ودود ص ۱۱۴)

قاضی صاحب تصنیف و تالیف کے باب میں اپنی سست رفتاری کو جو بعض اوقات جمود بن جاتی ہے، فراموش کر کے قارئین کو نوید دیتے رہتے ہیں کہ فلاں کتاب لکھ رہے ہیں، فلاں مضمون کا بقیہ تکملے میں پورا ہو گا۔ لیکن بسا اوقات وہ ساعت نہیں آتی۔ میں نے اپنی کتاب ''قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن'' میں ایسی کئی تدوینات کی تفصیل دی ہے جنھیں تقاضوں کے باوجود قاضی صاحب نے پورا نہیں کیا۔ یہاں اسی قسم کی کچھ اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں جہاں وہ قاری کو بہلا رہے ہیں لیکن اپنا وعدہ ایفا نہ کر سکے۔

۱۔ کتاب (دریائے لطافت) کی اہمیت کا احساس کر کے اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ کتاب پر بالتفصیل نظر ڈالی جائے اور جو اغلاط [نسخہ انجمن ۱۹۱۶ء] میں رہ گئی ہیں ان کی تصحیح بھی ضمناً کر دی جائے...... پہلے مضمون میں ہم ...... سے بحث کریں گے (معیار مارچ ۳۶ء ص ۵۶) خیال ہوتا تھا کہ آئندہ کسی مضمون میں اختلافات و اغلاط پر نظر ڈالیں گے لیکن مضمون نہ آیا۔

۲۔ ارگجے کے بارے میں کچھ اور بھی معلوم ہوا ہے۔ یہ حصہ ۴ میں پیش ہوگا (لسانیات۔ زباں شناسی ص ۵۳)۔ یہ حصہ نہ آیا۔

۳۔ مضمون میر ماشاء اللہ خاں مصدر دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں مصدر، ان کے بزرگوں اور ان کے اخلاف کے حالات ہیں۔ دوسرے حصے میں مصدر کا حال جو دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا ہے لکھا جائے گا (میر ماشاء اللہ خاں مصدر۔ مصحفی اور ان کے اہم معاصرین ص ۱۷۲)۔ دوسرا حصہ نہ آیا۔

۴۔ ان (سودا) کے چند کبت کلیات سودا کے اس قلمی نسخے میں ہیں جو کتب خانہ شرقیہ میں ہے۔ دو کبت فی الحال پیش کیے جاتے ہیں۔ باقی آئندہ پیش ہوں گے (درد وسودا ص ۶۳) باقی کبت پیش نہ ہوئے۔

۵۔ تفاصیل تبصرہ مغل اور اردو میں جو زیر تحریر ہے ملیں گے (علی گڑھ میگزین طنز و ظرافت نمبر ۱۹۵۳ء ص ۱۳۰)۔ تبصرہ نہ آیا۔

۶۔ نثر مرجز کی بحث میں اس کے متعلق تحقیق کے بعد لکھوں گا (جہان غالب ص ۴۷)۔ نہیں لکھی۔

۷۔ مندرجات آبِ حیات کی تنقید ابھی ختم نہیں ہوئی۔ قسط سوم و چہارم میں بھی اس سے بحث ہوگی (آزاد بحیثیت محقق ص ۴۱) چوتھی قسط نہ آئی۔

۸۔ اس سے میں قسط ۴ میں بحث کروں گا کہ ناصر خسرو بلغار گیا تھا کہ نہیں (ایضاً ص ۷۴)۔ قسط ۴ نہیں آئی۔

۹۔ بیدل پر ایک مقالہ لکھا جا رہا ہے، اس مقالے میں جو باتیں مجملاً درج ہیں، بشرطِ امکان اس مقالے میں تحریر ہوں گی (اختر اورینوی کی کتاب پر تبصرہ۔ مقالاتِ ودود متن ص ۵ حاشیہ) بیدل پر مقالہ نہیں آیا۔

۱۰۔ اکبر کا مزید احوال و کلام کسی دوسرے موقع پر پیش ہوگا (مثنویِ اکبر علی خاں اکبر۔ اردو شعر و ادب ص ۴۵)۔ نہ ہوا۔

۱۱۔ اس مقالے میں دیوانِ غالب کے نسخہ حمیدیہ اور نسخہ شیرانی سے بحث کی گئی ہے، مگر یہ ناتمام ہے۔ اس کا تکملہ آیندہ لکھا جائے گا (دیوانِ غالب کے دو نسخے۔ کچھ غالب کے بارے میں حصہ اول ص ۱۱۸) تکملہ نہ آیا۔

۱۲۔ دیوانِ نوا کا تکملہ آیندہ لکھا جائے گا (دیوانِ نوا۔ اردو شعر و ادب ص ۴۶)۔ تکملہ نہ آیا۔

۱۳۔ میرا ارادہ درد پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا ہے۔ اس میں کل باتیں حوالے کے ساتھ درج ہوں گی (درد اور آبِ حیات۔ درد وسودا ص ۱۲) نہیں آئی۔

۱۴۔ ادارۂ تحقیقاتِ اردو (پٹنہ) کے پروگرام میں کلیاتِ سودا کے ناقدانہ نسخے کی اشاعت شامل ہے اور حالات ساز گار ہوئے تو اس خیال کو عملی جامہ پہنایا جائے گا (کلیاتِ سودا کے ناقدانہ نسخے کی ضرورت۔ درد و سودا ص۵۳)

ظاہرا قاضی صاحب خود اس کی تمنا رکھتے تھے۔ قاضی صاحب اور اتنی بڑی کتاب!

۱۵۔ مجھے یاد آتا ہے کہ کمال کے تذکرے میں ان (مرزا علی لطف) کے حیدر آباد جانے کا ذکر ہے۔ اس کے متعلق میں قسط چار میں لکھوں گا۔ (عبدالحق بحیثیت محقق ص۱۷۸) قسط ۴ نہ آئی۔

۱۶۔ پہلے مقدمے کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ بعد ازاں ان کے متن سے بحث ہو گی (دیوانِ یقین مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم (۱) مشمولہ تبصرے ص۲۷)۔ متن سے متعلق دوسرا حصہ نہ آیا۔

۱۷۔ اپنے مضمون اسلافِ درد کی ابتدا میں کہتے ہیں کہ اس میں چار فصلیں ہوں گی۔ پہلی تین میں اسلاف کے متعلق درد، ان کے اعزہ اور اغیار کے بیانات ہوں گے۔ چوتھی فصل میں فصولِ ماسبق کی تنقید ہے۔ مضمون میں تین فصلیں ہیں (درد و سودا ص ۵) چوتھی نہ آئی۔

۱۸۔ شمارہ ۳۱ تا ۴۴ کے بارے میں کبھی اور لکھا جائے گا (اخبار الاخیار مظفر پور۔ اہم اخبارات و رسائل ص۶۵) نہ لکھا گیا۔

۱۹۔ ''مولانا احمد علی اور غالب'' کی دو قسطیں تحریک نومبر ۶۵ء اور جنوری ۶۶ میں آئی۔ ان دو قسطوں میں قاطع برہان کے ۱۱ لفظوں کے بارے میں غالب اور حریفوں کی بحث درج کی۔ دوسری قسط کے شروع میں لکھا قسط ثالث میں ان سب کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کروں گا (کچھ غالب کے بارے میں حصہ دوم ص ۳۹۸)۔ قارئین قسط ثالث اور قاضی صاحب کی رائے سے محروم رہے۔

۲۰۔ تذکرۂ نصر آبادی کے آخر میں لکھا ہے باقی دارد (فارسی شعر و ادب ص۱۸۳)۔ وہ بقیہ کبھی نہ آیا۔

۲۱۔ مظفر نامہ نئی تاریخ بنگال از کرم علی: ذیل میں پہلے اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ پھر بتایا جائے گا کہ اس کا مصنف کن امور میں دوسرے مورخوں سے اختلاف رکھتا ہے (ایضاً ص۱۸۴)۔ نہ بتایا۔

۲۲۔ اس مقالے کا تتمہ بعد کو لکھا جائے گا۔ کچھ باتیں جو اصل مقالے میں بالکل نہیں یا ناتمام ہیں۔ اس میں ملیں گی (گلشن سخن۔ شعرا کے تذکرے ص۶۴)۔ تتمہ کبھی نہ آیا۔

۲۳۔ خدا بخش لائبریری میں باخوزی کی رباعیوں کا شاید واحد قلمی نسخہ ہے۔ قاضی صاحب نے تحریک کی کہ انھیں شائع کیا جائے اور یہ کام انھیں کے سپرد ہوا۔ رباعیوں کی نقلیں کی گئیں۔ بلاکس بنوائے گئے۔ کاغذ خریدا گیا لیکن یہ کام بھی انجام نہ پا سکا (کلیم الدین احمد: حرفِ آخر۔ معاصر ۷۶ء ص ۴۲۸)

۲۴۔ میں (نے) فروری ۱۹۷۹ء میں پٹنے میں قاضی صاحب سے پوچھا کہ حسنِ مطلع کسے کہتے ہیں۔ سودا کے رسالہ عبرت الغافلین پنڈت آنند نرائن ملا، شمس الرحمٰن فاروقی اور اپنی رایوں سے آگاہ کیا۔ قاضی صاحب نے کہا میں کتابیں دیکھ کر آپ کو لکھ دوں گا۔ انھوں نے کبھی نہ لکھا۔

۲۵۔ اس وقت دیوانِ سیّد محمود آزاد کے اردو اشعار پیش ہوتے ہیں۔ آئندہ ان کے حالات لکھے جائیں گے اور دایونِ مطبوعہ سے مفصل بحث ہوگی (دیوانِ سیّد محمود آزاد کے اردو اشعار۔ اردو شعر و ادب ص ۱۷۹) حالات تو کیا لکھے جاتے، اردو اشعار والا معاصر ۳۵ ہی واپس لے لیا گیا۔ ان بیانات میں موعودہ کتاب، تکملہ، تتمہ، اگلی قسط کبھی نہ آئی۔ قاضی صاحب منصوبہ بندی سے کام نہیں کر سکتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی صلاحیت کہاں ختم ہوتی ہے اور عدمِ صلاحیت کہاں شروع ہو جاتی ہے۔

۱۵۔ لہجہ گفتار۔ قاضی صاحب کا اندازِ گفتگو کئی بار عام خوش اخلاقی کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ کہنے کو تو انھوں نے غالب۔ زباں پہلوان میں ایک یہ اصول پیش کیا

ہے۔

''سوقیانہ لہجہ اختیار کرنا خود اپنی بد ذوقی کا اعلان کرنا ہے، علمی مباحث میں سب و شتم کی تو گنجائش ہی نہیں'' (غالب کے بارے میں، دوم ص ۲۰۴) دوسروں نے نہ صرف سوقیانہ لہجے بلکہ طعن و تشنیع تک کرنا واجب قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو میری کتاب 'تحقیق کا فن' (لکھنؤ ایڈیشن ص ۸۳-۵۸۲ اسلام آباد ایڈیشن ص ۳۸-۵۳۷) نیز میرا مضمون اخلاقیات تحقیق مشمولہ کھوج ص ۱۲ تا ۱۷)۔ چند مغربیوں کے اقوال :

غیر معتدل تنقید نہیں کرنی چاہیے۔ غلطیاں ہوں گی۔ کسی کی علمی اہلیت پر طنز نہ کیجیے (رچرڈ ایلک۔ تحقیق کا فن ص ۵۸۳)

دوسرے محقق سے خلق کے ساتھ اختلاف کیجیے (جارج والٹن ۔ ایضاً تحقیق کا فن)

طنز سے کام نہ لیجیے۔ غیر جانب داری سے لکھیے ۔(رابرٹ براس ۔ ایضاً)

دوسروں کی غلطیاں خلق کے ساتھ بیان کیجیے (پارسنس۔ ایضاً)

اور ہماری برادری کے اقوال :

محمود شیرانی نے اپنے شاگرد ابراہیم ڈار کو لکھا تھا ''یہ بھی یاد رہے کہ زبان اور لہجہ نرم اور مناسب رہے'' (بیدار: دو ہم آہنگ محقق۔ غالب نامہ جنوری ۸۷ء ص ۹۲)

رشید احمد صدیقی نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ اشتعال (Provocation) کتنا بھی شدید کیوں نہ ہو، تحریر میں شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیے۔

لیکن قاضی صاحب کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ میں نے شعبہ تحقیق انجمن اساتذۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے خطبہ صدارت میں کہا تھا ''اغلاط کی نشان دہی میں احساس برتری یا طنز و تمسخر کا شائبہ نہ ہو۔ غلطی کون نہیں کرتا، اغلاط کی طرف ہمدردی و دل سوزی کے

ساتھ اشارہ کیا جائے'' اس پر قاضی صاحب نے مجھ پر طنز و استہزا کرتے ہوئے کہا۔

''ہندوستان میں نرمی کی نہیں سختی کی ضرورت ہے بلکہ بہتوں کو طنزیہ الفاظ میں نہیں صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ تحقیق آپ کے بس کا روگ نہیں'' آپ کو کوئی اور کام کرنا چاہیے'' (اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں ص ۳۴) ایسا فتویٰ وہی دے سکتا ہے جو خود کو تحقیق کا خدا یا کم از کم خدائی فوجدار سمجھتا ہو۔ میں اس انا سے محروم ہوں کہ کسی کو بھی انجمنِ تحقیق سے بدر کر سکوں۔ میں دلآزاری کا نہیں نرمی کا لہجہ پسند کروں گا۔ قاضی صاحب جب اعتراض کرتے ہیں تو اپنے لیے ہر سطح کا طنز و تشنیع روا رکھتے ہیں بلکہ ذاتیات تک کو درمیان میں لے آتے ہیں۔ مولوی عبدالحق اردو دنیا کی کتنی محترم شخصیت تھے۔ عمر میں قاضی صاحب سے کافی بڑے لیکن قاضی صاحب نے جب عبدالحق بحیثیت محقق کا سلسلہ شروع کیا تو پہلے ہی صفحے پر حاشیہ آرائی کی'' کہنے کو تو ڈاکٹر عبدالحق انجمن ترقی اردو کے معتمد تھے لیکن یہ کوئی راز نہیں کہ انھیں اس ادارے میں مرتبہ آمریت حاصل تھا۔ کل امور کا فیصلہ وہ بے شرکت غیرے کر سکتے تھے۔ (عبدالحق بحیثیت محقق ص ۲)

مولوی صاحب کی ذکرِ میر کی تدوین پر لکھتے ہوئے اس مشاہدے کی کون سی معنویت تھی وہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ قاضی صاحب مالک رام کے مضمون عبدالصمد استادِ غالب کے جواب میں لکھتے ہیں۔

نامحتاط مصنف بالارادہ ایسی باتیں بڑھا دیا کرتے ہیں جن کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال جناب مالک رام کی یہ عبارت ہے: عبدالصمد زردشتی مذہب کے مرید تھے۔ (احوالِ غالب ۱۹۸۶ء ص ۲۴۸)

''اس کے ساتھ اگر وہ یہ بھی لکھ دیتے کہ حالی و شیفتہ نے عبدالصمد سے ملاقات کی تھی تو میں ان کا کچھ بگاڑ نہ سکتا (ایضاً ص ۴۵-۲۴۴) اس پر مالک رام نے بڑی متانت کے ساتھ لکھا:

''مجھے واقعی حیرت ہے کہ انھوں نے ایک سنجیدہ گفتگو میں یہ لہجہ اختیار کیا (فسانہ غالب ص ۷۶)

خواجہ احمد فاروقی کی تدوین تذکرۂ عمدۂ منتخبہ کی پیش گفتار اس استہزا سے شروع کرتے ہیں:

تذکرۂ سرور سلسلہ اشاعتِ مخطوطاتِ اردو دہلی یونیورسٹی کی پہلی کڑی ہے۔ اسے دیکھ کر یہ باور کرنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ اس غرض سے چھپوایا گیا ہے کہ قدیم متون کی ترتیب و تصحیح کا کام کرنے والے متنبہ ہو جائیں کہ کس طرح اسے نہ کرنا چاہیے۔ اگر ایسا ہے تو دانش گاہ کو اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی ہوئی ہے (اشتر و سوزن ص ۳)

اسی طرح وہ بعض اوقات کسی کی کمزوری کی گرفت کرنے پر اس لہجے میں سوال کرتے ہیں یا مشاہدہ پیش کرتے ہیں جیسے وہ کوتوال ہیں اور پوچھ گچھ کے مرکز (Interogation Centre) میں کسی ملزم سے استفسار کر رہے ہیں مثلاً:

۱۔ نکات الشعراء:

وہی دیر وہی بت وہی مالا یہی انشاء اللہ تعالیٰ (کذا)

ڈاکٹر عبدالحق سے استدعا ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ یہ شعر کس بحر کا ہے اور دونوں مصرع ہم وزن ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو ان کی تقطیع کس طرح ہو گی۔ (عبدالحق بحثیت محقق ص ۱۶۰)

۲۔ نکات الشعرا کے مقدمے میں مولوی صاحب نے لکھا تھا کہ دتاسی کے قول کے مطابق گردیزی بھی اپنے تذکرے کے لیے اولیت کا مدعی ہے۔ قاضی صاحب کی رائے میں دتاسی نے یہ کہیں نہیں کہا۔ مولوی صاحب کو دارالتفتیش میں کھڑا کر کے پوچھتے ہیں ڈاکٹر عبدالحق کو اصرار ہے کہ دتاسی نے واقعی وہ بات کہی ہے جو انھوں نے اس کی طرف منسوب کی ہے تو اس کی اصل عبارت پیش کریں اور یہ بتائیں کہ کس کتاب کے کس صفحے میں ہے۔ (ایضاً ص ۱۱۷)

۳۔ فرہنگِ غالب۔ جناب عرشی سے استدعا ہے کہ وہ ان ایرانیوں کے نام بتائیں جنھوں نے ضوابطِ عظیم ...... اور گلشنِ اکبر سے استفادہ کیا ہے۔ (غالب بہ حیثیت

محقق پٹنہ ۱۹۹۵ء ص ۱۷۲)

۴۔ جنابِ عرشی فرہنگِ جہانگیری، مجمع الفرس، سراج اللغتہ کے دیباچوں کو ایک بار پھر پڑھ لیں تو عجب نہیں کہ انھیں اپنی رائے بدلنی پڑے۔ (ایضاً)

۵۔ سیّد حسن عسکری لکھتے ہیں کہ ایک مشہور پروفیسر اور صدر شعبہ اردو [خواجہ احمد فاروقی] قاضی صاحب کے یہاں مہمان تھے۔ قاضی صاحب نے ان کے اعزاز میں دعوت دی۔ اسی اثنا میں کسی نے ایک پارسل پروفیسر صاحب کے حوالے کیا۔ انھوں نے اسے کھولا اور اپنی نئی شائع شدہ کتاب کو قاضی صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ کہا یہ پہلا نسخہ ہے جو رجسٹری ڈائریکٹ ہو کر میرے پاس پہنچا ہے۔ قاضی صاحب نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، ایک جگہ نگاہ ٹھٹکی۔ حسبِ عادت ایک دیئے گئے حوالے کے متعلق کچھ پوچھ بیٹھے۔ کوئی تشفی بخش جواب نہ ملا۔ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ کیا آپ نے اس کتاب کو کہیں دیکھا یا پڑھا ہے۔ میں نے کہا پڑھا تو نہیں البتہ اتنا جانتا ہوں کہ میرے استاد محترم سر جادو ناتھ سرکار نے اس کی فوٹو کاپی لندن سے منگوائی تھی۔ پھر پروفیسر صاحب کی طرف پلٹے۔ پوچھا آپ نے اس کی فوٹو کاپی یا اصل کتاب کو کب اور کہاں دیکھا۔ یاد نہیں کیا جواب ملا۔ اس کے بعد معاصر کے دو نمبروں کے بیشتر اوراق منقل تبصرہ و تنقید کی نذر ہو گئے (معاصر ۷۶ء ص ۱۹۶)

اس موقع پر مہمانِ خصوصی کو مزید شرمندہ نہ کر کے ستار عیوب بن کر بات ٹال دینی چاہیے تھی۔

ان کے مضمون 'غالب- زباں پہلوان' کی میزان میں آخری پیمانہ یہ ہے۔

دوسروں سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ جو امور ہم اپنے لیے جائز سمجھتے ہیں وہ ان کے واسطے ناروا قرار دیں'' وہ عمر بھر دوسروں کی بے محابا اور بے لگام تنقیص کرتے رہے۔ میں نے اپنا مضمون بت شکن محقق لکھنے سے پہلے انھیں خط لکھا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ اعتراض کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن غالباً یہ نہیں سوچتے ہوں گے کہ کوئی

واقعی ان پر بھی اعتراض کر سکتا ہے۔ اپنے اوپر اعتراض سے وہ آتش زیرپا ہو جاتے تھے۔ معاصر قاضی عبدالودود نمبر ۱۹۷۶ء پر خود ہی تبصرہ کرنے کی بدعت نکالی تو کسی کا شکریہ ادا کرنے کی یا کسی کے لیے ایک حرفِ تحسین ادا کرنے کی توفیق نہ ہوئی، ہاں لچر، لغو جیسے غیر علمی الفاظ استعمال کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوا۔ ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے میرے مضمون بُت شکن محقق کے بارے میں لکھا ہے۔

ان (قاضی صاحب) کی تحقیقی بصیرت، وسعتِ علم، راست بازی اور صاف گوئی کا اعتراف فی الواقع ایک حقیقت مسلمہ کا عتراف اور ایک مثبت عمل ہے جس میں بظاہر کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ اس کے برخلاف ان کے فیصلوں سے تعرض ان کے فرمودات کی تردید اور ان کے صداقت سے اختلاف ایک پُر خطر اقدام ہے جس کے لیے غیر معمولی دقت نظر، وسعتِ مطالعہ اور قُوتِ فیصلہ درکار ہے۔ جین صاحب قاضی صاحب کے پہلے معتبر نقاد ہیں جنھوں نے یہ کام پوری جرأت اور دیانت داری کے ساتھ انجام دیا ہے (ڈاکٹر گیان چند اور قاضی عبدالودودؔ۔ غالب نامہ) مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے قاضی صاحب کی زندگی میں ان کی ان تمام خامیوں کو جن سے میں اس وقت واقف تھا بے خوفی کے ساتھ ان کے سامنے انڈیل دیا۔ اس کے خمیازے میں مجھے ان سے سب و شتم ملے۔ اس کا مجھے ملال نہیں۔ میں اسے ایک سال خوردہ بزرگ کی جھلاہٹ کا اُبال سمجھ کر درگزر کرتا ہوں۔

شاگردانِ رشک

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

سرسیّد نگر، علی گڑھ

فہرست

باسمہ

شیخ عبداللہ امام بخش کا تخلص ''ناسخ'' خود اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ انھوں نے شاعری کے بارے میں قدیمی تصورات کو منسوخ کر دینے کی نیت سے اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ ان قدیمی تصورات کے کئی پہلو تھے اور ناسخ نے ہر پہلو پر ضرب لگانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ فرد واحد کا عمل زمانے کی روش کو بدلنا تو کجا، اس وقت تک موثر بھی ثابت نہیں ہو سکتا جب تک باصلاحیت اور مخلص افراد کی ایک مقتدر جماعت اس کی روش کو اپنے لیے دستور و آئین کی حیثیت سے قبول و اختیار نہ کر لے۔ شعر گوئی کے لیے نئے تصورات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ، شیخ امام بخش ناسخ کا بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے سو سے زیادہ ایسے صاحب استعداد شاگردوں کی ایک موثر جماعت بھی تیار کر دی تھی جو استاد کی دکھائی ہوئی راہوں کے نشیب و فراز اور پیچ و خم پر بھی بخوبی نظر رکھ سکتے تھے۔ ایک دو کو چھوڑ کر جو برخود غلط ہو جانے کی وجہ سے استاد کے نام اور کلام کی وقعت کو کم کر کے دکھانے کے خواہاں تھے، ناسخ کے سبھی شاگردان کے بنائے ہوئے آئین پر سختی سے نہ صرف کاربند تھے بلکہ اپنے اپنے طور پر اسی آئین کی روشنی میں شعر و زبان سے متعلق لیے گئے اصول اور ضابطے اختراع کر کے کام کو آگے بڑھانے اور استاد کے نام کو چمکانے پر اپنی ساری صلاحیتوں کو صَرف کرتے رہے تھے۔

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے جو ناسخ کے نام برآوردہ شاگردوں میں سے تھے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

''بعد[۱] وفات جناب مغفور (شیخ ناسخ) چند شخص شاگردانِ رشید

ایسے نامور ہوئے کہ سب نے ان کو مانا اور اہل کمال سے جانا۔ از انجملہ جناب سید علی اوسط صاحب رشک سلمہ اللہ اور خواجہ وزیر مرحوم اور مرزا محمد رضا برق مغفور اور شیخ امداد حسین بحر کہ ہر ایک ان میں سخنور یگانہ اور بے مثل زمانہ ہے صاحبان طبائع اخاذ ہیں اور اذہان ان کے نقاد۔

سید علی اوسط صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بڑے صاحب تدقیق و اہل استعداد باتحقیق ہیں کہ مثل ونظیر اپنا نہیں رکھتے۔ چند قواعد اور اصول اور قیود اختراع کیے کہ اکثر قابل قبول و پسند اہل سخن ہیں۔ اگرچہ فی الجملہ دشواری فکر میں ہوتی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ ان میں اکثر امور پسندیدہ ہیں، بعض تو بطور کلیہ اور بعض بطور اکثریہ تجربہ سے اور غور سے معلوم ہوئے ہیں......''

میر علی اوسط رشک کے شاگردوں کی تعداد پانچ درجن سے بھی زیادہ تھی۔ ان میں سے شاید کوئی ایک بھی کھل کر ان سے منحرف نہیں ہوا تھا۔ ہر ایک اپنے استاد کا گرویدہ اور شیدائی معلوم ہوتا ہے۔ تذکرہ نویسوں نے اگرچہ میر رشک کے تلامذہ کے حالات بہت اختصار سے لکھے ہیں، ہر ایک کے لیے توصیفی اور تعریفی انداز اختیار کیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر صاحب دیوان اور بعض صاحب تصانیف بھی ہوئے ہیں۔

میر رشک کے شاگردوں کے جو کچھ حالات دریافت ہو سکے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک عروض اور بیان و بدیع وغیرہ کے اصول اور مسائل و مباحث سے کم وبیش واقفیت رکھنے کے علاوہ سیر لغات اور تحقیق الفاظ کو بھی شعر گوئی کے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ وہ شاعری کو محض جذبات کے اظہار کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کے لیے علم اور مطالعے کو بھی لازمی قرار دیتے تھے۔ واقعات شاہد ہیں کہ ان میں تعلیم و تدریس کے باضابطہ سلسلے بھی جاری تھے۔ نثر ونظم میں مربوط کتابوں کے علاوہ ان میں سے بعض نے اسی نقطۂ نظر سے اپنے دیوان بھی تیار کیے تھے۔

نواب معتمدالدولہ معزول ہونے کے بعد لکھنؤ سے کانپور پہنچے تھے۔ ان کی خرابی میں اس لیے مقام کی تعمیر کی صورت میں مضمر تھی۔ وہ خود تو بہت جلد انتقال کر گئے تھے لیکن ان کی اولاد کی سرپرستی میں یہ ''کوردہ'' آباد ہو کر بہت جلد ایک چھوٹا سا بارونق شہر بن گیا تھا۔ امین الدولہ، نظام الدولہ، ان کے اعزا اور اقربا کی شخصیتوں کو اس شہر میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ان کا ہر فعل اور ہر عمل شہر والوں کے لیے نمونہ اور معیار تھا۔ شعر وسخن اور علم و ادب کے معاملے میں بھی خاص و عام اسی گھرانے سے فیض پا رہے تھے۔ میر علی اوسط رشک امین الدولہ اور نظام الدولہ دونوں کے استاد تھے اس لیے ان کے اندازِ فکر اور طرزِ سخن کو اس شہر میں سکۂ رائج الوقت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

لکھنؤ کے خوش باشوں کے لیے ''کوردہ کانپور'' میں آنا بجائے خود بڑا سخت واقعہ تھا۔ اس ''دیس نکالا'' کے غم نے ان کے دل و دماغ کو اس طرح متاثر کیا تھا:

کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس شہر میں اول روز سے جو اشعار کہے گے وہ کانپور کے مخصوص ماحول، حالات اور واقعات سے ہی متعلق تھے۔ کچھ مدت کے بعد جب طبیعتیں معمول پر آئیں تو ''ترسائے کانپور'' کی طرف دل مایل ہوئے۔ غرض کانپور کی مختلف چیزیں، تفریحیں اور مشغلے وغیرہ شاعری کے مقبول موضوعات بن گئے۔ شعرائے کانپور کے دواوین میں ایسی غزلوں کی کثرت ہے جن میں مطلع سے مقطع تک ایک مخصوص فضا پائی جاتی ہے۔ بہت سی غزلوں پر تو عنوان بھی قایم کیے جا سکتے ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد نے میر علی اوسط رشک کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کو ''شاعری (۲) کی سرکار سے تاریخیں کہنے کا ٹھیکہ ملا۔''

بے شک میر رشکؔ نے بڑی کثرت سے تاریخیں نظم کی ہیں لیکن اس سلسلے میں بھی ان کا بڑا اور اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بعض شاگردوں کو اس فن کا غیر معمولی چسکا لگا دیا تھا اور یہ شوق ان کے حالات سے مطابقت بھی رکھتا تھا۔ میر رشکؔ کے شاگردوں میں سے ایک سے زاید نے ایسے دیوان مرتب کیے تھے جن کی ہر غزل کا مقطع تاریخی

ہے۔ ان غزلوں سے اس زمانے کی تاریخ کے کھانچوں کو پُر کیا جا سکتا ہے بلکہ اُس عہد کے تصنیفی، تالیفی کارناموں اور ادبی، معاشرتی اور تہذیبی معاملوں اور فکر و خیال کے انداز وغیرہ کا بھی صحیح طور پر علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مولانا حسرتؔ موہانی نے (۳) میر رشکؔ کے پچیس شاگردوں کے نام لکھے ہیں اور صفیر بلگرامی (۴) نے ان کی تعداد پینتیس بتائی ہے لیکن صحیح تعداد بہت زیادہ ہے۔ راقم نے جو فہرست تیار کی ہے اس کے بھی مکمل ہونے کا دعوا کرنا غلط ہوگا۔ یقیناً اور نام بھی ہوں گے جن کا علم راقم کو نہیں ہو سکا ہے۔

کہنے کو تو یہ میر علی اوسط رشکؔ کے شاگردوں کا تذکرہ ہے لیکن غور کریں تو یہ ان شاعروں کا تذکرہ ہے جنھوں نے کانپور کو دہلی اور لکھنؤ سے مختلف ایک مخصوص طرز کا دبستانِ شاعری بنا دیا تھا۔ اور باتوں سے قطع نظر اس شہر میں ایسے کئی لفظ مل جائیں گے جو دہلی اور لکھنؤ میں مروّج نہیں تھے۔ تذکیر و تانیث کے معاملے میں بھی دہلی اور لکھنؤ والوں نے اہل کانپور سے اختلاف کیا ہے۔ با ایں ہمہ یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ کانپور کوئی جزیرہ نہیں تھا۔ دبستان کانپور کے اثرات رفتہ رفتہ شمالی ہند کے سبھی مراکز تک پہنچنے لگے تھے اور خود اہل کانپور بھی ''خذ ما صفا'' کے مقولے پر ہمیشہ عامل رہے ہیں۔ شعر و سخن ہی نہیں، علم و ادب کے لیے بھی کانپور کے دبستان کی خدمات بلاشبہ قابل قدر رہی ہیں۔ ان کی طرف مناسب توجہ کی ضرورت ہے۔

۴/۱۱۷۲ سر سید روڈ، سر سید نگر

علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

فقط

محمد انصار اللہ

۱- آرزو :

آرزو تخلص، مرزا علی محمد (۵) نام تھا۔ ان کے والد مرزا ابو جعفر میر علی اوسط رشک (۶) کے ماموں تھے۔ اسی رشتے سے سعادت خاں ناصر نے ان کو رشک کا ''برادر'' لکھا ہے۔ میر رشک کی طرح مرزا ابو جعفر بھی لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ معتمد الدولہ کے زوال کے بعد یہ گھرانے لکھنؤ سے کانپور میں منتقل ہو گئے تھے۔ وہیں مرزا علی محمد تحصیل اور یہ کے تحصیلدار (۷) ہو گئے تھے۔

مرزا علی محمد میر علی اوسط رشک کے معروف شاگردوں میں سے تھے چنانچہ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ:

> ''شہرہ (۸) اس کے سخن کا چار سو، مرزا علی محمد تخلص آرزو، برادر اور شاگردِ یگانہ میر علی اوسط رشک''۔

کچھ مدت کی مشق کے بعد انھوں نے اپنا دیوان مرتب کر لیا۔ ان کا جو کچھ کلام تذکروں میں ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صنایع بدایع کے صرف کا ان کو بہت شوق تھا۔ شاید ہی کوئی شعر ہو گا جس میں ایک دو صنعتیں صرف نہ کی گئی ہوں۔ نمونہ یہ ہے:

وہ ہاتھ آئے میرے نہ ہیہات ہاتھ میں ۔۔۔ رکھے جسے معاند بد ذات ہاتھ میں
زاہد میں نوجواں ہوں بھلا کس طرح نہ لوں ۔۔۔ دے جامِ مے جو پیرِ خرابات ہاتھ میں

بوسہ نہ دیگا نشّے میں زنہار دوسرا ۔۔۔ اس شوخ مست سا نہیں ہشیار دوسرا
عاشق ہوں خال و کاکل مشکینِ یار کا ۔۔۔ مجھ سا نہیں جہاں میں سیہ کار دوسرا

نازک ہے بدن پہنچے گا صدمہ، نہ پہن پھول — اے غیرتِ گل تیرے ہیں اعضائے بدن پھول
موت آئی مجھے ہجرِ بتِ غیرتِ گل میں — بالائے کفن پھول ہوں کچھ زیرِ کفن پھول

۲- آہ :

آہ کا نام فرید(۹) الزماں تھا اور یہ بجنور کے رہنے والے تھے۔

۳- احمد :

محسن نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے :

''احمد (۱۰) علی، احمد تخلص ولد عنایت اللہ، باشندۂ صفی پور، توابع لکھنؤ، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

کلام ان کا یہ ہے :

سایل ہوں بوسے کا تو سزا اپنی آپ دوں — رکھ دوں تمھارے سامنے میں کاٹ کر زباں
تحریر شوق کی نہیں طاقت قلم میں ہے — قاصر ہے اس بیان سے اے نامہ برزباں

۴- اعزاز :

اعزاز (۱۱) تخلص، میر باقر علی نام تھا۔ میر اسد علی صبر کے بیٹے اور اُن کے واسطے سے نواب معتمدالدولہ کے گھرانے سے قرابت بھی تھی۔ محسن نے ان کو ''باشندۂ (۱۲) لکھنؤ، شاگرد میر علی اوسط رشک'' لکھا ہے۔ نواب معتمدالدولہ کے تعلق کی وجہ سے یہ بھی کانپور میں رہنے لگے تھے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے :

خدا جانے بتوں نے پالے کیا اعجاز آنکھوں میں
نظر آتے ہیں جب دیکھو نئے انداز آنکھوں میں

۵- افضل:

شاعری کا مذاق ان کے خاندان میں کئی پشتوں سے چلا آتا تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے:

"شاہ غلام اعظم افضل خلف شاہ ابو المعالی [۱۳] عالی بن حضرت شاہ اجمل اجمل صاحب دایرہ الہ آباد، ابن شاہ خوب [۱۴] اللہ"۔

شاہ ابو المعالی عالی کے شیخ ناسخ کے ساتھ اچھے [۱۵] روابط تھے اور ناسخ افضل کے ساتھ بھی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کے تلمذ کا حال شاہد علی فانی گورکھپوری نے محمد عبدالعلیم آسی کے توسط سے اس طرح بیان کیا ہے:

"جب [۱۶] حضرت ناسخ الہ آباد تشریف لائے تو حضرت افضل کی ذہانت پر عاشق ہو گیے۔ شاہ صاحب موصوف پیشتر ایک میاں جی کے شاگرد تھے جو ہجوگوئی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ہاجی صاحب کے خوف سے ناسخ کی ہمت نہ پڑی کہ شاہ صاحب موصوف کو اپنا شاگرد بنائیں چنانچہ ایک روز حضرت پانچ روپیہ کی مٹھائی اور دو سو روپیہ نقد لے کر میاں جی صاحب کے پاس حاضر ہوئے۔ عرض کی کہ میں شاگرد ہونے آیا ہوں۔ میاں جی آدمی بہت مفلس تھے۔ دو سو روپے کی کثیر رقم پا کے بہت خوش ہوئے۔ جب وہ نذر قبول کر چکے تو ناسخ نے دست بستہ عرض کی کہ افضل کو مجھے دے دیجیے۔ میاں جی نے فرمایا کہ بڑا دھوکا دیا۔ وہی تو مجھے ایک لڑکا ملا ہے۔ قہر درویش برجان درویش افضل کو ناسخ کے حوالے کیا"۔

معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ کے انتقال کے بعد افضل میر رشک سے اصلاح لینے لگے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

"درویش [۱۷] کامل بلکہ اکمل، شاہ غلام اعظم تخلص افضل، پسر شاہ

خلیل ابوالمعالی نبیرۂ شاہ اجمل صاحب دایرہ الہ آباد۔ پہلے شاگرد ناسخ کے تھے، اب میر علی اوسط رشک ان کے استاذ"۔

افضل ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۲۵ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے دو دیوان اور ایک مثنوی یادگار چھوڑی ہے۔ ان کے علاوہ بقولِ فانی گورکھپوری:

"ایک رسالہ (۱۸) ناسخ اور رشک کے قواعد کے مطابق تصنیف کیا تھا"۔

تاریخ گو کی حیثیت سے بھی افضل معروف تھے۔ منیر شکوہ آبادی کے پہلے دیوان میں ان کے قطعات تاریخ درج ہیں۔ ایک یہ ہے ؎

"تاریخ ہائے مصنفہ جناب فضیلت مآب محقق عارف شاہ غلام اعظم افضل الہ آبادی"۔

اے منیر اہل جوہر واہ کیا ہے فکر صاف ؎ شاعری نے پائی رونق آپ ہی کی ذات سے
استعارے میں کیا تصنیف دیوانِ نفیس ؎ ہر کلام صاف بالکل پاک ہے حشوات سے
ہے زبانِ رشک گویا آپ کی بالکل زباں ؎ انکشافِ قاعدہ ہوتا ہے ہر ہر بات سے
فکر میں تاریخ کی تھا افضل معجز بیاں ؎ دل سے تھا مستخرج اعداد ان ادوات سے

ولولے سے بول اٹھی ناگہاں طبعِ رسا
پاک دیواں آپ کا ایطائے تعقیدات سے
۱۲۶۴

افضل کے چند شعر بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں ؎

اے جانِ جاں وصال سے یا شاد کیجیے ؎ یا بندگی سے بندے کو آزاد کیجیے
قمری کو اپنے عشق کا پہنایئے جو طوق ؎ تو راستی سے سرو کو آزاد کیجیے
ہے غیر سے تو یاد فراموش کا مزا ؎ کب کہتے ہیں یہ ہم نہ انھیں یاد کیجیے

جچتا نہیں ہے کوئی بھی افضل نگاہ میں
ناسخ کو چھوڑ کر کسے استاد کیجیے

۶- انور :

"سخنور(۱۹) بہتر، علی مرزا مرثیہ خواں، تخلص انور، ولد مرزا اکبر علی مرثیہ خواں ساکن فیض آباد، وارد لکھنؤ، شاگرد رشک" ۔

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے تک مرثیہ خوانی نے فن کا درجہ حاصل کرلیا تھا اور لکھنؤ میں جو بعض گھرانے اس کے لیے معروف تھے انھیں میں انور کا خاندان بھی تھا۔ انور کی غزل گوئی کا نمونہ یہ ہے ۔

غیروں کو دیا بوسۂ رخ، بوسۂ سر بھی ‏ ‏ ہم پر نہ کبھی مہر سے کی تو نے نظر بھی
اے چرخِ کہن قدسیوں کی تجھ کو قسم ہے ‏ ‏ اِس طرح کا دیکھا ہے کہیں رشکِ قمر بھی

۷- اوج :

اوج تخلص، میر محمود(۲۰) جان نام، سید جواد(۲۱) شاہ رضوی کے بیٹے تھے۔ سید جواد شاہ نواب معتمدالدولہ کی خاص محل کے عزیزوں میں تھے اسی لیے نواب کے زوال کے بعد لکھنؤ(۲۲) سے کانپور آگئے تھے۔ میر رشک کے ان کے ساتھ عمدہ روابط تھے چنانچہ ذیل کے قطعات سے ظاہر ہے ۔

آہ سید جواد شاہ جلیل ‏ ‏ شد زفوتش حواس گم افسوس
صوری معنوی شد ایں تاریخ ‏ ‏ ماہ ذیعقدہ و نہم افسوس

۱۲۴۳

اور ۔

زوجۂ میر جواد رضوی رحلت کرد ‏ ‏ آہ بود آں مہ جانکاہ ربیع الاول
صوری و معنوی ایں مصرعِ تاریخ رسید ‏ ‏ روز اثنین و یکم آہ ربیع الاول

۱۲۵۶

معلوم ہوتا ہے کہ میر محمود جان اوج لڑکپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اور نوجوان (غالباً غیر شادی شدہ) ہی فوت ہو گئے۔ سعادت خان ناصر نے شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ

کر کے لکھا ہے:

''(۲۳) مجبوبۂ سخنوری کا زوج، میر محمود جاں تخلص اوج، مقیم کانپور، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

شعر گوئی سے اوج کو غیر معمولی دلچسپی تھی۔ کم عمری کے باوجود دیوان مرتب کر لیا تھا۔ محسن کے تذکرے میں ہے:

''میر (۲۴) محمود جان مرحوم اوج ولد میر جواد شاہ رضوی، عزیزوں میں خاص محلِ نواب معتمدالدولہ بہادر کے، صاحب دیوان، باشندۂ لکھنؤ، مقیم کانپور، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

فنی نقطۂ نظر سے ان کے کلام کو قابلِ استناد سمجھا گیا ہے چنانچہ حکیم نجم الغنی خاں نے بھی ان کے بعض شعر سند کے طور (۲۵) پر نقل کیے ہیں۔ میر رشک نے اوج کی وفات کی تاریخیں اس طرح کہی ہیں ؎

میر محمود علی جانِ جہاں بود اثنا عشری حیف اے ہے
اوج در شعر تخلص بودہ مَردِ باوضع و جری حیف اے ہے
یافتم مصرعِ تاریخِ وفات نوجوان و رضوی حیف اے ہے
۱۲۶۲

دیگر ؎

میر محمود رسالہ دار (۲۶) بائیسی کہ بود جانبِ گلزارِ جنت کوچ فرمود از جہاں
مصرعِ تاریخ مرگِ آں معظم گفت رشک وائے ہے ہے پیشِ احمد رفتہ محمود از جہاں
۱۲۶۲

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

یار ہے، مطرب ہے، عالم ہے شبِ مہتاب کا
جام دے جلدی سے اے ساقی شرابِ ناب کا

تشنگی سبطِ نبی کی یاد جب آتی ہے اوج
حلق میں اپنے اٹک جاتا ہے قطرہ آب کا

۸- بہار:

عبداللہ خاں ضیغم نے بہار کے تعارف میں لکھا ہے:

"(۲۷) بہار تخلص، مرزا علی نام، گلشن الدولہ شاہِ اودھ سے خطاب پایا ہے۔ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ عمر قریب پچاس برس کی ہے۔ فنِ شعر میں میر علی اوسط رشک مرحوم لکھنؤ کے، جو شیخ امام بخش ناسخ مغفور کے تلامذہ میں سربرآوردہ و نامور تھے، شعر بھی خوب کہتے تھے، شاگرد ہیں"۔

عمر کا یہ اندازہ یقیناً غلط ہے۔ سعادت خاں ناصر نے (۱۲۶۲ھ کے قریب) لکھا تھا:

"(۲۸) جوان خوش شعار، مرزا علی تخلص بہار، شاگرد میر علی اوسط رشک"۔

اگر جوان لکھے جانے کے وقت ان کی عمر بیس برس سے کچھ زیادہ رہی ہو تو بہار کا سال ولادت ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۵ء کے قریب مانا جائے گا اور ضیغم کے تذکرے کی تالیف (۱۳۰۳ھ) کے وقت ان کی عمر تریسٹھ برس کے قریب ہوگی۔

عبدالغفور خاں نساخ نے بہار کے بارے میں کسی قدر زیادہ اطلاع فراہم کی ہے۔ لکھا ہے:

"(۲۹) بہار تخلص مرزا علی مرثیہ گو خلف مرزا حاجی علی بیگ لکھنوی، شاگرد رشک، کربلا کی زیارت بھی کی ہے۔ راقم نے ان کو کلکتہ کے مشاعرے میں دیکھا ہے۔ صاحب دیوان ہیں"۔

لکھنوی تذکرہ نویسوں نے ان کو "مرثیہ گو" نہیں لکھا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کربلا کو روانگی کے وقت تک بہار مرثیہ گو کی حیثیت سے عام طور سے متعارف نہیں

ہوئے تھے۔

بہار واجد علی شاہ بادشاہ کے مصاحب اور مقرب تھے۔ بادشاہ نے خود لکھا ہے کہ:

''(۳۰) گلشن الدولہ مرزا علی خاں بہار، یہ شاعر ہیں۔ ان لوگوں کے ذمہ خدمت سرکاری بھی تفویض ہے اور مصاحب بھی ہیں''۔

انتزاع سلطنت کے بعد بہار بھی کلکتہ گئے تھے اور اپنے بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہے تھے۔ بادشاہ نے لکھا ہے:

''(۳۱) صدر محل صدر، جو مشمول محلات ہمراہ راقم ہیں بہ مشورۂ گلشن الدولہ مرزا علی بہار ؎

بڑھے رتبہ شہ واجد علی کا
بجے ڈنکا شہ واجد علی کا''

بہار کی ایک کتاب ''مولود شریف موسوم بہ اسم تاریخی عرصۂ بہار'' جو مطبع نامی منشی نولکشور، لکھنؤ میں فروری ۱۸۶۸ء میں ساٹھ صفحوں پر چھپی تھی راقم کی نظر سے گزری ہے۔ یہ ''تصنیف بہ طور مسدس بہ زبان اردو ہے''۔ پہلا بند یہ ہے ؎

ساقی شرابِ معرفتِ کردگار دے جامِ جہاں نما میں مے خوشگوار دے
محفل کو بزمِ قدس کی صورت سنوار دے شیشوں میں آج بادۂ کوثر اُتار دے

صحبت ہے یہ ولادتِ شاہ جلیل کی
خم و سبو میں موج اُٹھے سلسبیل کی

خاتمہ:

یارب برائے حرمتِ سرتاجِ انبیا یارب پے ولادیتِ سلطانِ لافتیٰ
یارب بحقِ فاطمۂ اشرف النسا یارب پے حسن، پے مظلومِ کربلا

شاداب کر نہالِ ریاضِ شہی کو تو
رکھ اپنے حفظ میں شہ واجد علی کو تو

ہاں ملک و سلطنت کا اعادہ کراب کے سال ہاتھ آئیں تخت و تاج و نگین و متاع و مال
ڈنکا بجے ، نشان کھلے ، فوج ہو بحال پھر اخترِ اودھ کو بنا نیرِ کمال

سرسبز لکھنؤ کے چمن ہوں ، ہوا پھرے
سکہ پڑے ، جلوس ہو ، سر پر ہُما پھرے

اے خامۂ بہار اٹھا اب سرِ سجود وقتِ دعا ہے اول و آخر میں پڑھ درود
صدقہ رسولِ دیں کی ولادت کا اے ودود عقبٰی مری بخیر ہو، دنیا میں ہو نمود

تاریخ خاتمہ ہے دُرِ مدعا ملے
پیر دکو پاک صورتِ حسّاں صلا ملے

۱۲۸۳

اس کتاب کی تاریخ منشی سید آغا علی شمس، مظفر علی اسیر، میر نواب موزوں، وارث علی خاں فہم، آقا نجف سعید، منشی فدا علی عیش، میر علی جان صاحب مخاطب بہ ماہتاب الدولہ متخلص بہ درخشاں، بدرالدجی خلف ماہتاب الدولہ بہادر، میر حسن خاں صاحب ضیاء، لالا جے گوپال ثاقب دیوانِ سرکار جرنیل صاحب بہادر، علی الزماں عالی باشندہ نگینہ نے کہی تھی۔ اسیر نے اپنی تاریخ میں کہا ہے ۔

مرزا علی بہار جو ہیں ذاکرِ امام مولود وہ کہا کہ مرصع ہے بالتمام
سُنکر کہا یہ دل نے زہے عز و احتشام قابل درود پڑھنے کے بے شک ہے یہ کلام

تاریخ سال مل گئی یہ خاکسار کو
ممدوح دے بہشت صلے میں بہار کو

۱۲۸۳

میر علی اوسط رشک کے تیسرے دیوان کی ''تاریخ طبعزاد مرزا علی صاحب بہار درصنعتِ اسمائے شعرائے زمانا'' بھی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے جس میں ناموں کے التزام کے باوجود کلام کی خصوصیات کا بیان بھی آ گیا ہے۔

۹- ترکی:

لالا سری رام نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''(۳۲) ترکی ترک علی شاہ، اصل وطن لاہور ہے مگر اب عرصے سے بہ سلسلۂ روزگار حیدرآباد دکن میں مقیم ہیں۔ دربار دکن کے فارسی شعرا کے زمرہ میں ملازم ہیں۔ اب (۱۹۱۱ء میں) پچاس برس کے قریب عمر ہے''۔

خود ترکی نے اپنے بارے میں اطلاع دی ہے کہ:

''فقیر (۳۳) سراپا تقصیر علی شاہ ترکی۔ در فقیری دستِ ارادت بہ دامانِ غوث علی شاہ قلندر پانی پتی برزدہ۔ و در ریختہ از میر علی اوسط رشک لکھنوی فیض اندوختہ''۔

اور:

''در (۳۴) سخن اصلاح ازیں چار کہ درشش جہت نامِ شاں از آفتاب عالمتاب روشن تراست گرفتہ ام۔ اول از گل محمد خاں ناطق مکرانی۔ دویم از حضرت شہاب الدین واثق ہراتی۔ سیوم از حضرت مولوی امام بخش صہبائی دہلوی کہ اصلاحِ شعر و سبقِ کتبِ درسی و علم عروض و قافیہ ازاں مستِ صہبائے سخن گرفتہ ام۔ چارم جناب مولوی رکن الدین مکمل۔ در ریختہ دستِ ارادت بہ دامانِ حضرت میر علی اوسط رشک مغفور محقق لکھنوی برزدہ ام''۔

میر رشک ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء میں کربلا کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ ان سے کسبِ فیض کے وقت اگر ترکی کی عمر بیس برس بھی رہی ہو تو ان کا سالِ ولادت ۱۲۴۷ھ کے قریب ہو گا اور ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۱ء میں ان کی عمر اسی برس کے قریب ہو گی۔ لالا سری رام کا تخمینہ بہت غلط ہے۔

ترکی قصبہ نورمحل [۳۵] (پانی پت) کے رہنے والے تھے۔ ان کا اصل نام غلام میر تھا۔ وہ غلام قادر گرامی کے بہنوئی تھے اور ریاست حیدرآباد سے ان کے لیے پچاس روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر تھا۔ بہ وقتِ وفات ان کی عمر نوّے برس کے قریب تھی۔

میر رشک کے فیض تربیت نے ترکی کو لکھنوی انداز اور مزاج عطا کر دیا تھا۔ شعرائے دہلی مثلاً داغ، ظہیر وغیرہ سے اکثر چوٹیں رہتی تھیں اور بظاہر یہی ان کی شہرت کا سبب ہے۔ ترکی نے فارسی گویوں کا ایک تذکرہ ''سخنورانِ چشمدیدہ'' کے نام سے لکھا تھا جو مطبع شمس الاسلام حیدرآباد سے ۱۳۳۲ھ میں چھپا تھا۔

۱۰- تنویر:

محسن نے تنویر کے ذکر میں لکھا ہے:

''میر [۳۶] کاظم حسین تنویر ولد میر حسین داروغہ سرکار بہو بیگم صاحبہ، زوجۂ نواب آصف الدولہ بن میر اکبر علی مقبل مرثیہ گو باشندۂ فیض آباد، مقیم لکھنؤ شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

پھر کم و بیش یہی بات نساخ اور گوکل پرشاد رسا وغیرہ نے بھی اپنے تذکرے میں لکھ دی ہے لیکن خود تنویر نے میر رشک کے تیسرے دیوان کی تاریخ میں کہا ہے ؎

بیتِ شعر عم و استادِ شفیق   شمعِ بزم خانہ معمور طبع

اور رشک نے ''قطعہ تاریخ وفات میر حسین صاحب مرحوم مغفور'' میں بیان کیا ہے کہ ؎

خویشِ من بود وہم برادر زادم   انداخت فلک بہم جد ای صد وا ے

اس طرح یہ بات صاف ہے کہ میر حسین اور تنویر دونوں میر رشک کے بھتیجے اور آپس میں بھائی بھائی تھے۔ میر اکبر علی ان دونوں کے والد اور میر رشک کے بھائی تھے۔ پھر سرکار بہو بیگم میں میر حسین داروغہ تھے، نہ کہ میر کاظم حسین تنویر۔ بظاہر میر حسین میر کاظم حسین تنویر سے بڑے تھے۔ محسن کے تذکرے کی عبارت میں کسی وجہ سے سہو ہو گیا تھا

اور پھر وہی غلطی بعد کے تذکروں میں نقل ہوتی رہی چنانچہ نادر نے بھی لکھا ہے:

''تنویر (۳۷) سید کاظم حسین، صاحب دیوان و مولف عروضِ منظوم و مراثی، شاگرد میر علی اوسط رشک، ولد میر حسین ابن میر اکبر علی لکھنوی''۔

معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۲ھ کے قریب تنویر کی شاعری کی ابتدا تھی۔ سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں بہت اختصار سے ان کا ذکر کر دیا ہے:

''خوش (۳۸) تقریر، سید کاظم حسین تخلص تنویر، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

صغیر شاگرد رشک کے دیوان میں ایک قطعہ تاریخ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۷۷ھ کو ۱۸۶۰ء میں تنویر کا بیٹا پیدا ہوا تھا ۔

در خواہش چوں بود بطنِ امید　　فرزندش بخشود خدائے تقدیر
تاریخش گفتہ ام بہ سالِ ہجری　　پیدا شدہ نورِ دیدہ ہائے تنویر
۱۲۷۷

نساخ نے تنویر کو ''صاحب دیوان'' بتایا ہے اور نادر نے ان کی تصانیف کا ذکر کیا ہے جن میں ایک رسالہ عروض منظوم بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عروض جاننے کے لیے تنویر اپنے زمانے میں معروف تھے۔ لالا سری رام نے لکھا ہے:

''(۳۹) مولوی محمد راشد علی ضیاء بدایونی نے عام عروض کی تحصیل میر کاظم حسین تنویر سے کی تھی''۔

تاریخ گوئی میں بھی تنویر نے اچھی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اپنے استاد میر رشک کے تیسرے دیوان، مہدی علی خاں قبول کے دیوان نتائج الذہن و فیضان فکر، اصغر علی خاں نسیم دہلوی کے دیوان دفترِ شگوف اور ڈپٹی کلب حسین خاں کے دیوان مخمسات یعنی دیوان غریب وغیرہ کی تاریخیں انھوں نے کہی تھیں۔

تنویر کی غزلوں کا نمونہ یہ ہے ۔

جُز روئے صاف کب ہے مہِ آسماں پسند ‏ ‏ مانگ اس کی ہے پسند، نہیں کہکشاں پسند
میرے ہمائے فکر کی مغزِ سخن ہے چاٹ ‏ ‏ بے مغز جو ہو، آئے اسے استخواں پسند

بنتے ہو غماز جا کر صحبتِ غماز میں ‏ ‏ ہیں در اندازوں کے انداز آپ کے انداز میں
تھا محرر آہِ آتشبار و داغِ دل کا حال ‏ ‏ ہم نے خط باندھا پرِ طاوسِ آتشباز میں

۱۱- توقیر:

عبداللہ خاں ضیغم نے اپنے تذکرے میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

"(۴۰) توقیر تخلص میر عبداللہ نام، متوطن بلدۂ کانپور و مقیم عظیم آباد، حال وارد شہر بنارس ہیں۔ میر علی اوسط رشک سے تلمذ ہے"۔

لالا سری رام نے ان کے بارے میں جو لکھا ہے، وہ اس سے کافی حد تک مختلف ہے:

"توقیر (۴۱) میر عبدالعلی نام، قنوج کے رہنے والے اور رشک لکھنوی کے شاگرد تھے۔ غدر سے پہلے پٹنہ میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ مرثیہ تحت لفظ خوب پڑھتے تھے۔ عطر سازی کا پیشہ کیا۔ ۱۳۰۲ھ میں ساٹھ باسٹھ برس کی عمر تھی"۔

سری رام کا یہ بیان زیادہ قابلِ قبول معلوم ہوتا ہے۔

۱۲- ثابت و صادق:

عبداللہ خاں ضیغم کے تذکرے میں ثابت کا حال اس طرح سے آیا ہے:

"(۴۲) ثابت تخلص، محمد صادق حسین نام، خلف نثار علی خاں مرحوم، نواب تاج الدین حسین خاں معافی دار ضلع بریلی کے بھانجے ہیں۔

رشک کے تلامذہ سے ہیں۔ غزلیات میں ثابت۔ مرثیہ و سلام میں
صادق تخلص کرتے ہیں''۔

معاصر تذکروں میں اگرچہ ان کا ذکر غزل گو کی حیثیت سے آیا ہے، کسی نے بھی ان کا تخلص ثابت نہیں لکھا ہے۔ محسن کے تذکرے میں بھی ہے:

''(۴۳) صادق حسین خاں صادق، ولد نثار علی خاں، خواہرزادہ تاج
الدین حسین خاں کمبوہ، باشندہ لکھنؤ، شاگرد رشک''۔

تاج الدین حسین خاں نواب معتمد الدولہ کے خاص ''خیر خواہوں'' میں سے تھے۔ اُن کے بارے میں مذکور ہے کہ:

''(۴۴) تاج الدین حسین خاں ذی عقل ارسطوے عہد تھے۔
کمبوہوں کی قوم میں ایسا آدمی کم گزرا ہے''۔

سعادت خاں ناصرِ نے شاید سب سے پہلے شاعر کی حیثیت سے صادق کا ذکر کیا تھا، اس طرح:

''جوان (۴۵) وجیہہ، کلام اس کا واثق، صادق حسین خاں تخلص
صادق، خلف نثار علی خاں کمبوہ، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

اُس رنگ صندلی کا تصور گزر گیا — کیا سہل تھی دوا کہ مرا دردِ سر گیا
شاید زمین شعر میں صندل کی خاک تھی — فکرِ سخن جو کی تو مرا دردِ سر گیا
کل تو تم دور تھے خفا بیٹھے — آج کیوں میرے پاس آ بیٹھے
جب کہا بیٹھنے کو، بول اٹھے — میری جوتی، مری بلا بیٹھے

لالا سری رام نے ان کی شاعری کے بارے میں اِس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

''شیخ (۴۶) صادق حسین خاں صادق، ساکن لکھنؤ، متوطن بریلی،
شاگرد حضرت میر علی اوسط رشک و خلیفہ بشیر، فنِ بدیع اور علم عروض

سے واقف تھے مگر شعر میں مزہ نہیں ہے۔ الفاظ کی تحقیقات کا شوق تھا"۔

۱۴۳- ثاقب :

ثاقب تخلص، مرزا مہدی نام، مرزا انور علی بیگ کے بیٹے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے ان کے حال میں لکھا ہے :

"نورِ (۴۷) معنی کا کاسب، مرزا مہدی تخلص ثاقب، شاگرد ناسخ۔ جب مصنف اس کا طالب ہوا، ظاہر ہوا کہ مرزا صاحب یہاں تشریف نہیں رکھتے بلکہ راہی زیارات ایمۂ معصومین علیہم السلام ہوئے ہیں۔ آخر مجبور ہو کے یہ دو غزلیں کہ روزِ اول واسطے اصلاح فرمائی جناب شیخ صاحب کی خدمت میں لے گئے تھے، تیمناً لکھ دی گئی ہیں"۔

نہ کیونکر صاف ہوں بعد شہادت میں ستمگر سے
غبارِ دل مرا قاتل نے دھویا آپ خنجر سے
کس کی نظر کو تیرے نظارے کی تاب ہے
خورشید جس کو کہتے ہیں تیری نقاب ہے

محسن نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"(۴۸) مرزا مہدی ثاقب ولد مرزا انور علی بیگ استاد نواب محسن الدولہ بہادر، باشندۂ لکھنؤ، شاگرد شیخ ناسخ"۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ناسخ کی وفات کے بعد ثاقب نے میر رشک کے (۴۹) سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ نساخ نے ان کو "صاحب دیوان" بتایا ہے اور لالا سری رام نے اطلاع دی ہے کہ:

"ان (۵۰) کے شاگردوں میں آغا علی شمس نامور ہوئے"۔

۱۴- جبر:

جبر کا ذکر کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزرا۔ انھوں نے اپنے استاد میر علی اوسط رشک کے تیسرے دیوان کی تاریخ کہی تھی جو اس طرح ہے:

''تاریخ طبعزاد سید محمد تقی عرف جنگل صاحب متخلص بہ جبر''۔

تیسرا دیوان بھی اب تو مِرے استاد کا — فضلِ حق سے پاچکا ترتیب باصد ہا صفات

صحتِ الفاظ و حسنِ بندش و مضمونِ نو — جمع اس دیوان میں پائی گئیں یکجا صفات

مدحتِ اشعار میں ہرگز نہیں گویا زباں — خامۂ فکرِ رسا بھی لکھ نہیں سکتا صفات

مصرعِ تاریخ میں اے جبر اب لازم ہے غور — رتبۂ اعلیٰ ہوا حاصل یہ ہے ادنیٰ صفات

فکر میں بیٹھا ہوا تھا میں کہ بول اٹھا سروش

واہ کیا دیوانِ استادِ زماں ہے باصفات

۱۲۶۷ھ

۱۵- جلال:

جلالؔ تخلص، سید ضامن علی نام، حکیم سید اصغر علی کے بیٹے، لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کے سال ولادت کے بارے میں اختلاف [۵۱] ہے لیکن آرزو لکھنوی اور امیر [۵۲] مینائی کے بیان کی روشنی میں ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء صحیح سال معلوم ہوتا ہے۔

ابتدائی مشق کے زمانے میں انھوں نے امیر علی خاں ہلال [۵۳] شاگرد رشک سے اصلاح لی تھی۔ ان کا تخلص جلال بھی اسی مناسبت سے معلوم ہوتا ہے۔ جب کسی لائق ہوئے تو انھوں نے میر علی اوسط رشک کی شاگردی اختیار کرلی۔ جب رشک کربلا کے لیے روانہ ہوئے [۵۴] تو جلال کو مرزا برق کے حوالے کر گئے۔ افادۂ تاریخ میں جلال نے ہر جگہ اپنے دو ہی استادوں کا ذکر کیا ہے، اسی طرح:

''استاد اول مولف (جلال) میر علی اوسط رشک مرحوم''۔

''استاد دوم مولف (جلال) کے مرزا برق مغفور''۔

اس سے گمان ہوتا ہے کہ یا تو ہلال سے تلمذ کی مدت اتنی مختصر تھی کہ جلال اسے قابلِ ذکر نہیں سمجھتے تھے، یا پھر وہ ہلال کی شاگردی سے منحرف ہو گئے تھے۔

غدر کے بعد جلال رامپور چلے گئے تھے۔ پھر منگرول میں رہے۔ آخر زمانے میں لکھنؤ آ کر محلہ منصور نگر میں رہ پڑے تھے۔ وہیں (۵۵) ۴ شوال ۱۳۲۷ھ/ ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو وفات پائی۔ ان کے بارہ میں مذکور ہے کہ:

''نواب (۵۶) آصف الدولہ کے مدرسہ میں تعلیم پائی۔ فارسی بدرجۂ کمال اور عربی تھوڑی پڑھی تھی۔ فن عروض کو تو ایسا جانتے تھے گویا اس وقت ان کا مثل نہ تھا۔ تحقیق لغات میں بھی کامل تھے۔ ۱۲۷۲ھ میں نواب سید محمد یوسف علی خان بہادر فردوس مکاں نے طلب فرمایا...... نواب خلد آشیاں کی رحلت کے بعد شیخ حسین میاں رئیس منگرول نے بلا لیا اور پچاس روپے کا وظیفہ گھر بیٹھے مقرر کیا۔ نواب محمد حامد علی خاں صاحب بہادر نے طلب فرما کر تنخواہ جاری فرما دی''۔

جلال کی شاعری کے بارے میں نواب سید علی حسن خاں نے لکھا ہے کہ:

''(۵۷) پیشتر سخن بہ روشِ لکھنوی گفت، الحال بہ طرزِ دہلی فکر می نماید''۔

نظم ونثر میں جلال کی تصانیف کئی ہیں، اس طرح:

دواوین:	شاہد شوخ طبع،	کرشمہ گاہ سخن،	مضمون ہائے دلکش،	نظم نگاریں
	۱۲۹۷	۱۳۰۱	۱۳۰۶	۱۳۲۰

یہ چاروں چھپ گئے ہیں۔ ایک پانچواں دیوان اور بھی بتایا گیا ہے جو غیر مطبوعہ رہا۔

لُغات: تحفۂ سخن ورا‌ں یا سرمایۂ زبان اردو اور گلشنِ فیض مطبوعہ ہیں۔ ایک

غیر مطبوعہ رسالہ تنقیح اللغات بھی ہے۔

قواعد و عروض وغیرہ : قواعد المنتخب (مفرد، مرکب الفاظ کی تحقیق)، کار آمد شعرا، مفید الشعرا (رسالہ تذکیر و تانیث)، دستورا لفصحا (عروض میں)

تاریخ گوئی: افادۂ تاریخ۔

داستان: داستان بالا باختر، تین جلدیں —— غیر مطبوعہ

۱۶- جنوں :

جنوں تخلص، میر مہدی نام تھا۔ ان کے بارے میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''(۵۸) عقل و خرد میں افلاطوں، میر مہدی صاحب تخلص جنوں، ساکن بانس بریلی، عین شباب میں چراغ اس کی زندگی کا بادصرصر فنا سے گل ہوا۔ وہ مغفور شاگرد میر علی اوسط رشک سلمہٗ کا تھا''۔

اس سے واضح ہے کہ خوش معرکہ زیبا کی تالیف (۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء) سے پہلے جنوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ محسن نے ان کے بارے میں مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں:

''میر (۵۹) مہدی حسین مرحوم جنون، خلف میر عباس عرف میر مغل فیض آبادی، برادر خرد میر رضی رہا، باشندہ فیض آباد، مقیم لکھنؤ، وارد کانپور، شاگرد میر علی اوسط رشک۔ ان کے غزلیات و رباعیات مشہور ہیں''۔

محسن نے جنوں کے بانس بریلی میں قیام کا ذکر نہیں کیا ہے۔ شاید وہ سکونت عارضی ہو گی۔ ان کا کانپور میں ورود معتمد الدولہ کے بیٹوں کی قدر شناسی کے سبب ہو گا۔

تذکروں میں جنوں کی رباعی تو نہیں مل سکی البتہ ان کی غزل کے صرف دو شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں ؎

تم کو لازم ہے کہ خاطر مری اے جان کرو پاس آنے کا کرو ، وصل کا سامان کرو

رات کا وقت ہے زلفیں نہ پریشان کرو   آندھی آجائیگی کالی ، مرا کہنا مانو

جنوں کے بعض شعر حکیم نجم الغنی خاں نے بھی سند کے طور (۶۰) پر اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔

۱۷- جویا:

نصیرالدین حیدر بادشاہ دوم نے جب نواب قدسیہ محل سے نکاح کیا تو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے کلثوم بیگم تعینات ہوئیں جو آتو بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ وہ عظیم آباد کی رہنے والی تھیں۔ تقرری کے بعد وہ اپنے قریبی اعزا بیٹے (قادر علی خاں) اور داماد (شیخ فتح علی) کے ساتھ لکھنؤ آگئیں۔ آتو بیگم کی خاطر سے قادر علی خاں کو داروغہ ڈیوڑھی کا منصب اور شیخ فتح علی کو نظارت کا خلعت عطا ہوا۔ مقبول الدولہ قبول نے تاریخ کہی :

> ''خلعت نظارت جملہ محالات بہ حکیم شیخ فتح علی صاحب داماد آتو صاحب ---- ۱۲۴۹ھ''۔

یہ جویا شاعر انھیں شیخ فتح علی کے بیٹے تھے۔ محسن نے ان کے حالات میں لکھا ہے:

> ''(۶۱) شیخ علی حسین جویا ولد شیخ فتح علی جو قدسیہ محل، محل نصیرالدین حیدر بادشاہ کی آتو صاحبہ کے داماد تھے، عظیم آباد سے وارد لکھنؤ ہوئے۔ اس زمانے میں ان کا اور قادر علی خاں کا دور دورہ ہوا۔ چندے کانپور میں مقیم رہے۔ اب وطن کو گئے۔ صاحب دیوان، شاگرد رشک''۔

میر علی اوسط رشک کو بھی جویا کی خاطر عزیز تھی چنانچہ جب ان کی والدہ نے رحلت کی تو میر رشک نے تاریخ کہی ؎

ز جہاں رفت مادرِ جویا   رنج برغم فزود حیف افسوس

رشک تاریخ انتقال نوشت   ماہ ذیقعدہ بود حیف افسوس

۱۲۵۲

پھر جب جویا کے والد نے انتقال کیا تو رشک نے اس سانحہ کی تاریخ اس طرح نظم کی ۔

چوں شد حکیم فتح علی عازم جناں　　شدز غم یتیمی جویا حواس گم
فوراً رسید مصرعِ تاریخ انتقال　　صد حیف بودہ شہر رجب اربعا کیم
۱۲۶۳

معلوم ہوتا ہے کہ والد کے انتقال کے بعد کانپور میں جویا کے لیے حالات سازگار نہیں رہ گئے تھے، اس لیے وہ اپنے وطن یعنی عظیم آباد چلے گئے۔ ان کے دو شعر یہ ہیں ۔

نازک کہیں ہے شیشے سے بس، ظلم تا کجا　　ٹوٹے گا ایک ٹھیس میں ساقی ایاغ دل
کیونکر شگفتنی ہو نصیب اس ملول کو　　اے گل خزاں رسیدہ ہے مدت سے باغ دل

۱۸- حامی:

حامی تخلص، حکیم میر محمد جعفر نام، میر علی اوسط رشک کے عقیدتمند شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے استاد کے تیسرے دیوان کی تاریخ کہی تھی، اس طرح ۔

''تاریخ گفتۂ حکیم میر محمد جعفر حامی تخلص''

مقتدائے من جناب قبلۂ کونین رشک　　نظم شعر غیرت سلک لآلیِ عدن
سید عالی نسب، ہمنامِ شاہِ او صیا　　عندلیب بوستانِ ناسخ آں استادِ فن
از کمال جبر دیوانِ سوم ترتیب داد　　دید اولیٰ بعد ازیں در لکھنؤ ترکِ سخن
حامی ناچیز و ادنیٰ گفت تاریخش چنیں
ہست دیوانِ سیم اے دل ز اوستادِ زمن
۱۲۶۷

مصرعِ آخر واضح نہیں ہے۔

''حامی کے حالات کسی تذکرے میں دستیاب نہیں ہو سکے''۔

۱۹- حسن:

میر محسن نے اپنے تذکرے میں ان کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے:

"طالب علم (۶۲) مستعد احمد حسن حسن ولد سعادت علی، باشندۂ قصبہ موہان، توابع لکھنؤ، شاگرد رشک"۔

نساخ (۶۳) نے اپنے تذکرے میں انھیں باتوں کو لکھ دیا ہے، کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ حسن کا ایک شعر یہ ہے ؎

قید بے گیسوِ دلدار ہمارا دل ہے ۔۔۔ تیرہ بختی میں گرفتار ہمارا دل ہے

۲۰- خبیر:

عبداللہ خاں ضیغم نے خبیر کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"(۶۴) خبیر تخلص غلام محمد خاں، ان کے آباد اجداد اور رفاقت روو سائے بنگش میں آکر مقیم فرخ آباد ہوئے۔ قوم خٹک ہے......

جس زمانے میں میر علی اوسط رشک لکھنوی فرخ آباد میں آئے تو انھوں نے اُن کی شاگردی اختیار کی اور اکثر ان کو نواب مرزا کلب حسین خاں نادر ڈپٹی کلکٹر سابق سے جن کا یہ شعر ہے ؎

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے ۔۔۔ شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

صحبت رہی ہے"۔

خود نادر کا بیان خبیر کے بارے میں یہ ہے:

"خبیر (۶۵) غلام محمد خاں رئیس فرخ آباد، خلف غلام قادر خاں، شاگرد رشک، صاحب دو اوین ہندی و فارسی و عروض"۔

لالا سری رام نے ان کے حالات میں بعض مزید اطلاعات فراہم کی ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

''ان(۶۶) کے بزرگ روساۓ بنگش کی سرکار میں ملازم تھے اور غلام قادر خاں ان کے والد مہاراجا سیندھیا کی فوج میں رسالہ دار تھے۔ یہ خود ایک عرصے تک نواب کلب علی خاں والی رامپور کے مصاحب رہے۔ صاحب دیوان و مثنوی دریاۓ عشق و سخن فیضی ہیں''۔

پروفیسر گیان چند نے بھی ان کی ایک مثنوی کا پتا دیا ہے، اس طرح :

(۶۷) طلسم حیرت افزا ۔ غلام محمد خاں خبیر فرخ آباد ۱۲۹۰ھ

خبیر کی غزل کا نمونہ یہ ہے ؎

اک عالمِ خورشید ہے اس رشک پری کا ہے خطِ شعاعی کہ دوپٹا ہے زری کا

مجھ کو نظر آتا ہے جو خورشید جہاں تاب پردے میں یہ عالم ہے تری جلوہ گری کا

۲۱- خورشید :

خورشید تخلص، خوشوقت علی خاں نام، اصلاً اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ غالباً اپنے والد کے ساتھ جو تھانیدار تھے، یہ لکھنؤ پہنچے اور فتح الدولہ مرزا برق کے شاگرد ہو گئے۔ نواب معتمدالدولہ کے اخلاف کی بدولت جب کانپور شہر نے رونق پائی تو خورشید بھی وہاں گئے اور میر علی اوسط رشک سے اصلاح لینے لگے۔ محسن نے لکھا ہے :

''(۶۸) خوشوقت علی خاں، خورشید، ولد داؤد خاں تھانیدار، باشندۂ اکبر آباد، نووارد لکھنؤ۔ پہلے شاگرد مرزا محمد رضا برق کے تھے، بعدۂ میر علی اوسط رشک کے ہوئے''۔

معلوم ہوتا ہے کہ کانپور میں خورشید کا قیام مختصر رہا۔ وہاں سے وہ لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں آ کر پھر وہاں اپنے قدیمی استاد سے منسلک ہو گئے چنانچہ محسن ہی کے الفاظ یہ ہیں :

''(۶۹) کانپور میں میر علی اوسط رشک کے شاگرد ہوئے۔ لکھنؤ میں جب آۓ محمد رضا برق سے اصلاح لی''۔

اور :

"اول (۷۰) اصلاح میر علی اوسط رشک سے لی، بعدۂ فتح الدولہ برق سے"۔

میر رشک کربلا چلے گئے تو خورشید مستقلاً مرزا برق کے شاگرد ہو گئے اسی لیے ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے ان کے رشک سے تلمذ کا بالکل ذکر نہیں ہے۔ لکھا ہے :

"خورشید (۷۱) خوشوقت علی خاں خلف داؤد خاں تھانیدار، باشندۂ اکبر آباد، شاگرد برق"۔

سعادت خاں ناصر جس وقت تذکرہ لکھ رہے تھے، تلمذ میں تبدیلی کا واقعہ تازہ تھا اس لیے انھوں نے اس کا ذکر دلچسپ انداز سے کیا ہے :

"ملقب (۷۲) بہ تازہ گویان، موزون الطبع، خوشوقت علی خاں تخلص خورشید، مرزا محمد رضا برق کا شاگرد جدید۔ پہلے یہ شاگرد میر علی اوسط رشک کا تھا اور امیر علی خاں ہلال شاگرد مرزا محمد رضا برق کا۔ اب ہلال کو اگر شادی پر رشک کی دعویٰ کمال ہے، یہ خورشید نعم البدل ہلال ہے"۔

خورشید کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

جھڑکیاں وصل میں او تُرک ستمگر دینا ۔۔۔ میں گلا کاٹوں گا ، دینا مجھے خنجر دینا

بادۂ ناب کا طالب ہے ازل سے خورشید ۔۔۔ کوئی ساغر مرے مولا لب کوثر دینا

پھولو نہ اپنے حُسن پہ تم ، بے ثبات ہے ۔۔۔ بے عیب اک فقط مرے خالق کی ذات ہے

دنیا میں نام اہل سخن کو ثبات ہے ۔۔۔ دیواں مرا سفینۂ آب حیات ہے

جب تک ہے روح جسم میں چلتے ہیں ہاتھ پاؤں

دولھا کے دم کے ساتھ یہ ساری برات ہے (۷۳)

۲۲- دریا:

دیبی پرشاد بشاش نے دزیا کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"(۷۴) دریا پنڈت رتن ناتھ خلف پنڈت امرناتھ شعلہ، واہ باپ بیٹوں نے کیا دو عنصر آبی و آتش مسخر کر لیے ہیں۔ قوم برہمن کشمیری، باشندۂ لکھنؤ، دیوانِ سبحان علی خاں کنبوہ، شاگرد میر اوسط علی رشک اور بعضے مولانا ناطق بلگرامی کے شاگرد لکھتے ہیں"۔

واقعہ یہ ہے کہ باپ بیٹے نے اپنے نام کی مناسبت سے اپنے تخلص مقرر کیے تھے اور یہ بجائے خود اُس زمانے کے مزاج کے مطابق ایک دلچسپ صورت تھی۔

سبحان علی خاں اپنے زمانے کے نہایت دانشمند شخص تھے۔ ان کا دیوان ہونا بھی اہم بات ہے۔ لالاسری رام نے دریا کے بارے میں لکھا ہے:

"(۷۵) پنڈت رتن ناتھ دریا خلف پنڈت امرناتھ شعلہ جو سبحان علی خاں کنبوہ کے دیوان تھے، باشندۂ لکھنؤ۔ زبان فارسی اور دری، ژند کی تحصیل عالمانہ درجہ کی تھی۔ دس بارہ سال ہوئے پیرانہ سالی میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا"۔

سراپا سخن اور سخن شعرا وغیرہ میں بھی ان کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل نہیں ہوتی ہے البتہ سعادت خاں ناصر نے مختصراً یہ کلمات لکھے ہیں:

"(۷۶) معنی آشنا رتن ناتھ پنڈت تخلص دریا، شاگرد رشک، مقیم کانپور"

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

مست ہو جاؤں چشمِ دلبر سے ہو مجھے نشہ چشم ساغر سے
عشق میں قتل سے ہے نشوونما سبز ہے کھیت آبِ خنجر سے

ہو جاؤں میں فریفتہ ابروے یار پر دریا بہاؤں آنکھوں سے خنجر کی دھار پر

۲۳- ذرّہ:

''لالہ[۷۷] شنکر لال ذرہ، قوم کایستھ، باشندہ لکھنؤ، شاگرد میر علی اوسط رشک''

سبھی معاصر تذکروں میں ان کو رشک[۷۸] کا شاگرد لکھا ہے، البتہ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر کے تذکرے میں ہے:

''قوم[۷۹] کایستھ شاگرد میر صبا''

ممکن ہے کہ انھوں نے میر رشک کی روانگی کربلا کے بعد کچھ مدت میر وزیر علی صبا سے بھی اصلاح لی ہو۔ کلام یہ ہے ؎

لکھے جو مصور تری زنجیر مرصع　　خامہ ہو معِ کاغذِ تصویر مرصع
منہال طلائی ہے تو کر دیتی ہے دم میں　　یاقوتِ لبِ لعل کی تاثیر مرصع

اب ہم بھی محرمی ترے صبح و مسا کے ہیں　　عاشق ہیں رخ کے شیفتہ زلف رسا کے ہیں
روز جزا کھڑے ہوئے دیکھیں گے وہ بہار　　اے ذرہ جو غلام شہ کربلا کے ہیں

زہرا و مصطفیٰ و علی و حسن حسین　　اے ذرہ مغفرت ہے انھیں پنجتن کے ہاتھ

۲۴- ذکی:

''[۸۰] اسدالدولہ رستم الملک محمد ذکی خان بہادر فیل جنگ عرف نواب بہادر متخلص بہ ذکی خلف اکبر نواب دلیر الدولہ آغا حیدر متخلص بہ حیدر نیشا پوری، باشندہ لکھنؤ، صاحب دیوان، شاگرد مرزا سرفراز علی قادر[۸۱] اور میر علی اوسط رشک''۔

ذکی کے والد آغا حیدر اپنے زمانے کے مقتدر امرا میں سے تھے۔ ان کے بارے میں ہے کہ:

''(بہو بیگم کی وفات کے بعد) مرزا محمد تقی خاں مالک وثیقہ اور گویا

فیض آباد کے نواب تھے۔ بی بی لطف النسا بیگم جو بہو بیگم کی روشنی چشم تھی ان کے نکاح میں تھی۔ مرزا حیدر خلف مرزا محمد تقی خاں اس کے بطن سے تھے۔ ریذیڈنٹ نے فیض آباد کے تمام معاملات کا انتظام محمد تقی خاں کی رائے پر رکھا — ایک مدت تک یہ کام (تقسیم وثیقہ) مرزا حیدر سے متعلق رہا''۔

ذکی کو باپ دادا کا اقتدار حاصل نہیں تھا، پھر بھی بڑی شان و شوکت سے بسر کرتے تھے۔ منیر شکوہ آبادی نے:

''(۸۲) قطعہ شکر یہ عطیۂ رومال جالی بہ خدمت امیر فقید النظیر فیاض عالمیان نواب اسد الدولہ بہادر عُرف نواب بہادر متخلص بہ ذکی دام اقبالہٗ''۔

میں کہا ہے:

مرے نواب کی یارب حکومت ہو زمانے میں　　فلک پر بھی ہو جاری حکم معزولی بحالی کا

فقط ہے فیض نواب بہادر کا منیر اتنا　　وگرنہ میں مقر ہوں آپ اپنی بے کمالی کا

لالا سری رام نے ذکی کے تلمذ کے بارے میں لکھا ہے:

''(۸۳) پہلے اشرف علی قادر، پھر میر اوسط علی رشک۔ پھر منیر شکوہ آبادی کے شاگرد ہوئے۔ ان استادوں کے فیض سخن سے صاحب دیوان ہو گئے''۔

قادر کا نام اشرف علی نہیں، مرزا سرفراز علی تھا۔ اسی طرح رشک کا نام علی اوسط تھا۔ ذکی کو محسن نے صاحب دیوان لکھا ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ میر رشک سے تلمذ کے زمانے میں ہی وہ اپنا دیوان تیار کر چکے تھے۔ منیر کی شاگردی کے زمانے میں دوسرا دیوان مرتب کیا ہوگا۔

ذکی اپنے زمانے میں تاریخ گوئی کے لیے بھی معروف تھے۔ ''سیف مسلول'' میں

ہے:

''قطعہ تاریخ تصنیف عالی جناب فیض مآب مرزا محمد ذکی علی خان بہادر المتخلص بہ ذکی دام اقبالہٗ''۔

اس میں نو شعر ہیں۔ آخری شعر یہ ہے ؎

معما ہے ذکی تاریخ ہجری　　سرِ غاصب برید سیفِ مسلول

۱۰۰۰ + ۳۱۶

۱۳۱۶

ذکی کے چند شعر یہ ہیں ؎

چڑھتا ہے زہر بن کے مجھے ماجرائے زلف　　اللہ سر سے دور ہی رکھے بلائے زلف

سودائے بوئے گیسوِ جاناں کسے نہیں　　بادِ صبا کے سر میں بھی دیکھی ہوائے زلف

اعمالِ بد نے مجھ کو نکالا بہشت سے　　دوزخ بھڑک اٹھا مرے افعالِ زشت سے

اٹھا نہ بارِ ضعف کا مجھ ناتوان سے　　شرمندہ ایک خس کا نہیں میں جہان سے

۲۵- رسا:

''(۸۴) صاحب فہم و ذکا میر علی احمد، تخلص رسا خلف الصدق مولانا سیدنا جناب غفراں مآب میر نجف علی صاحب طاب ثراہ، شاگرد میر علی اوسط رشک سلمہ اللہ تعالیٰ''۔

میر نجف علی فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ میر رشک ان کے عقیدتمند تھے چنانچہ ان کی وفات کے قطعہ سے ظاہر ہے ؎

ویران و تباہ ہو گیا فیض آباد　　ہے ہے سید نجف علی فاضل

لکھی قلم رشک نے تاریخ وفات　　اے ہے نجف علی فاضل

۱۲۵۴

رسا انھیں نجف علی کے بیٹے تھے۔ غالباً اپنے والد کی وفات کے بعد لکھنؤ آ گئے

تھے۔ محسن کے تذکرے میں ہے:

''(۸۵) میر علی احمد رسا خلف میر نجف علی مجتہد فیض آباد، رفیق نواب عالیجاہ بہادر کے، مقیم لکھنؤ، صاحب دیوان، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

دلیر الدولہ مرزا محمد علی خاں عرف آغا حیدر نیشاپوری کے صاحبزادے نواب مرزا عالی جاہ(۸۶) شاعر اور شاعر نواز تھے۔ ان کی خاطر سے رسا فیض آباد سے آکر لکھنؤ میں رہنے لگے تھے۔ لالا سری رام نے غلطی سے لکھ دیا ہے کہ:

''(۸۷) رامپور کے رہنے والے تھے''۔

رسا کا کلام قواعد وغیرہ کے اعتبار سے قابل استناد سمجھا جاتا رہا ہے۔ جلال لکھنوی نے بھی اپنی کتاب میں ان کے بعض شعر سند کے طور پر(۸۸) نقل کیے ہیں۔ نمونے کے طور پر صرف دو شعر لکھے جاتے ہیں ؎

بجلیاں پہنیں تو اک آگ لگی کانوں میں
کنگھی زلفوں میں جو کی درد اٹھا شانوں میں

نالے کرتا ہوں، نکلتے ہیں جہاں طفلِ سرشک
بچے پیدا ہوں تو دیتے ہیں اذاں کانوں میں

۲۶۔ رہا:

پہلے شوق، پھر رہاؔ تخلص اختیار کیا، چنانچہ سعادت خاں ناصر کا بیان ہے کہ:

''(۸۹) خوش فکری میں معاصرین پر اسے فوق، میر رضی تخلص شوق، اب سنتے ہیں کہ شوق کو چھوڑ کر رہاؔ تخلص کیا ہے۔ شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

اپنے چھوٹے بھائی میر مہدی جنوں کے بعد یہ بھی جوانی میں ہی انتقال کر گئے۔ محسن کے تذکرے میں ان کو ''مرحوم'' لکھا ہے:

''(۹۰) میر رضی مرحوم رہا، ولد میر عباس عرف میر مغل، باشندہ فیض آباد، مقیم کانپور، صاحب دیوان، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

لالا سری رام کا یہ بیان کہ:

''کانپور(۹۱) میں ۱۸۶۶ء کے قریب رہتے تھے''۔

صحیح نہیں ہے البتہ ان کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ:

''(۹۲) نازک خیال اور مشاق کہنے والے تھے''۔

ابتدائی مشق کے چند شعر یہ ہیں ؎

ایسا سبک ہوا ہوں جہانِ خراب میں
گوشہ نشیں ہوں خانۂ چشم حباب میں

کہتا ہے کوئی مہر تجھے ، کوئی ماہتاب
رکھا نہ تو نے فرق مہ و آفتاب میں

مارا جَلا جَلا کے تپِ عشقِ یار نے
لب کا بخار مجھ پہ نکالا بخار نے

اور ؎

آشنا خواب سے ہوتیں نہیں اصلا آنکھیں
دیدۂ روزن دیوار ہیں گویا آنکھیں

ظاہر نہیں ہے کس پہ وقارِ کمالِ لب
سیارہ ماہِ چرخ ہے ، ثابت ہلالِ لب

۲۷- ساحل:

سعادت خان ناصر نے ساحل کو ''سید'' لکھا ہے:

''(۹۳) نئی باتوں کے پیدا کرنے میں کامل، سید اکبر علی تخلص ساحل، مقیم کانپور، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

اور ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے ان کا نام کچھ فرق کے ساتھ تحریر کیا ہے:

''(۹۴) ساحل علی اکبر خاں ولد مرزا باقر علی شاگرد میر علی اوسط رشک، باشندۂ لکھنؤ، صاحب دیوان''۔

لیکن صحیح وہ ہے جو محسن علی موسوی کے تذکرے میں ہے، یعنی:

''(۹۵) مرزا اکبر علی ساحل ولد مرزا باقر علی، خویش منشی محمد حسین کے

ہیں، اسی سبب سے لکھنؤ میں آئے، بعدہٗ کانپور میں چند سال مقیم رہے۔ بطرز شوکت بخاری فکر شعر فرماتے ہیں، باشندۂ دہلی، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

گوکل پرشاد رسا نے بھی یہی لکھا ہے۔ اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

''(۹۶) ساحل مرزا اکبر علی ولد مرزا باقر علی، باشندۂ دہلی، مقیم کانپور، شاگرد میر علی اوسط رشک، صاحب دیوان''۔

لالا سری رام نے ساحل کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

''(۹۷) ساحل مرزا اکبر علی صاحب شاگرد میر علی اوسط رشک لکھنوی، تشبیہ اور استعارے کے وسیع میدان میں پروازِ خیال کو مدِنظر رکھتے تھے اور خال و خط کے مضامین، الفاظ کی طلسم بندی میں خداداد ملکہ تھا۔ اپنے رنگ میں نہایت پختہ اور صنائع بدائع کو اچھی طرح نباہتے تھے۔ عہدِ امجد علیشاہ اور واجد علیشاہ کے شعرا کے ہمعصر اور لکھنؤ میں رہتے تھے''۔

ساحل کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

موسا سے چل کے کیجیے طول کلام زلف
ہو جائے آج وادی ایمن میں شام زلف

اہل سخن میں آج مجھے سلطنت ملی
قبضے میں میرے آگئی اقلیم شام زلف

بیساختہ ہنسی کو بناوٹ سے ننگ ہے
مسی تمھاری تیغ تبسم کو زنگ ہے

اہل سخن یہ کہتے ہیں سُنکر تری غزل
ساحل ترے کلام میں شوکت کا رنگ ہے

۲۸- سپہر:

''سپہر، (۹۸) میر محمدی خلف میر مہدی عرف میر شاہ علی لکھنوی، خواہرزادۂ محسن صاحب سراپا سخن، شاگرد خواجہ وزیر، صاحب دیوان

گزرے''۔

سراپا سخن، خوش معرکہ زیبا اور دوسرے تذکروں میں ان کو خواجہ وزیر کا شاگرد لکھا ہے۔ ایک قلمی بیاض سے معلوم ہوا کہ (۹۹) یہ ''شاگرد رشک'' تھے۔

۲۹- سجاد :

''خوش (۱۰۰) معاش، نیک معاد، سید علی سجاد، تخلص سجاد، محافظ دفتر کلکٹری ضلع الہ آباد، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

محسن نے ان کے بارے میں کچھ زیادہ اطلاعات قلمبند کی ہیں :

''(۱۰۱) محافظ دفتر کلکٹری، ضلع الہ آباد، میر علی سجاد سجاد، خلف میر حیدر علی، باشندہ موضع کھڑا (کذا)، پرگنہ مینہ توابع ضلع مذکور، صاحب دیوان، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر کے تذکرے میں ان کے والد کا نام :

''میر (۱۰۲) صفدر علی، باشندہ موضع کھرا، پرگنہ مہ، ضلع الہ آباد''۔

چھپا ہے کہ لیکن صحیح حیدر علی (۱۰۳) ہی ہے۔ لالا سری رام نے بھی لکھا ہے:

''(۱۰۴) میر علی سجاد صاحب خلف میر حیدر علی، باشندہ موضع کھڑا (کذا) پرگنہ مہ۔ آپ الہ آباد میں محافظ دفتر کلکٹری تھے۔ میر علی اوسط رشک کے شاگرد تھے۔ ایک دیوان ان کی یادگار تھا۔ معلوم نہیں کہ شایع ہوا یا گمنامی کی نذر ہو گیا۔ طرز بیان میں اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں''۔

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

ہو گیا تن کا زعفرانی رنگ — لائی اس درجہ ناتوانی رنگ
کیوں نہ میرا کلام سنکر ہو — میرے دشمن کا زعفرانی رنگ
ہوں وہ رنگیں سخن کہ رکھتے ہیں — میرے الفاظ اور معانی رنگ

صدقے ترے قد پہ لاکھوں خوش قد　　آنکھوں پہ فدا ہزار آنکھیں
گل رنگ ہیں آستین و دامن　　دکھلاتی ہیں کیا بہار آنکھیں

۳۰- سعادت:

سعادت خاں ناصر نے بہت اختصار سے ان کا تعارف کرایا ہے:

''(۱۰۵) صاحب خدمت، سعادت خاں تخلص سعادت، تھانیدار ضلع کانپور، رشک کے تلامیذ میں مشہور''۔

محسن نے کسی قدر زیادہ اطلاعات فراہم کی ہیں۔ لکھا ہے:

''(۱۰۶) تھانیدار کرنیل گنج، ضلع کانپور، سعادت خاں، سعادت، ولد جہاں خاں، ساکن اعظم گڑھ، مقیم کانپور، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

سعادت مشاق شاعر تھے اور اپنے استاد کے فیض پر نازاں۔ ان کے چند شعر یہ ہیں ؎

ہنس کے چھیڑوں اسے، دکھلائے جو جاناں عارض
دیکھ تیرے نہیں ایسے گل خنداں عارض

وہ ہمیں ماہِ دو ہفتہ ہے، وہ رخ غیرتِ مہر
دانت موتی کی لڑی، لعل بدخشاں عارض

کس جگہ عرضی لگائیں آپ کی بیداد کی
کون ہے جو داد دیگا عاشقِ ناشاد کی

طوطی ہندوستاں سمجھیں نہ کیوں شاعر مجھے
اے سعادت ہے عنایت رشک سے استاد کی

۲۳۱- سید :

نواب معتمدالدولہ آغا میر کے دوسرے بیٹے نواب نظام الدولہ، امیر الملک سید علی خان بہادر دلاور جنگ اپنے نام کی مناسبت سے سید تخلص کرتے تھے۔[۱۰۷] ٦ مارچ ۱۸۱٦ء کو پیدا ہوئے اور ٦ ستمبر ۱۸۸۷ء کو وفات پائی۔ حکیم نجم الغنی خاں نے لکھا ہے کہ:

"[۱۰۸] معتمدالدولہ کے تین بیٹے تھے۔ ایک بیٹی تھی جو پاؤں سے معذور تھی اور میر نذر علی خاں پسر محمد افضل علی خاں بائیسی والے کے ساتھ منعقد تھی۔ معتمدالدولہ کا ایک بیٹا روشن الدولہ کی بیٹی کے ساتھ منعقد تھا اور دوسرے بیٹے کی نسبت شاہ میر خاں کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ شاہ میر خاں بہو بیگم کے خاندان سے تھے"۔

اس اقتباس میں معتمدالدولہ کے جن تین بیٹوں کا ذکر ہے ان کو غازی الدین حیدر بادشاہ اول کی طرف سے ملے ہوئے خطابات اس طرح تھے:

امین الدولہ، سیف الملک، نواب سید آغا علی خان بہادر فیروز جنگ...... پسر اول

نظام الدولہ، امیر الملک، نواب سید علی خان بہادر دلاور جنگ .... پسر دوم

معین الدولہ، انتظام الملک، نواب سید باقر علی خان بہادر ظفر جنگ...... پسر سوم

چوتھا بیٹا جو بعد میں پیدا ہوا تھا ننھے نواب محمد علی خاں شمس، شاہی خطابات سے محروم رہا۔

معتمدالدولہ کی بیٹیاں تین تھیں۔ ان میں عالیہ بیگم اور ننھی بیگم خاص محل کے بطن سے اور ایک بیٹی خرد محل کے بطن سے تھی۔ وثیقہ کی تقسیم میں صرف عالیہ بیگم کا نام آتا ہے۔

امین الدولہ کی شادی شاہ میر خاں کی بیٹی سے اور نظام الدلہ کی روشن الدولہ کی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی۔ نظام الدولہ کی بیوی کو سسرال سے "نواب بہو بیگم صاحبہ" خطاب ملا تھا۔

نواب معتمدالدولہ کے آجانے کے بعد کانپور شہر کو غیر معمولی رونق حاصل ہو گئی

تھی۔ وزیرالسلطان نواب محمد امیر علی خان بہادر (وزیرِ واجد علی شاہ) نے لکھا ہے :

”چوں[109] از اکبر آباد مراجعت نمودم، گزرم بہ کانپور افتاد۔ حکام والا مقام نہر اندریں شہر بہ کمال خوبی آوردہ اند، آبش نہایت لطیف است و مقام عساکرِ سرکاری نیز نہایت پُرفضا و لطیف و خوشنما۔ اگرچہ شہر کلاں نیست فامّا صاف و آباداں خیلی است...... بہ ملاقات نواب نظام الدولہ بہادر خلف نواب معتمدالدولہ مرحوم سرمایۂ مسرت بہ حدے اندوختم کہ مکارم اشفاق آں یگانۂ آفاق راتا زندہ ام بہ یاد دارم“۔

اس صاف اور آباد شہر کانپور میں نظام الدولہ جس شان سے رہتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی کیا جانا چاہیے کہ واجد علی شاہ بادشاہ ان کے یہاں مہمان رہے تھے۔ مذکور ہے کہ :

”[110] یہ قافلہ (اسیران لکھنؤ مع بادشاہ) شام سے قبل کانپور کے گھاٹ پر پہنچا ...... یہاں نواب نظام الدولہ پسر نواب معتمدالدولہ آغا میر کے مہمان ہوئے۔ دو تین دن میں برسات کا سامان درست کر کے الہ آباد کو روانہ ہوئے“۔

غدر میں ہند کی رعایا پر جو تباہی آئی۔ اس کے بیان کی احتیاج نہیں ہے۔ نواب معتمدالدولہ کے اخلاف بھی اس عذاب میں مبتلا ہوئے لیکن جلدی ہی گلو خلاصی ہو گئی۔ آغا حجو شرف نے بیان کیا ہے ؎

[111]خبر ہو گئی فتح کی دور دور — اسی طرح سے لے لیا کانپور......
جو مغوی تھے ان کو ملیں پھانسیاں — گئی یوں ہی اعظم علی خاں کی جاں
جو فرزند تھے معتمد دولہ کے — بچی جان ان کی طلب ہو گئے
جو سید علی خاں تھے عالی جناب — وہ باقر علی خان اہلِ خطاب
وہ نواب دولہا سب ان کے عزیز — مع ننھے نواب سب باتمیز

بلائے گئے رو بکاری ہوئی ہوئے مطمئن رستگاری ہوئی

نواب نظام الدولہ کی رہائی کا سبب کمال الدین حیدر نے اس طرح قلمبند کیا ہے:

"(۱۱۲) نواب نظام الدولہ سید علی خاں اس ہنگامہ میں لکھنؤ چلے آئے تھے۔ جب کانپور گئے بہ ہزار خرابی بعد کئی برس کے وثیقہ جاری ہوا۔ ایک وجہ اور بھی تھی کہ یہ فریمیشن بھی تھے اس جہت سے اس فرقۂ خاص میں طریق حق برادری ایک دوسرے پر بہ شرط اختیار لازم ہوتا ہے"۔

غدر کے عذاب سے نجات مل گئی لیکن اس مدت میں قرض کا بار بہت بڑھ گیا تھا۔ منشی درگاہی لال نے لکھا ہے:

"(۱۱۳) نظام الدولہ صاحب — ان کے اوپر قرضہ کا بار اس قدر ہو گیا ہے کہ اس سے سبکدوش ہونا دشوار ہے"۔

بہر نوع بالآخر حالات سازگار ہوئے اور وہ کانپور میں باعزت بسر کرتے رہے۔ ایک دفعہ بادشاہ سے ملاقات کے لیے کلکتہ گئے۔ وہاں جو صورت پیش آئی اس کا ذکر کمال الدین حیدر نے اس طرح کیا ہے:

"(۱۱۴) نظام الدولہ سید علی خاں پسر نواب معتمد الدولہ کانپور سے کلکتہ فقط اپنے خلوص محبت سے گئے تھے۔ ایک دن سید حسین پسر معتوب شاہی کو بے خبری سے اپنی گاڑی میں سوار ہو کر چاہتے تھے کہ داخل در دولت ہوں۔ دربان نے منع کیا آپ کے واسطے حکم حاضر ہونے کا نہیں ہے۔ گفتگو ہوئی۔ آخر بد دماغ ہو کر پھر گئے۔ حضور عالم سے رخصت ہو، کانپور چلے آئے۔ ہر چند بادشاہ (واجد علی شاہ) نے فرمایا کہ ان کے واسطے ممانعت نہیں تھی لیکن وضعداری پر کام فرمایا۔ پندرہ ہزار کے عبث زیر بار ہوئے"۔

کانپور (۱۱۵) میں اکثر شاعران کے وابستگان دولت میں تھے اور بعض ملازم بھی تھے

چنانچہ میر حسین علی روش ان کی سرکار میں داروغہ تھے اور منیر شکوہ آبادی وغیرہ متوسل اور دعا گو۔

نظام الدولہ کا دیوان بہت پہلے مرتب ہو چکا تھا لیکن غالباً وہ چھپ نہیں سکا۔

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

چٹکی لی، جان کسی کی نکلی — یہ نئی وضع ہنسی کی نکلی
ایک بھی زخم پہ چھڑکا نہ نمک — ہر جفا آپ کی پھیکی نکلی
بیجا نہیں حسینوں کی یہ لن ترانیاں — اے غافلو یہ حُسن امانت خدا کی ہے
سید کبھی نہ طالب اکسیر ہوں جو آئے — خاکِ مزارِ حیدرِ کرار ہاتھ میں

۳۲- شاد:

صرف سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں ان کا ذکر مل سکا، اس طرح:

''(۱۱۶)فضل امام خاں تخلصِ شادؔ، میر علی اوسط رشک اس کے استاد، یہ شعر یادگار''۔

لطف بے مَے ہے کہیں برسات میں — مَے نہیں تو میں نہیں برسات میں
آ گلے لگ جا ہمارے اے پری — بس ''نہیں'' اچھی نہیں برسات میں
رعد کیا ہے شاد اگر نالہ کروں — کانپ اٹھے عرشِ بریں برسات میں

۳۳- شاکر:

میر رشک کے شاگردوں میں کوئی شاکر بھی تھا لیکن اس کے مفصل حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

۳۴- شرف:

سعادت خاں ناصر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"(۱۱۷) گوہر مضامین آبدار کا صدف، شیخ شرف الدین حسین، تخلص شرف، ساکن شہر کول، شاگرد میر علی اوسط رشک"۔

محسن نے ان کے بارے میں زیادہ اطلاعات قلمبند کی ہیں، اس طرح :

"(۱۱۸) تھانیدار ضلع کانپور، شیخ شرف الدین حسین، شرف، خلف شیخ شہاب الدین حسین، باشندۂ علی گڑھ، وارد لکھنؤ، صاحب دیوان، شاگرد میر علی اوسط رشک"۔

ارمغان گوکل میں غلطی سے ان کو "باشندۂ اعظم گڑھ" لکھا ہے۔ ان کا اعظم گڑھ سے تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ لالا سری رام نے ان کے بارے میں رائے دی ہے کہ :

"(۱۱۹) استعارہ بندی میں ہوشیار ماہر، قدیم تخیل کے دلدادہ"۔

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

نخلِ طوبا اور ہے ، وہ قدِ بالا اور ہے
چشمِ نرگس اور ہے، وہ چشمِ شہلا اور ہے
جان اگر اس کو نہ دوں کس کام کی ہے کس کو دوں
ناصحا اس سے زیادہ کون پیارا اور ہے
گاتے گاتے غیر کے آتے ہی بگڑا ہم سے شوخ
خوب سمجھو اے شرف یہ راگ مالا اور ہے
جو قسمت میں ہے دید ان ابروؤں کی ہو گی بے شبہ
شرف کیا دیکھتا ہے فال دیوانِ ہلالی میں

۳۵- شگفتہ :

شگفتہ میر واجد (۱۲۰) علی شاگرد میر علی اوسط رشک۔

۳۶- شوق :

حکیم میر علی ضامن شوق تخلص کے بارے میں آغا جو شرف نے لکھا ہے ؎

ہیں سید علی ضامن اک باکمال(۱۲۱) خدا دان و زاہد ، فرشتہ خصال
پسر ہیں علی اوسط استاد کے جو موجد تھے مضمونِ ایجاد کے
یہ ہیں شاعر و صاحبِ علم بھی طبیعت میں ہے خُلق بھی، حلم بھی
عجب شعر کہنے کا اسلوب ہے کہ طبعِ رواں میں مزہ خوب ہے
مہذب ، مدبر ، سخن سنج ہیں
خدا دوست ، بےنفس ، بے رنج ہیں

سید علی ضامن میر علی اوسط رشک کے بڑے بیٹے تھے۔ غالباً ۱۲۳۱ھ کے قریب پیدا ہوئے تھے۔ ان کے ختنہ کی تاریخ شیخ امام بخش ناسخ نے اس طرح کہی تھی ؎

ہمایوں باد ٔیا اللہ ختنہ
۱۲۵۱ھ

اور میر علی اوسط رشک نے اس موقع پر یہ قطعہ کہا تھا ؎

پائے عمر خضر علی ضامن جیسے یہ میری جان یا اللہ
ہے سنین ختاں کی یہ تاریخ ہو ہمایوں ختان یا اللہ
۱۲۵۱

اسی سال میں علی ضامن کی شادی ہوئی۔ ان کے والد نے اس تقریب کی تاریخ اس طرح کہی ؎

شادی عقد علی ضامن کردم اے رشک خواستم از کرم و لطف خدا آبادی
یافتم مصرعِ تاریخِ عروسی از غیب یوم بست و نہم از ماہ مبارک شادی
۱۲۵۱

اور شیخ ناسخ نے دعائیہ قطعہ تاریخ کہا ؎

بہ سید علی ضامن از لطف معبود شدہ کدخدائی ہمایون و مسعود

خدایش دہد زود اولاد صالح شود نیک و مسعود اولاد صالح

صد و بست سالہ شود والدِ تو زوضعِ تو راضی شود والدِ تو

جناب معلائے او قبلۂ من تو ہم ہستی اے نیک خو قبلۂ من

فزوں جاہ و اقبال ہر روز بادا عدوے شما حسرت اندوز بادا

خدا و نبیؐ یاور و یار باشند ایمہ معین و مددگار باشند

رقم سال کردم بدستِ خیالی

ہمایون و مسعود شد کد خدائی

۱۲۵۱

میر رشک اگرچہ شیخ ناسخ کے شاگرد اور ان سے عمر میں کافی چھوٹے تھے، ان کے لیے ناسخ کے دل میں جو احترام تھا اس کا اندازہ خصوصاً چوتھے شعر سے کیا جانا چاہیے۔

علی ضامن کی شادی مرزا محمد جعفر خاں مصنف منافع الابرار[۱۲۲] کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ منافع الابرار کے لیے علی ضامن نے جو قطعۂ تاریخ کہا تھا اس سے دونوں کے روابط کا پتا چلتا ہے:

"قطعہ تاریخ تحریر رسالہ و اتمام طبع آں (منافع الابرار) از جناب حکیم سید علی ضامن صاحب متخلص بہ شوق"۔

سبحان اللہ کیا ہے فکر حضرت دیکھا نہیں واللہ محقق ایسا

ہر فن میں کمال، عابدوں میں ممتاز ہیں وعظ میں زینت منابر بخدا

میرے استاد، باپ[۱۲۳] سے بڑھ کے شفیق ظل رحمت ہے سایۂ مجد و علا

ہیں پیروِ خاصِ نائبِ ختم رسل فیاض و خلیق و صاحب جود و سخا

مصروفِ فضائل و مصائب ہر دم غمگین غمِ اہلِ بیت میں صبح و مسا

ظاہر میں گو منافع اس کا ہے علم باطن میں بھی عابدوں کے ہے راہنما

اس کے اتمام و طبع کے ختم کے سن منظور ہوا کہ ہوں یہ دونوں یکجا

تھا فکر میں شوق ، بول اٹھا ہاتف غیب
ہاں خوب رسالہ دینِ حق میں لکھا

۱۲۸۸

علی ضامن کے ایک بیٹے کا انتقال ۲۴ جمادی الاول ۱۲۶۵ھ کو ہوا تھا۔ منیر شکوہ آبادی نے اس مصرع سے تاریخ نکالی ۔

بست و چارم ماہ پنجم پنج شنبہ

۱۲۶۵

اس سانحے سے متعلق ایک دوسرے قطعے میں منیر شاگرد رشک نے کہا ہے ۔

رفت چوں فرزند مرشد زادۂ من از جہاں ۔۔۔ پارہ پارہ شد دلم زیں صدمۂ جانکاہ حیف
شد سیہ عالم بچشمِ حضرتِ (۱۲۴) استادِ من ۔۔۔ منخف گروید در ظلماتِ قراین ماہ حیف

اس کے بعد میر رشک کی طبیعت مرجھا گئی تھی۔ کچھ ہی مدت میں اسباب فراہم ہو گئے اور وہ کربلا کے لیے روانہ ہو گئے۔

سید علی ضامن کے حال میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ:

"(۱۲۵) کلام میں متانت تمام، شعر میں لطافت اور نظام، میر علی ضامن، صاحبزادہ جناب میر علی اوسط صاحب رشک سلمہٗ۔ اول میں حسب الارشاد اپنے والد کے تحصیل علوم درسی تمام و کمال کیا، پھر علم طب کا اشتغال۔ شیخ ناسخ نے تخلص نامی رکھا تھا۔ جب اس نے علم عروض اپنے والدِ گرامی سے حصول کیا تو شوق تخلص قبول کیا اور ہر غزل کے آخر میں تاریخ کہنا ایجاد کیا۔ آپ کو اس میں استاد کیا"۔

شیخ ناسخ کے انتقال کے وقت سید علی ضامن کی عمر بائیس تیئس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نومشقی کے زمانے میں علی ضامن شیخ صاحب سے کسبِ فیض کرتے رہے تھے

اور اس وقت ان کا تخلص نامی تھا۔

شیخ صاحب کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے والد سے اصلاح لینی شروع کی اور تخلص شوق مقرر کیا۔ میر رشک کو تاریخ گوئی کے فن میں غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ بیٹے نے بھی اس باب میں امتیاز کی وہ صورت پیدا کی جس کا ذکر ناصر نے کیا ہے۔ محسن نے ان کے بارے میں تحریر کیا ہے:

"(۱۲۶) حکیم اور فاضل سید علی ضامن شوق، خلفِ اکبر اور شاگرد میر علی اوسط رشک، باشندۂ لکھنؤ، صاحب دیوان۔ ان کی ہر غزل کا مقطع تاریخی ہوتا ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ شوق بھی کربلائے معلا ہو آئے تھے چنانچہ آغا حجو شرف نے ان کو "زائر" کہا ہے۔ آخر عمر میں انھوں نے بریلی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ عبداللہ خاں ضیغم کا بیان ہے کہ:

"(۱۲۷) حکیم میر علی ضامن شوق مرحوم لکھنوی ـــــ میر علی اوسط رشک مرحوم کے خلف و شاگرد تھے۔ بہ صیغۂ طبابت نواب کاظم علی خان بہادر جو والی حال رامپور کے حقیقی چچا تھے اور بریلی میں سکونت اختیار کی تھی، ان کے ملازم تھے۔ قضائے الٰہی سے وہیں انتقال کر کے مدفون ہوئے"۔

علی ضامن شوق نے "(۱۲۸) ریاض العروض" میں خود اپنے حالات اس طرح بیان کیے ہیں:

"مجھے غدر ۱۸۵۷ء میں اپنے وطن سے نکلنا پڑا۔ کئی سال مختلف قصبوں اور دیہی علاقوں میں طبابت کرنے کے بعد ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں آغا علی خاں مہر کے بیٹے نواب بہادر علی خاں شمس کی خدمت میں کانپور پہنچا۔ کچھ دنوں کے بعد نواب موصوف نے مجھ سے فن عروض پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی جسے میں چند ماہ تک

ٹالتا رہا۔ آخر جب ان کا اصرار بہت بڑھا تو صرف ایک ہفتہ کی قلیل مدت میں زیرِ نظر کتاب لکھ کر نواب کی خدمت میں پیش کر دی''۔

شوق کی علم عروض سے واقفیت کے سلسلے میں سعادت خاں ناصر نے بیان کیا ہے کہ:

''[(۱۲۹)] حکایت: ایک دن میں حسب دستور ان کے مکان پر بیٹھا تھا اور وہ (شوق) معیار الاشعار شیخ غلام حیدر کو پڑھاتے تھے اور مضامین خوش بیانی سے سمجھاتے تھے کہ میاں بحر صاحب تشریف فرما ہوئے اور اُنھوں نے ایک شعر فارسی پڑھا اور تقطیع کرنے کو کہا۔ ایک ادنا تامل میں انھوں نے سمجھا دیا کہ یہ دو مصرعے الگ الگ ہیں۔ میاں بحر چپ ہو رہے''۔

یہ حکایت اس زمانے کی ہے جب شوق کی عمر تیس کے قریب رہی ہو گی۔ تذکروں میں شوق کے بعض شاگردوں کا ذکر ملتا ہے مثلاً منشی [(۱۳۰)] مرتضیٰ خاں پرویز لکھنوی اور [(۱۳۱)] نواب احمد مرزا خاں توقیر وغیرہ۔ کہتے ہیں کہ شروع زمانے میں آرزو لکھنوی نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔

تاریخ گو کی حیثیت سے بھی شوق بہت جلد ممتاز ہو گئے تھے۔ محسن کے تذکرہ سراپا سخن میں بھی ہے:

''قطعہ تاریخ فرمودہ میر علی ضامن شوق خلف الرشید میر علی اوسط رشک''۔

آں محسن و مستجمع اخلاق و کرم   تلمیذ امام شعرائے اُردو
از سعی بلیغ خویش یکجا فرمود   ترصیع کلام شعرائے اُردو
من بعد چو خواست طبع آں مخزن حسن   دارندۂ نام شعرائے اُردو

ہاتف از شوق گفت فصلی اعداد
شر طبع کلام شعرائے اُردو

۱۲۶۸

شوق کے کلام کا نمونہ پیش کرتے ہوئے سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ:

"(۱۳۲)دل عاشق سے عبث کاوشیں ہیں در پردے
جو تمھیں خواہش دل ہو تو یہ حاضر کر دے

یہ غزل انھوں (شوق) نے میرے سامنے اپنے والد سے اصلاح لی تھی اور انھوں نے اس غزل میں یہ ایک تھا شعر، اس میں لفظ بنائے تھے ۔

بخت تیرہ سے ملا ہے یہ نیا داغ مجھے
روشنی گور پر آئے تو ہوا گل کر دے

میر علی اوسط صاحب رشک نے فرمایا ۔

بخت تیرہ نے دیا ہے یہ نیا داغ مجھے
روشنی گور پر آئے تو ہوا گل کر دے

سبحان اللہ لفظ 'دیا' کیا شعر میں رکھ دیا ہے"۔

شوق کے چند شعر یہ ہیں ۔

کچھ جھوٹ نہیں مصرع تاریخ یہ اے شوق
سچ ہے کہ بجز رشک کے استاد نہیں ہے

۱۲۵۶

شوق دیدار میں پتھرائیں سراسر آنکھیں
بدلے ڈھیلوں کے یہاں رکھتی ہیں پتھر آنکھیں

ٹکڑے گریباں، پُرزے داماں، اشک فشاں، فریاد کناں
صحرا کو اس طرح سے چلیے، وحشت کی واں فرمائش ہے

۳۸- صادق:

"(۱۳۷) صادق، حکیم میر محمد صادق عرف صادق مرزا ولد حکیم سید محمد حسن خاں شاگرد رشک کے ہیں"۔

محسن موسوی نے اپنے تذکرے میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

"(۱۳۸) حکیم سید محمد۔ صادق عرف صادق مرزا صادق ولد حکیم سید محمد حسن خاں نبیرۂ سید روشن علی خاں برادر نواب معتمدالدولہ بہادر باشندہ لکھنؤ، مقیم کانپور، شاگرد سید ہادی علی بیخوذ"۔

معلوم ہوتا ہے کہ قیام کانپور کے زمانے میں انھوں نے رشک سے استفادہ کیا تھا۔

ان کا کلام یہ ہے ؎

تاک آئیں رخِ پُرنور کسی کا آنکھیں — بے سبب آٹھ پہر رہتیں نہیں وا آنکھیں

۳۹- صبر:

"(۱۳۹) صبر کانپوری، ان کا نام محمد رضا تھا، صبر تخلص، رشک لکھنوی کے شاگرد تھے"۔ کسی تذکرے میں ان کے مفصل حالات نہیں ملے۔ ان کے دو شعر یہ ہیں۔

رات یہ ہم نے عجب خواب پریشاں دیکھا — غیر کو شانہ کشِ گیسوِ جاناں دیکھا

کیا خیال رخ و کاکل میں ہے مصروف اے صبر
رات دن ہم نے تجھے سربہ گریباں دیکھا

۴۰- صغیر:

یہ میر رشک کے عقیدت مند شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے اپنے استاد کے

تیسرے دیوان کی تاریخ اس طرح کہی تھی:

''تاریخ گفتۂ شیخ امین الدین حیدر متخلص بہ صغیر''۔

فخرِ استادانِ عالم رشک ہے واقعی ہے صاد افرادِ جہاں
ہے یہی تاریخِ دیواں اے صغیر تیسرا دیوان استادِ جہاں
۱۲۶۷

۴۱۔ صغیر:

''(۱۴۰) شیخ حیدر علی (۱۴۱) صغیر ولد شیخ دھومن، باشندۂ لکھنؤ، صاحب مشاعرہ و صاحب دیوان، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

عبداللہ خاں ضیغم نے ان کے تعارف میں کچھ تھوڑا سا اضافہ کیا ہے۔ لکھا ہے:

''(۱۴۲) صغیر تخلص، حیدر علی شاہ نام ابن شیخ دھوبن مرحوم، متوطن لکھنؤ، قوم شیخ صدیقی ہیں۔ میر علی اوسط رشک مرحوم کے شاگرد ہیں۔ سب طرح قابل ہیں۔ عمر قریب ستر برس کے ہے۔ فی الحال دھارو پور ضلع پرتاب گڈھ میں مقیم ہیں۔ صاحب دیوان اور مصنف آئینۂ اختر وغیرہ''۔

صغیر میر رشک کے باصلاحیت شاگردوں میں سے تھے۔ شاعروں میں معزز اور باوقار تھے اور اس حقیقت پر ان کا ''صاحب مشاعرہ'' ہونا دلالت کرتا ہے۔

محسن نے صغیر کو ''صاحب مشاعرہ'' کہا ہے لیکن صغیر کا جو مطبوعہ دیوان راقم کی نظر سے گزرا ہے اس میں ''تاریخ ترتیب دیوان صغیر'' ۱۲۸۳ء لکھی ہے اور اس کا سال طباعت ۱۳۰۵ھ ہے۔ اگر محسن کے بیان پر اعتماد کیا جائے تو اسے دوسرا دیوان ماننا پڑے گا۔ اس دیوان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ صغیر کو تاریخ گوئی میں بھی پوری مہارت حاصل تھی۔ اس دیوان میں ان کے کہے ہوئے باکثرت قطعاتِ تاریخ شامل ہیں۔

لالا سری رام نے کہا ہے کہ صغیر ''غزل کے علاوہ مرثیے بھی لکھتے تھے''۔ دیوانِ

صغیر میں ایک قطعہ ''تاریخ وفات میر انیس صاحب و مرزا دبیر صاحب'' سے متعلق بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صغیر کو مرزا دبیر سے بھی تلمذ حاصل تھا ۔

بود مرزا دبیر استادم مگر اُنس از انیس ہم دارم
بنویسم دو گونہ چوں تاریخ ماتمِ ہر دو یک قلم دارم
فصلی و ہجری اے صغیر بگو
وائے داغ دروں ز غم دارم

۱۲۸۲ھ ۱۲۹۲ف

صغیر کو واجد علی شاہ بادشاہ کی خدمت میں رسائی تھی۔ اپنی کتاب ''بنی'' کی ایک ''نقل'' میں بادشاہ نے شاعر کی حیثیت سے صغیر کا نام لیا ہے۔ خود صغیر کے دیوان میں ایک ''قصیدہ حضرت سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ والی ملک اودھ'' موجود ہے جس کا مطلع یہ ہے ۔

شہِ گردوں نشیں، قطبِ زمیں، مہر جہانبانی سلیمانِ زماں ، سلطانِ عالم ،ظلِ سبحانی

شاہزادوں اور وزیر الممالک وغیرہ کی شان میں بھی صغیر نے قصیدے اور قطعے وغیرہ لکھے تھے۔

راجا رامپال سنگھ، راجاؔ تخلص، تعلقدار کالا کانکر صاحب علم شخص تھے۔ ان کا فارسی دیوان ''دیوانِ راجا'' کے نام سے ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء میں ہنونت پریس کالا کانکر سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ صغیر ان کے استاد تھے۔ غدر کے بعد انھیں کی خدمت میں رہنے لگے تھے۔ صغیر کے دیوان میں کالا کانکر سے متعلق قطعات تاریخ موجود ہیں مثلاً :

''تاریخ تعمیر گھاٹ (لب دریائے گنگ) راجا ہنونت سنگھ بہادر کالا کانکر۔ ۱۲۷۸ھ''۔

صغیر نے اپنی مشہور مثنوی آئینِ اختر عرف ظفر نامہ اسی مقام پر ۱۲۷۶ھ میں لکھی تھی جس میں ولی عہدی کے قضیے اور مولوی امیر علی کے واقعات بھی نظم کیے تھے۔ یہ مثنوی بھی اس حقیقت کی غماز ہے کہ صغیر کو سرکار شاہی میں رسوخ حاصل تھا۔

دیوان صغیر میں صغیر کے بعض شاگردوں مثلاً فدا حسین اسیر متوطن قصبہ مؤ ضلع الہ آباد اور مولوی شاہ عبدالغفور بقارئیس مانکپور وغیرہ کے قطعات تاریخ بھی موجود ہیں۔ صغیر کا دیوان ان کی وفات کے بعد چھپا تھا۔ حافظ جلیل حسن جلیل مانکپوری نے اس کے لیے جو قطعہ لکھا تھا، یہ ہے ؎

دیوان صغیر کا ہے یا معدنِ لطافت
ہر شعر میں صفائی ، ہر لفظ میں فصاحت
کیا لطف ہے غزل میں ، کیا بات ہے سخن میں
گویا ٹپک رہی ہے ہر شعر سے ملاحت
اشعار میں بندھے ہیں ہر رنگ کے مضامیں
دو چار میں فصاحت ، دو چار میں بلاغت
مضموں نگاریاں کچھ ، نازک خیالیاں کچھ
کچھ لطف سادگی کا ، کچھ شوخی و شرارت
کی اے جلیل مَیں نے جس وقت سیرِ دیواں
بے چین ہو گیا دل ، پھڑکی مری طبیعت
فوراً قلم اٹھا کر ، تاریخ طبع لکھی
اشعار کا ہے مخزن ، یا نسخۂ فصاحت
۱۳۰۵ ۱۳۰۵

سید علی ضامن شوق کی طرح صغیر نے بھی اپنی اکثر غزلوں کے لیے تاریخی مقطعے کہے ہیں۔ بعض یہ ہیں ؎

ہر غزل میں چاہیے تاریخ ہجری اے صغیر
اے دل اب بے یار کیا کیا راگ لائے گا خیال
۱۲۶۷

مصرعِ تاریخ قولِ بدگماں تھا اے صغیر
میر(۱۴۳) صاحب جا چکے بہرِ زیارت آج کل

۱۲۶۷

اے صغیر اس کو کہوں میں سنِ فصلی کیونکر
وصل حاصل ہے مجھے روز اب اٹھوارے میں

۱۲۶۷ فصلی

چند شعر یہ بھی لائق توجہ ہیں ۔

شمعیں رونے لگیں پروانوں کے جل جانے سے
بیوفاؤں نے کیا یاد وفاداروں کو

چھوڑیئے سو کام پر یاروں سے ملیے اے صغیر
ہر طرح ہے صحبتِ اہلِ سخن سے فائدہ

اے صغیر اپنے اشعار لکھ جا
خلق میں تیری شہرت رہے گی

سُننے والوں کو بہت یاد تو آئے گا
جس گھڑی تیری غزل گائیں گے گانے والے

صغیر کے ایک چھوٹے بھائی منشی بشارت علی خاں تھے۔ انھوں نے ایک کتاب ''جدولِ عروض'' تالیف کی تھی۔ اس کی تاریخ صغیر نے اس طرح کہی تھی :

''تاریخ تالیف جدولِ عروض منشی بشارت علی خاں صاحب''۔

کشید جدولِ صنعت برادرِ خُردم خلاصہا بنوشت و دراں مفصلہا
دریں زمانۂ آخر چنانست نثر نویس شکست شد قلم ، دستِ فکر اوّلہا
عروض و قافیہ را آنچناں خلاصہ کرد کہ اختصار شدہ دفتر مطلوبہا

صغیر بینہ و زبر گفت از منقوط
عروض و قافیہ اندر حساب جدولہا

۱۲۶۷

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ بشارت نے بھی میر رشک سے کسبِ فیض کیا تھا، یا نہیں۔

۴۲۔ صفدر (۱۴۴)

سید فرزند حیدر صفدر تخلص کو محسن نے (۱۴۵) اپنے تذکرے میں منیر کا شاگرد لکھا ہے لیکن عبداللہ خاں ضیغم کا کہنا ہے کہ:

''(۱۴۶) صفدر تخلص، فرزند حیدر نام ابن منشی سید امیر حیدر مرحوم، ساکن فرخ آباد ہیں۔ فکر نزاکت پسند رکھتے ہیں۔ میر علی اوسط رشک مرحوم کے شاگرد ہیں''۔

اور لالا سری رام نے تحریر کیا ہے کہ:

''(۱۴۷) صفدر، سید فرزند حیدر، خلف میر امیر حیدر فرخ آبادی تلمیذ میر علی اوسط رشک و اسمٰعیل حسین منیر۔ بڑے عاشق مزاج، شوخ طبع، ذہین، شعر گوئی میں منہمک اور سرکار نواب کلب علی خاں میں بہ زمرۂ شعرا منسلک تھے۔ بہت مشاق اور عالی خیال سخنور تھے۔ زبان پیاری لکھتے تھے۔ روزمرہ صاف اور شستہ تھا''۔

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر کے ''دیوان سراپا'' (۱۴۸) کی تقریظ اور تاریخ بھی صفدر نے لکھی تھی:

سید فرزند حیدر صفدر شاگرد رشک کا قطعہ تاریخ۔

سب بحروں میں بندش کی صفائی ہے سراپا — ہر شعر ہے نادر گہرِ درجِ فصاحت
اتمام کی تاریخ یہ صفدر نے رقم کی — دیوان ہے بالکل قمر برجِ فصاحت

۱۲۹۳

صفدر کے کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

منہ دیکھے کی اے جان محبت نہیں اچھی
رہنے دو تم اپنی یہ عنایت نہیں اچھی

یہ مدعا ہے ، نہ ہو کوئی مدعا یارب
یہ آرزو ہے ، نہ ہو کوئی آرزو مجھ کو

افشاں سے خوب چمکے ہیں زلف دو تا کے بال
ہیں کوڑیالے سانپ مرے دلربا کے بال
سنبل کا دل گھٹاتے ہو ، اپنے بڑھا کے بال
لٹکاتے ہو کمر سے جو زلف دو تا کے بال

۴۳- طوفان :

"(۱۴۹) صاف گو، سادہ بیان، میر نوازش علی تخلص طوفان، شاگرد میر علی اوسط رشک"۔

محسن نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے :

"(۱۵۰) میر نوازش علی طوفان خلف میر نظر علی، باشندۂ قصبہ آسیون توابع لکھنؤ، شاگرد رشک"۔

نساخ(۱۵۱) اور نادر نے اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ ارمغانِ گوکل میں البتہ ان کے والد کا نام میر نظیر علی لکھا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

چشم بددور تمھاری ہیں وہ زیبا آنکھیں
انھیں آنکھوں کی رہا کرتی ہیں شیدا آنکھیں
ابر برسات میں ایسا نہ برستا ہو گا
ایسی روتی ہیں، بہا دیتی ہیں دریا آنکھیں
جلوہ افروز تو جہاں ہو گا
سارا عالم اُدھر رواں ہو گا

نہ جیا ہو گا ہجر میں طوفاں زندہ ہو گا تو نیم جاں ہو گا

۴۴- عروج:

عروج سرکار انگریزی کے متوسلین میں سے تھے۔ قیاساً ۱۲۴۲ھ کے قریب فرخ آباد میں پیدا ہوئے تھے اور:

''(۱۵۲) فرخ آباد میں صاحب ایجنٹ گورنر جنرل بہادر مختار الملک سرکار دولت مدار کمپنی انگریز کے پاس ملازم رہے''۔

شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر شاید سب سے پہلے سعادت خاں ناصر نے کیا ہے، اس طرح:

''(۱۵۳) صاحب فکر تازہ، بلند آوازہ، سب سے اونچا، ہر مصرع بلندی میں مثل قامتِ عوج، منشی احمد خاں تخلص عروج، ساکن لکھنؤ، مقیم کانپور، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مدت کے بعد عروج دہلی چلے گئے تھے اور:

''ایک (۱۵۴) زمانے تک دہلی ریذیڈنسی میں ملازم تھے''۔

دہلی سے لکھنؤ چلے گئے۔ پھر وہاں سے کانپور آ کر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ محسن نے ان کے اصل وطن اور پھر کانپور میں مقیم ہو جانے کا سبب اس طرح بیان کیا ہے:

''(۱۵۵) منشی احمد حسن خاں عروج، خلف الرشید منشی محمد حسن خاں، وطن بزرگوں کا قصبہ اسیون (توابع لکھنؤ)، بہ سبب رفاقت نواب روشن الدولہ مقیم کانپور، ارشد تلامذہ میر علی اوسط رشک''۔

غدر کے بعد عروج رامپور چلے آئے تھے، چنانچہ مذکور ہے:

''(۱۵۶) آخیر میں نے کانپور میں بودو باش اختیار کی۔ ۱۲۸۸ھ میں جناب سید کلب علی خاں صاحب بہادر خلد آشیاں کی قدر دانی

رامپور کھینچ لائی۔ سو روپے کی تنخواہ ہوئی۔ عربی میں پوری دستگاہ تھی۔ فارسی میں گویا استاد کامل تھے۔ خوش نویسی، نستعلیق میں یدطولیٰ تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ اور میر علی اوسط رشک سے اردو کلام میں استفادہ کیا تھا۔ نہایت مہذب اور باوضع آدمی تھے۔ رامپور سے علیل ہو کر کانپور گئے اور تیرہ سو بارہ ہجری میں انتقال ہوا۔ رامپور میں ۱۰ جنوری ۱۸۷۶ء کو رجسٹری کی خدمت آپ کے سپرد ہوئی۔ پھر مصاحبین میں تعلق رہا''۔

امیر مینائی نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

''(۱۵۷) عروج منشی احمد حسن خاں خلف منشی محمد حسن خاں مغفور، مضافات لکھنؤ میں ایک قصبہ ہے آسیون۔ وہاں کے شیوخ میں نامی ہوئے اور دہلی اور لکھنؤ میں بہت رہے۔ اب کانپور میں بودوباش ہے اور اس دارالریاست میں دو برس سے صورت معاش ہے۔ سرکار فیض آثار کے وظیفہ خوار ہیں۔ قدردانی بندگان حضور کے شکرگزار ہیں۔ چون برس کی عمر ہے۔ فکر بلند ہے۔ مذاق دلپسند ہے۔ فرماتے ہیں کہ دو ایک سلام شیخ امام بخش ناسخ مرحوم کو دکھائے تھے اور چند غزلیں میر علی اوسط رشک مغفور کو دکھائی تھیں۔ دیوان مرتب نہیں ہوا''۔

عروج کانپور میں رئیسانہ بسر کرتے تھے۔ بعض شاعر ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ ان میں منیر شکوہ آبادی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ منیر کے دیوان میں عروج سے تعلق بعض قطعات تاریخ ملتے ہیں مثلاً:

(۱۵۸) قطعہ تاریخ رحلت والدہ حضرت ملاذنا مولانا احمد حسن خاں بہادر عروج۔ ۱۲۷۴

(۱۵۹) تاریخ ولادت فرزند عالم اکمل فاضل اجل جناب مولانا احمد

حسن خان بہادر عروج دام مجدہ۔

مولوی احمد حسن خاں تاجدارِ ملکِ علم کشورِ سخن کے واسطے زیبائے تخت
عیسوی ہجری ہے تاریخ ایک مصرع میں منیر مہر شرقستان عزت ہے سر بیدار بخت؟
۱۸۴۸ ۱۲۶۴

منیر کا یہ مقطع بھی قابلِ توجہ ہے ۔

لکھنو میں بھی نہیں بھولتی ہے یاد عروج جی لگے خاک منیر آہ سخندانوں میں

ترکی نے عروج کے بارے میں اتنا لکھا ہے:

"(۱۶۰) عروج تخلص، احمد حسن خاں لکھنوی، پیش نواب کلب علی خاں بہادر والی رامپور دیدہ بودم۔ در عمر صد سالگی رحلت فرمود"۔

عمر کے بارے میں ترکی کا تخمینہ صحیح نہیں ہے۔ عبداللہ خاں ضیغم نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

"(۱۶۱) عمر قریب ساٹھ برس کی ہے"۔

اس اعتبار سے عروج نے کوئی اُنہتر ستر برس کی عمر پائی ہوگی۔

عروج اپنے زمانے کے استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں بھی ان کے دو شاگردوں یعنی شیخ عبداللہ عاجز اور علی اشرف خاں عشق کا ذکر ملتا ہے۔ زبان و بیان کے معاملے میں ان کے قول کو سند کا درجہ حاصل تھا۔ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے بھی لکھا ہے:

"(۱۶۲) زبان دُرفشان جناب منشی احمد حسن خاں صاحب سے کہ تلامذۂ ارشد میر صاحب (رشک) سے ہیں یہ قول بھی سنا گیا کہ سقوط الف کا دوحرفی الفاظ میں مضائقہ نہیں ہے"۔

عروج کے کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

کچھ حد نہیں فریبِ بتِ خوش نگاہ کی ایماں کی طرح سے دِل زاہد میں راہ کی
اتنا دماغ چاند سے منہ پر نہ کیجیے ڈوری بہت نہ کھینچیے قندیلِ ماہ کی

گلیوں کی خاک چھانتے پھرتے ہوائے عروج　　مٹی خراب کرتے ہو کیوں گردِ راہ کی
موت سے اسی بات کی تھی مجھ کو تمنا　　چھیڑا ہے تو سن لیجیے قصّا مرے دل کا

۴۵- عشقی :

عشقی کے تعارف میں سعادت خاں ناصر نے اگرچہ بہت اختصار سے کام لیا ہے، بہت واضح رائے دی ہے:

"(۱۶۳) شاہد خوش گوئی، شیخ الٰہی بخش، تخلص عشقی، مقیم کانپور، میر علی اوسط کے تلامیذ میں معروف و مشہور"۔

ناصر کے تذکرے کے دوسرے نسخے میں عشقی کو "مردِ مشہور" اور "پختہ کار" لکھا ہے۔ محسن نے اپنے حالات میں جس طرح دو جملوں میں ان کا ذکر کیا، اس سے عشقی کے انس و اخلاص کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

"(۱۶۴) (یہ احقر) چندے بہ اقتضائے آب و خورش بہ تقریب تجارت کنپ کانپور میں مقیم رہا۔ جب وہ سلسلہ برہم ہوا ہر آشنا کو ناآشنا پایا اِلّا...... بحث مونس دلی، شفیق و زکی شیخ الٰہی بخش عشقی، زیادہ کرے اللہ انس ان کا، انیس کنج تنہائی رہے"۔

انھیں عشقی کے مشورے سے محسن نے اپنا تذکرہ تالیف کیا چنانچہ اس میں ہے۔

"قطعہ تاریخ دیباچہ"۔

لکھا محسن نے عشقی ایسا یہ دیباچۂ رنگیں
فزوں تر بوستاں سے ہے، گلستاں سے زیادہ ہے
نہ کیوں ہو روحِ سعدی مست، اس دیباچہ کو سُن کر
کہ ہر فقرہ سے بوئے بادۂ شیراز پیدا ہے
تخلص شاعروں کے مندرج ہیں ایسے فقروں میں

که خوشبو پھول میں جیسے نہان و آشکارا ہے
سُنی تاریخ طورِ فکر پر یہ موسیٰ دل نے
سراپا فقرہ ایک اک نور کے سانچے میں ڈھالا ہے

محسن نے عشق کے بارے میں لکھا ہے:

''(۱۶۵) محبّ بے ریا، شفیق دلی، صادق الولا، میاں شیخ الٰہی بخش، عشق ولد شیخ محمد بخش، ان کے بزرگ باشندہ بجنور توابع لکھنؤ، ان کا مولد و مسکن کانپور، صاحب دیوان اور تاریخ گوئی میں دستگاہ نہایت رکھتے ہیں، شاگرد رشید میر علی اوسط رشک''۔

ناصر کے تذکرے میں ان کے ایک شاگرد لالا کنھیا لال غافل کا ذکر بھی ملتا ہے۔

عشق کے چند شعر یہ ہیں:

دنیا کی دولت آئے ترے ساتھ ہاتھ میں
اس مفلسی میں ہو جو ترا ہاتھ ہاتھ میں

کوہِ الم دبائے نہ اس کو کبھی، اگر
عشق دبائے لیکے ترا ہاتھ ہاتھ میں

تیری طرح ہے نور اگر آفتاب میں
زلفیں کہاں، کہاں ہے کمر آفتاب میں

کچھ نہیں روزِ جزا کا خوف اے عشق مجھے
پشت پر دستِ جنابِ حضرتِ شبیر ہے

۴۶- عیش:

عیش کے بارے میں سعادت خاں ناصر کے الفاظ اس طرح ہیں:

''(۱۶۶) سرو سامان شاعریٔ کو صاحب جیش، منشی ابو محمد، تخلص عیش، قاضی زادۂ جاجمؤ، شاگرد رشک''۔

محسن نے ان کی ولدیت وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے:

''(۱۶۷) شیخ ابو محمد فاروقی، عیش تخلص، ولد شیخ نوراللہ، عزیزوں میں قاضی امین اللہ مغفور جاجموی کے، باشندۂ کانپور، صاحب دیوان، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

نساخ نے بھی یہی باتیں اپنے لفظوں میں (۱۶۸) نقل کر دی ہیں۔ کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ عیش کے دو شعر یہ ہیں ۔

معین کب ہے مثلِ بوئے گل یکجا مکاں اپنا
لیے پھرتے ہیں ہم دوشِ صبا پر آشیاں اپنا
اٹھایا ہاتھ شاید آسماں نے کینہ جوئی سے
ہوا ہے مہرباں جو اب بتِ نامہرباں اپنا
اللہ کو پسند کسی کا نہیں دماغ
اے بت خدا کے بندوں سے اچھا نہیں دماغ
بال رکھے نہیں وحشت میں یہ سارے سر پر
ایک پریزاد کا سایہ ہے ہمارے سر پر

۴۷- غنی:

عیش کے بیٹے غنی تخلص بھی میر رشک کے شاگرد تھے۔ سعادت خاں ناصر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''(۱۶۹) معرکۂ شعر کا دھنی، غنی محمد، تخلص غنی، خلف ابو محمد، قاضی جاجموَ پرگنہ، کانپور، شاگرد رشک''۔

محسن نے اپنے تذکرے میں کچھ اطلاعات اور بھی قلمبند کی ہیں:

''(۱۷۰) غنی احمد، غنی، ولد ابو محمد عیش، باشندہ جاج موَ، متعلقۂ کانپور، خویش مولوی عباس علی عاشق جاجموی، جن کا رسالہ صولت الضیغم ہے۔ شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

غنی بھی اپنے زمانے میں تاریخ گوئی کے لیے معروف تھے۔ امیر اللہ تسلیم کے کلیات (۱۷۱) میں ان کا کہا ہوا

''قطعہ تاریخ کلیات امیر اللہ تسلیم معروف بہ اسم تاریخی نظم ارجمند از

مستغنی الاوصاف جناب شیخ عبدالغنی صاحب غنی سلمہٗ۔ ۱۲۸۹"۔

راقم کی نظر سے گزرا ہے۔

عبدالغفور خاں نساخ کے تذکرے میں غنی کو "(۱۷۲) شاگرد میر علی اوسط رشک و شوکت" لکھا ہے۔ اس کی تائید خود غنی کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

شوکت کے فیض سے ہوئی فکر غنی رسا
موزوں کیے ہیں شعر بہت حسب حال اب

تذکروں میں شوکت تخلص کے کئی شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ غنی ان میں سے کس کے شاگرد تھے۔ ظاہرا میر رشک کی روانگی کربلا کے بعد غنی نے ان سے تلمذ اختیار کیا ہوگا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

جام جہاں نما بنے ساغر شراب کا — اس میں پڑے جو عکس مرے آفتاب کا
پھبتی کہونگا عارض و چشمانِ یار پر — نرگس کے پاس پھول کھلا ہے گلاب کا

۴۸- فریاد :(۱۷۳)

"(۱۷۴) صاحب ارشاد، پیشۂ طبابت میں استاد، میر محمد باقر، تخلص فریاد، مقیم کانپور، شاگرد رشک"۔

ان کی ایک غزل کے دو شعر یہ ہیں ؎

قاتل نے بے سبب نہیں ترچھی نگاہ کی — آئی قضا ضرور کسی بے گناہ کی
فریاد ہاتھ آیا نہ محبوب باوفا — چھانی بہت سی خاک محبت کی راہ کی

۴۹- قایل :

ناصر کے تذکرے میں ان کا تعارف اِس طرح درج ہے:

"(۱۷۵) ایجاد کا استاد، سید علی جان، تخلص قایل، ساکن عظیم آباد، مقیم

کانپور، شاگرد رشک"۔

اور محسن کے تذکرے میں ہے:

"(۱۷۶) سید علی جان قایل ولد میر فضل علی عرف میر مٹھن، باشندہ عظیم آباد، بہ سبب قرابت شیخ فتح علی داروغہ نواب قدسیہ محل، لکھنؤ میں آئے۔ بعد چندے کے مقیم کانپور ہوئے۔ راہ کربلائے معلیٰ میں گوشہ نشین گور ہوئے۔ صاحب دیوان، بلند گویوں میں سب سے اونچے، شاگرد میر علی اوسط رشک"۔

جویا کے ذکر میں شیخ فتح علی کے حالات بیان کیے جا چکے ہیں۔ میر فضل علی کی عرفیت (۱۷۷) نساخ نے "میر بڈھن" لکھی ہے۔ نواب معتمدالدولہ کے ساتھ ان کی عداوت مشہور ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ:

"(۱۷۸) محرم ۱۲۳۸ھ/ ۶ اکتوبر ۱۸۲۲ء کو میر فضل علی اور ان کے باپ غلام حسین اور پھوپھی فیض النسا اور دوسری چودہ مغلانیاں انگریزی تلنگوں کی حفاظت میں کانپور کی طرف روانہ کر دی گئیں"۔

پھر نصیرالدین حیدر بادشاہ دوم کے عہد میں:

"(۱۷۹) معتمدالدولہ کے نظر بند ہونے کے بعد میر فضل علی کو خلعت نیابت بائیس پارچہ کا ملا اور اعتمادالدولہ خطاب عنایت ہوا۔ یہ میر فضل علی وہی شخص ہیں جو بادشاہ بیگم زوجۂ غازی الدین حیدر کی جاگیر کے منتظم تھے اور اپنی بہن بی مغلانی کی وجہ سے جس کا نام فیض النساء ہے، بیگم صاحبہ کی سرکار میں پورا تسلط رکھتے تھے اور معتمدالدولہ کی عداوت کی وجہ سے کانپور کی طرف نکلوائے گئے تھے۔ یہ فیلبانوں کے زمرے میں تھے"۔

میر فضل علی کے زمانۂ وزارت میں ان کے بیٹے میر علی جان قایل بھی باوقار اور صاحب اقتدار تھے۔ چند سال بعد جب وہ معزول ہوئے تو سارا خاندان پریشان ہوگیا۔

آخر زمانے میں میر علی جان کربلا کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے ہی میں انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ میر رشک نے کہا:

''تاریخ وفات میر علی جان صاحب قایل''۔

ایں سیدنکو روئے ، ہم اسم او علی جان — گویافت مرگ اے دل ، درراہِ کربلا آہ
جائے ولادتِ او بودہ عظیم آباد — کردہ ثواب حاصل ، درراہِ کربلا آہ
می گفت شعر اردو مانند شعر شوکت — گشتہ بخلد داخل درراہِ کربلا آہ
بود او جوان و عمرش در عشرۂ سوم بود — زیں دہر گشت ناقل درراہِ کربلا آہ
مانند چاردہ روز چوں ازمہِ محرّم — مُرد آں وجیہہ و عاقل درراہِ کربلا آہ

تاریخ فوتش اے رشک فرمود ہاتف ازمن
افسوس مُردہ قایل درراہِ کربلا آہ
۱۲۶۶

اس سے ظاہر ہے کہ میر علی جانؔ قایل عین عالم شباب میں وفات پاگئے تھے۔ اس کم عمری کے باوجود وہ صاحب دیوان ہوئے اور بقول ناصر ''ایجاد کے استاد'' تھے اور بقولِ رشک اردو میں شوکت کے طرز میں شعر کہتے تھے۔ نمونہ یہ ہے

وقتِ شکار تیر جو کھایا نگاہ کا — طاؤسِ چرخ مرغ بنا صیدگاہ کا
چنتا ہوں تنکے یادِ خطِ سبز رنگ میں — میں جامہ چیں ہوں دامنِ موجِ گیاہ کا

کیونکر نہ مجھ پہ آتشِ دوزخ حرام ہو
قایلؔ میں کلمہ گو ہوں رسالت پناہ کا

آنکھوں میں پھر رہا ہے خیالِ جمالِ لب — کیا دامنِ فلک کی دھنک ہے ہلال لب
نامِ گل مشق یہاں تک کیے ماشاء اللہ — خطِ گلزار ہوئے اُس بُتِ گلفام کے حرف

۵۰- قیس:

’’(۱۸۰) بلبل چمن خوش سرائی، شیخ کاظم علی قدوائی، تخلص قیس، شاگردِ علی اوسط رشک‘‘۔

ان کی ولدیت اور سکونت کا ذکر محسن نے کیا ہے، اس طرح:

’’(۱۸۱) شیخ کاظم علی قدوائی قیس، ولد شیخ وحدت علی، باشندۂ قصبہ جگور، پرگنہ نواب گنج، توابع لکھنؤ، صاحب دیوان، شاگرد رشک‘‘۔

ان کے مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔ شعر اس قسم کے کہتے تھے ؎

حلق پر جب مرے شمشیر پھری — لب پہ آئی ہوئی تقریر پھری
پھر گیا ایک زمانہ مجھ سے — جب نگاہِ بتِ بے پیر پھری

کس درجہ اوج پر ہے مرے یار کا دماغ — ہے ساتویں فلک پہ ستمگار کا دماغ
بے جا بھی ہم نے اس کے اٹھائے غرور و ناز — اس پر نہ کم ہوا بتِ عیار کا دماغ

۵۱- کاشف:

کاشف کا شجرۂ نسب اِس طرح ہے:

’’(۱۸۲) کاشف تخلص حکیم ابو ابراہیم سید جعفر حسین خاں ابن حکیم مولوی سید محمد تقی خاں ابن حکیم مولوی میر علی خاں ابن حکیم مولوی سید محمد نقی خاں ابن حکیم مولوی سید محمد حامد مخاطب بہ نواب اصلح الدین محمد خان بہادر مجید الملک جہانگیری عُرف میر نواب ابن حکیم مولوی سید زین العابدین مخاطب بہ نواب اصلح الدین محمد خان بہادر مجیدالملک عالمگیری [خراسان سے بہ عہد عالمگیر اورنگ زیب دہلی میں آئے] ابن نواب حکیم مولوی فیاض الدین محمد خان بہادر ابن قاضی القضاۃ نواب حکیم سید ابو سعید خان بہادر ابن نواب حکیم مولوی امام الدین خان بہادر ابن نواب حکیم مولوی سید نظام الدین خان بہادر ابن نواب حکیم سید سعداللہ خان بہادر ابن نواب عبداللہ خان بہادر ابن حجتہ الاسلام حضرت سید صدرِ

جہاں شیرازی بہ عہد چنگیز خاں و ہلاکو۔ والدہ کی طرف سے ان کا شجرہ اس طرح ہے :

(۱۸۳) حکیم محمد جعفر خان بہادر میرزا جوہری الفن (کاشف کے حقیقی ماموں) ابن حکیم محمد زماں خان بہادر میرزا حاذق الزماں ابن حکیم علی شریف خان بہادر میرزا رئیس الاطبا، شریف الملک، محقق ہندی ابن حکیم محمد شریف خان بہادر میرزا ابن عالی جاہ افتخار الملک۔

حکیم کاشف کے حالات میں مذکور ہے کہ :

"(۱۸۴) پیدائش رمضان ۱۲۴۴ھ، وطن لکھنؤ، سکونت بریلی — آپ کے بعض بزرگ بعد انقراض عہد سلطنت محمد شاہ مرحوم دہلی سے فیض آباد بہ عہد شجاع الدولہ بہادر مرحوم جناب نواب بہو بیگم صاحبہ مرحومہ کے علاج کے لیے حسب الطلب تشریف لائے۔ یہاں بھی معزز و ممتاز رہے۔ جاگیر پائی۔ منصب پائے۔ حکیم مولوی میر محمد صاحب اور حکیم مولوی میر مہدی صاحب فیض آبادی مشہور تھے۔
آپ کے بعض بزرگ نواب سعادت علی خاں بہادر مرحوم کے عہد حکومت میں لکھنؤ تشریف لائے اور حکیم باشی رہے۔ حکیم مولوی میر محمد جعفر خان بہادر مرحوم عہد نصیرالدین حیدر شاہ اودھ میں حکیم باشی تھے۔ دارالشفا یونانی شاہی — انھیں مرحوم کے واسطے شاہ موصوف مرحوم نے بنوائی تھی۔ ساٹھ روپیہ جیب خاص سے اور ساٹھ روپیہ دارالشفا سے مقرر تھا۔

کاشف شاعری میں جناب میر علی اوسط رشک مرحوم سے، جو شاگرد رشید حضرت شیخ ناسخ مرحوم کے اور آپ کے ایک خاندانی بزرگ تھے، تلمذ رکھتے تھے۔ جناب منشی منیر مرحوم اور آپ خواجہ تاش کی نسبت سے منسوب ہیں۔

آپ بعد سلطنت واجد علی شاہ مرحوم مرزا پور کے ایک راجا کے یہاں ملازم رہے۔ وہاں سے نواب میر محمد تقی مرحوم نے اپنے واسطے بلا لیا۔ مدتوں کھجوے اور رسڑے ضلع چھپرا میں نواب موصوف کے پاس رہے۔ وہاں سے غازی پور آئے۔ پھر نواب محمد کاظم علی خاں نے بلا لیا۔ اسی مناسبت سے بریلی میں مستقل قیام کیا۔ دیوان و کلام مدوّن نہیں ہوا''۔

یہ آخری بات صحیح نہیں ہے۔ سید شاہد علی سبز پوش گورکھپوری فانی تخلص کے ذخیرۂ کتب میں راقم نے کاشف کا دیوان دیکھا تھا، ترقیمہ یہ ہے:

''دیوان حکیم سید جعفر حسین مرحوم کاشف لکھنوی شاگرد رشید جناب رشک مرحوم لکھنوی وہم جلیس حضرت آسی قدس سرہٗ حسب فرمائش جناب سید شاہد علی شاہ صاحب سجادہ نشین حضرت آسی قدس سرہٗ جعفرا بازار گورکھپور — ضخامت ۱۸۳ صفحات — ناچیز حقیر سراپا تقصیر بخط خام سید محمد ظہیر حسن عفی عنہ گورکھپوری، تاریخ ختم دیوان پانچ ذیقعدہ (کذا) ۱۳۴۲ھ گیارہ جزو چھ صفحہ''۔

کاتب خوشخط لیکن سخت غلط نویس ہے۔ اس دیوان میں بعض اشخاص و مقامات سے متعلق بھی اشعار ہیں مثلاً ؎

کاشف کی نبض تین مہینے رہی سریع بھوپال میں کسی کو الٰہی نہ آئے تپ
راجہ صاحب کی توجہ ہے غزل پر کاشف وہ کہاں فکر جو پہلے مجھے اشعار کی تھی

محرّم سے رہے مصروف ماتم نور اے کاشف
خیال مرثیہ گوئی میں ہیں مصروف چہلم سے

(نور تخلص حکیم آغا نادر حسین مرحوم و مغفور)

نہ ہوتا ایک شعر ان کا اگر مرغوب اے کاشف
بریلی سے تلاشِ دفترِ مائل میں کیوں آئے

(نام شاعر)

غزل در تعریف شیخ محمد رضی صاحب ساکن بریلی (۱۱ شعر) مطلع ؎

کنبے میں تو دو چار جگہ غم ہے رضی کا ہر دوست یہاں صاحب ماتم ہے رضی کا

اپنے استاد میر علی اوسط رشک کا ذکر تو کاشف نے اپنی باکثرت غزلوں میں کیا ہے۔ چند مقطعے یہ ہیں ؎

پاک کر دی کاشف اردوئے معلا کی زباں رشک تلمیذانِ ناسخ میں بڑا استاد تھا
لوگ کہتے ہیں مر گیا کاشف رشک کے بعد کاملِ فن تھا
گومتی کے اُدھر استاد ، اِدھر ہم کاشف لائے ہیں آبِ سخن کھینچ کے اُس پار سے ہم

کاشف یہ فیضِ صحبتِ رشکِ فصیح ہے
برسوں رہا ہوں میں بھی اسی اہلِ فن کے ساتھ

اے کاشف استفادہ و تقلید کے لیے کافی ہے نظمِ رشکِ فصیح البیاں مجھے

ہو گئیں رشک کی اصلاح سے دریا کاشف
غزلیں اِس پار کی تھیں ، مشورت اُس پار کی تھی

کاشف میر رشک کے اصولوں پر نہ صرف سختی سے کاربند تھے بلکہ انھوں نے ان اصولوں کو مزید ترقی دینے کی کوشش بھی کی تھی چنانچہ سید شاہد علی سبز پوش نے لکھا ہے:

''(۱۸۵) حضرت (آسی) اور حکیم کاشف صاحب ناسخ اور رشک کے جملہ قواعد کے سختی سے پابند تھے بلکہ حضرت آسی کے یہاں 'کا' کا الف بھی دبنا ناجائز تھا''۔

کاشف کے شاگردوں میں شمشاد لکھنوی نے زیادہ نام پایا تھا۔ شمشاد کے دیوان (۱۸۶) ''خزینۂ شمشاد'' میں کاشف اور ان کی اولاد سے متعلق کئی قطعات تاریخ

موجود ہیں۔

۵۲- متین:

متین بھی اپنے زمانے کے معروف شاعروں میں سے تھے۔ سعادت خان ناصر نے ان کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''خوش (۱۸۷) وضع، نیک آیین، میر بہادر علی، تخلص متین، ساکن فرخ آباد، میر علی اوسط کی زبانی معلوم ہوا کہ چند غزل اس کی میری نظر سے گزری ہیں، اس واسطے تلامیذ میں میر صاحب کے لکھا گیا''۔

ڈپٹی کلب حسین خان نادر نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''(۱۸۸) متین حافظ بہادر علی رئیس فرخ آباد ولد سید قطب علی، شاگرد، سید اسمٰعیل حسین منیر''۔

معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں میر رشک فرخ آباد گئے تھے، متین نے ان کو اپنی کچھ غزلیں دکھائی ہونگی۔ اس زمانے کے چند شعر یہ ہیں ؎

عکس افگن جو مرا وہ بتِ طناز ہوا
صاف آئینے کو جوہر پرِ پرواز ہوا

غیر کو اس نے جو دیکھا تو میں غیرت کے سبب
ہدفِ تیرِ نگاہِ غلط انداز ہوا

مرے دل کا علاج اے چارہ گر کرنے سے کیا حاصل
کہیں جیتا بھی ہے مارا ہوا داغِ جوانی کا

میں عاشق ہوں، تسلی مجھ کو باتوں سے ہو کیا ممکن
وہ موسیٰ کو تحمل تھا صدائے لَن ترانی کا

۵۳- مجروح(۱۸۹)

مجروح کا ذکر صرف سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں مل سکا۔ لکھا ہے:

''(۱۹۰) شعر سے اس کے دل بستہ کو فتوح، غلام سعد، تخلص مجروح، ساکن جاجموٗ، پرگنۂ کانپور، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

کلام ان کا، اس طور پر ہے ؎

او سلیماں ہم فقیروں کی انگوٹھی ہے یہی — نام جاناں نقش ہو گا، دل نگیں ہو جائیگا
دیکھ لینگے ہم انھیں گر عرش پر بھی ہونگے وہ — دیدۂ داغِ محبت دوربیں ہو جائیگا

۵۴- محبت:

''(۱۹۱) شیو پرشاد پنڈت، تخلص محبتؔ، ساکن لکھنؤ، شاگرد رشک''۔

ان کے چند شعر یہ ہیں ؎

بیکسی میں کچھ نہیں درکار مجھ کو دوستو — دامنِ دشت جنوں میرا کفن ہو جائیگا
زخم تازہ ہیں ابھی ان کی دوا کچھ ہو تو ہو — ورنہ پھر ناسور ہر زخمِ کہن ہو جائیگا
دیوانہ ہوں لیکن مری بدبختی کے باعث — لڑکوں کو بھی میرے لیے پتھر نہ ملے گا
آخر ملا یہ مجھ کو اُس آہِ آتشیں سے — سینے میں دل تلک بھی میرا کباب نکلا

۵۵- محرور:

''(۱۹۲) صاحب فہم و شعور، شیخ ہادی حسن، تخلص محرور، کلام اس کا علی اوسط رشک کا منظور''۔

محسن نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''(۱۹۳) ہادی حسن محرور، خلف منشی علی حسین تحصیلدار ضلع کانپور، باشندۂ کاکور، متعلقۂ لکھنو، شاگرد رشک''۔

نساخ کے تذکرے میں ان کے والد کا نام "منشی (۱۹۴) علی حسن" چھپ گیا ہے۔

کلام یہ ہے ؎

ہر مہینے میں فلک پر وہی بنتے ہیں ہلال
ساتویں روز جو کٹتے ہیں تمھارے ناخن

زلف نے گلشن میں پیچ و تاب سنبل کو دیا
تیرے قدِ راست نے سیدھا کیا شمشاد کو

مثل شانے کے عشقِ گیسو میں
چاہیے ہم بھی دل فگار کریں

عاشقِ سرد مہر ہیں محرور
کیوں علاجِ مزاجِ حار کریں

۵۶- محسن :

محسن نے اپنے تایا کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"(۱۹۵) جناب عموی صاحب مولف سید حسن شاہ ضبط خلف الرشید عرب شاہ، مراۃ حیدری اور کئی رسالے منظوم رمل اور جفر میں ان سے یادگار ہیں۔ شاگرد قلندر بخش جرات"۔

ضبط نے ایک کتاب میں اپنے عشق کی روداد قلمبند کی تھی۔ محمد سجاد حسین کسمنڈدی نے اصل فارسی سے اس کا ترجمہ اردو میں "نشتر" کے نام سے کیا تھا اس میں ضبط نے اپنے خاندانی بزرگوں کا جو حال لکھا ہے اس کا خلاصہ اس طرح ہے:

"(۱۹۶) حضرت سید عبداللہ ملقب بہ مظلوم جن کا سلسلہ گیارہ واسطوں سے حضرت سید شہدا امام حسین ــــــ تک پہنچتا ہے اپنے والد حضرت ابراہیم رضا کے سامنے حدود یمن میں مخفی سکونت پذیر تھے۔ بعد شہادت والد بزرگوار مع چند ہمراہیان حدود ترکستان میں پہنچے۔ ان کی اولاد سے حضرت سید امیر کلان عرف امیر کلال نے امیر تیمور کو اپنا پسر خواندہ فرمایا اور بشارت سلطنت ہفت کشور کی دی۔ آپ کے صاحبزادے امیر برہان مشہور بہ امیر بزرگ چندے صاحبِ قران کے پاس رہ کر وطن تشریف لے گئے۔ ان کے

صاحبزادے سید امیر شاہ نے خوست مضافات بدخشاں میں اقامت اختیار کی — نوبت سجادگی حضرت حاجی الحرمین سید میرک شاہ جدِ بزرگوار کاتب الحروف کو پہنچی۔ ۱۱۲۵ھ میں بیس قرابتداران کے ساتھ کابل ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ حاجی صاحب نے جناب سید حقانی متوطن قصبہ بندگی متعلقہ چکلہ کوڑہ جہان آباد کی صاحبزادی سے نکاح کیا۔ موصوف کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں:

سید محمد شاہ، سید اشرف شاہ، سید عرب شاہ والد مصنف اور سید محمد سیر شاہ۔ میرے والد آنولہ بریلی میں تشریف لائے۔ وہیں شادی کی۔ ۱۱۸۴ھ میں میری ولادت ہوئی اور دو چھوٹے بھائی بھی پیدا ہوئے۔ ۱۱۹۱ھ میں جناب والد مغفور نے انتقال فرمایا۔ میں اور دونوں چھوٹے بھائی یعنی سید حسین شاہ و سید قاسم شاہ جناب نانا صاحب حکیم میر محمد نواز ابن شاہ نیاز کے زیر تربیت و تعلیم اسی شہر میں رہے۔ میری عمر پندرہ سولہ برس کی تھی اور نانا صاحب نے بریلی سے اپنے متعلقین کو بلوا کے قصبہ جاجموٗ میں جو کانپور سے دو کوس پورب کی طرف ہے سکونت کر لی''۔

خود محسن نے اپنے بزرگوں کا ذکر مختصراً اس طرح کیا ہے:

''(۱۹۷) سید امیر برہان حسب الطلب شاہ جہجاہ فرخ سیر مع تبرکات سندی۔ خوست سے لاہور میں تشریف فرما ہوئے۔ سید میرک شاہ عہد میں حضرت شاہ عالم بادشاہ کے شاہجہاں آباد میں وارد ہوئے۔ والد ماجد (سید شاہ حسین حقیقت ابن سید عرب شاہ) ہمراہ اپنے نانا صاحب میر محمد نواز کے بیت السلطنت لکھنو میں آکر مقیم ہوئے۔ اس سبب سے مولد و مسکن احقر یہاں ہے۔ چندے بہ تقریب تجارت کنپ کانپور میں مقیم رہا''۔

شاعر کی حیثیت سے محسن کا ذکر شاید سب سے پہلے سعادت خاں ناصر نے کیا ہے:

''(۱۹۸) سید خجستہ خصال، شیریں مقال، غیر ممکن اس سے ممکن، میر محسن علی تخلص محسن، صاحب بینش و لیاقت، خلف الصدق منشی شاہ حسین تخلص حقیقت، سید صاحب موصوف نے ایک تذکرہ اشعار تعریف سراپا لکھنا شروع کیا ہے۔ الٰہی انجام اس کا بخیر ہو۔ پہلے وہ شاگرد خواجہ وزیر کا تھا۔ اب رشک کا''۔

اس تذکرے کے دوسرے نسخے میں ہے کہ:

''(۱۹۹) بہ سبب سکونت کانپور کے میر علی اوسط رشک سے تلمذ حاصل ہوا''۔

خود محسن نے اپنے تلمذ کا ذکر بہت اختصار سے کیا ہے:

''(۲۰۰) کمترین تلامذہ خواجہ وزیر وزیر اور میر علی اوسط رشک''۔

کانپور میں رہ کر محسن نے اپنا تذکرہ مکمل کیا۔ خود اس کے الفاظ یہ ہیں:

''(۲۰۱) دس برس میں یہ تذکرہ مسمّٰی بہ سراپا سخن آغاز ۱۲۶۹ھ میں انجام پا کر نظر کیمیا اثر آقائے نامدار —— مرزا محمد خورشید قدر بہادر و مرزا محمد عزیز القدر بہادر سے گزرا، مقبول نظر ہوا''۔

قائم کے تذکرہ ''مخزن نکات'' کے دو طبقوں کا اردو ترجمہ رضا لائبریری رامپور میں ہے۔ اس کے بارے میں امتیاز علی خاں عرشی نے لکھا ہے کہ:

''(۲۰۲) میرا خیال ہے کہ محسن علی محسن مصنف سراپا سخن اس کے مترجم ہیں۔ اس خیال کی بنیاد کس دلیل پر تھی اب کچھ یاد نہیں''۔

نساخ نے (۲۰۳) محسن کو ''صاحب دیوان'' لکھا ہے۔ محسن نے تاریخیں بھی کہی ہیں۔ اشرف علی اشرف نے محسن کے بارے میں کہا ہے ؎

سخنداں ، سخن فہم ، عالی گہر خدا جو ، بہت متقی ، پارسا

شاگردوں کے علاوہ محسن کے اعزا میں سید محمد حسین محمد اور میر محمدی سپہر وغیرہ کا بھی شاعر کی حیثیت سے ذکر ملتا ہے۔ محسن کے چند اشعار نمونے کے طور پر درجِ ذیل ہیں:

موجزن حسن کا دریا نظر آیا سر پر چُن کے اوڑھا جو کبھی تم نے دوپٹا سر پر
اسلام والے مصحفِ رُخ پر نثار ہیں کالی سمجھ کے ہوتے ہیں ہندو فدائے زلف
چاندنی میں جو تری جلوہ گری ہو جائے نورِ مہتاب چراغِ سحری ہو جائے
معجزے کا جو سرِ دست ارادا ہو جائے تل ہتھیلی کا تمھاری یدِ بیضا ہو جائے

۵۷- منیر:

منیر کا سلسلۂ نسب حضرت علی نقی سے ملتا ہے۔ ان کے جد اعلا سید بہاء الدین سلطان علاء الدین خلجی کے زمانے میں عرب سے ملتان ہوتے ہوئے شکوہ آباد پہنچے۔ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں ان کی اولاد میں سے سید شرف الدین علی خاں کو شکوہ آباد کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ حسن انتظام پر نظر کر کے محمد شاہ نے ان کو فیروز آباد کی صوبیداری بھی عطا کر دی جو شاہ عالم کے وقت تک بدستور رہی۔ سید شرف الدین کے پوتے سید احمد حسین شاد مغلوں کے دورِ زوال میں معمولی سی جاگیر کے مالک رہ گئے تھے۔ احمد حسین شاد مرزا محمد رفیع سودا کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ۱۲۵۰ھ میں شکوہ آباد میں وفات پائی۔

منیر ۱۲۲۹ھ/ ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ فرخ آباد، باندہ، لکھنو، کانپور، مرشد آباد وغیرہ مختلف مقاموں پر رہے۔ کسی قتل کے معاملے میں بے گناہ ماخوذ ہو کر کالے پانی بھیج دیئے گئے۔ جب بے قصور ثابت ہوئے وہاں سے رہا ہو کر آئے۔ نواب رامپور نے قدر کی۔ آخر وقت تک وہیں رہے، اور ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔ سعادت خاں ناصر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''(۲۰۴) تازہ گو، صاحب ایجاد، طرۂ دستار استاد، حیرت فزائے صغیر و کبیر، میر اسماعیل حسین تخلص منیر، شاگرد رشک''۔

اور محسن کے تذکرے میں ہے:

"(۲۰۵) سید اسمٰعیل حسین منیر ولد منشی احمد حسین شکر شکوہ آبادی، مولد ان کا لکھنؤ، چندے مسکن اکبر آباد رہا۔ بزرگ ان کے باشندہ شکوہ آباد، کانپور میں ملازم نواب نظام الدولہ کے تھے، بعد اس کے رئیس فرخ آباد اور رئیس باندہ کے رفیق (ملازم) رہے۔ دو دیوان مع قصائد ایک بہ طرز شوکت بخاری اور دوسرا عاشقانہ، ایک رسالہ سراج منیر ان کا مشہور ہے۔ داستان گوئی میں کمال دستگاہ ہے، قواعد نظم و نثر سے طبیعت بخوبی آگاہ ہے۔ شاگرد رشید میر علی اوسط رشک"۔

اپنے والد کے بارے میں منیر نے کہا ہے ؎

شکر و شاد تخلص دونوں کندہ تھے یہ نقش نگیں میں

اور خود اپنے حالات میں انھوں نے لکھا ہے:

"(۲۰۶) سید اسمٰعیل حسین منیر بن سید احمد حسین شاد شکوہ آبادی — میگوید — بعضے نزہاتِ من بہ وساطت عرائض آب و رنگ اصلاح از افادات افضل البلغا ملاذ الفصحا مجتہد الشعرا عالی جناب شیخ ناسخ تغمدہ اللہ بغفرانہ پذیرفت تا آنکہ بہ ملازمت و علاقہ مصاحبت امیر کبیر نواب نظام الدولہ بہادر خلف اوسط نواب معتمد الدولہ بہادر مرحوم از گوشہ انزوا برآمدہ سر از گریباں ارتفاع برآوردم و در کانپور بہ آستانہ بوس حضرت مجتہد الشعرا کہ بہ تقریبے مہمان مرحوم نواب امین الدولہ بہادر مہر بودند از جواہر انواع استفادہ جیب تمنا مالا مال کردم و بعد معاودت حضرت بہ گلستان ہمیشہ بہار لکھنؤ صانہ اللہ عن کل سوء حسب اشارت فیض بشارت جناب شاں دست ارادت بہ دامان استاد المحققین ملاذ المتبحرین سیدی و مولائی جناب میر

علی اوسط رشک دامت افاداتہ زدہ —— در لکھنؤ و کانپور و مرشد آباد و دیگر بلاد نزدیک و دور شریک مشاعرہ ہابودم —— آخر قائد توفیق دستگیری کردہ بہ انجمن فرخی نشیمن امیر سخنور قدر افزائے اہل ہنر ظفرالدولہ علی اصغر خان بہادر رسانیدہ۔ التفات ملازمان نواب معین الدولہ سید باقر علی خان بہادر ظفر جنگ خلف ثالث نواب معتمدالدولہ مرحوم۔ از لکھنؤ بہ کانپور آوردہ —— باز بر و زسیاہ دشمن کامیہا نشستم اگر دراں ورطہء صبر گداز اعانت جناب حاوی معقول و منقول، جامع فروع و اصول، کشاف مفصلات تحریر و تقریر، شاعر فقید النظیر امیر فیاض جناب مولانا احمد حسن خان بہادر عروج نہ گردیدے تا حال مدہتا بود کہ غبار وجودم آں سوئے صحرائے عدم رسید —— امیر دانا فیاض بے ہمتا شاعر شیریں مقال متکی اریکہ جاہ و جلال اسدالدولہ رستم الملک سید محمد ذکی خان بہادر فیل جنگ عرف نواب بہادر متخلص بہ ذکی ایں ہیچمداں را درسلک متوسلان خود انتظام دادہ و از خدمت اصلاح کلام خویش منت نہادہ۔ بار دیگر —— نواب نصیرالدولہ معین الملک تجمل حسین خان بہادر —— فرمان فرمائے ریاست فرخ آباد —— ذرہ پروری بجنبید —— علاوہ ازیں محبت و الطاف شفیق و الاہمم لالا مادھو رام جوہر کہ از تلامذہ ایں بے سروپا و صاحب دیوان اندمی گذاشت —— ذرہ خاکسترم را نواب علی بہادر متخلص بہ علی صدر نشین حکومت باندا در تسبیح وابستگان خود انتظام دادہ —— الحمدللہ کہ ایں دیوان پیشگاہ حضرت ولی نعمی نواب علی بہادر دام اقبالہ مخاطب بہ خطاب منتخب العالم کہ ہم تاریخ تالیف اوست، گردیدہ''۔

۱۲۶۴

منتخب العالم میں منیر کے سبھی ممدوحوں اور ان کے اقربا وغیرہ سے متعلق بہ کثرت

قطعات تاریخ مندرج ہیں۔

امیر مینائی نے منیر سے متعلق بہت سی مفید اطلاعات قلمبند کی ہیں۔ لکھا ہے کہ:

''(۲۰۷) منیر منشی سید محمد اسمٰعیل حسین ولد سید احمد حسین شاد، متوطن شہر شکوہ آباد، اب کئی برس سے ملازم سرکار دولت مدار ہیں۔ عواطب خسروانہ سے مورد افتخار ہیں۔ پہلے شیخ امام بخش ناسخ مرحوم سے فیض اٹھایا، پھر میر علی اوسط رشک مغفور کو کلام دکھایا۔ دور دور کے لوگ ان سے فایدہ پاتے ہیں۔ اکثر شہروں سے اصلاح کو کلام آتے ہیں۔ جملہ اقسام شعر کا رنگ دکھا چکے ہیں۔ تین دیوان ترتیب پا چکے ہیں۔ دیوان اول کا نام تاریخی منتخب العالم اور دیوان دوم کا نام تنویر الاشعار، تیسرے دیوان کا سال ترتیب نظم منیر بے آشکار ہے۔ ان دواوین کے علاوہ ایک مثنوی لکھی ہے۔ معراج المضامین اس کا اسم تاریخی ہے۔ کہتے ہیں کہ مجموع نتائج افکار از روئے شمار تیس ہزار ابیات ہیں اور علاوہ ان کے بعض رسائل اور تقریظیں اور رقعات ہیں۔ چھپن برس کا سن، خوش خلق و نیک باطن، مہذب اور متین ہیں۔ طباع اور ذہین ہیں۔ حق تعالٰی ان کی عمر میں برکت دے اور دولتِ حسنِ خاتمہ بخشے''۔

عبدالغفور خاں نساخ کے معرکے کے سلسلے میں منیر نے ''سنان دلخراش'' کے نام سے ایک کتاب لکھ کر تفضیح اودھ پریس لکھنؤ سے ۱۲۹۸ھ میں شائع کی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک داستان ''طلسم گو ہر بار — تکملہ بالا۔ اختر'' ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء میں تصنیف کی تھی۔

منیر کے پہلے دیوان سے متعلق شاہ غلام اعظم افضل کا ایک قطعہ تاریخ اس طرح ہے۔

منیر صاحب علم و ذکا نے ہے جس سے آب و تابِ است
کہا ہے استعارہ کا جو دیواں کھلا ہے جس سے بابِ استعارہ

خدا نے اے منیر صاف طینت
عجب دی ہے کتابِ استعارہ

۱۲۶۴

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ منیر شعر کہتے وقت خود پر کس طور سے زبان و ب
کے بعض ضابطوں کو لازم کر لیتے تھے۔ ان کے چند اشعار یہ ہیں ؎

رشک کے فیضِ تلمذ سے منیر شاعروں میں تو بھی یکتا ہو
حضرت ناسخ کی اصلاح اس غزل پر ہے منیر آج رتبہ تیری فکر پست کا بالا
رنگ شوکت سے شفق گوں ہے مے فکر منیر لکھنؤ میخانۂ ایجادِ مضموں ہو
مدح حضرت کی کری افیون پی پی کر منیر نقل انجم اس کو نشہ میں کھلائے صبح
خوب کر تعریف نواب ظفر جنگ اے منیر کام آجائیگی یہ آقا پرستی ایک

۵۸- موج:

سعادت خاں ناصر نے موج کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"(۲۰۸) میر کاظم حسین، تخلص موج، پسر میر علی حسین آزاد۔ افسوس کہ عین موسم میں گلشن اس کی زندگی کا خزاں رسیدہ ہوا۔ پدر اس کی مرگِ جوانانہ سے زارو نزار۔ اس کو تلمذ میر علی اوسط رشک سے تھا"۔

میر رشک نے موج کے انتقال کی تاریخ کہی تھی، وہ یہ ہے ؎

لطمہ ہُمایِ دق خورد و بنا چار شد
غرقِ یمِ بیکراں موجِ جواں حیف حیف

گفتم تاریخ آں دُرِ محیطِ شرف
رفت ز بحرِ جہاں موجِ جواں حیف حیف

۱۲۶۱

اس جواں مرگ کے حال میں محسن نے بھی کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ اس کے تذکرے میں ہے:

''(۲۰۹) میر کاظم حسین مرحوم موج ولد میر حسین علی، باشندۂ لکھنؤ، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

میر علی حسین آزاد تخلص پدر موج شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ موج کے چند شعر یہ ہیں ۔

موج آخر عاشق زلف چلیپا ہو گیا عشق کیا ، بلکہ سُنتے ہیں کہ سودا ہو گیا
تاکہ دکھلائے ہمیں نرگسِ شہلا آنکھیں بھولتی کب ہیں تری اے گلِ رعنا آنکھیں

۵۹- مہر:

مہر نواب معتمد الدولہ آغا میر کے پسر مہین اور میر علی اوسط رشک کے ان شاگردوں میں اولین تھے جن کا ذکر شعرائے اردو کے تذکروں میں آیا ہے۔ ابن امین اللہ طوفان نے میر رشک کے تعارف میں لکھا ہے:

''رشک کا رکن و استاد امین الدولہ مہر تخلص پسر مہین نواب معتمد الدولہ مرحوم است''۔

مہر کا اصل نام ''آغا علی'' یا ''آقا علی'' تھا۔ غازی الدین حیدر بادشاہ اول نے اپنے پہلے جشن جلوس کے موقع پر ان کو جن خطابات سے نوازا تھا، اس طرح تھے:

''امین الدولہ، سیف الملک، نواب، سید آغا علی، خان بہادر، فیروز جنگ''۔

کچھ مدت کے بعد بموجب عہد نامہ یکم محرم ۱۲۴۱ھ/ ۱۷ اگست ۱۸۲۵ء دو ہزار

روپے نواب امین الدولہ کی تنخواہ قرار پائی۔

امین الدولہ کی پہلی شادی شاہ میر خاں کی بیٹی بی بیگم کے ساتھ ہوئی تھی، جو
شاہ میر خاں کے ہجرت کر جانے کے بعد بادشاہ نے نواب مبارک محل صاحبہ کے حوا
اس ہدایت کے ساتھ کر دیا تھا کہ ان کو اپنی بیٹی سمجھ کر ان کی شادی معتمدالدولہ کے
کے ساتھ کر دیں۔ بی بیگم سسرال میں نواب بی یا نواب بیگم کہلائیں۔ میر علی اوسط رشّ
کے دیوان میں ''نواب محل'' کے مرنے کا ایک قطعہ تاریخ اس طرح ہے ۔

ایں عفیفہ ز سرائے گزراں اے گردوں — ز آمدِ پیکِ اجل رفت بہ سوئے فرد
شبِ یک شنبہ و اول ز مہِ شعباں بود — کہ ز آلام کسل رفت بہ سوئے فرد
رشک ایں مصرع تاریخ و فاتش بنوشت — وائے نواب محل رفت بسوئے فرد

۱۲۶۲

گمان غالب ہے کہ یہ قطعہ نواب امین الدولہ کی خاص محل نواب بی بیگم
متعلق ہو گا۔ ممکن ہے کہ وہ نواب محل بھی کہلاتی ہوں۔

نواب مبارک محل سے امین الدولہ کو جو تعلق تھا، غالبًا اسی بنا پر میر رشک نے
کے مرنے کی تاریخ بھی کہی تھی ۔

افسوس مبارک محل ایں مریم عصر — رو کرد سوے گلشن رضواں اے یا
تاریخ وفات خامہء رشک نوشت — ہشتم بودہ ز ماہِ شعباں اے

۱۲۶۵

امین الدولہ کی دوسری شادی ان کی سگی پھوپھی فاطمہ بیگم کی بیٹی کے ساتھ
تھی۔ فاطمہ بیگم نے ۹ ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ / دسمبر ۱۸۴۶ء کو وفات پائی تھی۔ میر رشک
تاریخ کہی ۔

فاطمہ بیگم کہ بُد خوشدامنِ نواب من
سوئے جنت رفت و برلب میرسد صد حیف آہ

یافتم از غیب ایں تاریخ صوری معنوی
وائے ذیحجہ نہم روزِ احد صد حیف آہ

۱۲۶۲

یہ دوسری بیگم امین الدولہ کی مُحرمحل ہوئیں۔

نصیرالدین حیدر بادشاہ دوم کے زمانے میں معتمدالدولہ معزول ہو کر نظر بند ہوئے۔ پھر ۱۲۴۵ھ میں انھیں لکھنؤ سے کانپور چلے جانے کی اجازت ملی۔ کانپور میں معتمدالدولہ نے اپنے متعلقین کے ساتھ ریذیڈنٹ کے مہمان کی حیثیت سے جوہی میں قیام کیا۔ اس موقع پر میر رشک نے کئی غزلیں کہی تھیں۔ ایک غزل کے دو شعر یہ ہیں ؎

کب آگے جانتے تھے ہے کدھر میدان جوہی کا
نظر آتا ہے اب آٹھوں پہر میدان جوہی کا
مزا ہے جب نکلیے خیمے سے، وسعت دکھاتا ہے
اِدھر میدان جوہی کا، اُدھر میدان جوہی کا

امین الدولہ کی اس موقع کی ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں ؎

ہم کو شہا دیس نکالا ملا تا بہ گدا دیس نکالا ملا
لکھنؤ تھا جسم تو ہم جان تھے آئی قضا دیس نکالا ملا
شاہ ہم اس حکم کے دیوانے ہیں بے سرو پا دیس نکالا ملا
ظلم ہے شیطاں بنی آدم ہیں ہم
مہر بجا دیس نکالا ملا

نواب معتمدالدولہ نے محلہ گوالٹولی میں بخشی گرانڈ کا بنگلہ خرید کر اس میں آسائش کے تمام اسباب درست کر لیے۔ ان کے اعزا اور متوسلین بھی آس پاس کے علاقوں میں رہ پڑے لیکن بطورِ مجموعی کانپور کا ماحول لکھنؤ کے ان خوشباشوں کے لیے وحشت ناک تھا۔ میر رشک نے ایک غزل میں کہا ہے ؎

یارب یہ گورے ہیں کہ فرشتے عذاب کے بنگلے بھی کانپور کے گوروں سے کم نہیں

اسی حال میں رہنا اور بسر کرنا تھا۔ یہیں تقریبیں ہوتی تھیں اور خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ شیخ ناسخ کے دیوان میں ایک قطعہ ہے ؎

مولد پور مہین پور وزیر کرد شاداں خاطر برنا و پیر
گفت ناسخ سال میلادش بخواب صبح طالع شد، برآمد آفتاب

۱۲۴۵

یہ سب کچھ تھا لیکن نواب معتمدالدولہ کے لیے اس "دیس نکالا" کا غم قابل برداشت نہیں تھا۔ صحت بگڑنے لگی تھی۔ آخر اسی مایوسی کے عالم میں انھوں نے اپنے بڑے بیٹے امین الدولہ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ اس موقع پر میر رشک نے یہ قطعہ تاریخ کہا ؎

از ثروت نواب امین الدولہ شاد و خرم شدند جملہ کہہ و مہہ
از ناخن جود و کرم خود بکشوہ ہرکس کہ بدل داشت ز افلاس گرہ
از تیغ حوادث ہمہ تن محفوظیم فیض و ہمش کرد بما کارِ زرہ
اے رشک نوشتیم چہ تاریخ جلوس
ذیحجہ و یوم اول سہ شنبہ

۱۲۴۷

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس موقع پر بڑا جشن منایا گیا تھا اور ہر چھوٹا بڑا خوشی میں شریک تھا۔ اس جشن کے صرف چار روز بعد نواب معتمدالدولہ نے انتقال کیا۔ میر رشک نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا ؎

یا رب ایں معتمدالدولہ چہ شد مُرد دستورِ کبیر اے افسوس
گفت تاریخ وفاتش ہاتف زیں جہاں رفت وزیر اے افسوس

۱۲۴۷

ان کی وفات کے بعد خاندان کی سرپرستی کے علاوہ تمام املاک و جائیداد کی نگہداشت اور انتظامات کی ذمہ داری بھی امین الدولہ کے سر آ گئی۔ انھوں نے تمام متعلقین

کی بہ صورت احسن سرپرستی کی۔ اپنے والد کے رہائشی مکان کو ثواب کے خیال سے ''مقبرہ'' اور ''عزا خانہ'' کی حیثیت دیدی۔ میر رشک نے تاریخ کہی ؎

بہ غم معتمدالدولہ ، مختارالملک آصف عہد ، سلیماں چشم ، اسکندر جاہ
چہ نصارا و چہ گبر و چہ مسلمان و ہنود می نمودند فغان و قلق و نالہ و آہ
آں مکان کز پے آسائش خود ساختہ بود دفن گردید دراں عشرت و آسائش گاہ
خانۂ ماتمِ شبیر مقرر گردید مسکن و مدفن مغفور حقیقت آگاہ

رشک تاریخ عزا خانہ و مدفن بنوشت
ہم عزا خانہ وہم مقبرہ اے واویلاہ
۱۲۴۷

بعد میں یہی مکان اس گھرانے کا خاندانی قبرستان بن گیا اور اب گوالٹولی کے مقبرے کے نام سے معروف ہے۔

شہر کانپور کے بارے میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے لکھا تھا کہ یہاں ''چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی''۔ میر رشک نے بھی کہا ہے کہ ؎

اے کار ساز خانۂ کنبو خراب ہو جو آگیا خراب ہوا کانپور میں

شیخ امام بخش ناسخ نے بھی شروع ۱۲۴۸ھ میں اس شہر کو ''دشت'' کہا تھا ؎

دشت سے کب وطن کو پہنچونگا کہ چھٹا اب تو سال آ پہنچا

امین الدولہ خود بھی ''مبتلائے فراقِ لکھنؤ'' تھے چنانچہ ان کا ایک مقطع یہ ہے ؎

فرقت لکھنؤ کی ہے تاریخ مہر سچ ہے، ہوں مبتلائے فراق
۱۲۴۸

لیکن اب کانپور ان کا مسکن تھا۔ اس شہر کی ساری نعمتیں ان کے لیے تھیں اور وہ خود اس شہر کو عزت و رونق بخشنے والے تھے۔ انھوں نے بحدِ امکان و وسائل اس شہر کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ نصراللہ خاں خویشگی نے اپنے تذکرے میں ان کے ''دولت سرائے''

تعمیر کرانے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے بعض عمارتیں بنوائیں مثلاً ایک ''عبادت سرائے'' کا قطعہ تاریخ میر رشک نے اس طرح کہا تھا ؂

عبادت سرائے چوں ترتیب یافت زفرمانِ مہر ابنِ دستورِ شاہ
ز ارشاد عقل و ز فضل خدا عبادت ہمی کرد شام و پگاہ
رفیقاں بہ تقلیدِ آں راہبر شب و روز مصروفِ ذکرِ الٰہ
خدایا دہش از گنہ اجتناب بحقِ خود و بہر ایں خانقاہ
چنیں گفت مصراعِ تاریخ رشک
محلِّ نماز است و تعقیب گاہ

۱۲۵۱

امین الدولہ کی دولت سرائے سے متصل دریائے گنگا بہتا تھا۔ نواب نے دریا کی سیر کی طرف بھی توجہ کی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک کشتی بنوائی۔ تاریخ اس طرح ہوئی ؂

یہ کشتی نواب امین الدولہ تحفا کشتی بنی ہے ماشاء اللہ
تاریخ کہی رشک نے اس کشتی کی اب کیا کشتی بنی ہے ماشاء اللہ

۱۲۴۹

نواب کی توجہ سے دریا کے گھاٹ کو رونق حاصل ہوئی۔ ایک مقطع میں خود کہتے ہیں ؂

مہر کی تاریخ سیر گنگ و بزم عیش ہے
جام مے ، مطرب ، شبِ مہ ، دلبر و دریائے گنگ

۱۲۴۹

گنگا میں مختلف قسم کی کشتیاں مثلاً بوٹ، اگن بوٹ اور بجرے وغیرہ نظر آنے لگے اور ایسی ترقی ہوئی کہ بقول میر رشک ؂

ہوتا نہیں ایسا کبھی دریا کا کنارا بہتر لبِ کوثر سے ہے گنگا کا کنارا

شاعروں نے دریا کے کنارے، کشتی کی سیر، مچھلی کے شکار اور میلوں ٹھیلوں، تفریحوں وغیرہ سے متعلق غزلیں کہنی شروع کر دیں۔ خود امین الدولہ کے دیوان میں "بٹھور کے میلے" سے متعلق کئی غزلیں موجود ہیں۔ دو غزلوں کے مقطعے یہ ہیں ؎

اس ماہ وش نے مجھ سے یہ تاریخ میں کہا　　اے مہر لو پری ہے یہ میلا بٹھور کا
۱۲۴۹

اور ؎

تاریخ عیسوی میں یہ مصرع ہوا ہے مہر　　کیا ہی پسند آیا ہے تیرت بٹھور کا
۱۸۳۳

جینے، مرنے، خوشی اور غم کی مختلف تقریبوں سے متعلق بھی غزلیں کہی جانے لگیں۔ امین الدولہ کی دو غزلوں کے اشعار نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں ؎

سارے عالم کو مبارک ہو تری بسم اللہ　　لوح پر لکھے قلم آج یہی بسم اللہ
حرف ان پر ہے نہ ہوں آج جو مشغول طرب　　اس طرح کی نہیں دیکھی ہے کبھی بسم اللہ

ہے دعا مہر کی آئے تجھے لکھنا پڑھنا
یہ مبارک کریں اللہ و نبیؐ بسم اللہ

اور ؎

امروز سیاہ است جہاں در نظر ما　　مدفن شدہ پُرنور ز نورِ نظر ما
چوں چرخ بہ کوکب شدہ اے بخت محور　　از داغ دریں رنج دلِ ما جگرِ ما
بربست چو رختِ سفر اے مہر ز دنیا　　ایں دخترما ، راحت شام و سحر ما

بود اے فلک از شہر صفر لیل دہم حیف
۱۲۵۳
شد مصرع تاریخ غروبِ قمرِ ما

کانپور کے اس ماحول میں بیشتر غزلیں کسی واقعہ، معاملے یا موضوع سے متعلق کہی جانے لگی تھیں۔ مطلع سے مقطع تک سارے شعر ایک متعین خیال یا کیفیت کے آئینے دار

ہوتے تھے۔ ردیفیں بسا اوقات ایسی اختیار کی جاتی تھیں کہ ان کو متعلق غزل کا عنوان کہا جاسکتا تھا۔ ان واقعاتی غزلوں کے مقطعے اکثر تاریخی ہوتے تھے۔

نواب امین الدولہ مہر شروع میں شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ استاد نے بھی شاگرد کی خاطر سے بہت سی غزلیں انھیں کے طور پر کہی تھیں۔ ان کے اثر سے لکھنؤ، الہ آباد اور دوسرے مقامات پر بھی غزل گوئی کا یہی طور بتدریج رواج پانے لگا۔ محسن کا تذکرہ سراپا سخن اس طور پر ایک مخصوص موضوع سے کہی جانے والی غزلوں کا انتخاب ہے۔

ناسخ کے بعد امین الدولہ مہر نے میر علی اوسط رشک کی شاگردی اختیار کرلی تھی۔ ناسخ کا کہنا تھا کہ

شام سے تا صبح ہے مجھ کو جو اَب سیرِ لغات ‏ ‏ سامنے رکھتا ہوں اپنے نسخۂ فرہنگ و شمع

اور میر رشک بھی کہتے تھے کہ

اے رشک حال غفلت اہل سخن یہ ہے ‏ ‏ افسانوں کی تلاش ہے فرہنگ کے عوض

امین الدولہ مہر بھی انھیں کی روش پر چل رہے تھے۔ کہتے تھے

خدا کے فضل سے شوق لغت ہے مہر کو اتنا
دھرے رہتے ہیں پہروں نسخۂ فرہنگ سینے پر

مہر کے مطبوعہ دیوان میں کئی غزلوں کے مقطعوں میں شیخ ناسخ کا ذکر ملتا ہے مثلاً

پوچھتے ہو مجھ سے کیا اے مہر آہ ‏ ‏ نام تھا ناسخ مرے استاد کا

کہتے ہیں کہ ان کا ایک دیوان اور بھی تھا جو غیر مطبوعہ رہ گیا۔ غالبًا وہ رشک کا اصلاح کردہ ہوگا۔ سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں مہر کا تعارف اس طرح ہے:

"(۲۱۰) امین الدولہ، سیف الملک، سید آقا علی خان بہادر، فیروز جنگ، تخلص مہر، دستِ گوہر افشاں نیساں کا ہم سنگ، مہین پور نواب معتمدالدولہ بہادر، شاگرد رشید میر علی اوسط رشک"۔

کلام کا نمونہ یہ ہے

اس بات میں حواس بشر پانچوں ایک ہیں
احمدؐ سے تا شبیر و شبر پانچوں ایک ہیں
میں ، ذرہ ، کبک ، فاختہ ، بلبل ہیں پانچوں ایک
تو ، سرو ، مہر ، مہ ، گل تر پانچوں ایک ہیں
مجھ تیرہ بخت حیرتیِ دودِ زلف کو
دن ، رات ، صبح ، شام ، سحر پانچوں ایک ہیں
عاشق کو مرگ و زیست میں رہنے کے واسطے
گھر ، بحر ، بر ، بہشت ، سقر پانچوں ایک ہیں
اس مہ سے بدحواسی و دلبستگی میں مہر
شم ، ذوق ، لمس ، سمع ، بصر پانچوں ایک ہیں

مطرب و ساقی و مے، نہر و چمن، شاہد و مہر
اے خدا فرق نہ آئے کبھی ان ساتوں میں

امین الدولہ نے ایسی غزل بھی کہی ہیں جن کا ہر شعر ایک سے زائد بحروں میں موزوں ہوتا ہے، مثلاً ؎

داغ ہے شمع شب تار فراق — فرش ہے مجھ کو سرخار فراق
جب نظر آتا ہوں میں لوگوں کو مہر — کہتے ہیں مجھ کو سبھی زار فراق

حکیم نجم الغنی خاں نے لکھا ہے کہ ''(۲۱۱) یہ اشعار تین وزنوں میں ہیں:

ایک۔	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلان
دوسرا۔	مفتعلن	مفتعلن	فاعلان
تیسرا	فاعلاتن	فاعلاتن	فعلان

امین الدولہ مہر اپنے متعلقین اور متوسلین کے ساتھ ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء میں کربلائے معلا کے لیے روانہ ہوئے۔ میر علی اوسط رشک کے تیسرے دیوان میں اس سفر سے متعلق

کئی قطعات تاریخ موجود ہیں۔ کربلا پہنچ کر ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۳ء میں انھوں نے وفات پائی۔ صغیر شاگرد رشک نے تاریخ کہی ۔

''تاریخ وفات نواب آغا علی خاں امین الدولہ بہادر ابن نواب معتمدالدولہ بہادر''۔

چلا جو ہند سے ابن وزیر شاہ اودھ　　جنازہ صحن رواق حسین میں آیا
کہی صغیر نے تاریخ جب سنی یہ خبر　　پیام مہد اجل کاظمین میں آیا
۱۲۶۹

محسن نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے :

''(۲۱۲) زایر کربلائے معلا نواب امین الدولہ سید آغا علی خان بہادر فیروز جنگ مرحوم مہر، خلف اکبر نواب معتمدالدولہ سید آغا میر بہادر ضیغم جنگ، مولدان کا لکھنؤ، مسکن کانپور، مدفن نجف اشرف کربلائے معلا، صاحب دیوان، شاگرد میر علی اوسط رشک''۔

۶۰- نقی :

سعادت خاں ناصر نے نقی کا تعارف اس طرح کرایا ہے :

''(۲۱۳) شاہد مصر خوش گوئی، علی نقی خاں عرف پیارے صاحب، تخلص نقی ابنِ پسر سبحان علی خاں صاحب (مراد از پیارے صاحب نبیرۂ علامۂ عصر جناب سبحان علی خاں صاحب مدظلہٗ است) شاگرد مرزا محمد رضا برق''۔

اور محسن کے تذکرے میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ :

''(۲۱۴) نقی علی خاں عرف پیارے صاحب نقی ولد واجد علی خاں (یا امجد علی خاں؟) بن سبحان علی خاں کنبوہ، باشندۂ لکھنؤ، مقیم کربلائے معلا، صاحب دیوان، شاگرد فتح الدولہ مرزا محمد رضا خاں برق کے

تھے، بعدہٗ شاگرد میر علی اوسط رشک کے ہوئے"۔

ان کی ولدیت کا تعین نادر کے تذکرے سے ہوتا ہے، جس میں ہے:

"(۲۱۵)نقی، نقی علی خاں عرف پیارے صاحب خلف واجد علی خاں ابن سبحان علی خاں، باشندۂ لکھنؤ، صاحب دیوان، شاگرد مرزا برق"۔

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ان کا دیوان چھپا تھا یا نہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

واللہ کیا غضب کی ہے اے گلعذار آنکھ پڑتی ہے تیری آنکھ پہ بے اختیار آنکھ
گڑ جائے گی زمیں میں خجالت سے اے قمر نرگس سے ہو گئی جو تمھاری دو چار آنکھ

جو دن کو بیقراری ہے تو شب کو آہ و نالے ہیں
نہ پوچھو حال کچھ تیغ تغافل کے حوالے ہیں
کھلی یہ رمز برسوں میں طواف دیر سے ہم پر
کہ جو بندے صنم کے ہیں، وہی اللہ والے ہیں

۶۱- نور:

"(۲۱۶)حکیم میر نادر حسین نور خلف میر اصغر علی ابن حکیم میر عوض علی، باشندۂ بریلی، بہ سبب منسوب ہونے دختر ہمشیرۂ(۲۱۷) نواب معتمدالدولہ بہادر مقیم کانپور"۔

"حکیم آغا نادر حسین مرحوم و مغفور، نور تخلص" حکیم کاشف کے اقربا میں سے تھے۔ ان کے دیوان میں ان سے متعلق ایک مقطع ہے ؎

محرّم سے رہے مصروف ماتم نور اے کاشف
خیال مرثیہ گوئی میں ہیں مصروف چہلم سے

ان کا دیوان موسوم بہ "ضیائے نور" مطبع کارنامہ لکھنؤ سے ۱۲۹۶ھ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

تازیست رنج و غم ہی رہے غمگسارِ دل   شاید کف افسوس ہے لیل و نہارِ دل

۶۲- ہلال:

ہلال کا ذکر سعادت خاں ناصر نے بہت اختصار سے کیا ہے:

"(۲۱۸) شیریں سخن، خوش مقال، امیر علی خاں، تخلص ہلال شاگرد برق اول، شاگرد رشک ثانی الحال"۔

معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں ان کو رشک کے شاگرد ہی کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ جلال نے بھی لکھا ہے:

"(۲۱۹) ہلال مرحوم شاگرد رشک مغفور"۔

اور محسن کے الفاظ اس طرح ہیں:

"(۲۲۰) امیر علی خاں ہلال ولد تراب خاں، باشندۂ لکھنؤ، صاحب دیوان و مشاعرہ، شاگرد رشید میر علی اوسط رشک۔ ان کا کلام لطیف مشہورِ عام ہے۔ ایک دیوان کہ جس کا ہر مقطع تاریخی ہے اور ایک سراپا کہ جس کی تاریخ آغاز یہ شعر ہے ۔

یہ تاریخ آغاز اشعار کی ہے   سراپا یہ تصویر دلدار کی ہے

۱۲۶۹

اور ایک مثنوی مقفٰی و مردف ان کی طبعزاد ہے"۔

صغیر نے ہلال کے مرنے کی تاریخ کہی تھی، اس طرح:

"تاریخ وفات امیر علی خاں ہلال"۔

افسوس ہلال ازیں جہاں رفت   دل در غم او پُر اضطراب است

شیریں سخنے بہ شاعراں بود   دیواں کہ از دست خوش کتاب است

جستیم چو اے صغیر تاریخ   دل گفت حیات چوں حباب است

بنویس دو حرف از سروپا   باقی ز حباب غرق آب است

اعداد حروف چوں نوشتم
یک یک کم شد ہمیں حساب است

۱۲۷۸

خواجہ عبدالرووف عشرت نے ہلال کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"(۲۲۱) امیر علی خاں ہلال شاگرد میاں برق "پار" میں رہتے تھے۔ جلاجل نواز تھے۔ شعر بہت اچھا کہتے تھے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ قبر گئو گھاٹ (گومتی کے کنارے) پر سنی جاتی ہے"۔

کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

جان باقی نہیں نظارے سے انسانوں میں
شان خالق نظر آتی ہے ترے شانوں میں
جب سے اس مہ کو ہوا دھانی دوپٹوں سے شوق
چاندنی کرنے لگی کھیت ہرے دھانوں میں
کون کہتا ہے سراپا نہیں تجھ میں اعجاز
مچھلیاں رہتی ہیں گو پانی نہیں رانوں میں
سنا ہے حضرت یوسف کو ، پر تجھے دیکھا
ہزاروں ہاتھوں کی کٹتی ہیں انگلیاں پوریں
دل تیرا کیوں نہ لیویں ہم اے یار ہاتھ میں
شیشہ ہمیشہ رکھتے ہیں میخوار ہاتھ میں

۶۳۔ یکتا:

ان کا حال خواجہ عبدالرووف عشرت نے اس طرح لکھا ہے:

"(۲۲۲) نواب مرزا ہادی علی خاں یکتا لکھنوی تلمیذ رشک مرحوم...... چھیانوے برس کی عمر ہے...... جوان اولاد کے مرنے سے کمر ٹوٹ

گئی...... غزل گوئی کی مشق کے علاوہ خمسہ بہت اچھا کہتے تھے۔ شاہی زمانہ کی مکمل تاریخ ہیں۔ نواب سر بلند خاں کے خاندان سے ہیں۔ روشن دولہ ان کے پردادا تھے...... دیوان مرتب کرنے کی نوبت نہیں آئی...... شہدے کی مسجد کے قریب کسی رئیس کے مکان میں رہتے ہیں...... لکھنؤ میں ایسے لوگوں کی ذات غنیمت ہے"۔

ان کا مزید حال کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

☆☆☆☆☆

مآخذ

۱- دواوین و منظومات:

۱۔ آئین اختر، مثنوی، عرف ظفر نامہ/۱۲۷۹ یعنی حالات زمانہء واجد علی شاہ۔ صغیر استاد راجا رمپال سنگھ، طبع اودھ پریس لکھنؤ ۱۹۱۲ بار دوم۔

۲۔ خزینہء شمشاد عرف نظم دلفروز/۱۳۱۷ یعنی دیوان محمد عبدالاحد شمشاد لکھنوی۔ مطبع انوار محمدی، لکھنؤ

۳۔ دیوان راجا (فارسی)۔ راجا رامپال سنگھ والی کالا کانکر۔ ہنونت پریس، کالا کانکر ۱۹۰۳

۴۔ دیوان صغیر (ناقص الطرفین)۔ صغیر شاگرد رشک مطبوعہ ۱۳۰۵۔

۵۔ دیوان مہر۔ نواب امین الدولہ مہر (ناقص الآخر)

۶۔ عین المعارف۔ دیوان مولوی عبدالعلیم آسی مرتبہ سید شاہد علی فانی سبز پوش گورکھپوری۔ مطبوعہ بار دوم

۷۔ کلیات تسلیم عرف نظم ارجمند/ ۱۲۸۸۔ امیر اللہ تسلیم مطبوعہ مطبع نولکشور۔

۸۔ گلکدۂ صغیر عرف اختر سخن/۱۹۱۱۔ محمد اصغر حسین صغیر گورکھپوری۔ مطبع حکیم برہم گورکھپور۔ بار اول

۹۔ منتخب العالم/۱۲۶۴۔ دیوان منیر شکوہ آبادی۔ مطبع سعیدی رامپور ۱۲۶۴۔

۱۰۔ مولد شریف عرف عرضہء بہار۔ مرزا علی بہار مطبع نولکشور، لکھنؤ۔ بار اول فروری ۱۸۶۸۔

۱۱۔ نظم مبارک ونظم گرامی۔ دیوان اول و دوم۔ میر علی اوسط رشک۔ مطبع محمد حسین لکھنؤ۔

۲- تاریخ، تذکرے وغیرہ :

۱۲۔ آب بقا، خواجہ عبدالرووف عشرت، مطبع نامی، لکھنؤ، 1918۔

۱۳۔ آب حیات، پروفیسر محمد حسین آزاد، وکٹوریا پریس، دہلی، ۱۸۸۳ بار دوم۔

۱۴۔ آثار الشعرائے، ہنود دیبی پرشاد دبشاش، مطبع رضوی دہلی، ۱۳۰۰/ ۱۸۸۵۔

۱۵۔ ارمغان گوکل۔ گوکل پرشاد رسا مرتب فرمان فتحپوری۔ مشمولہ سہ ماہی اردو، کراچی۔

۱۶۔ افسانۂ لکھنؤ، آغا حجو شرف مرتب سید محمود نقوی۔ نشاط پبلیکیشنز، دہلی، ۱۹۸۵۔

۱۷۔ امیر نامہ وزیر السلطان امیر علی خاں، کلکتہ، ۱۸۷۳۔

۱۸۔ انتخاب یادگار، امیر احمد امیر مینائی، تاج المطابع، رامپور۔

۱۹۔ بحر الفصاحت، حکیم نجم الغنی خاں رامپوری، مطبع نولکشور، لکھنؤ ۱۹۲۷، بار سوم۔

۲۰۔ بزم داغ، سید رفیق مارہروی، سرفراز پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۶۔

۲۱۔ بنی، واجد علی شاہ بادشاہ، مولفہ ۱۲۹۴، مطبوعہ، ۱۲۹۵۔

۲۲۔ بہارستان سخن، شیام سندر لال برق، مطبع یل پی سیتاپور، ۱۹۳۲۔

۲۳۔ بیگمات اودھ، شیخ تصدق حسین، کتاب نگر، لکھنؤ۔

۲۴۔ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکینہ، مترجم مرزا محمد عسکری، راجکمار پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۲۔

۲۵۔ تاریخ اودھ (جلد ۳، ۴، ۵)، محمد نجم الغنی خاں رامپوری، مطبع مطلع العلوم، مراد آباد۔

۲۶۔ تواریخ اودھ (جلد ۱، ۲)، سید کمال الدین حیدر۔

۲۷۔ تاریخ کانپور (جلد ۲، ۳)، منشی درگاہی لال، مطبع شعلہ طور کانپور۔

۲۸۔ تذکرہ نادر، کلب حسین خاں نادر، مرتب سید مسعود حسن رضوی ادیب، سرفراز پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۷، بار اول۔

۲۹۔ تذکرہ کاملان رامپور، حافظ احمد علی خاں شوق رامپور، ہمدرد پریس، دہلی مارچ ۱۹۲۹ بار اول۔

۳۰۔ تلخیص معلا، کلب حسین خاں نادر، مرتب ڈاکٹر محمد انصار اللہ، لیتھوکل پرنٹرس، علی گڑھ، ۱۹۷۶۔

۳۱۔ جلال لکھنوی، ڈاکٹر محمد حسن، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔

۳۲۔ خمخانۂ جاوید (جلد ۱ تا ۶)، لالا سری رام، دہلی۔

۳۳۔ خوش معرکۂ زیبا (جلد ۲)، سعادت خاں ناصر، مرتب مشفق خواجہ، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۲۔

۳۴۔ دو نایاب زمانہ بیاضیں، عبدالباری آسی، ہندوستانی اکیڈیمی، الہ آباد، ۱۹۴۲۔

۳۵۔ ریاض العروض، حکیم علی ضامن شوق۔

۳۶۔ رموز الاطبا (جلد۲)، حکیم محمد فیروز الدین، رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور۔ اکتوبر 1915 طبع اول۔

۳۷۔ سخن شعرا، عبدالغفور خاں نساخ، مطبع نولکشور لکھنؤ، ۱۲۹۱/۱۸۷۴۔

۳۸۔ سخنوران چشمدیدہ۔ ترک علی شاہ ترکی، مطبع شمس الاسلام، حیدرآباد، ۱۳۳۲۔

۳۹۔ سراپا سخن، سید محسن علی موسوی، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۳۱۵/ ۱۸۹۸۔

۴۰۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں، ڈاکٹر گیان چند جین، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ۱۹۶۹۔

۴۱۔ فہرست مخطوطات اردو رامپور رضا لائبریری جلد اول، مرتب امتیاز علی عرشی، ہندوستان پرنٹنگ ورکس، رامپور، ۱۹۶۷۔

۴۲۔ فہرست نمائش ادارہ تحقیقات اردو (جلد اول)، مرتب قاضی محمد سعید، پٹنہ، ۱۹۵۹۔

۴۳۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، کراچی۔

۴۴۔ مراۃ الشعر (جلد ۱، ۲)، محمد یحیٰ تنہا، تعلیمی پریس، لاہور، ۱۹۵۰۔

۴۵۔ مفید الشعرا، سید ضامن علی جلال، مطبع مجیدی، کانپور، ۱۹۲۲۔

۴۶۔ منافع الابرار، مرزا محمد جعفر خاں، مطبع اثنا عشریہ، لکھنؤ، ۱۲۸۸۔

۴۷۔ نشتر، سید محمد حسن شاہ مترجم محمد سجاد حسین کسمنڈوی گلبرگہ، ۱۳۱۱۔

۴۸۔ ہندو شعرا، خواجہ عبدالرؤف عشرت، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۳۱ بار اول۔

۴۹۔ یادگار ضیغم، عبداللہ خاں ضیغم، ۱۳۰۳۔

۳۔ کتب قلمی :

۵۰۔ بیاض نواب سید علی خان بہادر نبیرہ نواب معتمد الدولہ مملوکہ نواب حیدر علی خاں خلف نواب سید علی خاں (کانپور)

۵۱۔ دیوان رشک (سوم)، مرتب محمد انصار اللہ۔

۵۲۔ دیوان کاشف، حکیم سید جعفر حسین کاشف مملوکہ سید ہاشم علی سبز پوش گورکھپوری۔

حواشی :

۱۔ تلخیص معلا، ص ۹۳۔

۲۔ آب حیات، ص ۳۵۸۔

۳۔ ارباب سخن، ص : ۲۴ تا ۲۵۔

۴۔ جلوۂ خضر، جلد دوم۔

۵۔ نساخ نے محمد علی لکھا ہے (سخن شعرا ص ۲۰) جو صحیح نہیں ہے۔

۶۔ مرزا ابو جعفر خاں نے ۶ رجب ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء کو وفات پائی تھی، رشک نے تاریخ کہی ؎

مُرد مرزای فلک رتبہ ابو جعفر خاں — بود آں اہل ورع خال من ہیچمداں

شدہ تاریخ چو او شد بہ ائمہ پابوس — زرجب بود ششم لیل جمعہ افسوس (نظم گرامی)

۱۲۵۹

۷۔ سراپا سخن، ص ۲۱۳۔

۸۔ خوش معرکہ، ج ۲ ص ۳۲۴۔

۹۔ لکھنؤ کا دبستان، ص ۴۲۰۔

۱۰۔ سراپا سخن، ص ۱۴۵۔

۱۱۔ ارمغان گوکل میں ان کا تخلص اعجاز لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۹۶، سخن شعرا، ص ۳۶۔

۱۳۔ مولانا محمد حسین آزاد نے عالی کو اجمل کا پوتا لکھا ہے (آب حیات، حاشیہ ص ۴۴۸)۔

۱۴۔ علی ابراہیم خاں خلیل نے شاہ خوب اللہ کا نام ''شاہ حضرت اللہ الہ آبادی'' لکھا ہے۔ (گلزار ابراہیم ص ۲۳۶)

۱۵۔ آب حیات، ص ۲۵۲، ۴۴۷۔

۱۶۔ عین المعارف، ص ۱۲۔

۱۷۔ خوش معرکہ، ج ۲ ص ۳۷۰۔

۱۸۔ عین المعارف، ص ۲۴۔

۱۹۔ خوش معرکہ، ج ۲ ص ۳۶۳۔

۲۰۔ سخن شعرا اور خوش معرکۂ زیبا (مرتبہ مشفق خواجہ) وغیرہ میں میر محمود خاں چھپا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے (سراپا سخن ص ۲۶ وغیرہ)

۲۱۔ سخن شعرا میں میر خواجہ شاہ چھپا ہے جو غلط ہے۔

۲۲۔ لالا سری رام کے تذکرے میں ہے:

''منشی میر محمود جان اوج، دہلی کے قدیم متوطن اور شیریں کلام و خوش فکر شاعر تھے۔ بہادر شاہ ثانی کے زمانے میں نشوونما پائی۔ ایک قلمی بیاض سے آپ کا

کلام انتخاب ہو کر درج تذکرہ کیا جاتا ہے''۔ (خمخانہ جاوید ج ۱ ص ۵۱۳)۔
وطن کے بارے میں سری رام کا خیال صحیح نہیں ہے۔

۲۳۔ خوش معرکہ، ج ۲، ص ۳۳۵۔

۲۴۔ سراپا سخن، ص ۲۶۔

۲۵۔ بحر الفصاحت، ص ۲۱۹، ۸۵ہ۷ وغیرہ۔

۲۶۔ میر فضل علی بائیسی والے نواب معتمد الدولہ کے سمدھی تھے۔ ان کے بیٹے میر نذر علی کے ساتھ ان کی بیٹی کی شادی ہوئی تھی۔ میر محمود بائیسی والے جن کا تخلص اوج تھا ممکن ہے کہ انھیں میر فضل علی کے قرابت دار رہے ہوں۔ بعد میں اس منصب نے غالباً خاندانی نشان کی صورت اختیار کر لی تھی۔ نواب حیدر علی خاں (نبیرۂ نواب معین الدولہ ابن معتمد الدولہ) فرماتے تھے کہ کانپور میں اس خاندان کے ایک صاحب تھے جو بائیسی والے کہلاتے تھے۔ اس واقعہ کو اب پینتیس چھتیس برس ہوئے۔ معلوم نہیں کہ اب کوئی شخص موجود ہے یا نہیں۔

۲۷۔ یادگار ضیغم، ص ۶۵۔

۲۸۔ خوش معرکہ، ج ۲، ص ۳۴۷۔

۲۹۔ سخن شعرا، ص ۶۹۔

۳۰۔ بنی، ص ۳۴۲۔

۳۱۔ بنی، ص ۲۴۴۔

۳۲۔ خمخانہ جاوید، ج ۲، ص ۵۴۔

۳۳۔ سخنوران چشمدیدہ، ص ۲۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۸ تا ۲۹۔

۳۵۔ بزم داغ، حاشیہ ص ۹۴۔ سخنوران چشمدیدہ کے سرورق پر ان کا نام ''مولوی ترک علی شاہ ترکی قلندر نور محلی'' کر کے چھپا ہے۔

۳۶۔ سراپا سخن، ص ۶۰۔

۳۷۔ تذکرہ نادر، ص ۴۹۔

۳۸۔ خوش معرکہ، ج ۲، ص ۳۲۷۔

۳۹۔ خمخانہ جاوید، ج ۵، ص ۳۸۳۔

۴۰۔ یادگار ضیغم، ص ۸۷۔

۴۱۔ خمخانہ جاوید، ج ۲، ص ۔

۴۲۔ یادگارِ ضیغم، ص ۹۲۔

۴۳۔ سراپا سخن، ص ۳۷۶۔

۴۴۔ تاریخ اودھ، ج ۴، ص ۱۵۳۔

۴۵۔ خوش معرکہ، ج ۲، ص ۳۵۵۔

۴۶۔ خمخانہ جاوید، ج ۵، ص ۲۵۰۔

۴۷۔ خوش معرکہ، ج ۲، ص ۲۲۷۔

۴۸۔ سراپا سخن، ص ۱۳۱۔

۴۹۔ لکھنؤ کا دبستان، ص ۶۰۶۔

۵۰۔ خمخانہ جاوید، ج ۲، ص ۱۶۶۔

۵۱۔ مراۃ الشعر (ج ۲، ص ۹۵) میں ۱۲۴۸ھ، خمخانہ (ج ۲ ص) آب بقا (ص ۳۶) جلال (حاشیہ ص ۱۲)، سکینہ (ص ۳۷۷) اور بزم داغ (حاشیہ ص ۸۰) میں ۱۲۵۰ھ اور یادگار ضیغم (ص ۹۴) میں عمر کے حساب سے ۱۲۵۳ھ کو سال ولادت ظاہر کیا ہے۔

۵۲۔ حالات جلال، ص ۵۳، انتخاب یادگار، وغیرہ۔

۵۳۔ جلال، ص ۱۴، آب بقا ص ۳۶، لکھنؤ کا دبستان، ص ۴۵۶ وغیرہ۔

۵۴۔ آب بقا میں (ص ۱۴۴ پر) ہے کہ امداد علی بحر سے جلال نے اصلاح لی۔

۵۵۔ مادۂ تاریخ ۔ میر ضامن علی جلال آہ آہ / ۱۳۲۷ (گلدۂ صغیر)، لیکن گل رعنا میں ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء، جلال لکھنوی (حاشیہ ص ۱۲) پر ۱۳۲۶ھ، بزم داغ حاشیہ ص ۸۰ پر اور حالات جلال (ص ۴۲) میں ۱۳۲۴ھ، لکھنؤ کا دبستان (ص ۵۰۰) پر ۱۹۰۹ء/ ۱۳۲۵ھ لکھا ہے۔ یہ سب صحیح نہیں۔

۵۶۔ کاملان رامپور، ص ۱۷۶ تا ۱۷۷

۵۷۔ بزم سخن، ص ۳۶۔

۵۸۔ خوش معرکہ، ج ۲، ص ۳۷۲۔

۵۹۔ سراپا سخن، ص ۱۱۹، ۱۳۱، ۳۲۶۔

۶۰۔ بحر الفصاحت، ص ۱۲۰۷۔

۶۱۔ سراپا سخن، ص ۱۲۵، ۲۶۹، ۳۲۳۔

۶۲۔ سراپا سخن، ص ۳۰۳۔

۶۳۔ سخن شعرا، ص ۱۳۳۔

۶۴۔ یادگار ضیغم، ص ۱۳۶۔

۶۵۔ تذکرہ نادر، ص ۶۲۔

۶۶۔ خمخانہ جاوید، ج ۳، ص ۱۲۔

۶۷۔ اردو مثنوی، ص ۷۹۳۔

۶۸۔ سراپا سخن، ص ۷۵۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۲۸۲۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۳۵۱۔

۷۱۔ تذکرہ نادر، ص ۶۴۔

۷۲۔ خوش معرکہ، ص ۴۵۱ تا ۴۵۲۔

۷۳۔ واجد علی شاہ بادشاہ سے منسوب ایک شعر ہے ؎

اختر پسند آگیا مصرع ہلال کا دولھا کے دم کے ساتھ یہ ساری برات ہے

(خمخانہ جاوید، ج ا ص ۲۱۴)

شاید ناصر سے سہو ہوا اور اس نے یہ غزل خورشید کے کلام میں شامل کر دی (خوش معرکہ ج ۲، ص ۴۵۳)

۷۴۔ آثار الشعرائے ہنود، ص ۵۴۔

۷۵۔ خمخانہ جاوید، ج ۳، ص ۱۸۰۔

۷۶۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۴۳۔

۷۷۔ ہندو شعرا، ص ۵۵، بہار سخن، ص ۱۶۱۔

۷۸۔ خوش معرکہ، ص ۳۶۸، سراپا سخن، ص ۱۸۵، سخن شعرا، ص ۱۶۵ وغیرہ۔

۷۹۔ تذکرہ نادر، ص ۶۸۔

۸۰۔ سراپا سخن، ص ۳۲۵۔

۸۱۔ قادر طالب علی خان عیشی کے شاگرد تھے۔

۸۲۔ منتخب العالم، ص ۳۴۔

۸۳۔ خمخانہ جاوید، ج ۳، ص ۲۵۳ تا ۲۵۴۔

۸۴۔ خوش معرکہ، ج ۲، ص ۳۲۶۔

۸۵۔ سراپا سخن، ص ۲۸۳۔

۸۶۔ ''امیر یا توقیر، امیر جناب سید الشہدا مرزا عالی جاہ بہادر موسوی عرف نواب منجھلے صاحب، شیدا تخلص خلف نواب دلیر الدولہ محمد علی خاں عرف آغا حیدر ... باشندہ فیض آباد، مقیم لکھنؤ، صاحب

دیوان، شاگرد مرزا سرفراز علی قادر" (سراپا سخن ص ۱۴۴، ۲۰۴ وغیرہ)

۸۷۔ خمخانہ جاوید، ج ۳، ص ۳۹۰۔

۸۸۔ مفید الشعرا، ص ۳۳۔

۸۹۔ خوش معرکہ، ج ۲، ص ۳۶۱۔

۹۰۔ سراپا سخن، ص ۱۳۷۔

۹۱۔ خمخانۂ جاوید، ج ۳، ص ۵۶۷۔

۹۲۔ خمخانہ جاوید ج ۳ ص ۵۶۷۔

۹۳۔ خوش معرکہ، ج ۲، ص ۳۳۶۔

۹۴۔ تذکرۂ نادر، ص ۷۸۔

۹۵۔ سراپا سخن، ص ۷۵، ۱۳۶۔

۹۶۔ ارمغان گوکل، ص ۔

۹۷۔ خمخانہ جاوید، ج ۴، ص ۱۷ تا ۱۸۔

۹۸۔ سخن شعرا، ص ۲۰۸۔

۹۹۔ فہرست نمائش پٹنہ، ص ۱۰۸۔

۱۰۰۔ خوش معرکہ، ج ۲، ص ۳۵۹۔

۱۰۱۔ سراپا سخن، ص ۸۳، سخن شعرا، ص ۳۰۹۔

۱۰۲۔ تذکرہ نادر، ص ۷۹۔

۱۰۳۔ ارمغان گوکل، ص ۔

۱۰۴۔ خمخانہ جاوید، ج ۴، ص ۸۰۔

۱۰۵۔ خوش معرکہ، ج ۲، ص ۳۷۱۔

۱۰۶۔ سراپا سخن، ص ۱۲۵۔

۱۰۷۔ بیاض نواب سید علی خاں (قلمی)۔

۱۰۸۔ تاریخ اودھ، ج ۴، ص ۱۶۷۔

۱۰۹۔ امیر نامہ، ص ۳۱۳۔

۱۱۰۔ تواریخ لکھنؤ، ج ۲، ص ۱۹۰، بیگمات اودھ، ص ۲۳۰۔

۱۱۱۔ افسانۂ لکھنؤ، ص ۔

۱۱۲۔ تواریخ لکھنؤ، ج ۲، ص ۲۵۲۔

۱۱۳۔ تاریخ کانپور ج ۲، ص ۱۱۱۔

۱۱۴۔ تواریخ لکھنؤ ج ۲، ص ۳۹۴۔

۱۱۵۔ سراپا سخن، ص ۲۰۲، سخن شعرا، ص ۲۳۳۔

۱۱۶۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۴۵۔

۱۱۷۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۷۳۔

۱۱۸۔ سراپا سخن، ص ۴۹، ۳۲۸۔ اس تذکرے میں ص ۳۲۸ پر غلطی سے ان کا نام ''شرافت الدین حسین'' چھپ گیا ہے۔

۱۱۹۔ خمخانہ جاوید ج ۴، ص ۵۳۰۔

۱۲۰۔ لکھنؤ کا دبستان، ص ۴۲۰۔

۱۲۱۔ افسانۂ لکھنؤ، ص ۔

۱۲۲۔ مطبوعہ مطبع اثنا عشریہ، لکھنؤ ۱۲۸۸ھ۔

۱۲۳۔ اس سے تین چار سال پہلے علی ضامن شوق کے والد میر علی اوسط رشک کا انتقال ہو چکا تھا۔

۱۲۴۔ یعنی میر علی اوسط رشک۔

۱۲۵۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۱۷۔

۱۲۶۔ سراپا سخن، ص ۴۲، ۸۴۔

۱۲۷۔ یادگار ضیغم، ص ۳۷۷۔

۱۲۸۔ ریاض العروض محمد میر کی فرمائش اور مشورے سے ۸ رجب ۱۲۷۹ھ / ۳۰ دسمبر ۱۸۶۲ء کو مطبع علی بخش خاں واقع کٹرہ محمد علی خاں لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ کل چودہ صفحات۔

۱۲۹۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۱۸۔

۱۳۰۔ خمخانۂ جاوید ج ۲، ص ۹۔

۱۳۱۔ خمخانۂ جاوید ج ۲ ص ۱۵۷۔

۱۳۲۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۱۸ تا ۳۱۹۔

۱۳۳۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۲۷۷۔

۱۳۴۔ ایضاً، ج ۲، ص ۲۷۷ تا ۲۸۱۔

۱۳۵۔ ایضاً، ج ۲، ص ۲۸۵ تا ۲۸۸، ۶۱۲ تا ۶۱۳۔

۱۳۶۔ خمخانہ جاوید ج ۵، ص ۲۰۳۔

۱۳۷۔ ارمغان گوکل، ص ۔

۱۳۸۔ سراپا سخن، ص ۷۷۔

۱۳۹۔ دو نایاب زمانہ بیاضیں ص ۱۱۴۔

۱۴۰۔ سراپا سخن، ص ۹۵۔

۱۴۱۔ لالا سری رام نے ان کا نام ''شاہ غلام حیدر'' لکھا ہے۔ (خمخانہ جاوید ج ۵ ص ۲۹۱) لیکن یہ کہیں اور نہیں ملا۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے رشک کے شاگردوں میں ''حیدر تخلص حیدر علی شاہ ابن دھومن لکھنوی'' کا بھی ذکر کیا ہے (لکھنؤ کا دبستان ص ۶۰۰) یہ حیدر علی صغیر کے سوا کوئی اور شخص نہیں ہیں لیکن ان کا تخلص حیدر نہیں تھا۔

۱۴۲۔ یادگار ضیغم، ص ۲۲۰۔

۱۴۳۔ میر علی اوسط رشک استاد صغیر۔

۱۴۴۔ بعض کتابوں میں میر رشک کے شاگردوں میں ایک نام غلام محمد خاں ضمیر بھی لکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ غلام محمد خاں کا تخلص خبیر تھا اور ان کا حال لکھا جا چکا ہے۔

۱۴۵۔ سراپا سخن، ص ۲۹۔

۱۴۶۔ یادگار ضیغم، ص ۲۲۶۔

۱۴۷۔ خمخانۂ جاوید ج ۵، ص ۳۰۲۔

۱۴۸۔ اس دیوان میں انسانی اعضاء کو ردیف بنایا گیا ہے۔ یہ دیوان مطبع حسنی واقع محلہ بزازہ فتح گڑھ سے شعبان ۱۲۹۴ھ/ستمبر ۱۸۷۷ء میں چھپا تھا۔

۱۴۹۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۴۲۔

۱۵۰۔ سراپا سخن، ص ۷۵۔

۱۵۱۔ سخن شعرا، ص ۳۰۶، تذکرہ نادر، ص ۱۰۴۔

۱۵۲۔ کاملان رامپور، ص ۱۱۔

۱۵۳۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۳۹۔

۱۵۴۔ کاملان رامپور، ص ۱۱۔

۱۵۵۔ سراپا سخن، ص ۲۸۴،۷۴۔

۱۵۶۔ کاملان رامپور، ص ۱۱۔

۱۵۷۔ انتخاب یادگار، ص ۲۲۵۔

۱۵۸۔ منتخب العالم، ص ۔

۱۵۹۔ ایضاً، ص ۳۰۷۔

۱۶۰۔ سخنوران چشمدیدہ، ص ۸۱۔

۱۶۱۔ یادگار ضیغم، ص ۲۴۵۔

۱۶۲۔ تلخیص معلا، مطبوعہ علی گڑھ ص ۹۶۔

۱۶۳۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۴۸۔

۱۶۴۔ سراپا سخن۔ مجمل حال اپنا۔ الخ۔

۱۶۵۔ سراپا سخن، ص ۳۵، ۳۲۴، ۳۲۸۔

۱۶۶۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۴۴۔

۱۶۷۔ سراپا سخن، ص ۲۰۶، ۳۶۰۔

۱۶۸۔ سخن شعرا، ص ۳۳۹ تا ۳۴۰۔

۱۶۹۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۳۲۔

۱۷۰۔ سراپا سخن، ص ۱۳۷، ۱۴۴۔

۱۷۱۔ مطبوعہ مطبع منشی نولکشور۔

۱۷۲۔ سخن شعرا، ص ۳۵۴۔

۱۷۳۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے رشک کے شاگردوں میں ایک نام ''محمد باقر فکر کانپوری'' بھی لکھا ہے۔ (لکھنؤ کا دبستان ص ۶۰۱) ظاہراً ان سے سہو ہوا۔ یہ محمد باقر فریاد ہیں۔

۱۷۴۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۳۴

۱۷۵۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۳۷۔ مرتب تذکرہ نے لکھا ہے ''نسخۂ انجمن میں نام ''سید علی جان'' جو درست نہیں — لیکن درست نہ ہونے کی وجہ نہیں بتائی۔ میر رشک کے قلمی دیوان اور تذکرہ سراپا سخن میں بھی علی جان (بہ جیم ابجد) ہی لکھا ہے''۔

۱۷۶۔ سراپا سخن، ص ۱۳۷۔

۱۷۷۔ سخن شعرا، ص ۳۸۰۔

۱۷۸۔ تاریخ اودھ ج ۴، ص ۱۷۵۔

۱۷۹۔ تاریخ اودھ ج ۴، ص ۲۳۰۔

۱۸۰۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۔

۱۸۱۔ سراپا سخن، ص ۷۶ — اسی تذکرے میں دوسری جگہ قیس کے والد کا نام ''وحدت اللہ'' لکھا ہے (ص ۲۵) اور یہی نساخ کے تذکرے میں بھی (سخن شعرا ص ۳۹۳)۔

۱۸۲۔ رموز الاطبا، ص ۳۰۳۔

۱۸۳۔ رموز الاطبا، ص ۳۰۳۔

۱۸۴۔ رموز الاطبا میں ۳۰۲ تا ۳۰۵۔

۱۸۵۔ عین المعارف ص ۲۲۔

۱۸۶۔ خزینۂ شمشاد عرف نظم دلفروز ۔ دیوان محمد عبدالاحد شمشاد لکھنوی مطبوعہ مطبع انوار محمدی، لکھنؤ۔
۱۳۱۷

۱۸۷۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۶۷۔

۱۸۸۔ تذکرۂ نادر، ص ۱۳۶۔

۱۸۹۔ نساخ کے تذکرے میں ''سید انعام حسین اظہار نویس عدالت دیوانی لکھنؤ مجنوں تخلص'' کو میر رشک کا شاگرد لکھا ہے اور اسی بنیاد پر غالباً ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے بھی ان کو شاگردان رشک میں جگہ دی ہے (سخن شعرا ص ۴۱۴ ،لکھنؤ کا دبستان ص ۴۲۰) لیکن محسن نے ان کو ''شاگرد خواجہ وزیر وزیرؔ'' کہا ہے (سراپا سخن ص ۲۴۸)۔

۱۹۰۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۳۳۔

۱۹۱۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۶۵۔

۱۹۲۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۴۸۔

۱۹۳۔ سراپا سخن، ص ۲۳۲۔

۱۹۴۔ سخن شعرا، ص ۴۱۸۔

۱۹۵۔ سراپا سخن، ص ۵۔

۱۹۶۔ نشتر ص ۵ تا ۹ — اس کتاب میں مصنف نے پانچوں وقت کی نمازوں کا الگ الگ ذکر کیا ہے اور کہیں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے کہ وہ خود شیعہ تھا۔

۱۹۷۔ سراپا سخن — مجمل حال اپنا ص ۔

۱۹۸۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۵۱ تا ۳۵۲۔

۱۹۹۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۵۲ برحاشیہ۔

۲۰۰۔ سراپا سخن، ص ۱۶۳۔

۲۰۱۔ سراپا سخن — سبب تالیف ۔

۲۰۲۔ فہرست مخطوطات اردو رامپور (ج ۱ ص ۴۰۰)

۲۰۳۔ سخن شعرا، ص ۴۱۹۔

۲۰۴۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۲۸۔

۲۰۵۔ سراپا سخن، ص۲۰۳، ۲۳۲، ۳۲۴، ۳۷۱۔

۲۰۶۔ منتخب العالم، ص۲ تا ۷۔

۲۰۷۔ انتخاب یادگار، ص ۳۵۵۔

۲۰۸۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۶۶۔

۲۰۹۔ سراپا سخن، ص ۷۵۔

۲۱۰۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۲۰۔

۲۱۱۔ بحر الفصاحت، ص ۹۶۵۔

۲۱۲۔ سراپا سخن، ص ۹۶، ۲۰۵، ۲۱۷۔

۲۱۳۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۴۴۸ تا ۴۴۹ و حاشیہ ص ۴۴۸، ۴۴۹۔

۲۱۴۔ سراپا سخن، ص ۶۸، ۷۴۔

۲۱۵۔ تذکرۂ نادر، ص ۱۶۸۔

۲۱۶۔ سراپا سخن، ص ۲۴۷۔

۲۱۷۔ نساخ کے تذکرے میں ''دختر نواب معتمد الدولہ'' (سخن شعرا، ص ۵۳۷) لفظ ہمشیرہ سہواً چھوٹ گیا ہے۔

۲۱۸۔ خوش معرکہ ج ۲، ص ۳۵۷۔

۲۱۹۔ مفید الشعرا، ص۴۳، ۵۳۔

۲۲۰۔ سراپا سخن، ص ۳۳۰، ۳۸۵۔

۲۲۱۔ آب بقا، ص ۱۷۵۔

۲۲۲۔ آب بقا، ص ۱۴۱۔

پروفیسر لطیف اللہ☆

باسمہ تعالیٰ وبعونہ

حضرت سلطان المشائخ شیخ نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے سالِ ولادت کا تعیّن

استادِ مکرم ڈاکٹر اسلم فرخی نے صحیح فرمایا ہے کہ ''بیسویں صدی دراصل حضرت سلطانجیؒ کی بازیافت کی صدی ہے، عرفان نظام کی صدی ہے۔''(۱) بے شبہہ بیسویں صدی میں حضرت سلطان المشائخ شیخ نظام الدین محبوب الٰہی قدس سرّہٗ کی سیرتِ مبارکہ، اخلاق حمیدہ، نظامِ تربیت اور مسلکِ تصوف کے حوالے سے اس قدر تصانیف اور مضامین معرضِ تحریر میں آئے ہیں کہ اگر ان کا اشاریہ مرتب کیا جائے تو ایک مختصر تحقیقی مقالہ یقیناً ترتیب پا سکتا ہے۔

سرسری طور پر اگر ہم بیسویں صدی میں حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرّہٗ کی حیات مبارکہ پر مختلف جہتوں سے لکھنے والوں کو شمار کریں تو مندرجہ ذیل حضرات ہمارے حافظے میں نمایاں ہوں گے:

(۱) محمد سعید احمد مارہروی (حیاتِ خسروؒ کے حوالے سے)

(۲) مولوی یاسین علی نظامی (سیرتِ نظامی)

(۳)	خواجہ حسن نظامیؒ	(نظامی بنسری)
(۴)	مولانا ابوالحسن علی ندویؒ	(تاریخِ دعوت وعزیمت۔ جلد سوم)
(۵)	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ	(ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت۔ جلد دوم)
(۶)	پروفیسر محمد حبیب، علی گڑھ	(حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حیات اور تعلیمات)
(۷)	شیخ محمد اکرام	(آبِ کوثر)
(۸)	اخلاق حسین دہلوی	(حضرت محبوبِ الٰہیؒ اور دیگر مضامین)
(۹)	پروفیسر خلیق احمد نظامی	(متعدد کتابیں اور مضامین)
(۱۰)	ڈاکٹر اسلم فرخی	(متعدد کتابیں اور مضامین)
(۱۱)	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	(متعدد کتابیں اور مضامین)
(۱۲)	مولانا ابرار علی صدیقی بدایونی	(نظام الاولیاءؒ اور دیگر مضامین)

مذکورہ بزرگوں کے علاوہ برصغیرِ پاک و ہند میں حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرّہ کے حالات زندگی پر لکھنے والے دیگر حضرات بھی ہیں، جن کے اسمائے گرامی فی الوقت یاد نہیں آرہے لیکن یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ گزشتہ چھ صدیوں سے حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے بارے میں جو کچھ معرضِ تحریر میں آیا ہے، اگر اس کا موازنہ اس ایک صدی کی تصانیف اور تحریروں سے کیا جائے تو کیفیت اور کمیّت: دونوں اعتبار سے بیسویں صدی کا پلہ کئی گنا بھاری نظر آئے گا۔

بیسویں صدی کی اس ہمہ جہتی فوقیت اور برتری کے باوصف حضرت محبوبِ الٰہی کی حیاتِ مبارکہ کا ایک پہلو ابھی تشنۂ تحقیق ہے اور وہ ہے حضرت قدس سرّہ کے سالِ ولادت کا تعیّن۔ زیرِ نظر معروضات، حضرت قدس سرّہ کے اسی سوانحی پہلو پر ایک طالبِ علمانہ کوشش ہے۔ امید ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے بزرگ محققین اس جہت میں قدم بڑھا کر اپنے برگزیدہ علم وتحقیق کا حق ادا فرمائیں گے۔

جن حضرات نے اپنی تصانیف میں حضرت محبوب الٰہیؒ کا سال ولادت تحریر کیا ہے

یا ایسی عبارتیں درج کی ہیں، جن کی بنیاد پر بعد کے لوگوں نے حضرت قدس سرہٗ کے سالِ ولادت کا استخراج کیا ہے، وہ پانچ زمروں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی اجمالی کیفیت یہ ہے:

(۱) زمرۂ اوّل، ۶۳۱ھ:

مولوی رضی الدین فرشوری بدایونی نے اپنی تصنیف ''تذکرۃ الواصلین'' میں ۶۳۱ھ کو حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرہٗ کا سال ولادت قرار دیا ہے۔[۲]

ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم[۳] اور مولانا ابرار علی صدیقی بدایونی[۴] ۶۳۱ھ ہی کو حضرت محبوبِ الٰہی کا سالِ ولادت تسلیم کرتے ہیں۔

(۲) زمرۂ دوم، ۶۳۴ھ:

''تاریخ فرشتہ'' میں قاسم فرشتہ نے حضرت قدس سرہٗ کا سال ولادت ۶۳۴ھ تحریر کیا ہے (بحوالہ: طریقۂ چشتیہ در ہند و پاکستان۔ مصنفہ ڈاکٹر غلام علی آریا۔ چاپ اوّل، ۱۳۴۵ش، تہران، ص۱۳۰)

غلام سرور لاہوری نے لکھا ہے: ''شیخ نظام الدین اولیاءؒ در سال شش صدوسی و چار ہجری مقدس کہ سالِ وفات سلطان التمش و خواجہ قطب الدین بختیارؒ بود، متولد شد'' [شیخ نظام الدین اولیاءؒ سال چھ سو چونتیس ہجری مقدسہ میں جو سلطان التمش اور خواجہ قطب الدین بختیارؒ کا سال وفات تھا، پیدا ہوئے] (خزینۃ الاصفیا، جلد اول مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ ۱۸۷۳، ص۳۲۹۔ تاریخِ فرشتہ (فارسی) راقم کو دستیاب نہ ہوسکی، مجبوراً ثانوی حوالے پر اکتفا کرنا پڑا)۔

(۳) زمرۂ سوم، ۶۳۶ھ:

(الف) شیخ محمد بلاق دہلویؒ نے تحریر کیا ہے: ''نیز سیر الاولیاء کے مصنف نے ساتویں باب کے ہفتہ وار اور سالانہ اوراد کے نکتے میں بیان کیا ہے اور ثابت کیا ہے

کہ سلطان المشائخ کی ولادت آخری بدھ کو طلوع آفتاب کے بعد بتاریخ ۲۷/صفر سنہ چھ سو چھتیس میں ہوئی"۔ (ملاحظہ فرمائیں "مطلوب الطالبین" (فارسی) خطی نسخہ محفوظ در نیشنل میوزیم، کراچی، ص ۸۔ اردو ترجمہ از راقم السطور، ص۲۱) شیخ محمد بلاق دہلوی نے اس عبارت میں تحریف کی ہے جس کی تفصیل آیندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔

(ب) مولانا سیّد عبدالحئیؒ "نزہتہ الخواطر" ذکرِ سلطان المشائخؒ۔ ملاحظہ فرمائیں جلد دوم، ص ۱۶۲، اردو ترجمہ از ابو یحییٰ امام خاں نوشہری، لاہور، ۱۹۶۵۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے عطائے خلافت کا سال ۶۶۹ھ ہی تحریر فرمایا ہے۔ ص ۱۶۳۔

(ج) مولانا سیّد ابوالحسن ندویؒ: "۶۳۶ھ میں بدایوں میں آپ کی ولادت ہوئی۔" حاشیے میں تحریر فرمایا ہے: "صاحبِ سیر الاولیاء نے آپ کی عمر شریف کا حساب لگا کر اس سنہ کی تعیین کی ہے۔" ملاحظہ فرمائیں: "تاریخِ دعوت و عزیمت" حصۂ سوم۔ کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۵۲۔

(د) پروفیسر محمد حبیب مرحوم: "امیر خوردؒ نے شیخ نظام الدینؒ کا سالِ ولادت ۶۳۶ھ (مطابق ۹-۱۲۳۸ء) دیا ہے۔" ملاحظہ فرمائیں: "حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حیات اور تعلیمات" اشاعتِ اوّل، دہلی، ۱۹۷۲، ص ۲۴۔ پروفیسر محمد حبیب جیسے عظیم عالم اور محقق سے ۶۳۶ھ کو سالِ ولادت تحریر کرنے کی غلطی کس بنا پر واقع ہوئی، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

(ہ) شیخ محمد اکرام مرحوم نے کسی ماخذ کے حوالے کے بغیر تحریر کیا ہے کہ حضرت محبوب الٰہی قدس سرہٗ کی ولادت ۹- اکتوبر ۱۲۳۸/ ہفتہ ۲۷ صفر ۶۳۶ھ کو ہوئی (شیخ صاحب مرحوم نے عیسوی سنہ اور تاریخ قلم بند کی ہے۔ احقر راقم السطور نے ازروئے تقویم ہجری سنہ اور تاریخ بغرض آسانی تحریر کیے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں: "آبِ کوثر"، طبع ہشتم، لاہور، ۱۹۷۹ء)۔

(۴) زمرۂ چہارم:

ڈاکٹر خلیق احمد نظامی مرحوم نے حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا سال ولادت ۶۴۲ھ مطابق ۱۲۴۴ء تحریر کیا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: "THE LIFE AND TIMES OF SHAIKH NIZAM UD DIN AULIYA" اشاعتِ اوّل، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۴۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ایک کتاب زبانِ اردو میں ہے۔ اس میں سنہ ولادت ۴۱-۶۴۰ھ تحریر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: ''شیخ نظام الدین اولیاء''۔ دہلی، ص ۲۶ حاشیہ ا)۔ مفصل تنقیح آیندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔

(۵) زمرۂ پنجم:

استادِ مکرم ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے محولہ بالا مقالے میں ارشاداتِ محبوبیؒ کے حوالے سے حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا سال ولادت ۶۴۵ھ اور بابا فریدؒ کا سال وفات ۶۷۰ھ قرار دیا ہے (مکالمہ کراچی، شمارہ ۵، ص ۳۸ تا ۴۳)۔ اخلاق حسین دہلوی مرحوم نے بھی اپنی تصنیف میں ارشاداتِ محبوبیؒ کی بنیاد پر تفصیلی بحث کے بعد مذکورہ سنین ثابت کیے ہیں (ملاحظہ فرمائیں: ''حضرت محبوبِ الٰہیؒ''۔ لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۱۵ نیز ص ۳۵ تا ۳۷، حاشیہ ۲)۔ ان مباحث سے متعلق گزارشات آیندہ صفحات میں پیش کی جائیں گی، ان شاء اللہ۔

قبل اس کے کہ ہر زمرے کے نقطۂ نظر کی تنقیح کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیر الاولیاء اور فوائد الفوادؒ سے حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے ان ارشادات اور ملفوظات کو پیش کردیا جائے جو حضرت قدس سرّہٗ نے اپنے سوانح سے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ سوانح نگاری کے اصول کے مطابق پہلا درجۂ استناد صاحب سوانح کی ذاتی شہادت کو دیا جاتا ہے اور یہ ذاتی شہادت تو ایسی عظیم اور محبوب ہستی کی ہے، جو دیانت و امانت کا زندہ پیکر تھی، قدس سرّہٗ۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ جو ارشاداتِ محبوبی یہاں نقل کیے جا رہے ہیں، ان میں سے کسی ارشاد میں سال ولادت بیان نہیں کیا گیا ہے، صرف دن اور مہینے کا ذکر ہے لیکن ان سے حضرت قدس سرّہٗ کے

سالِ ولادت کے تعیّن کا کما حقہ، مواد دستیاب ہو جاتا ہے۔ احقر راقم السطور نے حضرت قدس سرہٗ کے ارشاداتِ گرامی کو ''ذاتی شہادت'' کا عنوان دیا ہے۔

پہلی ذاتی شہادت:

''می فرمود کہ روز چہار شنبۂ آخریں ماہ صفر قوی با برکت است، ہر کہ ہست دریں روز بدانچہ می تو اند طعام می کند و چیزے از خود جدا می کند۔ بفقرا می دہد و خوش می باشد و می فرمود کہ تولّد ایں ضعیف ہم دریں روز است۔''

(سیر الاولیاء (فارسی)، باب ہفتم: نکتہ در بیانِ اورادِ ہفتہ و سالینہ، ص ۳۹۷، لاہور، ۱۹۷۸)

(فرماتے تھے کہ ماہ صفر کا آخری چہار شنبہ قوی اور با برکت ہے۔ اس دن جس قدر ہو سکے کھانا محتاجوں کو کھلائے اور کچھ مال اپنے سے جدا کر کے ضرورت مندوں کو دے اور خوش رہے۔ فرماتے تھے کہ اس ضعیف کا تولّد اسی روز ہوا ہے)۔ (۵)

یہ ذاتی شہادت فوائد الفواد میں بھی دستیاب ہے:

''دولتِ پاے بوس حاصل گشت۔ پیش ازاں یک روز بندہ با اعزّ نصیر الدین محمود سلّمہ اللہ تعالیٰ کہ یکے از مریدان خوب اعتقاد است، مشورت کرد کہ فردا چہار شنبۂ آخرین است و خلق ایں روز رانحس می گیرند، بیا تا بخدمتِ خواجہ رویم ذکرہٗ اللہ بالخیر کہ آں جا ہمہ نحوستہا بہ سعادت بدل می شود۔ القصہ، بعد از مشورت چوں چہار شنبۂ مذکور شد، بندہ و او: ہر دو بخدمتِ خواجہ رفتیم ذکرہ اللہ بالخیر، و صورتِ حالِ اتفاقِ دینہ عرض افتاد۔ تبسّم فرمود و گفت آرے مردماں ایں روز رانحس می گیرند و نمی دانند کہ روزے بس باسعادت است، و امروز روزے عظیم مسعود است تا اگر فرزندے دریں روز زادہ شود،

او بزرگ شود''

(فوائد الفواد (فارسی)، جلد چہارم، مجلسِ چہارم، ص۲۰۵، لاہور ۱۹۶۶ء)

(پابوسی کی دولت حاصل ہوئی۔ اس سے ایک روز قبل بندے (حسن علا سجزیؒ) نے عزیز ترین نصیر الدین محمود سلمہ اللہ تعالیٰ سے، جو نیک اعتقاد مریدوں میں شامل ہیں، مشورہ کیا کہ کل آخری چہار شنبہ ہے۔ لوگ اس دن کو منحوس خیال کرتے ہیں۔ آیئے خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر کی خدمت میں چلیں کہ وہاں تمام نحوستیں سعادت میں بدل جاتی ہیں۔ القصہ مشورے کے بعد جب بدھ کا دن ہوا تو بندہ اور وہ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گزشتہ دن جو بات طے ہوئی تھی، عرض کی۔ آپ مسکرائے اور فرمایا: ہاں! لوگ اس دن کو نحس خیال کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ بہت ہی سعادتوں کا دن ہے اور آج بھی یہی بڑا مسعود دن ہے۔ یہاں تک کہ اگر اس دن کوئی لڑکا تولد ہو تو وہ بزرگ ہوتا ہے)۔ (۶)

دوسری ذاتی شہادت:

''سلطان المشائخ می فرمود، در انچہ خورد بودم بقدر دوازدہ سالہ کم یا بیش لغت می خواندم۔''

(سیر الاولیاء، باب اوّل، نکتۂ دوم، ص۱۱۰)

(سلطان المشائخ فرماتے تھے: میں ابھی کم عمر تھا۔ میری عمر بارہ سال ہوگی شاید کم ہو یا زیادہ ہو۔ میں علمِ لغت پڑھ رہا تھا۔) (۷)

فوائد الفواد کا ملفوظِ گرامی یہ ہے:

''فرمود کہ من بقدر دوازدہ سالہ بودم کم و بیش لغت می خواندم

(فوائد الفواد۔ جلد چہارم، مجلسِ بست و دوم، ص۲۵۲)

(فرمایا کہ میں کم و بیش بقدر بارہ سال کا تھا تو علم لغت پڑھ رہا تھا۔)(۸)

تیسری ذاتی شہادت:

''بعد ازاں چوں شانزدہ سالہ شدم، عزیمتِ دہلی شد۔ پیرے عزیزے عوض نام ہمراہ شد۔''

(سیر الاولیاء، باب اول، نکتہ دوم، ص ۱۱۰)

(اس کے بعد جب میں سولہ سال کا ہوا تو دہلی کا سفر کیا۔ ایک بوڑھے بزرگ، جن کا نام عوض تھا، شریک سفر تھے)۔(۹)

چوتھی ذاتی شہادت:

''از سلطان المشائخؒ پرسیدند کہ شما چند سالہ بودید کہ بدولت ارادت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدّین طیب اللہ مرقدہ مشرف شدید، فرمود بیست سالہ۔ بعد ازاں بخدمتِ شیخ شیوخ العالم عرض داشت کردم۔ فرمانِ شیخ چیست؟ ترک تعلم گیرم و بہ اوراد و نوافل مشغول شوم۔ شیخ شیوخ العالم فرمود کہ من کسے را از تعلم منع نہ کنم۔ آں ہم کن ایں ہم کن تا غالب کہ آید، درویشے را قدرے علم باید۔''

(سیر الاولیاء، باب اوّل، نکتہ پنجم، ص ۱۱۷)

(لوگوں نے سلطان المشائخؒ سے دریافت کیا کہ جب آپ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدّین طیب اللہ مرقدہ کی دولتِ ارادت سے مشرف ہوئے تو کتنے سال کے تھے؟ فرمایا: بیس سال کا۔ بعد ازاں میں نے شیخ شیوخ العالم کی خدمت میں عرض کیا: شیخ کا فرمان کیا ہے؟ سلسلہ تعلیم ترک کر دوں اوراد و نوافل میں مشغول ہو جاؤں؟

شیخ شیوخ العالم نے فرمایا کہ میں کسی کو تعلیم حاصل کرنے سے منع نہیں کرتا ۔ وہ بھی کرو، یہ بھی کرو، پھر جو بھی غالب آجائے۔ درویش کے لیے کسی قدر علم بھی ضروری ہے)۔(۱۰)

پانچویں ذاتی شہادت :

''سلطان المشائخؒ بہ قلم مبارک خود بشتہ است کہ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدّین قدس اللہ سرّہٗ العزیز کہ کاتبِ حروف را بخواند در روزِ آدینہ بعد از فراغِ نماز، بیست و پنجم ماہ جمادی الاول سنہ تسع و ستین وستمایتہ لعاب از دہنِ مبارک دردہنِ کاتب کرد و وصیت فرمود بحفظِ کلام اللہ المجید رزقہ اللہ تعالیٰ و شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدّین فرمود : نظام! گفتم لبیک! خواجہ گفت: دین و دنیا ترا دادہ اند، ایں جاہمہ اینست ، برو ملک ہند گیر۔ .... در غرّہ مبارک شعبان سنہ تسع وستین وستماۃ از حضرت شیخ شیوخ العالم قدس اللہ سرّہٗ العزیز التماس نمودہ آمد۔ شیخ شیوخ العالم بہ اجابت و مدد فاتحہ مقرون فرمود از برائے آں کہ کاتب در بدرِ خلق نہ گردد۔''

(سیر الاولیاء، بابِ اول، نکتۂ ہشتم، ص ۱۳۲)

(سلطان المشائخؒ نے اپنے قلم مبارک سے تحریر کیا ہے کہ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدّین قدس اللہ سرّہٗ العزیز نے کاتبِ حروف کو جمعے کے دن بعدِ نماز بلایا۔ جمادی الاول سنہ چھ سو انہتر (۶۶۹) کی پچیسویں تاریخ تھی۔ کاتب کے منہ میں اپنے دہنِ مبارک کا لعاب ملا اور قرآن مجید کے حفظ کرنے کی وصیت فرمائی، اللہ تعالیٰ روزی فرمائے، پھر شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدّین نے فرمایا: نظام! میں نے عرض کیا: لبیک! خواجہ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ نے) تجھے دین اور

دنیا عطا کیے ہیں۔ سب کچھ یہی ہے۔ جا اور ملک ہند پر قبضہ کر .... شعبان المبارک سنہ چھ سو انہتر (۶۶۹) کی پہلی تاریخ کو میں نے ایک عرض پیش کی۔ شیخ شیوخ العالم نے اس امر کے لیے کہ کاتب در بدرِ خلق نہ ہو، اجابت اور مدد فاتحہ سے سرفراز فرمایا۔''(۱۱)

چھٹی ذاتی شہادت:

''سہ کرّت از دہلی بخدمتِ شیخ شیوخ العالم رفتم، بعدہٗ یک روز خواجہ طلبید، سیز دہم ماہِ رمضان سنہ تسع و ستین و ستماۃ بود و فرمود کہ نظام! یاد داری آں کہ گفتہ بودم۔ گفتم: آرے۔ فرمود کہ کاغذ بیارید اجازت نامہ بنویسید کاغذ آوردند، اجازت نامہ نبشتند۔''

(سیر الاولیاء، بابِ اوّل، نکتۂ ہشتم، ص ۱۲۶)

(میں تین بار دہلی سے شیخ شیوخ العالم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے بعد ایک روز خواجہ نے مجھے طلب فرمایا، رمضان چھ سو انہتر کی تیرھویں تاریخ تھی، اور فرمایا: اے نظام! تمھیں وہ بات یاد ہے جو میں نے کہی تھی۔ میں نے عرض کیا: جی ہاں! حکم فرمایا کہ کاغذ لائیں اور اجازت نامہ تحریر کریں، چناں چہ کاغذ لائے اور اجازت نامہ تحریر کیا)۔(۱۲)

''بر لفظ مبارک راند کہ من سہ کرّت بخدمت شیخ الاسلام فرید الحق والدّین قدّس اللہ سرّہٗ العزیز رفتہ ام ہر سال یک بار، بعد ازاں کہ نقل فرمود ہفت بار دیگر رفتہ شدہ است یا شش بار نیکو یاد نماندہ اما اغلب گمان آنست کہ ہفت بار رفتہ شدہ است چناں کہ در خاطر ہم چناں مقرر است کہ در حیات و ممات دہ بار رفتہ شدہ است۔''

(فوائد الفواد، جلد دوم، مجلس دوم، ص ۷۰)

(زبانِ مبارک سے ارشاد ہوا کہ میں تین بار شیخ الاسلام فرید الحق والدّین قدس اللہ سرّہٗ العزیز کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ہر سال ایک بار۔ حضرت کے انتقال کے بعد سات بار اور گیا ہوں یا چھ بار، ٹھیک سے یاد نہیں لیکن غالب گمان یہی ہے کہ سات بار گیا ہوں، چناں چہ میرے دل میں یہی بات جمی ہوئی ہے کہ میں شیخ کی حیات میں اور انتقال کے بعد کل دس بار (اجودھن) گیا ہوں)۔ [۱۳]

ساتویں ذاتی شہادت :

''دریں میاں بندہ عرض داشت کرد کہ شما وقتِ نقل شیخ حاضر بودہ اید؟ چشم پُر آب کرد و فرمود کہ خیر! مرادر ماہ شوّال بدہلی فرستادہ بود۔ نقل ایشاں در شبِ پنجم ماہِ محرم بودہ است۔''

(فوائد الفواد، جلد دوم، مجلسِ ہشتم، ص ۸۸)

(اس گفتگو کے دوران بندے (حسن علا سجزیؒ) نے عرض کیا: کیا آپ شیخ کے انتقال کے وقت موجود تھے؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فرمایا کہ میں موجود نہیں تھا، مجھے شوال کے مہینے میں ہی دہلی بھیج دیا تھا۔ خواجہ کا انتقال ماہ محرم کی پانچویں شب میں ہوا تھا)۔ [۱۴]

الحاقی عبارتیں :

حضرت محبوب الٰہی قدس سرّہٗ کی مذکورہ بالا ذاتی شہادتوں کے بعد دو الحاقی عبارتوں کا ذکر ضروری ہے۔ ایک الحاق تو اس مخطوطے میں ہوا ہے، جس سے چرنجی لال ایڈیشن کی

طباعت عمل میں آئی۔ اس عبارت کا دوسرے خطی نسخوں میں منقول نہ ہونا، اس کے الحاقی ہونے کا کامل ثبوت ہے۔ سیر الاولیاء (فارسی) کا ایک قدیم مخطوطہ نیشنل میوزیم، کراچی میں محفوظ ہے۔ اس میں یہ الحاقی اور جعلی عبارت سرے سے موجود ہی نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں مذکورہ خطی نسخہ ورق ۵۷ الف آخری سطر اور ۵۷ ب پہلی سطر۔ چرنجی لال ایڈیشن میں یہ الحاقی عبارت ''در لحذ شیخ خرج شد طیب اللہ مرقدہ وجعل حظیرۃ القدس مثواہ'' کے جملے کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ پوری الحاقی عبارت یہ ہے:

''پوشیدہ نماند کہ تولّد حضرت شیخ الشیوخ فرید الحق والدّین مسعود گنج شکر در سنہ ۵۶۹ پانصدو شصت ونہ بود و وفات حضرت ایشاں درشش صدو شصت و چہار بود۔ عمرِ حضرتِ ایشاں نود و پنج (۹۵) باشد۔ واللہ اعلم۔''

(سیر الاولیاء، (چرنجی لال ایڈیشن)، ص ۱۰۱)

(واضح ہو کہ حضرت شیخ الشیوخ فرید الحق والدّین مسعود گنج شکر کی ولادت سنہ ۵۶۹ پانچ سو انہتر میں ہوئی اور آپ کی وفات چھ سو چونسٹھ میں ہوئی۔ حضرتِ ایشاں کی عمر پچانوے (۹۵) سال ہو گی۔ واللہ اعلم۔)(۱۵)

دوسرا الحاق غلام احمد خاں بریاں نے سیر الاولیاء کے اردو ترجمے کے متن میں کیا ہے۔ اس الحاق کی اصل فارسی عبارت نہ چرنجی لال کے فارسی ایڈیشن میں ہے اور نہ اس مخطوطے میں ہے جو نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: سیر الاولیاء، (فارسی) ص ۱۶۴ اور مخطوطۂ کراچی، ص ۹۳ سطر ۲۔ غلام احمد خاں بریاں کی الحاقی عبارت اس شعر کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ (اردو ترجمہ بریاں، ص ۱۶۲)

ز روشنائیِ صحن و ہوائے او در دل
ہمی نماید اسرارِ غیب پوشیدہ

''واضح ہو کہ جناب سلطان المشائخ قدس سرّہٗ رجب کی پندرھویں

تاریخ ۶۵۵ھ میں شیخ شیوخ العالمؒ کی شرف ارادت سے مشرف ہوئے۔ اس وقت آپ کی بیس سال عمر تھی۔ آپ کی ولادت ۶۳۶ ہجری میں ہوئی اور انتقال ۷۲۵ھ میں، اور جس وقت آپ کا انتقال ہوا، اس وقت آپ کی عمر ۸۹ برس کی تھی۔''

(سیر الاولیاء، (اردو ترجمہ) از غلام احمد خاں بریاں، لاہور، ۱۹۷۸، ص ۱۶۲)

شیخ محمد بلاق دہلوی کی تحریف:

غلام احمد خاں بریاں کی مذکورہ بالا الحاقی عبارت کی اصل غالباً شیخ محمد بلاق کی یہ تحریف ہے، جو انھوں نے سیر الاولیاء کے حوالے سے اپنی تصنیف ''مطلوب الطالبین کے مطلبِ اوّل میں کی ہے:

''نیز سیر الاولیا کے مصنف نے ساتویں باب کے ہفتہ وار اور سالانہ اوراد کے نکتے میں بیان کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ سلطان المشائخؒ کی ولادت آخری بدھ کو طلوع آفتاب کے بعد بتاریخ ۲۷ صفر سنہ چھ سو چھتیس میں ہوئی۔''

(مطلوب الطالبین (فارسی) ص ۸، مخطوطہ نیشنل میوزیم کراچی
اردو ترجمہ از لطیف اللہ، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۱)

امیر خورد کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے سیر الاولیاء میں صرف اسی قدر تحریر کیا ہے جس قدر حضرت محبوب الٰہی قدس سرّہ نے اپنی زبان مبارک سے فرمایا ہے۔ حضرت قدس سرّہ نے اپنی ولادت مبارکہ کا صرف دن اور مہینا ظاہر فرمایا ہے۔ تاریخ اور سنہ کا ذکر نہیں کیا۔ امیر خورد کرمانی نے یہی ملفوظِ گرامی بابِ ہفتم نکتہ اوراد ہفتہ و سالینہ میں نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں مضمون ہذا میں پہلی ذاتی شہادت)، چناں چہ مذکورہ دو الحاقی تحریروں اور شیخ محمد بلاق کی اس تحریف نے اکثر لکھنے والوں کو غلط فہمی کا شکار بنایا۔ قارئین آیندہ صفحات میں اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں گے۔

حضرت محبوب الٰہی قدس سرّہ کی ذاتی شہادتوں ، سیر الاولیاء میں الحاق کردہ عبارتوں اور تحریفوں کی نشان دہی کے بعد ہر زمرے کے بیان کردہ سالِ ولادت کی تنقیح پیش کی جاتی ہے۔

(۱) زمرۂ اوّل نے حضرت قدس سرّہٗ کا سالِ ولادت ۶۳۱ھ قرار دیا ہے (اس سال آخری چہار شنبہ پچیس صفر کو تھا)۔ مولوی رضی الدین فرشوری بدایونی اور مولانا ابرار علی صدیقی بدایونی نے ۶۳۱ھ کو سال ولادت تسلیم کرنے پر دلائل دیے ہیں۔ مولانا موصوف نے اپنے دلائل میں فرشوری صاحب کے نقطۂ نظر کو بھی شامل کیا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زمرۂ اول کی تنقیح کے سلسلے میں مولانا ابرار علی صدیقی کے بیانات کے مطالعے تک اکتفا کیا جائے۔

مولانا موصوف نے حضرت محبوب الٰہی قدس سرّہٗ کے سوانح پر ایک تصنیف ''نظام الاولیاؒ'' کے نام سے تحریر فرمائی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے ان مقالات کو بھی شامل کر دیا ہے، جو مجلہ بدایوں، کراچی میں قسط وار شایع ہوئے۔ یہ کتاب کراچی سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی۔ مولانا موصوف نے ''تحقیقِ سال پیدائش'' کے زیرعنوان مندرجہ ذیل نکات پیش کیے ہیں: (ص ۲۴)

۱- اس تناظر میں یہ باور کرنا محال ہے کہ حضرت محبوبِ الٰہی صاحب جب پہلی مرتبہ اجودھن پہنچے اور بابا صاحب کے مرید ہوئے تو بیس سال کے تھے اور جب بداؤں سے دہلی تشریف لائے تو حضرت کی عمر سولہ سال تھی۔ اس روایت کی پوری ذمہ داری امیر خورد کرمانی پر ہے ورنہ حضرت محبوب الٰہی صاحب کے بیان اور تحریر میں تضاد کا ہونا خارج از امکان ہے۔ (ص ۲۸)

۲- امیر خورد کرمانی کے نزدیک حضرت محبوب الٰہی صاحب کا سنہِ پیدائش ۶۳۶ھ ہے۔ انھی کی روایت کے مطابق حضرت محبوب الٰہی صاحب بعمر بیس سال پہلی بار اجودھن گئے اور بابا صاحب کے مرید ہوئے، یعنی ۶۵۶

ہجری میں۔ تین بار بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آخری اور تیسری مرتبہ حاضری کے زمانے میں خلافت ملی، یعنی ٦٦٠ ہجری میں لہٰذا اس تفصیل کے پیشِ نظر ۵- محرم ٦٦١ ہجری بابا صاحب کی وفات کا سال تسلیم کرنا پڑے گا جو حضرت محبوب الٰہی صاحب کے تحریر کیے ہوئے خلافت ملنے والے سال سے نو برس پہلے ہی گزر چکا تھا، پس ثابت ہوا کہ سولہ سال اور بیس سال کی عمر والی روایت کسی طور پر قرینِ صحت اور قابلِ اعتنا نہیں۔ (ص ۲۸، ۲۹)

مذکورہ بالا نکات سے مولانا ابرار علی صدیقی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت محبوب الٰہی قدس سرہٗ کی دہلی میں بعمر سولہ سال آمد اور بعمر بیس سال اجودھن کی حاضری معتبر شہادتیں نہیں ہیں لیکن وہ ان شہادتوں کو نامعتبر ثابت کرنے میں ناکام رہے۔ تردیدی جملوں سے کوئی شہادت ساقط نہیں ہوتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسے عصری شواہد پیش کیے جائیں جو محلِ نظر عصری شہادت کی فی الحقیقت تردید کرتے ہوں۔

مولانا موصوف نے اپنے دوسرے نکتے میں غلام احمد خاں بریاں کی ایک الحاقی عبارت کو (جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے) اپنی دلیل کی بنیاد بنا کر اس الحاق کو امیر خورد کرمانیؒ کے کھاتے میں ڈال دیا ہے، جب کہ امیر خورد کرمانی نے ''سیر الاولیا'' میں کسی مقام پر حضرت محبوب الٰہی قدس سرہٗ کا سال ولادت ٦٣٦ھ بیان نہیں کیا۔ (ملاحظہ فرمائیں مضمون ہذا میں ذیلی عنوان ''الحاقی عبارتیں'') اس تحریف اور الحاق کا نامناسب عمل پہلے شیخ محمد بلاق دہلوی اور پھر غلام احمد خاں بریاں سے سرزد ہوا ہے، حضرت امیر خورد کرمانی رحمۃ اللہ علیہ ان غلطیوں سے بری الذمہ ہیں۔ اگر مولانا موصوف تحقیق کی غرض سے مطبوعہ سیر الاولیاء (فارسی) اور دیگر خطی نسخوں کا مطالعہ فرما لیتے تو غلام احمد خاں بریاں کا الحاق نظر آجاتا اور وہ ایسی بے اصل و اساس تنقید سے مانع رہتے۔

اگر مولانا موصوف کا موقف یہ ہے کہ سولہ اور بیس سال کی ذاتی شہادتیں دوسرے عصری مآخذ سے موید نہیں ہیں، تو یہ دلیل ''سیر الاولیاء'' کے مذکورہ مندرجات کو بنی برحق

تسلیم کرنے میں مانع نہیں ہوتی۔ امیر خورد کرمانیؒ حضرت محبوب الٰہی قدس سرّہٗ کے مرید تھے۔ انھوں نے تین ذریعوں سے معلومات فراہم کر کے حضرت قدس سرّہٗ کے سوانح مرتب کیے ہیں، کچھ باتیں اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں، کچھ اپنے خاندان کے بزرگوں اور حضرت قدس سرہٗ کے یارانِ خاص سے معلوم کی ہیں، کچھ معلومات حضرت قدس سرہٗ کے قلم مبارک سے لکھی ہوئی یاد داشتوں سے حاصل کی ہیں۔ سیر الاولیاء میں ان تینوں ذرائع کے حوالے جگہ جگہ منقول ہوئے ہیں۔ ایسے باخبر معاصر کی تحریروں کو غیر معتبر گمان کرنا علمی دنیا میں روا نہیں رکھا جاتا، تا وقتیکہ اپنے گمان کو عصری شواہد سے ثابت نہ کیا جائے۔ چوں کہ ''سیر الاولیاء'' میں ایسا کوئی نقص سرے سے موجود نہیں ہے، اس لیے آٹھویں صدی ہجری سے آج تک کسی مصنف نے اس کے استناد پر شبہے کا اظہار نہیں کیا۔ چنانچہ امیر خورد کرمانیؒ کی اس خبرِ واحد کو، کہ حضرت محبوب الٰہی قدس سرّہٗ سولہ سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے اور بیس سال کی عمر میں اجودھن حاضر ہوئے، تسلیم کرنے میں کون سا امر مانع ہے۔ مثال کے طور پر ''خیر المجالس'' چھپنویں مجلس میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے حضرت محبوب الٰہی قدس سرّہٗ کی بدایوں میں دستار بندی کی مجلس کی جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں، وہ نہ سیر الاولیاء میں بیان کی گئی ہیں، نہ فوائد الفواد میں قلم بند ہوئی ہیں لیکن ان کے سچ ہونے میں کسی کو شبہہ نہیں ہے کیوں کہ مذکورہ واقعے میں علی مولا بزرگ کے دو ہندی جملے: ''ارے مولانا! یہ بڈا ہوسی'' اور ''جو منڈا سا باندھے سو پائن پسرے'' پورے واقعے کے مبنی برحق ہونے کی دلیل ہیں۔ اسے اصطلاح میں داخلی شہادت کہتے ہیں، جو کسی صورت رد کرنے سے رد نہیں ہوتی۔

(ملاحظہ فرمائیں خیر المجالس (فارسی)، مجلسِ پنجاہ و ششم، ص۱۹۱، علی گڑھ، سال ندارد)

اسی طرح حضرت محبوب الٰہی قدس سرّہٗ کی بعمر سولہ سال دہلی میں آمد اور بعمر بیس سال اجودھن حاضری کے بیان کی ساخت اور ترکیب پر غور کیا جائے تو اس بیان میں داخلی شہادت عکس ریز محسوس ہو گی۔ دونوں ارشادات صیغۂ واحد متکلم میں تحریر ہوتے ہیں جب کہ ''روایت'' اکثر و بیشتر صیغۂ واحد غائب یا جمع غائب میں بیان کی جاتی ہے۔ علاوہ

ازیں بیس سال والی ذاتی شہادت ''فرمایا بیس سال کا'' کے بعد بھی مسلسل جاری ہے اور واحد متکلم کے صیغے میں ہے (ملاحظہ فرمائیں مضمون ہذا میں تیسری اور چوتھی ذاتی شہادت)۔ یہ سادہ کلمات ایک نوعمر تازہ دست گرفتہ کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں، چونتیس سال کے متعلم کا یہ لہجہ ہونا ناممکن ہے۔

مولانا ابرار علی صدیقی نے بذات خود اور مولوی رضی الدین فرشوری کی تحقیق کے بعد یہ تجزیہ پیش کیا ہے:

۱- سالِ ولادت ۶۳۱ھ (آخری چہار شنبہ، ۲۵ صفر)

(نظام الاولیاء ص ۲۹، ۳۰)

۲- دہلی میں آمد ۶۶۱ھ بعمر تیس سال (نظام الاولیاء، ص ۳۰)

۳- اجودھن پہلی حاضری ۶۶۵ھ بعمر چونتیس سال (نظام الاولیاء، ص ۳۰)

۴- عطائے خلافت ۶۶۹ھ بعمر اڑتیس سال (نظام الاولیاء، ص ۳۰)

یہ تحقیق تیسری اور چوتھی ذاتی شہادتوں سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ اس سے دوسری ذاتی شہادت کی بھی ایک درجے میں نفی ہوتی ہے۔ دوسری ذاتی شہادت یہ ہے:

''میری عمر بارہ سال کی ہوگی، شاید کم ہو یا زیادہ ہو، میں علمِ لغت پڑھ رہا تھا''

مولانا موصوف کے حساب سے یہ سنہ ۶۴۳ھ ہونا چاہیے، پھر قدوری ختم کرنے اور دستار بندی کا سنہ زیادہ سے زیادہ ۶۴۶ ھ ہو گا۔ دہلی تشریف آوری کا سنہ ان کے حساب سے ۶۶۱ھ ہے۔ سوال یہ ہے کہ سنہ ۶۴۶ھ سے ۶۶۱ھ، پندرہ سال تک بدایوں میں حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرہٗ کس مصروفیت میں رہے۔ مزید تعلیم تو حضرتِ اقدسؒ نے دہلی میں تشریف لانے کے بعد حاصل کی۔ اس پندرہ سال کے طویل عرصے کی خلیج کس طرح پر کی جائے؟ مولانا کی تصنیف ''نظام الاولیاء'' اس سوال اور اس کے جواب سے خالی ہے۔ حقائق تسلیم نہ کرنے سے اسی قسم کی گرہیں پڑتی ہیں جو کسی ناخن سے بھی وا نہیں ہوتیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ زمرۂ اوّل کا نقطۂ نظر ارشاداتِ محبوبی سے مطابقت نہیں رکھتا، اس لیے یہ کہنا کہ حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرّہٗ کا سال ولادت ۶۳۱ ھ ہے، کسی طرح بھی قابلِ اعتنا نہیں۔

(۲) زمرۂ دوم: ۶۳۴ ہجری = (ازروئے تقویم اس سال یکم صفر بروز ہفتہ تھی اور آخری چہار شنبہ چھبیس صفر کو تھا)۔ اس زمرے میں قاسم فرشتہ نے ''تاریخ فرشتہ'' میں اور غلام سرور لاہوری نے ''خزینۃ الاصفیا'' میں ۶۳۴ ھ کو حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرّہٗ کا سال ولادت قرار دیا ہے۔ جیسا کہ راقم گزشتہ صفحات میں عرض کر چکا ہے کہ تاریخِ فرشتہ کا فارسی نسخہ احقر کو دستیاب نہ ہو سکا، اس لیے اس کے ماخذ کے بارے سردست تحقیق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ غلام سرور لاہوری کی تصنیف خزینۃ الاصفیا احقر کی نظر سے گزری ہے۔ انھوں نے سالِ ولادت کی عبارت میں کسی ماخذ کی نشان دہی نہیں کی ہے، اس لیے ایسی مجہول روایت پر کسی طرح اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ سنہ ۶۳۴ ہجری حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرّہٗ کی ذاتی شہادتوں کے مطابق نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ سنہ یعنی ۶۳۴ ہجری کو حضرت قدس سرّہٗ کا سالِ ولادت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(۳) زمرۂ سوم: ۶۳۶ ہجری = (ازروئے تقویم اس سال یکم صفر کو پیر اور آخری چہار شنبہ ۲۴- صفر کو تھا)۔ اس زمرے میں سب سے پہلے عہدِ عالم گیری کے ایک بزرگ محمد بلاق دہلوی کا نام آتا ہے جنھوں نے حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرّہٗ کی ایک سوانح عمری ''مطلوب الطالبین'' کے نام سے ۱۱۱۱ ہجری میں مرتب کی۔ اس تصنیف میں شیخ محمد بلاق نے متعدد مقامات پر تحریفات کی ہیں۔ اب یہ علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے کہ انھوں نے کس باعث سیر الاولیاء کے حوالے سے اپنی تصنیف میں یہ تحریفات روا رکھیں(۱۶) لیکن سنہ ۶۳۶ ہجری والی تحریف تو سامنے کی بات ہے کہ امیر خورد کرمانیؒ نے سیر الاولیاء میں کہیں بھی حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرّہٗ کا سالِ ولادت تحریر نہیں کیا کیوں کہ حضرت قدس سرّہٗ نے نہ اپنے کسی ملفوظ میں ارشاد فرمایا تھا اور نہ اپنی قلم مبارک سے کسی یادداشت میں تحریر فرمایا تھا، لیکن شیخ محمد بلاق نے سالِ ولادت ۶۳۶ ہجری امیر خورد کے کھاتے میں ڈال دیا۔

ملاحظہ فرمائیں مضمون ہذا میں پہلی ذاتی شہادت اور مطلوب الطالبین (اردو ترجمہ)، مطلبِ اول، ص ۲۱ اور حاشیہ ۱۲ ص ۲۸-۲۹۔

شیخ محمد بلاق دہلوی کے علاوہ اس زمرے میں مولانا سیّد عبدالحیؒ، مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ، پروفیسر محمد حبیب اور شیخ محمد اکرام جیسے ارباب فضل وکمال شامل ہیں، جو اپنوں کے قبلۂ دیدہ و دل تھے ہی، بیگانے بھی ان کے علم وفضل کے معترف ہیں۔ ان بزرگوں نے حضرت محبوب الٰہی قدس سرّہٗ کی حیاتِ مبارکہ کے جن پہلوؤں کو اجاگر کیا، غالبًا ان کی جانب کامل طور پر متوجہ رہنے کے باعث وہ حضرت قدس سرّہٗ کے سال ولادت کی صحت اور عدم صحت کو پیشِ نظر نہ رکھ سکے۔ دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ سیر الاولیاء کے فارسی نسخے کی نایابی کے باعث انھوں نے سال ولادت سے متعلق سیر الاولیاء کے اردو ترجمے کی اطلاع کو کافی جانا، جو مستند شواہد سے الحاق ثابت ہو چکی ہے۔ راقم السطور کا یہ قیاس بے جا نہیں ہے بلکہ یہ نتیجہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم کی بعض عبارتوں سے ہوتا ہے، جو انھوں نے اپنی تصنیف میں درج کی ہیں۔ یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

> ''سیر الاولیاء کے فارسی نسخے کو شعبان ۱۳۰۲ھ (مطابق مئی ۱۸۸۴ء) میں لالہ چرنجی لال مالک و مہتمم مطبع محبِّ ہند، فیض بازار، دہلی نے شائع کیا تھا۔ اب یہ چھپی ہوئی کتاب کہیں نہیں ملتی ہے اور اس کا کاغذ بھی اس قدر خراب ہو گیا ہے کہ موڑنے سے پھٹ جاتا ہے۔ سیر الاولیاء فارسی کا صحیح نسخہ چھاپنا بہت ضروری ہے۔''(۱۷)

اسی صفحے پر حاشیہ ۱ میں یہ عبارت ہے:

> ''سیر الاولیاء (مطبوعہ چرنجی لال) کی ایک جلد مسلم یونیورسٹی لائبریری میں تھی۔ میں نے اس کو تین چار دفعہ پڑھا لیکن ہر صفحہ الٹنے سے پھٹ جاتا تھا، اس لیے کتاب بیکار ہوگئی۔ پروفیسر نظامی صاحب کے پاس سیر الاولیاء کا نسخہ ہے اور انھوں نے یہ کتاب تیار

کرنے کے لیے مجھے اپنی کتاب مستعار دی ہے لیکن میں اس کو استعمال کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ کہیں کہیں میں نے مولانا غلام احمد خاں بریاں کا ترجمہ استعمال کیا ہے۔''

اسی نوع کی دوسری دقتیں دیگر حضرات کو بھی پیش آئی ہوں گی، چناں چہ قیاس کہتا ہے کہ زمرۂ سوم نے سالِ ولادت سنہ ۶۳۶ھ اسی اردو ترجمے سے اخذ کیا ہے۔ کاش مولانا غلام احمد خاں بریاں اپنے قیاس کو سیر الاولیاء کا متن اور عبارت نہ بناتے اور اسے علٰحدہ حاشیے میں تحریر کرتے تو یقیناً بیسویں صدی کے یہ قابلِ احترام مصنفین ان کی بے احتیاطی کا ہدف نہ بنتے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ شیخ محمد بلاق دہلوی اور غلام احمد خاں بریاں کے زیر اثر جن حضرات نے حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا سال ولادت ۶۳۶ ہجری تحریر کیا ہے، وہ حضرت قدس سرّہٗ کے ارشادات (پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی ذاتی شہادت) کے مطابق درست ہے۔

(۴) زمرۂ چہارم: ۶۴۲ ہجری = (اس سال یکم صفر ہفتے کو اور آخری چہار شنبہ چھبیس صفر کو تھا)۔ زمرۂ چہارم میں ڈاکٹر خلیق احمد نظامی مرحوم واحد محقق ہیں جو ۶۴۲ھ کو حضرت قدس سرّہٗ کا سالِ ولادت قرار دیتے ہیں ۔ تاریخ اور سنین سے متعلق ڈاکٹر صاحب مرحوم کی تحریریں خاصی پیچیدہ اور الجھن میں ڈالنے والی ہیں۔ انھوں نے اپنی اردو تصنیف ''شیخ نظام الدین اولیاء'' (دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۶، حاشیہ ۱) میں حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا سالِ ولادت ۶۴۰ھ بتایا ہے جب کہ انگریزی تصنیف *The life and Times of Shaikh Nizam ud din Auliya* (دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۴) میں ۶۴۲ھ درج کیا ہے۔ راقم نے بعد کی تصنیف میں اندراج کو ان کا درست نقطۂ نظر فرض کیا ہے۔ اس تصنیف میں ص ۱۴ کے حاشیے ۸ کی عبارت یہ ہے:

"Shaikh Nizam ud din went to Ajodhan to see Baba Farid when he was twenty year of age. He

visited his spirtual mentor three times, one every year, before he breathed his last in 664/ 1265. Calculated on this the date of his birth would be 642 /1244."

(شیخ نظام الدینؒ، بابا فرید کی خدمت میں اجودھن اس وقت حاضر ہوئے جب ان کی عمر بیس سال تھی۔ وہ اپنے روحانی مرشد کی خدمت میں تین بار سال بسال ان کے انتقال ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء سے قبل حاضر ہوئے۔ اس بنیاد پر حساب لگانے سے شیخ نظام الدینؒ کی تاریخِ پیدائش سنہ ۶۴۲ھ/۱۲۴۴ء ہوتی ہے)۔(۱۸)

صفحہ ۴۹ پر یہ عبارت ہے:

"On 13 Ramzan 664/1265 Shaikh Farid granted him on Ijazat Namah certificate permitting to enrol discipls."

''۱۳ رمضان ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء کو شیخ فرید نے انھیں ایک اجازت نامہ عطا کیا، یعنی تصدیق نامہ کہ وہ لوگوں کو اپنا مرید بنا سکتے ہیں۔''(۱۹)

• حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرّہٗ کے ایک ملفوظِ گرامی کے مطابق بابا فرید قدس سرّہٗ کا وصال ماہ محرم کی پانچویں شب میں ہوا تھا (ساتویں ذاتی شہادت بحوالہ فوائد الفواد، جلد دوم، مجلس ہشتم، ص ۸۸) سنہ ۶۶۴ ہجری میں بابا صاحبؒ کے انتقال کا مطلب ہے کہ انھوں نے پانچ محرم ۶۶۴ ھ میں وفات پائی۔ اس صورت میں ۱۳/ رمضان ۶۶۴ھ، کو جو ۵/محرم ۶۶۴ ھ کے سات ماہ بعد آتا ہے، عطائے خلافت کو کس طرح تطبیق کی جائے گی۔ وصال کے بعد عطائے خلافت کا واقعہ قطعی طور پر ناممکن ہے۔ عیسوی سنہ میں بھی اسی طرح کی پیچیدگی ہے۔ عیسوی سال ۱۲۶۵ء، ربیع الاول ۶۶۴ ھ کی اکیس تاریخ کو ختم ہو چکا تھا۔

۲۲- ربیع الاول کو یکم جنوری ۱۲۶۶ء تھی، ۱۳- رمضان ۶۶۴ھ کو ۱۸- جون ۱۲۶۶ء تھی، اس لیے ڈاکٹر صاحب کو ۱۲۶۵ء کے بجائے ۱۲۶۶ء لکھنا چاہیے تھا۔ یہ مثالیں تو ڈاکٹر خلیق احمد نظامی مرحوم کی تحریروں میں تاریخ اور سنین کی پیچیدگی سے متعلق پیش کی گئیں۔ اصل مسئلہ حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرہٗ کے سالِ ولادت اور حضرت بابا صاحب قدس سرہٗ کے سالِ وصال کا ہے جس سے متعلق تنقیح ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر خلیق احمد نظامی، بابا فرید قدس سرہٗ کا سالِ وصال ۶۶۴ھ قرار دینے پر اس قدر مصر ہیں کہ سیر الاولیاء میں حضرت محبوبِ الٰہی کی زبانی اور تحریری شہادتوں میں جن جن مقامات پر ۶۶۹ھ درج ہے، انھوں نے اپنی انگریزی تصنیف میں نہ جانے کس مفروضے کے زیر اثر ۶۶۴ھ تحریر کیا ہے اور حوالہ سیر الاولیاء فارسی (چرنجی لال ایڈیشن) کا دیا ہے۔ دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

"سلطان المشائخ بقلمِ مبارک خود بنشتہ است کہ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز کہ کاتبِ حروف را بخواند در روزِ آدینہ بعد از فراغِ نماز، بیست و پنجم ماہ جمادی الاول سنہ تسع و ستین وستمائۃ لعاب از دہنِ مبارک در دہنِ کاتب کرد۔"[20]

(سیر الاولیاء، باب اوّل، نکتۂ ہشتم، ص ۱۳۳، نیز مخطوطہ، نیشنل میوزیم کراچی، ص ۴۷ الف)

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے انگریزی تصنیف میں تحریر کیا ہے:

"Perhaps it was the last visit of Shaikh Nizam ud din to his master in 664 A.H./1265 A.D. on 25 Jamadi-ul-Awwal — after the Friday prayers. Shaikh Farid put his Saliva in the mouth of Shaikh Nizam ud din." (Page 48)

(شاید یہ شیخ نظام الدینؒ کی اپنے مرشد کی خدمت میں آخری حاضری تھی۔ سنہ ۶۶۴ ہجری/۱۲۶۵ء میں پچیس جمادی الاول کو نمازِ جمعہ

کے بعد شیخ فرید نے شیخ نظام الدینؒ کے منہ میں اپنا لعابِ دہن رکھا)۔(۲۱) (ص ۴۸)

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنی انگریزی تصنیف میں حوالہ سیر الاولیاء (فارسی) کا دیا ہے، جو ان کی انگریزی عبارت سے اوپر بجنسہ تحریر کیا گیا ہے۔ چرنجی لال ایڈیشن دہلی میں اس کا صفحہ ۱۲۳ اور چرنجی لال ایڈیشن لاہور میں صفحہ ۱۳۳ ہے۔ فارسی عبارت میں ''بیست و پنجم ماہِ جمادی الاول سنہ تسع وستین وستمائۃ'' یعنی پچیس جمادی الاول سنہ چھ سو انہتر نقل ہوا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے حوالہ دینے کے باوجود ۶۶۹ھ کو ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۵ء تحریر کیا ہے اور اس غیر معمولی تبدیلی کا کوئی سبب بھی بیان نہیں فرمایا۔ شاید ڈاکٹر صاحب کو اس باب میں قطع نظر ہی منظور ہو۔

دوسری مثال بھی اسی نوعیت کی ہے۔ امیر خورد کرمانیؒ نے بابِ اوّل، نکتۂ ہشتم میں حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا ایک ارشاد نقل کیا ہے (مضمون ہذا میں چھٹی ذاتی شہادت)

> ''سہ کرّت از دہلی بخدمت شیخ شیوخ العالمؒ رفتم، بعدہٗ، یک روز خواجہ طلبید، سیز دہم ماہِ رمضان سنہ تسع وستین وستماۃ بود و فرمود کہ نظام یاد داری آں کہ گفتہ بودم۔ گفتم: آرے۔ فرمود کہ کاغذ بیارید، اجازت نامہ بنویسید۔ کاغذ آوردند، اجازت نامہ نبشتند۔'' (ص ۱۲۶)
>
> (میں تین بار دہلی سے شیخ شیوخ العالم کی خدمت میں ہوا۔ بعدہٗ ایک روز خواجہ نے مجھے طلب کیا۔ رمضان چھ سو انہتر کی تیرھویں تاریخ تھی اور فرمایا اے نظام! تمھیں وہ بات یاد ہے جو میں نے کہی تھی؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! حکم فرمایا کہ کاغذ لائیں اور اجازت نامہ تحریر کریں، چناں چہ کاغذ لائے اور اجازت نامہ تحریر کیا)(۲۲)

ڈاکٹر صاحب مرحوم اسی واقعے کو سیر الاولیاء (چرنجی لال ایڈیشن) کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

"On 13 Ramazan 664 / 1265 Shaikh Farid granted him an Ijazat Namah, Certificate permitting him to enrol disciples." (Page 49)

یہاں بھی ''تسع وستین وستماۃ''یعنی چھ سو انہتر ہجری، ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یہاں بھی اس تبدیلی کے سبب سے قطع نظر کیا گیا ہے۔ ایک ایسی تحقیق، جو بغیر سبب بیان کیے محکم شہادت کی نفی کرتی ہو، کس طرح قابلِ قبول ہو سکتی ہے؟ لہٰذا ڈاکٹر خلیق احمد نظامی کا یہ موقف قطعی طور پر درست نہیں کہ حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرہٗ کا سالِ ولادت ۶۴۲ ہجری اور بابا فریدؒ کا سال وصال ۶۶۴ ھ ہے۔

(۵) زمرۂ پنجم: ۶۴۵ ہجری = (اس سال یکم صفر بروز جمعہ اور آخری چہار شنبہ ستائیس صفر کو تھا)۔ زمرۂ پنجم میں حضرت محبوبِ الٰہی قدس سرہٗ کا سالِ ولادت سنہ ۶۴۵ ہجری قرار دینے والے حضرات استادِ مکرم ڈاکٹر اسلم فرخی اور اخلاق حسین دہلوی مرحوم ہیں۔ دونوں بزرگوں نے حضرت قدس سرہٗ کی کسی ذاتی شہادت کی نہ تو نفی کی ہے اور نہ اپنے مباحث میں کسی نوع کی تاویل کو روا رکھا ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کا موقف یہ ہے کہ:

> ''نظامی صاحب نے (حضرتؒ کا سال ولادت) ۲۷- صفر ۶۴۲ھ لکھا ہے جو اس لیے صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ شواہد اس کے حق میں نہیں ہیں۔ بعضوں نے ۶۳۶ھ، بعضوں نے ۶۳۸ھ اور علامہ اخلاق حسین نے ۶۴۵ھ لکھا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل امور قابل توجہ ہیں:
>
> ''(الف) حضرت سلطان جیؒ بہ قول خود بیس برس کی عمر میں پہلے پہل باوا صاحبؒ کی خدمت میں اجودھن حاضر ہوئے تھے۔
>
> ''(ب) حضرت سلطان جیؒ، بہ قولِ خود، باوا صاحب کی حیات میں تین دفعہ اجودھن حاضر ہوئے تھے۔

''(ج) نظامی صاحب کے بہ قول باوا صاحبؒ کا سالِ وفات ۶۶۴ھ ہے۔

''(د) ان شواہد کی مطابق حضرت سلطان جیؒ ۶۶۲ھ میں پہلے پہل اجودھن پہنچے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ۶۶۳ اور ۶۶۴ میں آپ نے باقی دو سفر بھی کر لیے ہوں؟ باوا صاحب کی تاریخ وفات ۵- محرم ہے اور حضرت سلطان جیؒ کے ایک ارشاد کے مطابق آپ کو شوال ہی میں دہلی بھیج دیا گیا تھا۔ اس طرح صرف ۶۶۳ھ کا سال بچتا ہے، جس میں دو سفر قرین قیاس نہیں۔ یہ بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ آپ ہر سفر میں مہینوں اجودھن میں قیام فرما رہے تھے۔

''(ہ) ''سیر الاولیا'' میں مذکور ہے کہ ۱۳- رمضان ۶۶۹ھ کو باوا صاحبؒ نے حضرت سلطان جیؒ کے لیے خلافت نامہ تحریر کیے جانے کا حکم دیا تھا۔ یہ بیان نظامی صاحب نے بھی نقل کیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خلافت نامہ رمضان ۶۶۹ھ میں لکھا گیا تھا تو اس حساب سے باوا صاحبؒ کا سال وصال ۶۷۰ھ میں ہونا چاہیے۔

''راقم الحروف کا خیال ہے کہ باوا صاحب کا سال وصال ۶۷۰ھ ہی ہے۔ اس کی توثیق حضرت سلطان جیؒ کے ایک بیان سے بھی ہوتی ہے۔ آپ نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ ''جب شیخ الاسلام فرید الدین قدس سرہٗ العزیز دنیا سے رخصت ہوئے تو اسی سال کافر اس دیار میں پہنچ گئے۔ منگول اس علاقے میں شیر خاں کے مرنے کے بعد پہنچے تھے۔ شیر خاں، جو اس علاقے کا مقطعے دار تھا، بلبن کا رشتے کا بھائی تھا۔ برنی کے بہ قول اس کی وفات بلبن کے سال جلوس کے پانچ چھ برس بعد ہوئی تھی۔ بلبن کا سالِ جلوس ۶۶۴ھ ہے، لہٰذا شیر خاں کا سال وفات ۶۶۹ھ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ۶۷۰ھ کے باوا صاحب کے سال وصال ہونے کی

تائید ہوتی ہے۔ اس تجزیے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت سلطان جیؒ کا سال ولادت ۶۴۵ھ ہے۔ آپ ۶۶۵ھ میں پہلی بار اجودھن تشریف لے گئے تھے اور ۶۷۰ھ تک وہاں کے دو سفر اور کیے تھے۔ بہرحال، یہ مسئلہ مؤرخوں کی تحقیقِ مزید کا محتاج ہے۔ نظامی صاحب نے اپنے یہاں سنین کے اختلاف پر غور نہیں کیا اور نہ سنین کی تنقیح پر توجہ کی، جو محتاط مؤرخ کے شایان شان نہیں ہے۔

(مکالمہ کراچی شمارہ ۶ ، ص ۴-۴۱)

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کی مندرجہ بالا تنقیح سے زیرِ نظر مسئلے کے ژولیدہ پہلو واضح ہو گئے ہیں اور اس کی تفہیم بھی آسان ہو گئی ہے۔

اخلاق حسین دہلوی مرحوم نے بھی حضرت محبوب الٰہی قدس سرّہٗ کے ارشاداتِ گرامی کی روشنی میں اس مسئلے کو حل کیا ہے اور بعض ایسے نکات پیدا کیے ہیں جو زیرِ نظر مسئلے میں بنیادی حیثیت کے حامل ہیں لیکن دوسرے لکھنے والوں کی نظر سے مخفی رہے۔ مثال کے طور پر اس الحاقی عبارت کی سب سے پہلے علامہ اخلاق حسین ہی نے نشان دہی کی جو سیر الاولیاء چرنجی لال ایڈیشن کے صفحہ ۱۰۱ پر نقل کی گئی ہے (ملاحظہ فرمائیں ''حضرت محبوبِ الٰہی'' صص ۳۵-۳۶؛ نیز مضمون ہذا میں ''الحاقی عبارتیں'')۔ علامہ مرحوم کی یہ تحقیق، نیشنل میوزیم کراچی کے مخطوطے سے صحیح ثابت ہو چکی ہے۔ زیرِ نظر مسئلے میں مرحوم کی اس تحقیق کا کردار کلیدی نوعیت کا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کسی ارشاد محبوبیؒ کی نفی کیے بغیر استادِ مکرم ڈاکٹر اسلم فرخی اور اخلاق حسین دہلوی مرحوم نے جو نتائج اخذ کیے ہیں، ان کا نقشہ اس طرح سامنے آتا ہے:

(۱) حضرت محبوبِ الٰہی کا سال ولادت : بدھ ۲۷- صفر ۶۴۵ ہجری

(۲) تعلیمِ علمِ لغت : ۶۵۷ ہجری، بعمر بارہ سال

(۳) دہلی تشریف آوری : ۶۶۱ ہجری، بعمر سولہ سال

(عہدِ حکومت سلطان ناصر الدین محمود)

(۴) اجودھن میں پہلی حاضری : ۶۶۵ ہجری، بیس سال

(۵) عطائے خلافت : ۶۶۹ ہجری

(۶) بابا فریدؒ کا وصال : ۶۷۰ ہجری (۵-محرم کی شب)

یہ حساب ہر اعتبار سے درست اور بے غبار ہے۔ اس حساب میں نہ کہیں پیچیدگی پیدا ہوئی ہے اور نہ کوئی خلا واقع ہوا ہے، اس لیے حضرت سلطان المشائخ شیخ نظام الدین محبوب الٰہی قدس سرہٗ کا سالِ ولادت ۶۴۵ ہجری تسلیم کر لینا چاہیے۔

بخوبی ہمچو مہِ تابندہ باشی
بملکِ دلبری پائندہ باشی

۞ ۞ ۞

حواشی

(۱) مقالہ ''نظام شناسی اور پروفیسر خلیق احمد نظامی''۔ مشمولہ ''مکالمہ''، کراچی، شمارہ ۵، ص۳۳۔

(۲) تذکرۃ الواصلین ۔ رضی الدین فرشوری بدایونی۔ اشاعتِ دوم، بدایوں، ۱۹۴۵، ص۱۲۲۔

(۳) تذکرۂ علمائے ہند، مولوی رحمان علی، اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم، اشاعتِ اوّل، کراچی ۱۹۶۱ء، ص ۵۲۲۔ مولوی رحمان علی نے تذکرۂ علمائے ہند (فارسی) میں حضرت محبوب الٰہیؒ کا سالِ ولادت تحریر نہیں کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں تذکرۂ علمائے ہند (فارسی)، طبع دوم، لکھنؤ ۱۹۱۴ء، ص۲۴۰۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنے اردو ترجمے کے حاشیے میں ۶۳۱ھ/۱۲۳۳ء تحریر کیا ہے۔ ''حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ صفر ۶۳۱ھ/۱۲۳۳ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے۔'' ص۵۲۲۔

(۴) مولانا ابرار علی صدیقی نے اپنی تصنیف "نظام الاولیاؒ" میں حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے سالِ ولادت پر تفصیل سے بحث کی ہے اور ''تذکرۃ الواصلین'' کے مندرجات کی بنیاد پر ....۶۳۱ھ کو حضرت قدس سرہٗ کا سالِ ولادت قرار دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ''نظام الاولیا''، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۸، نیز صص ۲۴ تا ۳۰۔

(۵) ترجمہ از راقم السطور۔

(۶) ایضاً۔

(۷) ایضاً۔

(۸) ایضاً۔

(۹) ایضاً۔

(۱۰) ایضاً۔

(۱۱) ایضاً۔ غلام احمد خاں بریاں مترجم سیر الاولیا نے اپنے اردو ترجمے میں ۲۵-رمضان المبارک ۶۶۹ھ تحریر کیا ہے جب کہ فارسی کے مطبوعہ نسخے (چرنجی لال ایڈیشن) میں ''بیست و پنجم ماہ جمادی الاول سنہ تسع وستین وستماۃ'' (۲۵-جمادی الاول چھ سو انہتر) نقل ہوا ہے۔ بریاں مرحوم کے حوالے کے لیے ملاحظہ فرمائیں ص ۱۳۰، شائع کردہ الکتاب، لاہور، ۱۹۷۸ء۔ ۶۶۹ھ میں جمادی الاول کی پہلی تاریخ منگل کو اور پچیس تاریخ جمعہ کو تھی، جب کہ ۶۶۹ھ میں رمضان المبارک کی پہلی تاریخ پیر، کو پچیس تاریخ جمعرات کو واقع ہوئی۔ ازروئے تقویم فارسی نسخے کی عبارت ہر اعتبار سے درست ہے۔

(۱۲) ترجمہ از راقم السطور۔

(۱۳) ایضاً۔

(۱۴) ایضاً۔ یہ ذاتی شہادت سیر الاولیاء (فارسی)، بابِ اوّل، نکتۂ ہشتم (حالاتِ شیخ شیوخ العالمؒ)، ص ۹۹ پر موجود ہے۔

(۱۵) ترجمہ از راقم السطور۔ کراچی کے مخطوطے میں صفحات کے نمبر دائیں جانب کے صفحے پر شروع کی دوسطروں کے درمیان درج کیے گئے ہیں۔

(۱۶) احقر راقم السطور نے ''مطلوب الطالبین'' کے اردو ترجمے میں، جو کراچی سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہو چکا ہے، اس نوع کی تحریفات کی نشان دہی کی ہے۔

(۱۷) ''حضرت نظام الدین اولیاءؒ --حیات اور تعلیمات''۔ مصنفہ پروفیسر محمد حبیب، دہلی، ۱۹۷۲ء، ص ۱۴۔

(۱۸) ترجمہ از راقم السطور۔

(۱۹) ایضاً۔

(۲۰) اس عبارت کا اردو ترجمہ ہے: (ترجمہ از راقم السطور)

سلطان المشائخؒ نے اپنے قلم مبارک سے تحریر کیا ہے کہ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہٗ العزیز نے کاتب حروف کو جمعے کے دن بعد نماز بلایا۔ جمادی الاول سنہ چھ سو انہتر کی پچیسویں تاریخ تھی۔ کاتب کے منہ میں اپنے دہنِ مبارک کا لعاب مَلا۔"

(۲۱) ترجمہ از راقم السطور۔

(۲۲) ایضاً۔

☆☆☆☆☆

کتابیات

(۱) آبِ کوثر	شیخ محمد اکرام	طبع ہشتم، لاہور، ۱۹۷۹ء
(۲) تاریخِ دعوت و عزیمت	مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی	کراچی، ۱۹۷۹ء
(۳) تذکرہ علمائے ہند (فارسی)	مولوی رحمان علی	طبع دوم، لکھنؤ، ۱۹۱۴ء
(۴) تذکرۃ الواصلین	مولوی رضی الدین فرشوری بدایونی	طبع دوم، بدایوں، ۱۹۴۵ء
(۵) حضرت محبوب الٰہیؒ	اخلاق حسین دہلوی	لاہور، ۱۹۸۵ء
(۶) حضرت نظام الدین اولیاء	پروفیسر محمد حبیب	طبع اول، دہلی، ۱۹۷۲ء
(۷) خزینۃ الاصفیا، جلد اوّل (فارسی)	غلام سرور لاہوری	لکھنؤ، ۱۸۷۳ء
(۸) خیر المجالس (فارسی)	حمید قلندر شاعرؒ	علی گڑھ، سال ندارد
(۹) سیر الاولیاء (فارسی)	امیر خورد کرمانیؒ	لاہور، ۱۹۷۸ء
(۱۰) سیر الاولیاء (فارسی)	مخطوطہ نیشنل میوزیم کراچی، سالِ کتابت ندارد	
(۱۱) سیر الاولیاء (اردو ترجمہ)	مترجم مولانا غلام احمد خاں بریاں	لاہور، ۱۹۷۸ء
(۱۲) شیخ نظام الدین اولیاءؒ	ڈاکٹر خلیق احمد نظامی	دہلی، ۱۹۸۵ء
(۱۳) طریقہ چشتیہ در ہند و پاکستان (فارسی)	ڈاکٹر غلام علی آریا	چاپ اول

تہران، ۱۳۴۵ش

(۱۴) فوائد الفواد (فارسی) حسن علا سجزیؒ لاہور، ۱۹۶۶ء

(۱۵) مطلوب الطالبین (فارسی) شیخ محمد بلاق دہلوی، مخطوطہ نیشنل میوزیم کراچی، مکتوبہ ۵-محرم ۱۲۶۳ھ

(۱۶) نزہتہ الخواطر، (جلد دوم) مولانا سیّد عبدالحیٔ (اردو ترجمہ) مترجم ابو یحییٰ امام خاں نوشہری، لاہور ۱۹۶۵ء

(۱۷) نظام الاولیا مولانا ابرار علی صدیقی بدایونی کراچی، ۱۹۹۶ء

(1) NIZAMI KHALIQUE AHMED *THE LIFE AND TIMES OF SHAIKH NIZAM UD DIN AULIYA* DELHI, 1991

◇—◇—◇

محمد عالم مختار حق

نقدِ غالبؔ

عالمی شہرت یافتہ شاعر میرزا اسداللہ خان غالبؔ کا انتقال ۱۵-فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں ان کی رحلت کو سو سال ہوئے تو اس سال کو غالبؔ صدی کے نام سے موسوم کیا گیا اور دنیا کے مختلف ممالک میں صد سالہ برسی کی تقریبات منعقد ہوئیں۔ غالبؔ کے برِصغیر پاک و ہند کی خاک سے متعلق ہونے کے سبب اس خطہ میں یہ سال غیر معمولی طور پر منایا گیا۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی طرف سے مختلف تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔ رسالوں اور اخبارات نے اس یادگار موقع پر خصوصی نمبر شائع کیے۔ غالبؔ کی بعض تصانیف کو از سرِ نو مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ خاص طور پر دیوانِ غالبؔ (اردو) کی بعض نہایت بیش قیمت اور بیش قدر اشاعتیں منظرِ عام پر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین نے غالبیات کے خزانے اگل دیے ہیں۔ یہاں تک کہ غالبؔ کے بدستِ خود لکھے ہوئے دیوان کی طباعت تک نسخۂ لاہور/نسخۂ امروہہ کے نام سے کتم عدم سے منصۂ شہود پر جلوہ فروز ہوئی۔ غالبؔ کی زندگی اور اس کے فن پر کئی کتابیں وجود پذیر ہوئیں۔ غرض اس عہد آفریں شاعر کو دنیا نے جس انداز سے خراجِ تحسین پیش کیا، یہ اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یاد رہے کہ اس سلسلے میں ۱۹۶۹ء میں غالبؔ پر جو کام ہوا، اسے کافی حد تک نہایت سلیقے سے ماہنامہ ''کتاب'' لاہور کے غالبیات نمبر برائے فروری مارچ ۱۹۷۰ء میں محفوظ کر دیا گیا۔

راقم الحروف کو غالبؔ سلسلے کی ہندوستانی مطبوعات خاص طور پر اخبارات و رسائل کے خصوصی غالبؔ نمبر جناب مالک رام صاحب (دہلی) اور جناب اکبر الدین صدیقی صاحب (حیدرآباد دکن) کی مہربانی سے موصول ہوتے رہے۔ راقم بھی جواب میں پاکستانی رسائل کے خصوصی غالبؔ نمبر ان صاحبان کو ارسال کرتا رہا۔ غالبؔ سلسلے کی مطبوعات مولانا غلام رسول مہرؔ راقم سے مطالعہ کے لیے منگوا لیا کرتے اور دورانِ مطالعہ کسی مضمون میں جہاں انھیں کوئی بات خلافِ واقعہ نظر آئی، اس سے صرفِ نظر نہیں کیا بلکہ فوراً گرفت کی اور وہیں حاشیہ پر اپنی رائے تحریر کر دی۔ جناب مشفق خواجہ صاحب اکتوبر ۲۰۰۱ء کے آخری ہفتہ میں لاہور تشریف لائے تو راقم کو حسبِ معمول شرفِ ملاقات سے نوازا اور مہرؔ صاحب کے رسالوں اور کتابوں میں اختلافی اضافات دیکھ کر فرمایا کہ میں انھیں مضمون کی شکل میں مرتب کر دوں تاکہ مہرؔ صاحب کا یہ غیر مدونہ علمی سرمایہ مرتب صورت میں قارئینِ ''غالب'' تک پہنچ جائے۔ میں نے ان کے ارشاد کی صرف تعمیل ہی نہیں کی بلکہ اس مضمون کے ساتھ مولانا مہرؔ کے غالبؔ پر لکھے گئے معلومہ مضامین اور کتابوں کی فہرست بھی مرتب کر دی ہے تاکہ جو صاحب غالبؔ یا مہرؔ پر کام کرنا چاہیں، یہ فہرست ان کے لیے مدد معاون ثابت ہو۔ اہتمام یہ کیا گیا ہے کہ پہلے عنوان رسالہ/کتاب کے کوائف، پھر اختلافی عبارت بقید صفحہ نمبر اور زاں بعد مہرؔ صاحب کی تصریح۔

ا۔ ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی ۱۹۶۹ء (غالبؔ نمبر)

ا۔ غالبؔ کی کہانی از ڈاکٹر ظ۔ انصاری:

''قوقان بیگ کے انتقال کے بعد یہ علاقہ ان کی اولاد سے چھن گیا'' (ص ۲۱)

مہرؔ: یہ صحیح نہیں۔ مرزا قوقان بیگ نے نجف خاں کی وفات کے بعد جانشینوں کے جھگڑے میں شاہ دہلی کی ملازمت چھوڑ کر جے پور میں ملازمت اختیار کر لی اور اس وجہ

سے وہ دہلی چھوڑ کر آگرہ میں آ بسے۔ ترکِ ملازمت کے بعد وہ علاقہ خود بخود چھوٹ گیا جو ماتحت سواروں کے خرچ کے لیے دیا گیا تھا۔

''چنانچہ جب بہادر شاہ کی فرمائش پر وہ شاہی خاندان کی تاریخ (مہرِ نیمروز) لکھنے بیٹھے تو ابتدا میں سارا زور اس پر صرف کر دیا کہ خود بھی کسی نہ کسی طور پر اسی سلسلے سے متعلق رہیں۔'' (ص-۲۲)

مہر: مہرِ نیمروز لکھنے سے بہت پہلے وہ اپنے خاندان کے متعلق کئی مفصّل تحریریں مرتب کر چکے تھے۔ مثلاً وہی قطعہ جو آگے نقل کیا ہے اور وہ ۱۸۴۵ء کے مطبوعہ دیوان میں بہت پہلے لکھا جا چکا تھا۔ قلعہ کی ملازمت ۱۸۵۰ء میں شروع ہوئی۔

''فیضِ حق را کمینہ شاگردیم (قدرت کے فیض سے ہم کو تھوڑا بہت حصہ ملا ہے)'' (ص-۲۳)

مہر: مصرعہ کا مطلب یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم فیض حق کے کمینہ شاگرد ہیں یعنی حقیر شاگرد ہیں اور یہ مقام کسرِ نفس کا تھا لہٰذا کمینہ کا لفظ استعمال کیا۔

''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل بکنے لگے گا'' (ص-۲۴)

مہر: تعجب ہے اس رائے کے الفاظ پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔ فرمایا: ''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا'' آپ سوچیں کہ کونسا استاد ملا جس نے راہ پر لگایا؟ استاد نہ ملنے کے باوصف میرزا نے مہمل نہیں بکا گویا رائے کے دونوں حصے غلط اور خلافِ حقیقت ثابت ہوئے۔ لیکن شیفتگان اسے مسلسل نقل کیے جا رہے ہیں اور اس کی پختگی پر مٹے ہوئے ہیں۔ یہ میر تقی کی بھی ہتک ہے اور میرزا غالب کی بھی۔

''غالب مذہبی معتقدات سے رفتہ رفتہ دور ہوتے جاتے تھے'' (ص-۲۵)

مہر: یہ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ تعجب ہے کہ غالب کے اپنے بیانات سے بھی

ناواقفیت کا ثبوت ہے اور "یادگار" بھی غالباً نہیں پڑھی ورنہ ایسی لغو بات کیوں زبانِ قلم پر آتی؟۔

"کلکتہ پہنچے (۱۸۳۵ء)" (ص-۲۵)

مہر: ۱۸۳۵ء غلط ہے۔ میرزا ۱۸۲۷ء میں کلکتہ میں تھے اور ۱۸۲۹ء میں واپس آ گئے۔

"تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا"

(ص- ۲۵)

مہر: عجیب نقطۂ نگاہ ہے کہ کئی مثبت تحریرات چھوڑ کر ایک فقرہ تلاش کر لیا جو پریشان کن حالات میں لکھا گیا تھا اور اس میں بھی اصل مقصود بیگم نہیں بلکہ سلسلہ تاہل ہے جس کی ذمہ داریاں ہیں جو باعثِ مصیبت ہوئیں۔ میرزا کی آزادہ روی کے لیے پیامِ مرگ تھا۔

"مفتی صدر الدین آزردہؔ یوں تو غالبؔ کے بہی خواہ اور مشکل حالات میں مددگار ثابت ہوئے لیکن ان کے ذوقِ شاعری کو غالب کی شاعرانہ خودسری گوارا نہ تھی۔ اور غالب کو یہ بات زندگی بھر کھٹکتی رہی اور وہ ہر پہلو کوشش کرتے رہے کہ اپنے عہد کے اس فاضل اجل کو کسی طرح قائل کر کے چھوڑیں" (ص- ۲۶)

مہر: یہ حالی کے ایک بیان پر مبنی ہے جو میرے نزدیک بے سروپا ہے۔ میرزا کے خطوط میں ایسی چیزیں ملتی ہیں کہ مشاعرے میں میرزا گئے اور آزردہؔ کسی وجہ سے نہ آسکے۔ وہ اس درجہ پریشان ہوئے کہ اپنا کلام پڑھے بغیر واپسی پر آمادہ ہو گئے۔ نیز یہ کہ آزردہ مرحوم کے سلجھے ہوئے ذوق شعر وسخن پر ظلم ہے کہ ایسی باتیں ان سے منسوب کی جائیں۔ اس سلسلے میں صرف تین فارسی مکاتیب دیکھ لیے جائیں جو کلیات نثر کے صفحہ ۲۰۰ سے ۲۰۳ تک ہیں۔ یہ مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کے نام ہیں اور غالباً ۱۸۴۳ء کے ہیں۔ ان سے پتا چل جائے گا کہ خود میرزا حضرت مفتی صاحب کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں، آیا اس روشنی میں یہ واقعہ قابلِ اعتنا سمجھا جا سکتا ہے؟

۲- جہانِ غالب از قاضی عبدالودود :

''مرتب نے سرورق میں سال گرد آوری ۱۲۸۳ھ بتایا ہے مگر خود غالب اسے سال آغاز کہتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ایک قطعہ ہے جس کے دو ابیات آخر یہ ہیں :

در غرۂ شعباں چو زمن بادہ گرفتند خود ''غالبِ پژمردہ'' نشانی زسنیں بود
روشش بدر آراز مہ شعباں کہ درینجا مقصودِ من از تخرجہ البتہ ہمیں بود

''غالب پژمردہ'' = ۱۲۹۱ سے بتخرجہ ۶ مادہ تاریخ نکالا ہے۔
(ص۔۲۷)

مہر: گویا ۱۲۸۳ھ آغاز ترتیب کا سال اور ۱۲۸۵ھ اختتام ترتیب کا۔ یہ قطعہ وفات سے چند ماہ پیشتر کہا گیا۔ اس کے بعد غالب نے شراب نہیں پی۔ باغِ دودر۔ قطعہ نمبر ۴۰ صفحہ ۲۸۔

۳- غالب کی افتادِ طبع از عبدالقادر سروری :

''سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو''

(ص-۳۳)

مہر: خدا کی طرف اشارہ ہے نہ کہ کسی دنیوی محبوب کی طرف۔

۴- غالب اور حافظ کا ایک تقابلی مطالعہ از سعید احمد اکبر آبادی :

گر مسلمانی اینست کہ حافظ دارد وائے گر در پس امروز بود فردائے

(ص-۳۷)

مہر: حافظ کا شعر یوں ہے :

گر مسلمانی ازیں است کہ حافظؔ دارد — آہ! گر از پسِ امروز بود فردائے[1]

۵- غالبؔ اور فنِ شعر از مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی :

"اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(ذوقؔ)

میرزا (غالبؔ) یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ میرزا نے اپنے اردو خطوط میں اس شعر کا جا بجا ذکر کیا ہے۔" (ص-۴۳)

مہرؔ: صرف ایک جگہ تذکرہ ہے۔ اصل مضمون عرفیؔ کا ہے :

امیدِ عافیت از مردن است وی ترسم — کہ مرگ دیگر و آسودگی دگر باشد

مگر ذوقؔ نے جس انداز میں یہ مضمون بیان کر دیا اس سے عرفیؔ کا مضمون بدرجہا بلند تر اور پرتاثیر ہوگیا ہے۔

۶- غالبؔ کے کلام میں تحریف و تصرف از نادم سیتا پوری :

"جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا — سویدا تا بہ لب زنجیر "سے" دود پسند آیا

(ص-۱۲۶)

مہرؔ: ایک صاحب یہ نسخہ لیے ہوئے میرے پاس آئے۔ سوچتے سوچتے خیال ہوا کہ زنجیر "سے" نہیں بلکہ "زنجیری" ہے۔ چونکہ کتاب میں مجہول و معروف کے درمیان اس

---

(۱) دیوان حافظؔ کے متداول نسخوں میں یہ شعر اس طرح چھپا ہوا ملتا ہے:

گر مسلمانی ازین است کہ حافظؔ دارد — آہ گر از پے امروز بود فردائے

البتہ دیوان حافظؔ کا جو نسخہ مرتبہ و مصححہ سید ابوالقاسم انجوی شیرازی ایران سے ۱۳۶۹ھ نوروز میں چھپا، اس میں اس شعر کے متعلق حاشیہ میں تصریح کی گئی ہے کہ "بعضے نسخہ ہا ایں بیت را علاوہ دارند" جس سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شعر مرقومہ صورت میں بھی درست ہے۔

زمانے میں چنداں امتیاز نہ تھا کاتب نے ''زنجیری'' کو ''زنجیرے'' لکھ دیا۔ اسے ''زنجیر سے'' پڑھا گیا۔ جب مرتب نسخہ حمیدیہ سے پوچھا گیا تو جواب ملا کہ صحیح ''زنجیری'' ہے ''زنجیر سے'' کاتب کی غلطی ہے۔ (دستۂ گل از مہر۔ غیر مطبوعہ)

۷۔ غالبؔ اور اردو خطوط نویسی از پنڈت گووند اس خموشؔ سرحدی:

''مرحوم دہلی کالج کے ماسٹر رام چند ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اس قدیم زمانے میں اردو کے تمول کی ترقی میں اور لوگوں کو اصلاح و ترمیم کی طرف توجہ دلانے میں نمایاں کام کیا ہے۔''

(ص۔۱۵۵)

مہرؔ: یہ اصول تو میرزا غالبؔ ماسٹر رام چندر سے بھی دس گیارہ سال پیشتر ''پنج آہنگ'' کے دیباچے میں لکھ چکے تھے۔ فرماتے ہیں: ''ہنجارِ من در نگارش اینست کہ چوں کلک و ورق بہ کف گیرم مکتوب الیہ را بلفظے کہ فراخور حالت اوست درسر آغاز صفحہ آواز دہم و زمزمہ سنج مدعا گردم (کلیات نثر غالبؔ فارسی صفحہ ۵)

''بھئی اگر شاعری ذریعہ عزت نہیں ہے تو اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے اور اپنے آبا کے صد سالہ پیشے کو کیوں نہیں اختیار کر لیتے''

(ص۔۱۵۶)

مہرؔ: اس شعر کا مطلب ہی وہ نہیں جو ظاہر الفاظ سے کیفیؔ صاحب نے سمجھا۔ مطلب یہ ہے کہ میں شاعری اس لیے نہیں کر رہا کہ اس سے عزت پاؤں گا بلکہ:

شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

۸۔ غالبؔ کے مزاج کے بنیادی عناصر از سید علی رضا حسینی:

''میر نے غالبؔ کے شروع عمر کا کلام سن کر بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ اگر اس بچے کو اچھا رہنما مل گیا تو یہ استاد بن جائے گا

وگرنہ بگڑ جائے گا۔ غالبؔ کا یہ استاد ان کا ذوقِ سلیم تھا‘‘

(ص۔۲۰۹)

مہرؔ: میر تقی نے کہاں کہا کہ ذوقِ سلیم میرزا کا استاد بنے گا؟ ہر شاعر ہی نہیں ہر فرد کا ایک استاد ذوقِ سلیم بھی ہوتا ہے بشرطیکہ یہ کسی کو حاصل ہو۔ میر تقی سے جو داستان منسوب ہے وہ بالکل بے بنیاد ہے اور اسے بے بنیاد مان لینا سہل ہے۔ تاویلات رکیکہ و باطلہ سے اسے بے معنی بنانا کیونکر مناسب سمجھا جا سکتا ہے۔

’’دل کی بربادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

میرؔ (ص۔۲۰۹)

مہرؔ: یہ کلیم ہمدانی کا مضمون ہے:

کلیم از درد بے داد کہ نالم کہ بر کشتم گزار لشکر افتاد

یعنی میں کسی خاص شخص کے جور و ظلم کی شکایت کیا کروں۔ میرے کھیت پر سے تو لشکر گزر گیا اور اسے برباد کر گیا۔

۹۔ غالبؔ کا دربار اور خلعت از امتیاز علی عرشی:

’’عیسوی گفتم از سر عزت ’’خلعت ہفت پارچہ سالش‘‘

(ص۔۲۱۷)

مہرؔ: ’’خلعت ہفت پارچہ‘‘ کے اعداد ۱۷۹۶۔ ان میں سر عزت یعنی عین کے اعداد ۷۰ شامل کر لیں تو ۱۸۶۶ بن جاتے ہیں۔

۱۰۔ اردو شاعری کے دو رجحانات (میرؔ و غالبؔ) از بشر نواز:

’’آرزو عشق مدعا ہے عشق‘‘

(ص۔۲۵۵)

مہر: For love is heaven and heaven is love

۱۱- سبد چیں اور غالبؔ کے انگریز ممدوح از حامد اللہ ندوی:

''تیسرے قصیدے میں کسی کا نام نہیں لیا ہے لیکن اس میں جو خصوصیتیں اپنے ممدوح کی بتائی ہیں وہ لارنس پر صادق آتی ہیں۔''

(ص-۲۹۳)

مہر: یہ کلب علی خاں والی رامپور کی مدح میں ہے۔

''تاز بخشش ہائے شاہنشاہ ہندو انگلینڈ خلعت از بہر خدیوشہ نشاں آوردہ اند

(ص-۲۹۳)

۱۲- غالبؔ کی تشبیہیں اور استعارے از ڈاکٹر میمونہ دلوی:

''دل گزر گاہ خیالِ مے و ساغر ہی سہی گر نفس جادہ سرِ منزل تقوی نہ ہوا''

(ص-۳۳۳)

مہر: لفظ ''تقوی'' قافیہ ہے نہ کہ ''تقویٰ'' ''بھی'' کا اور ''راضی'' کا۔

ع ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ع وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

۲- ماہنامہ ''فکر و فن'' دہلی۔ اپریل ۱۹۶۹ء (غالبؔ نمبر)

۱- روبرو بات چیت — مولانا امتیاز علی عرشی سے:

''غالبؔ کے یہاں ندرتِ خیال اور جدّت ادا خود ان کے اپنے بیان کے مطابق بیدلؔ کے ساتھ ظہوریؔ، عرفیؔ اور نظیریؔ کے کلام کے مطالعہ سے پیدا ہوئی۔'' (ص-۱۲)

مہر: یہ رائے میرے نزدیک نظر ثانی کی محتاج ہے۔ اس میں غالبؔ کی فطری صلاحیتوں

اور غیر معمولی کمالات کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی گئی۔ کیا ہر شخص بیدلؔ کے ساتھ ظہوریؔ اور نظیریؔ کے ساتھ عرفیؔ کے مطالعے سے وہ مقام پیدا کر سکتا ہے جو غالبؔ کو میسّر آیا؟ مطلب یہ تھا کہ نادر فطری صلاحیتوں کے ساتھ صحیح ذوقِ مطالعہ کا موقع ملا اور فطری صلاحیتیں جلا پا گئیں۔

۲- غالبؔ کی عظمت — ایک سیمینار:

''کیا تعجب ہے کہ آخر زمانے میں انھوں نے خود بھی یہ محسوس کر لیا ہو، جبھی تو کہتے ہیں:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں''

رشید احمد صدیقی (ص-۹۶)

مہرؔ: یہ شعر آخری زمانے کا نہیں۔ بالکل ابتدائی زمانے کا ہے۔

۳- قلمی خاکہ:

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

مہرؔ: مولانا نے مصرعہ اول میں ''یہ'' کاٹ کر ''بھی'' لکھا اور کہا ہے کہ:

یہ مقام ''بھی'' ہے کیونکہ ناسخؔ کے قول کی حمایت میں کہا گیا ہے۔

۴- سہ ماہی ''صحیفہ'' مجلس ترقی ادب لاہور۔ جنوری-۱۹۶۹ء

(غالبؔ نمبر۔ حصہ اول)

محکمہ ڈاک حکومتِ پاکستان نے غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر مورخہ ۱۵-فروری ۱۹۶۹ء کو دو یادگاری ٹکٹ پندرہ اور پچاس پیسے مالیت کے جاری کیے۔ پچاس پیسے والے ٹکٹ پر غالبؔ کا یہ شعر چھپا:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

میں نے اسی روز دونوں یادگاری ٹکٹ لاہور جی پی او سے خرید کر مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور کے سہ ماہی مجلّہ ''صحیفہ'' کے غالب نمبر (حصہ اول) برائے جنوری ۱۹۶۹ء کے سرورق پر چسپاں کر دیئے اور اسی روز ان پر جی پی او سے خصوصی یادگاری مہر لگوا لی۔ مورخہ ۲۸-۰۲-۱۹۶۹ کو میں جناب مولانا غلام رسول مہرؔ صاحب کی خدمت میں مذکورہ پرچہ ساتھ لیے حاضر ہوا۔ انھوں نے ٹکٹ پر چھپا ہوا شعر دیکھا تو لاحول پڑھی اور پھر اسی وقت اس پر مندرجہ ذیل نوٹ تحریر کر دیا:

باسمہ سبحانہ

سب سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ٹکٹ پر جو شعر درج ہے اس کے دوسرے مصرعہ میں ''کاش کہ'' بالکل غلط ہے۔ صحیح ''کاشکے'' ہے (ک، ا، ش، ک، ی)

۴- کلیاتِ غالبؔ (فارسی) جلد دوم مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء

''از پئے مدحِ توچوں نقطہ گزارد بورق خامۂ من بغزالی دم اِحیا ماند

کہ سیہ مست مے ناز بہ صحرا پوید واندراں پویہ ازو نافہ بصحرا ماند

دیوانِ فارسی طبع دہلی اور کلیات طبع لکھنو میں ایک لفظ کی تبدیلی سے معنی خیز اختلاف ہو گیا ہے۔ دیوان میں ہے ''دمِ احیاماند''۔ کلیات میں ''دمِ انشاماند''۔ ہم نے دہلی والے نسخے کو بہتر سمجھا ہے۔ کیونکہ غزالی کی کتاب ''احیاء العلوم'' وجہ امتیاز ہے نہ کہ انشائے غزالی۔''

(ص-۱۴۹)

مہرؔ: انا للہ۔ یہ ''غزالی'' نہیں ''غزالے'' ہے اور اگلے شعر سے مل کر معنی پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی وہ غزال جو سیاہ مست صحرا میں دوڑتا ہے اور ہر طرف مشک چھوڑتا جاتا ہے۔

اگر ''غزالی'' اور ''احیا'' والی تعبیر مان لی جائے تو:

۱- ''خامۂ من بغزالی دمِ احیا ماند'' کے معنی یہ کرنا ہوں گے کہ میرا خامہ غزالی کی مانند ہو جائے جب وہ احیاء العلوم لکھ رہے تھے۔ یہ تعبیر کی کون سی صورت ہے۔

۲- اگلے شعر کا مطلب کیا ہوگا؟ کیا یہ کہ امام غزالی جب احیاء العلوم لکھ رہے تھے تو وہ پھر غزالی ہی سیہ مست مئے ناز ہو کر صحرا میں قلانچیں بھر رہے تھے اور ہر طرف مشک بکھیر رہے تھے۔

میرزا غالبؔ نے ایک قصیدے میں کہا ہے:

از پئے مدحِ تو چوں نقطہ گزارد بہ ورق — خامۂ من بہ غزالے دم انشا ماند

کہ سیہ مست ے ناز بہ صحرا پوید — واندراں پویہ ازو نافہ بہ صحرا ماند

یعنی میرے قلم کی حیثیت اس غزال یعنی ہرن کی سی ہے جو مئے ناز سے سیہ مست ہو کر صحرا میں چوکڑیاں بھرتا ہے اور ہر چوکڑی بھرنے میں نافہ مشکبو کی لہریں صحرا میں چھوڑتا جاتا ہے۔ آج کل ہمارے فارسی دان ایرانیوں کی تقلید میں یائے مجہول کی جگہ بھی یائے معروف استعمال کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ''غزالے'' ''غزالی'' بنا۔ بعض اصحاب نے قطعہ بندی کا رشتہ توڑ کر غزالی کو امام غزالی بنایا اور شعروں کا مطلب کچھ سے کچھ ہو گیا۔ (دستہ گل از مہرؔ۔ غیر مطبوعہ)

''یہ قصیدہ ان کی خدمت میں لیفٹنٹ گورنری کے زمانے میں پیش ہوا ہوگا'' میں اسے ماننے میں تردد کرتا ہوں۔''

(کلیات ص-۲۷۱)

مہر: تردد ضرور کیجیے مگر اس شعر کی بھی کوئی شرح فرمایئے:

گفتی آفاق را گرفت فرو — فرِ فرمانروائے غرب و شمال

(ص-۲۷۳ کا تیسرا شعر)

۶ مارچ ۱۸۴۹ء سہ شنبہ دہلی کی رپورٹ میں ہے ''دہلی کے جاگیرداروں کے نام جنگ پنجاب کی فتح کے متعلق سات خطوط بھیجے

گئے تھے۔ جواب میں جاگیرداروں کی طرف سے تہنیت نامے آئے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ زیر نظر قصیدہ ۱۸۴۹ء کا ہے۔" (ص-۲۷۷)

مہر: ۱۸۴۹ء میں فتح پنجاب کے متعلق جو خطوط بھیجے گئے وہ دوسری جنگ کے بعد کے تھے۔ اس وقت ہارڈنگ نہیں ڈلہوزی گورنر جنرل تھا۔ ہارڈنگ جولائی ۱۸۴۴ء سے جنوری ۱۸۴۸ء تک گورنر جنرل تھا۔ دسمبر ۱۸۴۵ء میں لڑائی شروع ہوئی۔ جنوری ۱۸۴۶ء میں ختم ہوگئی۔ ۸-مارچ ۱۸۴۶ء کو صلح نامے کی توثیق۔ یہ قصیدہ بہ ہر حال ۱۸۴۶ء کا ہے۔

کلیاتِ غالب (فارسی) جلد سوم مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء:

آفتاب عالم سر گشتگی ہائے خودیم میرسد بوے تو از ہر گل کہ می بوئیم ما
تا چہا مجموعہ لطفِ بہاراں بودہ ای تا بہ زانو سودہ پائے ما و می پوئیم ما
(ص-۳۶)

مہر: ان اشعار کی صحیح صورت یہ ہے:

آفتاب عالم سر گشتگی ہائے خودیم تا بہ زانو سودہ پائے ما و می پوئیم ما
تا چہا مجموعہ لطف بہاراں بودہ ای میرسد بوے تو از ہر گل کہ می بوئیم ما

یہ غلطی طبع اول میں ہوئی (۱۸۶۲ء) لیکن پڑھنے والے پر مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔

ہم بہ عالم ز اہل عالم بر کنارافتادہ ام چوں امام سبحہ بیرون از شمارافتادہ ام
(ص-۲۸۴)

مہر: مطلع کا پورا مصرعہ ثانی فرخ حسین فرخ لاہوری کا ہے جو فرخ سیر کے عہد میں تھا۔ سوائے ردیف کے۔ شعر یوں ہے:

باسرو ساماں چنیں بے اعتبارم کردہ اند　　چوں امام سبحہ بیروں از شمارم کردہ اند

(شمع انجمن۔ص۔۳۷۰)

۵- دیوانِ غالبؔ جدید المعروف بہ نسخہ حمیدیہ۔ مرتبہ مفتی محمد انوارالحق مفیدِ عام پریس آگرہ۔ ۱۹۲۱ء

''آتشیں پا ہوں گدازِ وحشتِ زنداں نپوچھ
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا''

(ص-۱)

مہرؔ: آتشیں پا اور آتش زیرِ پا کا مطلب ایک ہے۔ ''گداز وحشتِ زنداں نپوچھ''۔ ''گداز وحشت زنداں'' غیر ضروری تھا لہٰذا اصلاح فرمائی۔

ع　اسدؔ ہے دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع
ع　نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

(ص۔۹۱)

مہرؔ: بیان میں زور پیدا ہوگا۔ پہلے مصرع میں صرف بیان تھا۔ اب اس کی دلیل بھی شامل ہوگئی۔

''چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں''

(ص-۱۳۳)

مہرؔ:

نامت زرشک پیش کسے چوں نے برم　　آیا سراغ از کہ کنم منزل شما

(غیاثی استر آبادی)

اگر سمجھا جائے کہ میرزا نے مضمون غیاثی ہی سے لیا تو واضح رہے کہ یہ مضمون کے باندھنے کی صحیح صورت وہ نہ تھی۔ جو غیاثیؔ نے اختیار کی۔ صحیح اور طبعی صورت وہی تھی جو

میرزا نے اختیار کی یعنی محبوب کا نام لیتے نہیں کیونکہ رشک اظہار کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کے بعد یہ طبعی صورت نہیں معلوم ہوتی کہ کہا جائے اب محبوب کے گھر کا سراغ کیونکر لگاؤں۔ نہایت عمدہ صورت یہی ہے کہ ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں میں کہاں جاؤں؟ کس طرف کا رخ کروں؟ شاید اسی طرح اتفاقیہ منزل محبوب کا سراغ مل جائے۔ جو لوگ کسی مکان یا مقام کا نام بھول گئے ہوں وہ اسی فکر میں رہتے ہیں کہ آس پاس کے رہنے والوں کی زبان پر اتفاقیہ وہ نام آجائے۔ ویسے بھی مختلف معروف ہستیوں کے مکانوں سے آس پاس کے مکانوں کا نشان بتایا جاتا ہے۔ میرزا کی یہی کوشش ہے کہ کسی کی زبان پر نام آجائے تو کچھ کہے بغیر اس کی طرف چل پڑیں۔

''نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو''

(ص-۱۴۹)

مہر:

از خرابی کس نمے گردد بہ گرد خانہ ام　　　پاسبانے نیست مشفق تر زویرانی مرا

(یاد رہے کہ مولانا نے نوائے سروش شرح دیوانِ غالبؔ کے صفحہ ۱۷ پر اس مضمون سے ملتا جلتا نظیریؔ نیشاپوری کا یہ شعر بھی درج کیا ہے:

بہ عریانی ازاں شادم کہ از تشویش آزادم　　　گریبانے ندارم تا کسے از دست من گیرد

''پا ترابِ سیل طوفان صدائے آب ہے''　　　(ص-۲۰۲)

مہر: ''بہارِ عجم'' میں'' پاتراب'' کوئی محاورہ نہیں۔ ''برہان قاطع'' میں بھی پاتراب نہیں ملا۔ بظاہر یہ فارسی نہیں۔

''ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں　　　شوق عناں گسیختہ دریا کہیں جسے''

(ص-۲۰۶)

مہر: نسخہ امروہہ میں یہ شعر یوں ہے:

ہے چشم تر میں حسرت دیدار سے سوا　　　شوق عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

''سوا'' بے حد بے محل معلوم ہوتا ہے۔ غالبؔ نے اس کی جگہ ''نہاں'' بنا کر شعر کو کمال پر پہنچا دیا۔

(حاشیہ) ''یہ شعر حاشیے پر بڑھایا گیا ہے اور اس کا آسان اور قریب الفہم ہونا خود ہی کہہ رہا ہے کہ یہ بعد کا کہا ہوا ہے۔''

(ص-۲۲۲)

مہرؔ: لیکن سوال یہ ہے کہ ''بعد کا'' سے کیا مراد ہے؟ یعنی سال دو سال یا دس بیس سال بعد؟ یہ زیادہ سے زیادہ اس وقت کہا ہو گا جب نظر ثانی شروع کی ہو گی۔

۶- شرح دیوان اردوے غالب از جناب مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی لکھنوی انوار المطابع لکھنؤ (سنہ ندارد)

۱- ''ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

(ص-۱۵۶)

یعنی پھر ہم تجھ سے محبت کر کے اپنے ساتھ دشمنی کیوں کریں، جب تجھے غیر کی محبت کا یقین ہو گیا۔''

مہرؔ: مطلب یہ ہے کہ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی مگر ہم بھی تو اپنے دشمن نہیں۔ یعنی تجھ سے محبت نہ کرنا اپنے ساتھ دشمنی کے مترادف ہے۔

۲- ''دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا موج خرام یار کے کیا گل کتر گئی

(ص-۱۷۰)

گل کترنا اور شگوفہ چھوڑنا ایک ہی معنی کے دونوں محاورہ ہیں یعنی کوئی ایسی بات کرنا جس سے فساد برپا ہو اور آپ الگ رہے۔''

مہرؔ: اس کے معنی اچنبھے کا کام کرنا بھی ہے۔

۷- نوائے سروش (شرح دیوانِ غالبؔ) از مولانا غلام رسول مہرؔ- شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور (۱۹۶۹ء)

(نوٹ) : میرا نسخہ ''نوائے سروش'' انٹر لیف شدہ ہے جس میں مولانا نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ اگر اسے الگ قلمبند کیا جائے تو 'مثنوی ہفتاد من کاغد شود' ایک اچھی خاصی جلد نقش پذیر ہو جائے۔ لہٰذا اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف تین مثالوں پر اکتفا کیا گیا:
حکایت بود بے پایاں ولیکن مختصر کردم۔

۱- ''عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا
(ص-۱۷۲)

موت کے بعد کی زندگی میں راحت و آسودگی ہر انسان کی طبعی اور فطری خواہش ہے۔ مختلف شاعروں نے اس کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ مثلاً عرفیؔ کہتا ہے:

امیدِ عافیت از مردن است و مے ترسم
کہ مرگ دیگر و آسودگی دگر باشد

یعنی مرنے کے بعد عافیت کی امید ہے لیکن مجھے اس خوف نے پریشان کر رکھا ہے کہ موت ایک شے ہے اور آسودگی بالکل دوسری شے۔ ضروری نہیں کہ موت بجائے خود ذریعہ آسودگی بن جائے۔ عرفیؔ کا یہی خیال شیخ ابراہیم ذوقؔ نے نہایت عمدہ انداز میں یوں پیش کیا ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

میرزا غالبؔ نے مفتی صدر الدین آزردہؔ مرحوم کی مدح میں جو بے مثال قصیدہ کہا ہے' اس کا مطلع یہ ہے:

زاں نمے ترسم کہ گردد قعرِ دوزخ جائے من
وائے گر باشد ہمیں امروز من ، فردائے من

یعنی میں اس سے نہیں ڈرتا کہ مرنے کے بعد مجھے دوزخ کی تہ میں پھینکا جائے گا اور وہی میرا مقام ہو گا لیکن اگر مجھے ویسی ہی زندگی مرنے کے بعد بسر کرنی پڑی، جیسی اب دنیا میں بسر کر رہا ہوں تو صد حسرت و افسوس کا مقام ہے۔ گویا دنیوی زندگی کی تکلیفیں اور مصیبتیں اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ ان کے مقابلے میں قعرِ دوزخ سے بھی کچھ ڈر اور خوف نہیں۔ اب آپ اصل شعر پڑھیے:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ　　　مرگئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

فارسی مثنوی ''ابر گہر بار'' کی مناجات میں جہاں محاسبہء اعمال کا منظر پیش کیا ہے وہاں زندگی کی مصیبتیں تفصیل سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بہر جرم کز روے دفتر رسد　　　زمن حسرتے در برابر رسد
بفرمائی کایں داوری چوں بود　　　کہ از جرم من حسرت افزوں بود
ہر آئینہ ہم چوں منے را بہ بند　　　تلافی فرا خور بود نے گزند

یعنی میرے نامہ اعمال سے جو گناہ مجھ سے جتلایا جائے گا میں اس کے مقابلے میں حسرت پر حسرت پیش کرتا جاؤں گا۔ فرمایئے اس صورت میں حضور کے عدل کا تقاضا کیا ہو گا۔ جب میرے گناہوں سے میری حسرتیں بڑھی ہوئی نظر آئیں گی۔ ظاہر ہے کہ مجھ ایسے گنہگار کے لیے تلافی نظر آئے گی نہ کہ سزا۔

۲- سر پا بے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی　　　رو سوے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات　　　''عارف'' ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

(ص-۴۴۷)

خواجہ غلام غوث خاں مرحوم کا ایک مکتوب ''انشائے بیخبر'' میں بنام منشی امین الدین خاں چھپا ہے جس میں اس قطعے پر نکتہ چینی فرمائی گئی ہے۔ خواجہ صاحب کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوف سے آگاہی رکھنے والے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اول اصحاب قال جو تصوف کی کتابوں نیز مصطلحات و دقائق سے واقف ہوتے ہیں۔ دوسرے اربابِ حال جو اپنی سرگزشت بیان کرتے ہیں۔ تیسرا گروہ ان دونوں طبقوں سے علٰیحدہ

ہے، جسے نہ علمِ باطنی سے تعلق ہے نہ علمِ ظاہری سے۔خواجہ صاحب نے میرزا کو تیسرے گروہ میں رکھا ہے اور قطعے کے اشعار کو باہم بے تعلق بتایا ہے۔بلا شبہ میرزا غالبؔ صاحبِ حالؔ نہ تھے یعنی ان معنی میں جو عموماً اس اصطلاح کے سمجھے جاتے ہیں حالانکہ صاحبِ حال ہونا ایک خاص قلبی یا روحانی کیفیت ہے جس کے لیے خاص شرطیں وضع کرنا ممکن نہیں۔ لیکن قطعے کے متعلق جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ تو قطعاً درخورِ قبول نہیں بلکہ اصل اشعار کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔عجیب بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے مصرع:

یعنی بحسب گردشِ پیمانۂ صفات

کی اصلاح کرتے ہوئے کہا کہ مصرع یوں ہوتا تو شعر کے معنی صاف ہو جاتے:

پیمانۂ صفات کو گردش اگرچہ ہو

حالانکہ اس طرح شعر کے معنی الجھ گئے، مصرع بے کیف ہو گیا اور بات کوئی نہ بنی۔ میرزا کا مقصد یہ ہے کہ پیمانۂ صفات کی گردش کے مطابق عارف کو حقیقت و اصلیت سے وابستہ رہنا چاہیے۔ یعنی وہ مستِ مئے ذات رہے۔ مثلاً ہر رنگ اور وضع کے پھول میں بہار کا اثبات، بے خودی میں خم کے پاؤں پر سر، مناجات میں قبلے کی طرف توجہ یعنی ظواہر سے ہٹ کر بواطن، مقاصد اور اصول پیشِ نظر رکھے جائیں۔

''بحسب گردشِ پیمانۂ صفات'' نہایت اچھا ٹکڑا ہے۔اس کی جگہ ''پیمانۂ صفات کو گردش اگرچہ ہو'' کچھ بھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے خواجہ صاحب شعروں کی معنویت پر غور نہیں فرما سکے اور انھوں نے بلا وجہ میرزا غالب کو حقیقت ناشناسوں میں شامل کر دیا۔ خواجہ صاحب کے علم و فضل سے ایسے انتقاد کی توقع نہ تھی۔

۳- ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

(ص-۲۰۷)

مطلب یہ کہ تمنا کی لذت نے مجھے اپنے دام میں الجھا لیا ہے۔ یہ مدعا نہیں کہ جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ حاصل ہو جائے۔ اس شعر کی معنویت تھوڑی سی تشریح کی محتاج

ہے:

۱- انسان کے لیے زندگی ایسی صورت میں دلچسپ و دلآویز ہو سکتی کہ دل میں تمنائیں اور آرزوئیں ہوں۔

۲- تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے انسان مختلف تدبیریں اختیار کرتا ہے۔ طرح طرح کے منصوبے بناتا ہے اور مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح وہ خود اور اس کائنات کی تمام دوسری چیزیں ایک فعال عنصر کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

۳- اگر مدعا بر آئے تو ظاہر ہے کہ انسان کی تدبیر آرائیاں اور سرگرمیاں ختم ہو جائیں گی اور زندگی کی دلآویزی بے معنی رہ جائے گی۔ کیونکہ خود انسان کی فعالیت ختم ہو جائے گی۔

۴- میرزا فرماتے ہیں کہ ہمارے لیے تمنا کی نیرنگیوں میں الجھے رہنا اچھا ہے کیونکہ زندگی کی بہار اسی کا نام ہے۔ ہم مدعا برآری سے اپنے اوپر سکون کی کیفیت طاری نہیں کرنا چاہتے جو زندگی کے لیے باعث ننگ ہے اور زندگی کو بے کیف بنا دیتی ہے۔

۵- ایسا بھی ہوتا ہے کہ جدوجہد میں کوئی مقصد تو پورا ہو ہی جاتا ہے۔ میرزا فرماتے ہیں کہ جزوی مقاصد بے شک پورے بھی ہوں لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم اپنے اصل مطلب کی تکمیل کے خواہاں ہیں کیونکہ اس کے ساتھ تو نیرنگ تمنا کا تماشائی بنے رہنا ممکن ہی نہیں رہے گا۔

میرزا غالبؔ پر مولانا غلام رسول مہرؔ کے مضامین کی فہرست

۱	غالبؔ کے پانچ پسندیدہ شعر	سالنامہ کاروان لاہور	۱۹۳۹ء
۲	غالبؔ کا سفرِ کلکتہ	۱۔ ماہنامہ اردو اورنگ آباد	اپریل ۱۹۳۶ء
		۲۔ماہنامہ قومی زبان کراچی	مئی ۱۹۶۸ء
۳	میرزا غالبؔ کا مقدمہ	علیگڑھ میگزین	۴۹-۱۹۴۸ء
۴	غالبؔ کی خاندانی پنشن	۱۔علیگڑھ میگزین	۴۹-۱۹۴۸ء
	(باضافہ و ترمیم)	۲۔احوالِ غالبؔ از مختار الدین احمد۔ انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۵۳ء
۵	میرزا غالبؔ اور میر تقی	ماہنامہ ماہِ نو کراچی	فروری ۱۹۴۹ء
۶	غالبؔ کے بہترین پانچ شعر (اہلِ نظر کی نظر میں) (فارسی پانچ، اردو پانچ)	انجمن ترقی اردو دہلی	۱۹۵۳ء
۷	جنگِ آزادی کی کہانی مکاتیب غالبؔ کی روشنی میں	ماہنامہ ماہِ نو کراچی	فروری ۱۹۵۳ء
	(غدر 1857ء خطوطِ غالب کے آئینے میں)	ماہنامہ تحریک دہلی	مارچ ۱۹۶۹ء
۸	غالبؔ کا تصورِ جنت و دوزخ	۱۔ماہنامہ ماہِ نو کراچی	فروری ۱۹۵۶ء
		۲۔ روزنامہ کوہستان لاہور	۱۶ فروری ۱۹۶۹ء
		۳۔ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ غالبؔ نمبر	فروری ۱۹۶۹ء

		۴۔ ماہِ نو کراچی (غالب نمبر)	جنوری، فروری ۱۹۶۹ء
۹	احوالِ غالب کی گمشدہ کڑیاں	ماہنامہ آجکل دہلی	فروری ۱۹۵۷ء
۱۰	پنج آہنگ	ماہنامہ آجکل دہلی	فروری ۱۹۵۸ء
۱۱	لطائفِ غیبی	اردوئے معلیٰ دہلی (غالب نمبر ۲)	فروری ۱۹۶۰ء
۱۲	غالب۔ دو شعر دو ستارے	ماہِ نو کراچی	فروری ۱۹۶۳ء
۱۳	غالب کی شاعری	۱۔ ماہِ نو کراچی	فروری ۱۹۶۳ء
		۲۔ ماہِ نو کراچی (غالب نمبر)	جنوری۔ فروری ۱۹۶۹ء
۱۴	حیاتِ غالب (چند گزارشیں)	۱۔ ماہِ نو کراچی	فروری ۱۹۶۴ء
		۲۔ ماہِ نو کراچی	فروری ۱۹۷۱ء
۱۵	احوالِ غالب (مشمولہ کلیاتِ غالب فارسی)	شیخ مبارک علی پبلشرز لاہور	۱۹۶۵ء
۱۶	غالب کے آٹھ شعر	ماہِ نو کراچی	فروری۔ ۱۹۶۵ء
۱۷	میرزا غالب کی صد سالہ برسی	۱۔ ماہِ نو کراچی	فروری ۱۹۶۶ء
		۲۔ ماہِ نو کراچی	جنوری۔ فروری ۱۹۶۹ء
۱۸	میرزا غالب	فولیو لاہور۔ مجلہ ایف سی کالج (غالب نمبر)	۱۹۶۷ء
۱۹	احوال و نقد غالب (پیش لفظ)	پروفیسر محمد حیات خاں سیال نذر سنز لاہور	۱۹۶۷ء

۲۰	خطوطِ غالبؔ کی اہم خصوصیات	مشمولہ احوال و نقد غالبؔ از پروفیسر محمد حیات خاں سیال نذر سنز لاہور	۱۹۶۷ء
	(ماخوز از خطوط غالبؔ۔ حصہ اول)	کتاب منزل لاہور	۱۹۵۵ء
۲۱	میرزا غالبؔ کے چند شعر	ماہِ نو کراچی (غالبؔ نمبر)	فروری ۱۹۶۷ء
۲۲	غالبؔ ذاتی تاثرات کے آئینے میں	مرتبہ: عبدالشکور احسن و سجاد باقر رضوی مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۶۹ء
۲۳	میرزا غالبؔ کی شاعری کے بعض پہلو	ا۔ گنجینہ غالبؔ پبلی کیشنز ڈویژن دہلی	۱۹۶۹ء
		۲۔ آجکل دہلی (غالبؔ نمبر)	فروری ۱۹۶۹ء
۲۴	افکارِ غالبؔ کے نئے زاویے	صحیفہ لاہور (غالبؔ نمبر)	جنوری۔ ۱۹۶۹ء
۲۵	فکرِ غالبؔ کی معجز نمائیاں (تقریر سرگودھا مورخہ ۳۰-۰۱-۶۹)	ا۔ روزنامہ امروز لاہور	۳۱۔ جنوری ۱۹۶۹ء
		۲۔ ماہنامہ افکار کراچی (غالبؔ نمبر)	فروری۔ مارچ ۱۹۶۹ء
۲۶	داستانِ فرہاد اور غالبؔ کا تصور محبت	ا۔ العلم کراچی (غالبؔ نمبر)	جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء
		۲۔ اردو زبان۔ سرگودھا	جنوری۔ فروری ۱۹۶۹ء

(غالب اور فرہاد از ملک حسن اختر بجواب داستان فرہاد اور غالب کا تصور محبت از مولانا مہر۔ تحریریں لاہور جلد نمبر ا شمارہ نمبر 2-1)

۲۷	حیاتِ غالب (چند گزارشیں)	ماہِ نو کراچی (غالب نمبر)	جنوری۔فروری ۱۹۶۹ء

(غالب اور فرہاد از ملک حسن اختر بجواب داستان فرہاد اور غالب کا تصور محبت از مولانا مہر
لاہور جلد نمبر ا شمارہ نمبر ۱-۲)

۲۸	غالب کی شاعری	نقوش لاہور (غالب نمبر 1)	فروری ۱۹۶۹ء
۲۹	میرزا غالب نقاد کی حیثیت سے	ا۔ ماہنامہ المعارف لاہور	فروری ۱۹۶۹ء
		۲۔ نگار کراچی	جنوری۔فروری ۱۹۶۹ء
۳۰	غالب کے ہم معنی اردو اور فارسی اشعار	سہ ماہی اردو، کراچی (غالب نمبر)	جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء
۳۱	دستنبو۔ واقعاتی پس منظر میں	مرتبہ: گوپال متل تحریک دہلی (غالب نمبر)	مارچ ۱۹۶۹ء
۳۲	نسخہ حمیدیہ (طباعت و تحقیق کی داستان)	سہ ماہی اقبال۔ لاہور	اپریل۔ ۱۹۶۹ء
۳۳	میرزا غالب کا مقام شعر گوئی	اوراق لاہور	اپریل۔ ۱۹۶۹ء
۳۴	صد سالہ تقریبات کی جھلکیاں (باتصویر)	روزنامہ جنگ کراچی	۱۳ مئی ۱۹۶۹ء
۳۵	میرزا غالب کا فارسی کلام (مسودہ راقم کے ذخیرہ غالبیات میں محفوظ ہے)	فنون لاہور	مئی۔ جون ۱۹۶۹ء
۳۶	اردو املا میں میرزا غالب کا اجتہاد	سب رس۔ حیدرآباد دکن	دسمبر۔ ۱۹۶۹ء

۳۷	بیاضِ غالب کی دریافت	۱۔نقوش۔ لاہور	جولائی۔۱۹۷۰ء
		۲۔نقوش لاہور (غالب نمبر حصہ سوم)	۱۹۷۱ء
۳۸	غالب۔شاعر امروز وفردا (اقتباسات تقریر از احسان بی اے)	روزنامہ امروز لاہور۔	۲۔نومبر۱۹۷۰ء
۳۹	اشاریہ غالب	۱۔نقوش ۔ لاہور (غالب نمبر حصہ سوم)	۱۹۷۱ء
		۲۔قومی زبان کراچی	نومبر۔۱۹۷۱ء
۴۰	غالب کی انسان دوستی	ہفت روزہ لیل ونہار لاہور	۱۵۔فروری ۱۹۷۱ء
۴۱	غالب	اردو دائرہ معارف اسلامیہ (حصہ ۲/۱۴) دانش گاہ پنجاب لاہور	۱۹۸۲ء
۴۲	میرزا غالب کی والدہ ماجدہ	دبستان (شمارہ غالب)	
۴۳	دیوانِ غالب مع شرح (مقدمہ)	عبدالرشید علوی حق برادرز انارکلی لاہور۔	

☆☆☆☆☆

فہرست کتب مصنفہ/مرتبہ مولانا غلام رسول مہرؔ

۱-	غالبؔ (میرزا غالبؔ کی نظم و نثر سے ماخوذ سوانح عمری)	مسلم پرنٹنگ پریس لاہور	۱۹۳۶ء
	(بعد کے ایڈیشن شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے شائع کیے)		
۲-	خطوطِ غالبؔ	کتاب منزل ۔ لاہور	۱۹۵۱ء
	(ایک یادگاری ایڈیشن مجلسِ مطبوعات یادگار غالبؔ پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا)		
۳-	قصائد و مثنویات فارسی	مجلسِ مطبوعات یادگار غالبؔ پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۶۹ء
۴-	قطعات، رباعیات، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس	مجلسِ مطبوعات یادگار غالبؔ پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۶۹ء
۵-	دیوانِ غالبؔ	شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ لاہور	۱۹۶۷ء
	(غالبؔ کی صد سالہ برسی پر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا)		
۶-	نوائے سروش (شرح دیوانِ غالبؔ)	شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ لاہور	(غیر مورخہ)
	(غالبؔ کی صد سالہ برسی پر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی)		

ڈاکٹر معین الدین عقیل

ملیشیا میں غالب کے نوادر

کوالالمپور، ملیشیا کے "INTERNATIONAL INSTITUTE OF ISLAMIC THOUGHT AND CIVILIZATION" (آئندہ : III TC) کا کتب خانہ اپنے ذخائر علمی اور بالخصوص عربی، فارسی، اردو مخطوطات کے لحاظ سے نہایت باثروت ہے۔ اس کے قلمی ذخیرے میں اسلامی ہند کے دورِ آخر کے متعدد اہم فارسی و اردو مخطوطات اس عہد کے مطالعۂ تاریخ و ادب اور تحقیق میں انتہائی قیمتی اور ناگزیر ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس کتب خانے کے ذخیرۂ عبدالرحمٰن بارکر میں غالب کے بھی چند نوادر موجود ہیں۔ یہاں مختصراً ان کی نشاندہی کی جاتی ہے:

(۱)

تحسین سروری (۱۹۱۷ء-۱۹۷۶ء) نے ''غالب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر''[۱] متعارف کرائی تھی۔ انھیں یہ تحریر ایک مخطوطے میں دستیاب ہوئی تھی جو پروفیسر عبدالقادر سروری (۱۹۰۶ء-۱۹۷۱ء) کی ملکیت میں تھا۔ اس مخطوطے کے بارے میں انھوں نے لکھا تھا کہ یہ کوئی پچاس ساٹھ اوراق کے حجم پر مشتمل ہے۔ کتاب کا نام ان سے پڑھا نہ جا سکا۔

کتاب کے نفس مضمون کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"حیدر آباد (دکن) میں نواب محمد وجہ الدین خاں معنی اور میر محمد زکی متخلص بہ زکی......... کے درمیان فن تاریخ گوئی کے......... (ایک) مسئلے پر بحث چھڑ گئی۔ وجہ الدین خاں کا کہنا تھا کہ تائے مستدیرہ جو تاریخ گوئی کی اصطلاح میں تائے مثناۃ بھی کہلاتی ہے اور ہائے مدورہ کی شکل میں لکھی جاتی ہے، بہ قاعدۂ ابجد اس کے چار سو عدد شمار کرنا چاہیے۔ لیکن میر زکی کہتے تھے کہ یہ قاعدہ غلط ہے۔ جب کہ کتابت میں واضح حرف ہائے ہوز ہو اس کے اوپر صرف دو نقطے لگا کر تانیث کے عدد شمار کرنا اصول کے خلاف ہے۔......... یہ بحث آگے بڑھتی گئی۔ دونوں نے نظائر و امثال اور اسناد و اشتہاد کے پیش کرنے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا۔ یہاں تک کہ ان دونوں کی بحث کے نتیجے میں ایک کتاب وجود میں آ گئی۔ پھر اس کتاب کو آخر میں چند سادہ اوراق کا اضافہ کر کے اس وقت کے ماہرین علم و فن کی خدمت میں رائے کے لیے بھیجا گیا تا کہ وہ سادہ اوراق پر اپنی رائے تحریر کریں۔ سب سے آخری ورق کے آخری صفحے پر غالب نے اپنی رائے تحریر کی ہے۔"

یہاں سے اس تحریر کو اخذ کر کے خلیل الرحمٰن داؤدی نے اپنے مرتبہ "مجموعہ نثر غالب اردو" میں اپنی تمہید کے ساتھ شامل کر لیا ہے۔[۲] یہی تحریر ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی اپنے مرتبہ مجموعے "غالب کی نادر تحریریں" میں "بہ نام نامعلوم" عنوان کے تحت درج کی ہے[۳] اور لکھا ہے کہ:

"غالب کا یہ خط کتاب مناظرہ معنی و زکی میں نقل کیا گیا ہے۔ جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ محمد اشرف صاحب انجینئر حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے۔"

انھیں یہ نقل ڈاکٹر مختار الدین احمد سے دستیاب ہوئی تھی۔ اس طرح غالب کی یہ تحریر مذکورہ کتاب کے کم از کم دو قلمی نسخوں سے دستیاب ہوئی۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی درج کردہ نقل کے آخر میں غالب کی مخصوص مہر بھی نقل کی گئی ہے جس پر سن موجود نہیں ہے۔ جب کہ تحسین سروری نے اسے ''ان کی وہی سنہ ۱۲۶۷ھ والی مشہور مہر'' بتایا ہے۔ پھر تحسین سروری نے غالب کی اس تحریر کے بعد نواب ضیاء الدین احمد نیر و رخشاں کی رائے اور ان کی مدور مہر ثبت ہونے کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی اطلاع دی ہے کہ:

> ''کتاب کے پشتے کے قریب روئے کتاب کی طرف اس زمانے کا مروجہ ڈاک ٹکٹ ابھی تک چپکا ہوا ہے، جس پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر اتری ہوئی ہے۔''

واقعہ یہ ہے کہ وہ مخطوطہ جو پروفیسر عبدالقادری سروری کی ملکیت میں تھا اور جس کی خصوصیات کا ذکر تحسین سروری نے کیا ہے، اب III TC کے کتب خانے میں پہنچ گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی طرح یہ عبدالرحمٰن بارکر کو حاصل ہو گیا اور ان کے متعدد مخطوطات و مطبوعات کے ساتھ اب مذکورہ کتب خانے کی زینت ہے۔

تحسین سروری کی بتائی ہوئی ساری تفصیلات تو اس مخطوطے میں موجود ہیں لیکن انھوں نے غالب کی اس تحریر کو مخطوطے کے آخری ورق کے آخری صفحے پر بتایا ہے۔ جب کہ دراصل یہ آخری ورق (۳۹) کے صفحہ ا کے وسط سے شروع ہو کر صفحہ ب کے وسط پر ختم ہوئی ہے۔ اس کے خاتمے پر غالب کی مہر سنہ ۱۲۶۷ھ کی شمولیت کے ساتھ ثبت ہے اور نیچے ترچھی سطور میں نواب ضیاء الدین خاں کی تحریر ہے۔ غالب کی تحریر سے قبل، ورق ۳۸ ب تا ۳۹ ا، الطاف حسین (حالی) کی تحریر ہے جو فارسی میں ہے اور غالبًا تا حال غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا آغاز یہ ہے:

> ''پوشیدہ مباد کہ فن تاریخ کہ از مخترعات متاخرین عجم بوداست نہ از اں قبیل است کہ کسے از گرانمایگان عالم.........''

نواب ضیاء الدین خاں کی تحریر کے بائیں جانب پشتے کے ساتھ ڈاک کے دو اصل ٹکٹ

بھی چسپاں ہیں۔ جن کی مالیت ۲/۱ آنہ ہے۔

مخطوطہ مجلد ہے اور اس کے استر پر ''افادات المعنی'' تحریر ہے۔ سائز ۶ انچ، فی صفحہ اوسطاً ۱۵ سطریں۔ یہ مذکورہ کتب خانے کی فہرست مخطوطات فارسی:

CATALOGUE OF PERSIAN MANUSCRIPTS IN THE LIBRARY OF THE INTERNATIONAL INSTITUTE OF ISLAMIC THOUGHT AND CIVILIZATION

مرتبہ حاجی علی بن حاجی احمد مطبوعہ، کوالالمپور، ۱۹۹۴ء میں نمبر شمار ۱۹۲ کے تحت شامل ہے۔

کتاب کے مرتب محمد وجیہ الدین معنی (۴) نے یہ مجموعہ مرزا محمد زکی بلگرامی کو ۲۳/ جمادی الاول ۱۲۸۵ھ (۱۱/ ستمبر ۱۸۶۸ء) کو پیش کیا تھا۔ جس بحث میں یہ مجموعہ مرتب ہوا اس کی بنیاد یہ مصرعہ تھا:

شد بنا ایں مسجد از بہر صلوٰۃ

جس سے ۱۲۶۶ برآمد ہوتے ہیں۔ اُس میں مسئلہ یہ تھا کہ ۃ صدورہ کے باعث چار سو عدد برآمد ہوتے ہیں یا پانچ سو؟ غالب، حالی، اور نواب ضیاء الدین خاں کے علاوہ جن ماہرین سے آراء لی گئیں، ان کے نام یہ ہیں:

مولوی عبداللہ، مولوی نیاز محمد بدخشانی، مولوی عارف شاہ، مولوی اعظم الدین بخاری، مولوی عبدالصمد ہراتی، مولوی کریم الدین، مولوی حسن علی مجددی، مولوی احمد علی احراری ساکن مصطفیٰ آباد، مولوی محمد ابو القاسم مدراسی، میر محمد حسین خاں بہادر شوستری افسر، مولوی محمد فضل اللہ خلف مولوی یوسف علی خان مرحوم، حکیم محمد مظفر الدین خراج، مولوی میر محمد شیرازی ناصری، مولوی سیّد علی شوستری، مولوی حیدر علی خاں، مولوی عبدالعلیم نصر اللہ خاں احمد پوری، منشی حبیب اللہ ذکا، مولوی محمد حسین راقم المخاطب بہ شیریں سخن، خان

بہادر افضل الشعرأ، مولوی نجم الدین حسن قادری افضل، مولوی سیّد
شاہ محمد، مولوی فضل حق، مولوی محمد زمان خاں، مولوی آلِ حسن،
مولوی محمد صدیقی، میر مہدی ثاقب، ملا مراد علی۔

(۲)

غالب اور میر سیّد علی غمگین خدانما (۱۷۵۳ء-۱۸۵۱ء) کے روابط متعدد محققین کا موضوع رہے ہیں[۵] ان دونوں کی باہمی مراسلت بھی سامنے آتی رہی ہے۔[۶] اس مراسلت کو غمگین کے ایک مرید خاص حافظ ہدایت النبی نے ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۲ء میں نقل کر کے محفوظ کر لیا تھا جو کتب خانہ فقیر منزل، گوالیار میں موجود ہے۔ اس مخطوطے میں غمگین کے چار خطوط اور غالب کے دس خطوط غمگین کے نام اور مزید دو خطوط ان کے لکھنوی احباب کے نام شامل ہیں۔

اس مجموعہ مکاتیب کے کسی اور مخطوطے کا علم عام نہیں ہے۔ لیکن اس کی ایک نقل کوالالمپور کے مذکورہ ادارے کے کتب خانے میں ذخیرۂ عبدالرحمٰن بارکر میں بہ ذیل شمار ۱۹۱، فارسی، موجود ہے جو ۲۷/ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء کو گوالیار میں مکمل ہوئی تھی۔ کتب خانے کی مذکورہ فہرست مخطوطات فارسی کے فہرست نگار نے اس کے مرتب کا نام ہدایت اللہ تحریر کیا ہے۔ جسے دراصل ہدایت النبی پڑھا جانا چاہیے تھا۔ پھر ان خطوط کو غیر مطبوعہ بتایا ہے۔ جو غلط ہے۔

مخطوطہ نہایت کرم خوردہ اور زردی مائل کاغذ پر ہے اور چونکہ اوراق کو دونوں جانب سے مومی کاغذ چسپاں کر کے محفوظ کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے اس لیے متن کا پڑھنا دشوار ہے۔ روشنائی سیاہ ہے۔ لیکن کہیں کہیں مکتوب نگار کے نام پر سرخ خط کھینچ کر نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خط پختہ نستعلیق ہے۔ مکتوبات ۱ تا ۴۵ صفحات کا احاطہ کرتے ہیں۔ صفحات کا نمبر شمار بعد میں پیشانی پر درمیان میں درج کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مکتوبات پر مشتمل یہ متن کسی اور متن کے ساتھ کتابت اور مجلد کیا گیا تھا، جسے بعد میں

علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ پیشانی پر بائیں جانب اوراق کے نمبر شمار درج ہیں۔ جن کے مطابق یہ متن ورق ۱۶۲، الف سے شروع ہو کر ۱۸۴ ب پر ختم ہوا ہے۔ متن کے آغاز سے پہلے اور اختتام کے بعد کے صفحات سادہ ہیں۔ سائز ۶×۹ انچ، فی صفحہ ۱۵ سطریں۔

مخطوطے کے متن اور مکاتیب مرتبہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ و وزیر الحسن عابدی کے متن میں گاہے لفظی اختلافات موجود ہیں۔ القاب و تخاطب میں بھی کہیں کہیں فرق موجود ہے۔ غالب کے وہ خطوط جو انھوں نے اپنے لکھنوی احباب کو، جن کے نام موجود نہیں، لکھے تھے۔ وہ دونوں خطوط زیر نظر مخطوطے میں ڈاکٹر عبداللہ و وزیر الحسن عابدی کے مرتبہ متن کے مطابق غالب کے آٹھویں خط کے بعد شامل ہیں۔ مخطوطے میں خطوط کی ترتیب اس طرح ہے:

تمہید	صفحہ	۱	تا	۲
غالب کا پہلا خط		۲	تا	۳
غمگین کا جواب		۴	تا	۷
غالب کا دوسرا خط		۷	تا	۱۲
غمگین کا جواب		۱۲	تا	۱۸
غالب کا تیسرا خط		۱۸	تا	۲۲
غمگین کا جواب		۲۲	تا	۲۸
غالب کا چوتھا خط		۲۸	تا	۳۰
غالب کا پانچواں خط		۳۰	تا	۳۲
غالب کا چھٹا خط		۳۲	تا	۳۵
غالب کا ساتواں خط		۳۵		
غالب کا آٹھواں خط		۳۵	تا	۳۷

غالب کے خط لکھنوی دوست کے نام:

(۱)	۳۷	تا	۳۹

(۳)

''دعائے صباح'' حضرت علیؓ کی مبینہ پسندیدہ دعاؤں کے مجموعے ''صحیفۂ علویہ'' میں شامل ایک معروف دعا ہے جس کا ایک منظوم فارسی ترجمہ غالب نے کیا تھا۔ غالب کی تصانیف کی فہرست میں اس کا حوالہ بالعموم معدوم رہا ہے۔ جب اس کی اولین اشاعت ۱۸۶۷ء سے ۱۹۷۷ء میں کالیداس گپتا رضا (۱۹۲۵ء-۲۰۰۱ء) کی محققانہ ترتیب و اشاعت تک، اِس کا ذکر عام نہ رہا۔ حالانکہ اس کی معلومہ چوتھی اشاعت مولانا امتیاز علی خاں عرشی (۱۹۰۴ء-۱۹۸۱ء)(۷) اور ساتویں اشاعت مالک رام (۱۹۱۲ء-۱۹۹۳ء)(۸) کے اہتمام سے منظر عام پر آئی۔ لیکن پھر بھی اسے عام شہرت حاصل نہ ہو سکی تھی۔ گپتا رضا نے اسے ایک معلوماتی مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے اور اس کی سابقہ اشاعتوں کی تفصیلات پیش کی ہیں۔(۹)

چونکہ غالب کا منظوم ترجمہ خود غالب کی حیات میں شائع ہو چکا تھا اور پھر گاہے بگاہے بعد میں چھپتا بھی رہا۔ اس لیے اس کی قلمی نقلیں ضروری نہ تھیں۔ اولین اشاعت (۱۸۶۷ء) کی ایک نقل رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے، جسے مولانا عرشی نے شائع کیا تھا۔ مزید نقلوں کا علم نہیں لیکن اس کی ایک نقل ایک بیاض میں کوالالمپور کے مذکورہ ادارے کے کتب خانے میں ذخیرۂ عبدالرحمٰن بارکر میں بہ ذیل فارسی ۱۴۷ (۳) موجود ہے۔ اسے فہرست نگار نے سہواً غیر مطبوعہ بتایا ہے۔

بیاض نہایت عمدہ حالت میں تقریباً ۷×۳ انچ سائز کے ۴۲۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ حکیم سیّد مظفر حسین حیدر آبادی کی ملکیت تھی جسے انھوں نے متعدد حضرات کو پیش کر کے

ان سے ان کی پسندیدہ نظم و نثر کی تحریریں خود ان کے اپنے قلم سے لکھوائیں۔ اس طرح یہ بیاض مزید افادیت کی حامل بن گئی۔ یہ کل ۳۵ اقتباسات پر مشتمل ہے جن کی تفصیلات مذکورہ ذخیرۂ فارسی مخطوطات کے فہرست نگار نے درج کی ہیں۔

بیاض کا آغاز ہی ''شرح دعائے صباح'' سے ہوتا ہے۔ ورق ۱، الف تا ۱۴، الف: پھر اصل ''دعائے صباح'' ورق ۱۴، الف تا ۱۵، ب تحریر کی گئی؛ اس کے بعد غالب کا منظوم ترجمہ، ورق ۱۶، الف تا ۱۵، الف ہے اور پھر غالب کا ''ہفت بند درشانِ مشکل کشا''، ورق ۱۸، ب تا ۲۰، ب تحریر ہے۔ ہفت بند کے خاتمے پر یہ ترقیمہ لکھا گیا ہے:

ایں اوراق کہ مشتمل است بر شرح و متن دعائے صباح کہ ....

بموجب فلاح است با ترجمۂ منظومۂ آن از شاعر مشہور غالب مغفور و

ہفت بند .... در منقبت فاتح خیبر، حسبِ فرمودۂ حضرت قبلہ

گاہی جناب سیّد علی حسن صاحب قبلہ و کعبہ حسینی واسطی بلگرامی مدظلہ

و دام ظلہ العالی در عشرِ آخر ثلث اول سال ہلالی سیزدہ صدوسی و یکم راقم

آثم بندہ فضل حسن بخطۂ دکن بخط زشت نوشت:

ناظر بچشم مہر نکر اجر برخدا است
کاتب ز خط خود خجل و چشم بردہ است

گپتا رضا کے مرتبہ متن کے درج ذیل اشعار بیاض میں موجود نہیں:

صفحہ ۱۸: شعر ۱، ۲، ۳، ۴

صفحہ ۱۹: شعر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶

صفحہ ۲۰: شعر ۱، ۲

جبکہ بیاض کے درج ذیل اشعار گپتا رضا اور امتیاز علی خاں عرشی کے پیش کردہ متون میں شامل نہیں، لیکن مرتضیٰ حسین فاضل (۱۹۲۳ء-۱۹۸۷ء) کے مرتبہ ''کلیات غالب فارسی'' جلد اوّل [۱۰] میں شامل ہیں۔

گپتا رضا کے پیش کردہ متن، صفحہ ۱۷، شعر ۴ کے بعد:

کن تو ایں شام مرا بہ من سپر — از مکائد ہائے اعدا پرشرر
دہ نجاتم از ہواے نفس بد — زاں کہ ہستی قادری بر نیک و بد
ہرچہ خواہی می کنی تو ہر زمان — ای تواناتر خداے مہربان
ہر کرا خواہی تو ملکی مید ہی — تاج شاہی برسرش ہم می نہی
می ستانی باز ملک و مال را — آں چہ خواہی میکنی اموال را

پھر صفحہ ۱۸، شعر ۵ کے بعد:

ہست در دستِ تو خیرو نیکوئ — قادرے برجملہ اشیأ بس توئ
روز را درشب تو پنہاں می کنی — ہم توئ شب را بروزے آوری
زندہ از مردہ ہویدا می کنی — مردہ را از زندہ پیدا می کنی

بیاض کے ورق ۴۰۵، الف پر بھی غالب کے متفرق تین اشعار درج ہیں، جنھوں آغا حسن برتی نے تحریر کیا ہے۔

ان سب سے قطع نظر، غالب کا 'ہفت بند درشانِ مشکل کشا'' زیادہ قابل توجہ ہے، جو راقم کے علم کی حد تک، تاحال غیر مطبوعہ ہے۔ یہ ان دنوں زیر مطالعہ ہے اور علیحدہ ترتیب کے منصوبے میں ہے۔

❖ ❖ ❖

حوالے

(۱) مشمولہ: ''اردو نامہ'' کراچی، شمارہ ۵، جولائی ۱۹۶۱ء، ص ۹-۱۲

(۲) لاہور، ۱۹۶۷ء ص ۳۲۱-۳۲۷

(۳) دہلی، ۱۹۶۱ء ص ۱۷۲-۱۷۳

(۴) ان کا ذکر نور الحسن خاں ''نگارستان سخن'' (بھوپال، ۱۲۹۳ھ) ص ۹۹ میں ہے۔ مظفر حسین صبا

''روزِ روشن'' (تہران، ۱۳۴۳) ص ۷۵۴-۷۵۵ میں مغنی بتایا گیا ہے۔ میر شمس الدین فیض (۱۷۸۰ء-۱۸۷۵ء) کے شاگرد تھے۔

(۵) حالات اور روابط کے لیے: محمد یونس خالدی ''مطالعہ حضرت غمگین دہلوی'' (علی گڑھ، ۱۹۶۳ء) محمد مسعود احمد ''سیّد علی غمگین'' مشمولہ ''نوائے ادب'' (بمبئی، اپریل، ۱۹۶۳ء)۔ یہی مصنف ''حضرت غمگین غالب کی نظر میں'' مشمولہ ''اردو'' (کراچی، اکتوبر ۱۹۵۹ء): سید شاہ رضا محمد حضرت جی گوالیاری، مقدمہ، مشمولہ ''مخزن الاسرار'' مصنفہ سیّد علی غمگین (گوالیار، ۱۹۶۳ء): ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ''غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات'' مشمولہ ''یاد و بود غالب'' دہلی، ۱۹۹۳ء)

(۶) مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ''غالب کے فارسی رقعات'' مشمولہ ''اردوے معلّٰی'' (دہلی، فروری، ۱۹۶۰ء، ص ۱۳۰-۱۵۶؛ فروری، ۱۹۶۱ء، ص ۸۶-۱۰۵)؛ ڈاکٹر سیّد عبداللہ و سیّد وزیر الحسن عابدی ''غمگین و غالب کے فارسی خطوط'' مشمولہ ''اورینٹل کالج میگزین'' (لاہور، فروری ۱۹۶۴ء) ص ۱-۴۷؛ محمد مسعود احمد ''مرزا غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی مکتوب'' مشمولہ ''اردو نامہ'' (کراچی، شمارہ ۱۸) ص ۸۱-۸۳۔ یہاں مقالہ نگار نے ان خطوط کے مطالعے کے مزید حوالے درج کیے ہیں۔

(۷) ''نگار'' (لکھنؤ) مئی ۱۹۴۱ء

(۸) مشمولہ: "K.G.SAIYIDAIN COMMIMORATION VOLUME" (دہلی، ۱۹۶۴ء)

(۹) (بمبئی، ۱۹۷۷ء)؛ جب کہ اس کے منثور و منظوم اردو، فارسی، انگریزی ترجمہ پر مشتمل ایک حالیہ اشاعت کراچی سے ۱۹۹۶ء میں سیّد الطاف نظر زیدی اور سیّد اسد رضا نقوی کے اہتمام سے منظر عام پر آئی ہے۔

(۱۰) (لاہور، ۱۹۶۷ء) ص ۴۱۹-۴۲۹

◇—◇—◇

ڈاکٹر عارف نوشاہی

وزیر/ وزیری

گیارھویں صدی ہجری کے ایک
تاتاری نژاد چینی شاعر کے حالات اور فارسی شاعری

۱۹۷۸ء میں افغانستان میں سوویت یونین کی فوجی مداخلت نے جہاں ایک طرف وسیع انسانی آبادی کو ملک سے انخلا اور ہجرت پر مجبور کیا، وہاں اُس کے کثیر الجہات منفی تہذیبی اثرات بھی مُلک پر پڑے۔ ایک بہت ہی محسوس کی جانے والی تباہی کتب خانوں اور ذخائر مخطوطات پر نازل ہوئی جس سے افغانستان کے سرکاری کتب خانے بھی محفوظ نہ رہ سکے اور وہاں سے نکالے جانے والے اور بعض دیگر ذاتی کتب خانوں کے قلمی نسخے ہمسایہ ملک پاکستان پہنچنے لگے اور یہاں ان کی کسی روک ٹوک کے بغیر خرید و فروخت ہونے لگی۔ چونکہ ابھی تک (اوائل ۲۰۰۱ء) افغانستان میں خانہ جنگی جاری ہے اور وہاں ایسے حالات پیدا نہیں ہو پائے جن میں کتب خانے اور تحقیقی ادارے پھر سے یکسوئی کے ساتھ علمی کام کر سکیں، لہٰذا وہاں سے مخطوطات کی منتقلی کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کی حکومتوں نے اِس ثقافتی ورثے اور علمی سرمائے کی بربادی سے کبھی تعرض نہیں کیا اور اس پر روک لگانے کے لیے کوئی انتظامی قدم نہیں اٹھایا۔ جو نسخے پاکستان پہنچتے ہیں ان میں سے کچھ یہاں کے ذاتی، سرکاری یا نیم سرکاری کتب خانوں

میں کھپ جاتے ہیں، بقیہ دیگر ممالک کے کتب خانوں اور اداروں کو بیچ دیے جاتے ہیں جن میں ایران، سعودی عرب، ملائشیا اور برونائی دارالسلام وغیرہ شامل ہیں۔ حکومتِ پاکستان نے بھی نوادرات کی بیرون ملک منتقلی پر پابندی کے قانون کے باوجود ان نوادر کو ملک سے باہر جانے سے کبھی نہیں روکا۔ ایسی صورت حال میں واقفانِ حال اور محققین کی صدائے احتجاج محض نقار خانے میں طوطی کی آواز ہے۔

مجھے مخطوطات کے علمی پہلو سے جو دل چسپی ہے، اس وجہ سے افغانستان سے پاکستان منتقل کیے جانے والے مخطوطات دیکھنے افغان کتب فروشوں یا پاکستانی خریداروں کے ہاں جاتا رہتا ہوں یا وہ ازخود مخطوطات کی قدر و قیمت جاننے کے لیے نسخے مجھے دکھا دیتے ہیں۔ افغانستان سے آنے والے کچھ نادر مخطوطات پر مقالے بھی لکھ چکا ہوں۔[1] ۲۰۰۱ء کے اوائل میں وہاں سے ایک گوہر نایاب ''کلیات وزیری'' پاکستان پہنچا ہے اب لاہور میں جناب خلیل الرحمان داودی[2] کے پاس آیا ہے اور انھوں نے مجھے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا موقع فراہم کیا جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔ یہ بھی وہاں کے شاہی اور قومی کتب خانے کا سرمایہ تھا۔ آیندہ صفحات میں اپنا حاصلِ مطالعہ پیش کر رہا ہوں۔

کلّیات وزیری کے نسخے کے ظاہری کوائف حسب ذیل ہیں۔ حجم: ۸۱۶ صفحات یا ۴۰۸ ورق، ۱۸سطوری صفحہ تقطیع: ۲۷ × ۱۷ اسنٹی میٹر؛ جلد: چرمی مضبوط، کاغذ: مٹیالا/خاکی؛ خط: معمولی نستعلیق، بلا تاریخ، بارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ نسخے کے ابتدا اور خاتمے پر کچھ یادداشتیں ہیں جن سے نسخے کے مختلف ادوار میں پرانے مالکوں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ مثلاً نسخے کے آخری ورق (۴۰۶ ب) پر یہ یادداشت: ''این کتابِ عوض خان بن قبادخان است، روز جمعہ خریدہ شد۔ مبلغ چہار روپیہ در نوشحر [کذا: نوشہر؟] در ۱۱۵۲ بود''۔ اسی عوض خان نے نسخے کے شروع میں اپنی اکیس پشتوں کا شجرہ لکھا ہے۔ پوری تحریر اسی طرح ہے: ''نسب نامۂ عوض خان: عوض خان ابن قباد خان ابن خوجہ مرزا

ابن خوجہ محمد مسحود [کذا] ابن محمد یوسف ابن امیر کو جکہ ابن حسن بن ملک اصل الدین حسین ابن ملک رئیس میرک ابن ملک محمد مسعود ابن مولانا محمود ابن ملک محمد قاسم زرین کمر ابن ملک شمس الدین حسین ابن ملک محمد حسین ابن ملک معز الدین حسین ابن ملک غیاث الدین حسین ابن محمو [د] ابن محمد ابن ہشام ابن حسین سلاطین کثرت مشحور [کذا: مشہور] بغور عراق عجم سلطان مشرقین شہنشاہ مغربین محمود بن محمد ہشام بن حسین۔ تحریراً فی التاریخ چہاردہ ماہ سفر [کذا: صفر] سنہ ۱۱۵۲ یادگاری تحریر نمودہ شد''۔ اسی عوض خان نے نسخے کے اوراق ۱۳۱ ب تا ۱۳۳ الف کے حاشے پر کچھ اشعار نقل کیے ہیں اور آخر میں اپنا نام یوں لکھا ہے: ''الٰہی خیر باد عاقبت در التاریخ [کذا] ۵۳ [۱۱] العبد عوض خان''۔ عوض خان کے طرزِ کتابت اور جملہ بندی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی زیادہ تعلیم یافتہ شخص نہیں تھا۔ نسخے کے شروع یا آخر کے اوراق میں اپنے خاندان میں پیدایشوں اور اموات کی تاریخیں لکھ دی جاتی تھیں، اس نسخے کے شروع اور آخر میں بھی ایسی بہت سی یادداشتیں ہیں جو سب کی سب ولادت سے متعلق ہیں۔ میرا اپنا گمان یہ ہے کہ یہ عوض خان کے بیٹوں یا قریبی عزیزوں کی تاریخیں ہیں کیوں کہ یہ اُسی خط میں ہیں جس میں اس نے اپنے دستخط کیے ہیں، زمانہ بھی وہی ہے۔ کچھ یادداشتیں نقل کرتا ہوں:

۱۔ تولد شدن اسفند یار خان در بیست [و] ہفتم ماہ محرم شد [کذا] در تاریخ ۱۱۳۹۔

۲۔ تولد شدن شاہ سوار خان بتاریخ بیست نوہم [کذا: بیست و نہم] ماہ مبارکہ رمضان در ۱۱۵۲ بود۔

۳۔ تولد شدن شاہ نواز خان بتاریخ دہم ماہ مبارکہ رمضان ۱۱۵۷ بود۔

۴۔ تولد شدہ شاہ مغل بتاریخ پانزدھم ماہ رجب بود در ۱۱۶۱۔

پہلے صفحے پر ایسی مزید سات تاریخیں ہیں۔ آخری صفحے پر جہاں عوض خان کی نسخہ خریدنے کی یادداشت موجود ہے اس کے اوپر ایک اور یادداشت ہے: ''باز این کتاب را یار محمد خرید از اسفند یار [بہ] مبلغ چہار [و] نیم روپیہ در ۱۱۸۶ کاتب الحروف میر عبدالرحمان''۔ ممکن ہے یہ اسفند یار وہی ہو جو ۱۱۳۹ میں پیدا ہوا اور ہمارے گمان کے

مطابق عوض خان کا بیٹا ہے اور عوض خان کی وفات کے بعد یہ نسخہ اس کی تحویل میں آیا ہو اور اُس سے عبدالرحمان نے خرید لیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ان ہاتھوں سے ہوتی ہوئی یہ کتاب بعد کے زمانوں میں کابل کے شاہی کتب خانے میں پہنچی جیسا کہ چند ایک مُہروں سے پتا چلتا ہے۔ مُہروں کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ورق ۱ ب پر سیاہ روشنائی سے آٹھ کونوں والی ۱،۷۵ × ۱،۷۵ سنٹی میٹر کی یہ مہر ''مُہر کتاب خانۂ مبارکہ امیر عبدالرحمان''۔ یقیناً یہ افغانستان کے بارک زئی خاندان کا بادشاہ امیر عبدالرحمان ہے جس کا زمانۂ حکومت ۱۲۹۷-۱۳۱۹ھ ہے۔

ورق ۱ ب پر بنفشی روشنائی سے آٹھ کونوں والی ۲،۵ × ۳،۵ سنٹی میٹر کی یہ مُہر:
''کتابخانۂ ملّی دارالسلطنہ کابل ۱۲۹۸۔''

ورق ۲ الف اور ۳۹۷ ب پر پانچ کونوں (مستطیل مایل) والی مہر جو سیاہ روشنائی سے لگائی گئی ہے، سائز: ۲،۵ ×۵٫۵، سنٹی میٹر، اس میں صرف ''للہ کتابخانۂ مبارکہ'' لکھا ہے۔ اسی عبارت کی ایک اور مُہر لیکن بیضوی شکل کی اور سائز میں چھوٹی ۱،۵ × ۱ سنٹی میٹر ورق ۱۴۰ الف اور ۲۱۷ الف پر ثبت ہے۔

ورق ۱۸۱ الف اور ۳۹۷ ب پر سیاہ روشنائی سے آٹھ کونوں والی ۱،۷۵ × ۱،۷۵ (پونے دو) سنٹی میٹر کی مہر جس میں '' للہ مہر کتاب خانۂ مبارکہ'' لکھا ہے۔ کتاب خانۂ مبارکہ سے مراد وہی شاہی کتب خانہ ہے۔

عام طور پر شاہی کتب خانوں میں نفیس، مطلا و مذہب اور خوشنویسی کے عمدہ نمونوں پر مشتمل نسخے داخل کیے جاتے تھے، لیکن ہمارے اس نسخے میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ یہ محض اپنے متن یا مندرجات کے اعتبار سے اہم ہے۔

نسخے کے مندرجات:

پیشِ نظر مخطوطے میں وزیری —— جس کے بارے میں ہم مضمون کے اگلے حصے میں بات کریں گے —— کا مختلف اصناف میں کلام درج ہوا ہے۔ نسخے کی جلد بندی کے وقت اوراق آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔ خود کاتب نے بھی کسی ترتیب کو چنداں ملحوظ نہیں رکھا۔ موجودہ ترتیب کے مطابق ہم کلام اور مندرجات کا تعارف کروا رہے ہیں:

ورق ا ب تا ۱۹ ب: ردیف ہائے الف، ت، د، ر، ز، س، ش، ط کی بلا ترتیب چھہتر (۷۶) غزلیں؛

ورق ۲۰ ب: ایک مثنوی کے باقی ماندہ نو اشعار۔

پہلا شعر:

شیر دلی کو کہ درین راہ دور
گرم قدم ماندہ و باشد صبور

آخری شعر:

ما نظر العین الاّ غیرکم
اقسم باللہ و آیاتکم

اس مثنوی کا موضوع مندرجہ ذیل شعر سے متعین ہوسکتا ہے:

گفت وزیری سخن از حال عشق
سطر سخنہاش شدہ بال عشق

ورق ۲۰ الف تا ۲۱ ب: مثنوی داستان حقایق الاشیاء در بیان عرش، لوح و قلم و پیدایش۔

پہلا شعر:

ای خداوند عرش و لوح و قلم
جملہ آوردہ ای برون ز عدم

آخری شعر:

داستان عجب وزیری گفت
روز و شب دیدہ ھا ز فکر نخفت

مصنف نے یہ مثنوی اپنے بڑھاپے میں کہی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے
پتا چلتا ہے:

موی سر شد مرا چو برف سفید
بین کہ پیری بسر دو اسبہ رسید
در جوانی گرتختم چندان
کہ زگفتن نماند یک دندان

(۲۱ الف)

ورق ۲۱ ب تا ۲۵ الف: مثنوی ساقی نامہ و تعریف بادشاہان چغتی کہ در ملک
ہندوستان گشتہ اند۔

پہلا شعر:

بدہ ساقی آن جام مستان مست
کہ چون چشم ساقی شوم مَی پرست

آخری شعر:

سما بر سہام و زمین بر تگرگ
بمیدان ز ہر سو بباریدہ مرگ

اس مثنوی میں پہلے ساقی نامہ ہے۔ پھر تیموری بادشاہوں کا ذکر اس ترتیب سے
ہے: تیمور، شاہرخ، الغ بیگ، بابر اور بابر کی پانی پت کے میدان میں ابراہیم افغان کے
ساتھ جنگ۔

ورق ۲۴ الف تا ۲۶ الف: مثنوی بلا عنوان در حال کواکب

پہلا شعر:

شد قلم بلبل این بوستان
نغمہ سرا گشت بصد داستان

موضوع کی طرف اشارہ اس شعر میں ہوا ہے:

حال کواکب بکنم من بیان
ہست ز کوکب ہمہ سود و زیان

ورق ۲۶ الف تا ۳۲ الف: داستان جواب و سوال ابوزر جمہر [کذا: بزرجمہر]

پہلا شعر:

گفت بدانا چوا نوشیروان
گویی سخنہا تو ز نفع و زیان

آخری اشعار:

گفت وزیری سخنان عجب
تا کہ پسندند ہمہ اہل عرب
گفت بدیہہ ہمہ داستان
ماند سخنہاش بروی جہان

یہ داستان پہلے نثر میں تھی، وزیری نے اسے نظم میں منتقل کیا ہے:

نثر بُد این موعظہ ھا گشت نظم
خاطر من کردہ بگفتن چو عزم

(۳۱ ب)

اس میں بزرجمہر کی چالیس نصیحتیں ہیں:

ہست چہل موعظہ این داستان
می کنم اینک ہمہ را من بیان

(۲۶ الف)

ورق ۳۲ الف۔ ۳۳ الف: مثنوی بلا عنوان در وصفِ سخن

پہلا شعر:

شک نیاری تو در کلام خدا
ہست شکّاک کافرِ دو سرا

آخری شعر:

داستان عجب وزیری گفت
با زبان قلم گہر ہا سُفت

اس مثنوی میں مصنف نے سخن یعنی شاعری کی عظمت بیان کی ہے اور اپنے بارے میں کہا ہے:

نام من زندہ از سخن شدہ است
سخنم شمع انجمن شدہ است
تا سخن ہست نامِ من باقیست
بزمِ عیش مرا سخن ساقیست

ورق ۳۳ ب تا ۳۵ ب: مثنوی بلا عنوان در شرح بروج دوازدہ گانہ

پہلا شعر:

نقش طرازندۂ این داستان
زد رقم صدق ز حال جہان

شاعر نے اس مثنوی میں بارہ بُرجوں کے کوائف بیان کیے ہیں:

شرح دہم باز ہمہ بُرجہا
حالت ہر یک بکنم من جدا

(۳۴ الف)

ورق ۳۶ الف یا ٦٦ ب: ردیف ہاے الف، ب، ت، ث، ج، ح، خ، د، کی بلا ترتیب غزلیں، حصہ اول، درمیان اور آخر سے ناقص ہے۔

ورق ۶۷ الف: معراج نبوی کے بیان میں ایک مثنوی کے باقی ماندہ صرف تین اشعار:

شکر خدا کرد وزیری بجان
کرد چو معراج نبی را بیان
آن کہ ز معراج نبی منکراست
در نظر اہل یقین کافر است

ورق ۶۷ الف تا ۶۷ ب: قارون اور اس کے خزانے کے بارے میں مثنوی

پہلا شعر:

قصۂ قارون بشنو گنج او
از سبب گنج نگر رنج او

آخری شعر:

قصۂ قارون چو وزیری بگفت
تا گہر نظم خود الماس سُفت

ورق ۶۷ ب تا ۶۸ الف: قصۂ ابرہہ

پہلا شعر:

ابرھہ یک کافر بد بخت بود
عزم سواری سوی مکہ نمود

ورق ۶۸ الف تا ۷۰ ب: قصۂ ولادت حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام

پہلا شعر:

موسیٰ عمرانست کلیم خدا
قصۂ او گوش بکن ز ابتدا

آخری شعر:

گفت وزیر سخن از کلام
کرد چنین قصۂ موسیٰ تمام

ورق ۷۰ ب تا ۷۲ ب: قصۂ حضرت ابراہیم خلیل اللہ و نمرود

پہلا شعر:

قصہ بشنو تو ز خلیل خدا
لطف خدا گشت باو رہنما

آخری شعر:

گفت چنین قصۂ مشکل وزیر
بندۂ مومن شو و یاد گیر

ورق ۷۲ ب تا ۷۳ الف: داستان درمعنی ایمان

پہلا شعر:

نکتۂ ایمان چو کنم من بیان
بندۂ مومن تو ہمین نوع دان

ورق ۷۳ الف تا ۷۴ ب: داستان رموز دنیا

پہلا شعر:

چار کس از نہ دہ چون آمدیم
چار تن القصہ برہنہ بُدیم

آخری شعر:

گفت وزیری سخنی از رموز
داشت چو در خاطر ویران کنوز

ورق ۷۴ ب ـ ۷۵ الف: موعظہ در بیان پیدایش عالم

پہلا شعر:

کرد خدا خلق یکی جوہری
تا بدر آرد ہم ازو گوہری

آخری شعر:

قصۂ ایجاد جہان کردہ ام
خلق چسان کردہ بیان کردہ ام

اس مثنوی میں شاعر نے یہ بیان کیا ہے کہ حق جل و علا نے محض اپنی قدرت اور حکمت سے اِس عالم بوقلموں کو کس طرح پیدا کیا ہے۔

ورق ۷۵ الف تا ۷۷ الف: قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

پہلا شعر:

حکم قضا را نکند کس دگر
آنچہ مقدر شدہ آید بسر

ورق ۷۷ الف تا ۷۷ ب: داستان مہتر یونس علیہ السلام

پہلا شعر:

حکم قضا بین کہ بہ یونس چہ کرد
گردش این نہ فلک تیز کرد

ورق ۷۸ الف- ۷۹ ب: داستان سلطان سکندر ذوالقرنین رفتن بہ ظلمات بہ طلب آب حیات تا بیابد از دغدغۂ مرگ نجات۔

پہلا شعر:

بود یکی روز سکندر بخت [کذا]
ساختہ آمادہ ہمہ رخت و بخت

آخری شعر:

قصۂ یاجوج وزیری بگفت
گوہر معنی ہمہ در نظم سُفت

اس کے بعد پندرہ شعروں کا ساقی نامہ ہے۔

ورق ۸۰ الف–۸۰ ب : داستان در بیان خلقت ارواح و کیفیت آن

پہلا شعر:

قسم جہان آمدہ ملک و ملک
خود ملکوت آمدہ جان فلک

آخر سے ناقص ہے۔

ورق ۸۱ الف تا ۸۶ ب: حافظ شیرازی، عبدالرحمان جامی اور قاسم (انوار) کے اشعار پر تضمینیں ہیں۔ ان تضمینات کا بقیہ ۹۳ الف پر ہے۔

ورق ۸۷ الف: ایک مثنوی کے باقی ماندہ سولہ اشعار۔ آخری دو اشعار یہ ہیں:

تازہ کنم باز خیال سخن
شرح دہم، قصۂ نو و کہن
قصہ کنم من ہمہ حالِ جہان
نام بنام از ہمہ اہلِ زمان

ورق ۸۷ الف تا ۸۸ الف: قصۂ مہتر نوح علیہ السلام

پہلا شعر:

نوح چو از قوم بسی دید رنج
ماند بسی چون بہ سرای سپنج

ورق ۸۸ الف تا ۸۹ ب: (قصہ سلیمان و ہدہد)

پہلا شعر:

بود یکی ہدہد افلاک گرد
پر بسر و عمر صف [؟] رہ نورد

ورق ۸۹ ب تا ۹۱ الف: عشق کی تعریف میں اشعار

پہلا شعر:

بار امانت غرض از عشق دان
حامل این آدم خاکی بدان

آخری شعر:

ہمچو گل و لالہ بود رنگ رنگ
تاکہ بود گنبد فیروزہ رنگ

ورق ۹۱ الف تا ۹۲ الف: داستان انوشیروان

پہلا شعر:

بود یکی روزگہ نوشیروان
گشتہ بصحرا پی صیدی روان

ورق ۹۲ الف-۹۲ ب: تفسیر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا شعر:

معنی قرآن ھمہ در بسملہ است
معنی این نکتۂ بی مشکلہ است

آخر سے ناقص ہے۔

ورق ۹۳ الف تا ۹۶ ب (ناقص): ورق ۸۶ ب کا بقیہ یعنی تضمینات ہیں۔

ورق ۹۷ الف: ایک مناجات (مثنوی) کے باقی ماندہ ۱۲ اشعار۔

ورق ۹۷ الف تا ۱۱۲ ب: مثنوی نامہ نوشتن سلطان سکندر ذوالقرنین بہ خاقان چین

پہلا شعر:

زبان برگشایم بحمد و ثنا
بہ درگاہ او پادشاہان گدا

آخری شعر:

وزیری چنین داستانی بگفت
گہرھای معنی سراسر بسُفت

اس مثنوی میں سکندر اور خاقان چین کے مابین ہونی والی جنگ کے واقعات بھی ہیں۔

ورق ۱۱۲ الف-۱۱۳الف: مثنوی بلا عنوان دربارۂ عدل سکندر

پہلا شعر:

بنام خدا ابتدا نامہ را
کنم تیز آنکہ سر خامہ را

یہ شاہنامۂ فردوسی کی طرز پر ہے جیسا کہ تیسرے شعر میں شاعر کہتا ہے:

کنم طرز شاہ نامہ را باز نَو
بیا چند بیتی زمن ہم شنو

ورق ۱۱۳ الف تا ۱۱۷ ب: مثنوی بلا عنوان

پہلا شعر:

زبان برگشایم بحمد خدا
کہ از لطف خود شد بخود رھنما

آخری شعر:

وزیری چنین داستانی بگفت
گہرھای معنی سراسر بسفت

ورق ۱۱۷ ب تا ۱۲۰ الف: ایک بلا عنوان مثنوی، تصوف اور فلسفے کے مضامین میں

پہلا شعر:

دیدۂ حق گشا و حق بین
حق نبینی تا کہ بینی ما و طین

آخری شعر:

چار عقل دیگر آمد رهنما
هر یکی را هست یک کار جدا

ورق ۱۲۰ الف- ۱۲۲ الف: داستان در بیان حقیقت وجود انسان

پہلا شعر:

بده باده حواس آراست یزدان
به پنج ظاهر و با پنج پنهان

آخری شعر:

وزیری داستان بوالعجب گفت
گهرهای معانی سربسر بسفت

یہ مثنوی، نظامی کی خسرو و شیرین کی زمین میں ہے۔

ورق ۱۲۲ الف تا ۱۲۷ الف: مثنوی در وصف دل

پہلا شعر:

دل کو ز عرفان درو نیست نور
بصد دور باشست از فیض دور [؟]

ورق ۱۲۷ الف - ۱۲۷ ب (ناقص): داستان موعظه

پہلا شعر:

زر پرست و خود پرست و بُت پرست
در حقیقت هر سه از یک مادر است

ورق ۱۲۸ الف تا ۱۳۳ب: قصاید کا بقیہ حصہ ہے۔اس میں ایک قصیدہ خاقانی کے جواب میں ہے۔

پہلا شعر:

دامن افلاک سوزد آه گردون سای من
سر فرو نارد به عالم همت والای من

ورق ۱۳۴ الف-۱۳۴ ب: ایک ناقص الطرفین مثنوی کے ۳۶ اشعار جس کے ہر ایک شعر میں ایک قصے کی طرف اشارہ ہے۔

بہر بیت یک قصہ کردم ادا
چو لطف خدا شد بہ ما رھنما

اس کا سال تصنیف ۱۰۰۰ھ ہے۔

وزیری عجب داستانی بگفت
بدعوی گہرھای معنی بسفت
ز ہجرت فزون بود از الف سال
کہ شد بستہ این نخل بند خیال

(۱۳۴ ب)

ورق ۱۳۵ الف تا ۱۴۵ ب (ناقص): قصاید کا بقیہ حصّہ ہے۔ اس میں بعض قصاید خاقانی، انوری اور امیر خسرو کے جواب میں کہے گئے ہیں۔

ورق ۱۴۶ الف تا ۱۴۷ ب: ایک مثنوی کے باقی ماندہ اشعار

آخری شعر:

در زمین مثنوی کردم سخن
ای وزیری خود ز لطف ذوالمنن

ورق ۱۴۷ ب تا ۱۴۹ الف: داستان دویم شرح عقاید در بیان حدوثِ قدم

پہلا شعر:

حدوث جملہ عالم از قِدم شد
کہ عالم جملہ پیدا از عدم شد

ورق ۱۴۹ الف تا ۱۵۰ الف: مثنوی در توحید باری تعالی

پہلا شعر:

ای تو خلاّق کارگاہ وجود
می کنی ہست و می کنی نابود

ورق ۱۵۰ الف تا ۱۵۱ ب: مثنوی در تعریف عشق

پہلا شعر:

در ابجدِ عشق این سہ حرفست
از جملہ حروفہا شگرفست

ورق ۱۵۱ الف تا ۱۵۲ ب: حکایت شیخ صنعان

پہلا شعر:

شیخ صنعان در حریم کعبہ بُود
روز و شب اندر طوافِ عمرہ بود

آخری شعر:

پیرو عطّار شد بنگر وزیر
شد سخنہایش ازان رو دلپذیر

ورق ۱۵۲ ب تا ۱۵۳ ب (ناقص): مثنوی داستان سوم

پہلا شعر:

خدایی کہ دو عالم کرد پیدا
شد از نابود عالمہا مہیّا

ورق ۱۵۴ الف تا ۲۴۰ ب: اس ناقص الطرفین اور پریشان حصے میں غزلیں اور قصیدے ہیں اور ورق ۲۴۰ الف-۲۴۰ ب پر ایک ناقص الاوّل مثنوی کے اشعار بھی ہیں۔

ورق ۲۴۱ الف تا ۲۴۲ ب: انبیاء کے اسماء میں ایک مثنوی کے باقی ماندہ اشعار آخری شعر:

واقعۂ جملۂ پیغمبران
در روش نظم بکردم بیان

ورق ۲۴۲ ب تا ۲۴۴ الف: قصۂ جنگ اُحد

پہلا شعر:

قصۂ جنگ احد مصطفیٰ
گوش کن این قصہ بسمع رضا

ورق ۲۴۴ الف تا ۲۴۵ ب: حکایت خیروشر کہ ہر یک درخور نام خود از عالم نیکنامی و بدنامی بخود بردند۔

پہلا شعر:

ہست خدا خالق ہر خیر و شر
حکم قضا را نکند کس دگر

ورق ۲۴۵ الف تا ۲۴۷ ب؛ (قصۂ موسیٰ و عاج)

پہلا شعر:

حکم خدا شد بہ کلیم خدا
بود چو با خَلق خدا رہنما

یہ قصہ ۱۰۰۲ھ میں تصنیف ہوا جیسا کہ آخری شعر سے واضح ہوتا ہے:

در سنہ الف دو شد این تمام
قصۂ موسیٰ است علیہ السلام

ورق ۲۴۷ الف تا ۲۴۸ ب: مثنوی کی صورت میں ایک نوجوان کا مرثیہ جس کی وفات ۱۰۰۲ھ میں واقع ہوئی۔ اس مرثیے پر تبصرہ مضمون کے اگلے حصے میں کیا جائے گا۔

پہلا شعر:

ای سرو بہار نوجوانی
رفتی تو ازین جہان فانی

ورق ۲۴۸ ب تا ۲۵۰ الف: مثنوی در قصۂ جنگ مہتر موسی با فرعون

پہلا شعر:

گشت یکی روز قضا جنگ جو
موسی و فرعون بہم رو برو

یہ قصہ ۱۰۰۲ھ میں لکھا گیا جیسا کہ آخری شعر میں بتایا گیا ہے:

بود ز ہجرت سنہ الف و دو سال
طبع من انگیخت ہزاران خیال

ورق ۲۵۰ الف - ۲۵۰ ب: قصۂ مہتر سلیمان علیہ السلام و مور

پہلا شعر:

قصّہ یک مور و سلیمان شنو
می کنم این قصۂ دیرینہ نو

ورق ۲۵۰ ب تا ۲۵۲ ب (ناقص): ساقی نامہ

ورق ۲۵۳ الف - ۲۵۳ ب: مثنوی در تعریف شمایل سرور کاینات۔

ورق ۲۵۳ ب تا ۲۵۸ الف: حکماء قدیم کی نصیحتوں پر مبنی ایک مثنوی بلاعنوان۔

پہلا شعر:

ہست سر جملہ چو لقمان حکیم
بود بحکمت ز ہمہ او عظیم

آخری شعر:

کرد چو احوال حکیمان بیان
کرد وزیری سخنان را عیان

یہ مثنوی اکبر بادشاہ کے عہد میں ۱۰۰۲ھ میں تصنیف ہوئی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

در سنہ الف دو این گفتہ شد
گوہر معنی ھمگی سُفتہ شد
بود بعہد شہ فیروز بخت
صاحب مُلک و حشم تاج و تخت
اکبر غازی شہ اقلیم گیر
بندہ ی او جملہ صغیر و کبیر

ورق ۲۵۸ الف - ۲۵۸ ب: قصہ حضرت موسیٰ و جواب لن ترانی شنو دن از طور

پہلا شعر:

موسی عمران بہ سوی طور شد
طور ز سر تا بقدم نور شد

ورق ۲۵۸ب تا ۲۶۰ الف: نور نامۂ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم

پہلا شعر:

نور نبی از ہمہ نورھا
خَلق بشد در حرم کبریا

ورق ۲۶۰ الف تا ۲۶۶ ب: مثنوی کی صورت میں تین مختصر داستانیں۔

ورق ۲۶۶ ب تا ۲۶۹ الف: مثنوی جوہر عقل

پہلا شعر:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
سر سخن جملہ کلام قدیم

آخری دو اشعار:

جوہر عقل آمدہ نام کتاب
تا کہ بہ خوانندہ رساند ثواب

ہست وزیری ز ہمہ کم بدان
ماند ازو ہم سخنان در جہان

اس مثنوی میں شاعر نے ''سخن'' کی تعریف کی ہے۔

ورق ۲۶۹ الف تا ۲۷۰ ب: مثنوی بلاعنوان در بیان خرقۂ اویس قرنی۔

پہلا شعر:

نظم کنم تذکرۃ الاولیا
از مدد جُملہ و لطفِ خدا

آخری شعر:

بندہ وزیری ہم ازان جمع باد
خود بدہد لطف خدایش مراد

ورق ۲۷۰ ب تا ۲۷۴ ب: قصۂ حجاج و یزید و امام حسین / واقعہ کربلا۔

پہلا شعر:

بود یکی ظالم حجاج نام
قصۂ او را بشنو تو تمام

آخری اشعار:

گفت وزیری سخنان از سیَر
داد ز احوال جہان او خبر
کار جہان را سرو پایی ندید
دامن خود رفت ز دنیا کشید

ورق ۲۷۴ب تا ۲۷۶ب: مثنوی قصۂ جنگ خیبر کہ بہ چہ رنگ وعدہ رسید و چہ سان آن قلعہ بہ دست شاہ مردان شیر یزدان مرتضی علی کرم اللہ وجہہ فتح شد۔

پہلا شعر:

حمد و ثنای تو ز حد بی قیاس
عاجزم از گفتن حمد و سپاس

آخری شعر:

ہر کہ ترا دوست بجان بندہ ایم
شکر وزیری بہ سخن زندہ ایم

اس کے بعد ۲۶ اشعار کی ایک مثنوی ہے جو شاید ماقبل اور مابعد مثنوی کو جوڑنے کے لیے ہے۔

ورق ۲۷۷ الف تا ۲۷۸ ب: (مثنوی در واقعہ فتح مکّہ)

پہلا شعر:

امر خدا شد بہ رسول امین
زود برو جانب یثرب(۳) زمین
فتح بکنؔ مکّہ شو آنجا مقیم
ہست در این کار ثواب عظیم

آخری شعر میں سال تصنیف ۱۰۰۲ھ کی طرف بھی اشارہ ہے:

در سنہ الف دو شد این تمام
در روش نظم بہ شیرین کلام

ورق ۲۷۹ الف تا ۲۸۰ ب: مثنوی در تعریف سخن

پہلا شعر:

بہ شاہ سخن می کنم من نگین
سخن آفرینِ سخن آفرین

ورق ۲۸۰ ب تا ۲۸۱ ب: مثنوی در منقبت خواجہ حسن بصری

پہلا شعر:

خواجہ حسن عارف بصری لقب
تابع حکمش عجم و ہم عرب

ورق ۲۸۱ ب تا ۲۸۲ ب (ناقص) واقعات روز قیامت

پہلا شعر:

حال قیامت بکنم من بیان
یک بیک اینجا تو از ینجا بدان

ورق ۲۸۳ الف تا ۲۸۴ الف: غزلیات کا باقی حصہ اور ایک قصیدہ بجواب عصمت [بخاری]۔

ورق ۲۸۴ ب تا ۲۸۹ ب: مثمن، رباعیات، مخمس غزلیات حافظ

ورق ۲۹۰ الف تا ۴۰۶ ب: اِسے ہم اِس کلّیات یا نسخے کا آخری حصّہ قرار دیتے ہیں جس میں معاصر بادشاہوں (اکبر، جہانگیر، شاہزادہ مراد) اور امرا (خان خانان) اور مناظر فطرت کی تعریف میں قصاید ہیں۔ ایک مناجات طلبِ باران کے لیے ہے۔ عمارات کی تعمیر کے کچھ قطعات ہیں۔ غزلیات اور حافظ کی غزلوں پر تضمینیں ہیں۔ ان مندرجات پر ہم مضمون کے اگلے حصے میں بحث کریں گے کیوں کہ اسی کلام سے شاعر کی زندگی پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

مضمون کے اِس حصّے میں ہم پیش نظر مخطوطہ کی کتابت کے بارے میں بات کریں گے۔

(الف): کاتب نے واو پر ختم ہونے الفاظ کی اضافت بنانے کے لیے یاء کا استعمال کیاہے۔ جیسے:

خسروی غازی جلال الدین محمد اکبراست (۲۹۵ الف)

جو دراصل ''خسرِو غازی......'' ہے۔ اسی طرح:

پیروی عطار شد بنگر وزیر (۱۵۲ ب)

جو حقیقت میں ''پیرِ عطار......'' ہے۔ کاتب نے پورے نسخے میں ''پیرِ'' کی اضافت ''ی'' سے بنائی ہے۔

(ب): کاتب کم سواد ہے اور اس نے بعض الفاظ غلط کتابت کیے ہیں۔ مثلاً: ابابیل کو عبابیل (۶۸الف) ثواب (بمعنی اجر) کو صواب (بمعنی صحیح) لکھا ہے، جیسے: نیکویی کردی بیابی تو صواب (۱۱۹-الف)، یابد ازین قصہ صواب عظیم (۲۵۳ب)، خواندن این ہست صواب عظیم (۲۶۰الف)؛ صلیب کو سلیب (۱۲۷الف)، عزم کو عظم جیسے: عظم سواری سوی مکّہ نمود (۶۷ب)؛ نجم ثاقب کو نجم ساقب (۲۹۱ب)؛ ہبوط وصعود کو ہبوت وسعود (۱۳۵الف)، یثرب کو یسرب (۲۸۰ب)

(ج): نسخے کی فی صفحہ سطور کی تعداد مختلف ہے۔ کہیں اٹھارہ (ورق ۱۰۴) کہیں سولہ (ورق ۱۰۱)، کہیں بیس (۵۴ب)۔ اگر ہم فی صفحہ اوسط سطور اٹھارہ فرض کریں تو ۸۱۲ صفحات پر کل تقریباً ۱۴۶۱۶ سطور یا دوسرے الفاظ میں چودہ ہزار چھ سو سولہ ابیات درج ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارے نسخے کے کاتب کے حواس کوئی زیادہ منظم نہیں ہیں۔ کیوں کہ اس نے متعدد غزلیں اور قصیدے دو دوبار اور بعض تین تین دفعہ نقل کیے ہیں۔ اس اعتبار سے ''صافی'' اشعار کی تعداد کم کرنا پڑے گی۔ میں نے ایسی کم از کم ۲۹ غزلیں اور قصیدے تلاش کیے ہیں جو مکرر درج ہوئے ہیں۔ یہاں ان کی نشان دہی موجبِ طوالت ہو گی۔

اب ہم مقالے کے اہم ترین سوال پر توجہ مرکوز کرتے ہیں یعنی اس کلّیاتِ اشعار کا شاعر کون ہے؟

کلّیات کے مندرجات سے جنہیں ہم مقالے کے تیسرے حصے میں نقل کر آئے ہیں، دو باتیں مسلّم اور واضح ہیں۔ ایک شاعر کا تخلص اور دوسرا اس کا زمانۂ حیات لیکن کلّیات میں کچھ اور مقامات بھی ہیں جو اس کے نام، نژاد، وطن، عقاید اور عہد کی

طرف راہنمائی کرتے ہیں۔

شاعر کا نام:

ورق ۲۸۴ ب پر جو مثمن درج ہوا ہے، کاتب نے اس کا عنوان ''مثمنِ نواب وزیر خان'' لکھا ہے۔ ہمارا قیاس ہے کہ شاعر کا نام نواب وزیر خان ہے اور اسی مناسبت سے اس نے تخلص ''وزیر'' اور ''وزیری'' اختیار کیا ہے جس کی مثالیں مضمون کے اُسی حصے میں گذر چکی ہیں۔ البتہ بیشتر اشعار میں اس نے ''وزیری'' تخلص استعمال کیا ہے۔

وطن اور اصل:

شاعر نے اپنے ایک قصیدے میں جس کا مطلع یہ ہے:

دل مراست ز زلف تو صد پریشانی
عجب کہ حال دلِ خستہ را نمی دانی

اپنے اصل کی طرف اشارہ کیا ہے:

ز اصل خود سخن [کذا: سخنی] در قصیدہ می گویم
منم چراغِ شبستان چین ایلگانی

(۲۹۹ ب)

مصرعۂ ثانی میں چین اور ایلگانی کے الفاظ قابل توجہ ہیں۔ ایلگ خانی سلسلہ مدتوں کا شغر، ختن اور ماوراء النہر میں حکومت کرتا رہا ہے۔ ان کی حکومت ۳۱۵ھ سے کاشغر اور بلاساغون میں شروع ہوتی ہے۔ بعد میں اس کی متعدد امارتیں بن گئیں۔ ۳۹۸ھ میں سلطان محمود غزنوی نے امرائے ایلگ خانی کو شکست دی۔ ۶۰۷ یا ۶۰۹ھ میں محمد خوارزمشاہ نے ماوراء النہر اور ترکستان میں سلسلۂ ایلگ خانی کی سلطنت ختم کی۔[۴] مذکورہ بالا شعر کو سامنے رکھیے اور اس شاعر کے قصیدہ بہ مطلع:

شرف بہ آدمی از علم و فضل و گفتار است
بہ ہر وجود خود این سہ صفت سزاوار است

کا ایک دوسرا شعر پڑھیے:

بشعر من ہمہ نقش بدیع از چین است
منم ز چین و کنون زادِ من ز تاتار است

(۱۴۲ الف،مکرر۲۹۹الف--۳۰۰ب)

یہاں بھی وہ اپنے آپ کو چین کا قدیم باشندہ بتاتا ہے جس کا مولد تاتارستان ہے۔

وزیری کی شاعری میں چین، ترکستان، تاتار اور خُتن کے مزید تلازمے بھی ملتے ہیں۔ ممکن ہے یہ محض شاعرانہ تخیلات ہوں، لیکن شاعر کے چینی الاصل اور تاتاری المولد ہونے کی وجہ سے معنویت سے یکسر خالی بھی نہیں ہیں۔ مثلاً:

نسیم زلف تو گر سوی چین گذار کند
زند بخاک سیہ نافہ ھای تاتاری

(۳۹۵ب)

مسخر کردہ جانان خاتم لعل لَبت بنگر
ہمہ خوبان چین را در لطافت تا بترکستان

(۱۹۴الف)

ای وزیری سخنم نافۂ مشکِ ختن است
نافہ ھرگز بہ چنین بوی نشد در خُتنم

(۳۷۶ الف)

باد تا بُوی سر زلف تو آورد بہ من
گاہ در مُلک حبش ، گاہ بہ مُلک خُتنم

(۳۷۷ الف)

اس شعر میں زلف کے سیاہ اور معطّر ہونے کے تلازمے حبش و خُتن ہیں۔

شاعر کی غریب الوطنی اور ہندوستان میں قیام:

وزیری کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن مالوف سے نکل آیا تھا۔ وہ اپنی ایک غزل میں جس کی ردیف ''جدا'' ہے، کہتا ہے:

ای دل جدا شدی تو زتن ، جان ز تن جُدا
من از تن غریب و تنم از وطن جُدا

(۱۸۰ ب)

وہ غالباً خراسان میں بھی پھرتا رہا ہے اور وہاں بسطام میں حضرت بایزید بسطامی کے مزار سے فیضاب ہوا ہے:

فیض از روضۂ سلطان جہان یافت دلم
مَیلِ خاطر چو مرا جانب بسطام کشید

(غزل ۲۳۲ ب اور مکرر ۳۴۲ الف)

اُس نے اپنے بیٹے (متوفی ۱۰۰۲ھ) کی وفات کی خبر بھی وطن سے دور سُنی۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ ایسے بہت سے شواہد موجود ہیں جو وزیری کے ہندوستان میں قیام پر دلالت کرتے ہیں۔ مغل حکمرانوں اکبر، جہانگیر، شاہ مراد اور امرا میں سے خان خانان کی مدح میں اس کے قصاید سے یہ بات ثابت ہے۔ بعض غزلوں میں اس نے اپنے ہندوستان میں ہونے کی صراحت کی ہے۔ مثلاً شاہ مراد کی تعریف میں غزل کا یہ مقطع:

در ملک ہند گفت وزیری چنان غزل
در وصف تو کہ سر ز دیارِ عجم کشید

(۲۹۵ الف و مکرر ۳۲۰ الف)

اس میں مصرعۂ ثانی قابل توجہ ہے کیا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ دیار عجم (ایران) سے سفر کر کے ہندوستان آیا ہے؟ ایک دوسری غزل کا شعر یہ ہے:

بس ترکتاز کرد وزیری بہ ملک ہند
شد وقت آن کہ مَیل بہ کم کوشی آورد

(۶۰ الف)

ہندوستان میں اجمیر شریف میں وہ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانے پر گیا۔ اس بارے میں کلیات میں دو غزلیں موجود ہیں۔ متعلقہ اشعار حسب ذیل ہیں:

بر درت آمد وزیری از رہ عجز و نیاز
پادشاہ دین و دنیا کن بہ حال او نظر

(۱۸۳ ب)

بر درش آمد وزیری رحم کن بر حال او
او گدای مستمندانِ شہ دنیا و دین

(۳۹۲ الف)

شاعر کا زمانۂ حیات:

اس کلیات میں شامل وزیری کی بیشتر مثنویات کا سال تصنیف ۱۰۰۲ھ ہے، جیسے قصۂ موسیٰ (ورق ۲۴۷ الف)، قصۂ موسیٰ و فرعون (۲۵۰ الف)، مثنوی نصائح حکمائے قدیم (۲۵۶ ب)؛ مثنوی واقعہ فتح مکّہ (۲۷۸ ب)۔ ایک بلا عنوان مثنوی (۱۳۴ ب) کا سال تصنیف ۱۰۰۰ھ ہے۔ کلیات میں کچھ قطعات تاریخ بھی ہیں۔ مثلاً کسی محل رقصر کی تعمیر کا سال ۱۰۰۲ھ ہے:

سال تاریخ بنایش از خرد کردم سؤال
گفت با من کن حساب "قصر فردوس برین"

(۳۰۲ الف)

ایک امیر شاہم خان کی وفات کے قطعۂ تاریخ سے کچھ اشعار:

سلیمان و سکندر رفت ، صد فغفور و صد خاقان
درین دار فنا باقی نمی ماند کسی می دان
گل این باغ از بوی فنا ہر صبح دم می زد
درخت باغِ دولت بود گویم باتو شاہم خان
درختش میوۂ احسان داد با سر سبزی خرم
درخت دولتش را میوہ دایم بود از احسان
من از تاریخ فوت او ز دہقانِ خرد جویم
کشم از درد خود آہ بگویم واہ شاہم خان

(۳۸۱ الف)

اگر ہم ''واہ شاہم خان'' کو مادّہ تاریخ شمار کریں تو اس کے اعداد ۱۰۰۸ کے برابر ہیں اور اگر ''آہ'' کھینچنے کو تخرجہ تصور کریں یعنی اس کے عدد نکال دیں تو ۱۰۰۲ کو سال وفات قرار دیا جا سکتا ہے۔

شاعر نے اپنے ایک عزیز کی وفات کی تاریخ یوں بیان کی ہے:

در الف و دو رفتی از جہان تو
از شہر فنا بہ جاودان تو

(۲۴۸ ب)

کلّیات وزیری میں جو متأخر تاریخ بصراحت ملتی ہے وہ بھی ایک مادّۂ تاریخ ہے جس سے ۱۰۱۲ استخراج ہوتا ہے۔ یہ ایک قصیدہ بردیف ''قلم'' کا شعر ہے جس کا نفس مضمون سے کوئی تعلق نہیں لیکن شاعر نے اسے قصیدے میں داخل کیا ہے، شعر یہ ہے:

''خانۂ معمور'' شد تاریخ این عالی بنا
گفت تاریخش وزیری ، می کند انشا قلم

ایک عمارت جو ۱۰۱۲ھ میں تعمیر ہوئی یہ اس کا مادۂ تاریخ ہے۔

ان تاریخوں سے قطع نظر کلیات میں معاصر ہندوستانی بادشاہوں، شہزادوں اور امیروں کی مدح میں قصاید بھی ہیں۔ مثلاً اکبر (۹۶۳-۱۰۱۴ھ)، جہانگیر (۱۰۱۴-۱۰۳۷ھ)، شاہ زادہ مراد فرزند اکبر (متوفی ۱۰۰۷ھ) اور خانخانان (۹۶۴-۱۰۳۶ھ)۔

شاعر کے شیخِ طریقت:

وزیری نے اپنی ایک غزل میں جس کا مطلع یہ ہے:

ہر کہ حق امر نکرد است ، بہ جانست فتور
آنچہ از جنسِ مناھیست، زمن آن ہمہ دور

اپنے شیوخ طریقت کا ذکر کیا ہے، ان کے اسماء عبد غفور رعبدالغفور اور شیخ حسن ہیں:

پیرِ من بودہ یکی عارف کامل بہ جہان
نام آن عارف کامل تو بدان عبد غفور
دست با دست رسیدیم چو با شیخ حسن
در دلم ہست ازین واسطہ بسیار سرور
ہست امید کہ زیر علمش جمع شویم
از عنایات خداوند در آن روزِ نشور

(۳۴۷ الف)

ویسے شاعر نے اپنے سلسلۂ طریقت کا ذکر نہیں کیا۔ چند مقامات پر شیخ عبدالقادر گیلانی اور خواجہ معین الدین چشتی رحمہم اللہ تعالیٰ کی مدحیات کی ہیں۔

شاعر کا جوانمرگ بیٹا:

وزیری نے ایک نوجوان، جس کا انتقال ۱۰۰۲ھ میں ہوا اور یہ خبر اس نے اپنے وطن سے دور (غالباً ہندوستان میں) سُنی، کا مرثیہ لکھا ہے۔ اس نوجوان نے حج کیا تھا

اور اس نے اپنے پیچھے دو بیٹے اسد اور عنایت نامی چھوڑے تھے۔ ایک شعر میں وزیری نے متوفی کو اپنی دو روشن آنکھیں کہا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ اس کا بیٹا تھا۔ مرثیے میں صفات کی بجائے جذبات و احساسات کی فضا غالب ہے۔ چند متعلقہ اشعار جن سے ہم نے مذکورہ بالا نتائج اخذ کیے ہیں حسب ذیل ہیں:

ای سرو بہار نوجوانی
رفتی تو ازین جہان فانی
افسوس کہ روی تو ندیدم
آوازۂ مرگ تو شنیدم
پیراہن صبر چاک کردم
خود را زغمت ہلاک کردم
شدہ تیرہ بہ من جہانِ روشن
بودی تو مرا دو چشم روشن
از عمر و حیات برنخوردی
و ز باغ مراد گل نچیدی
حاجی شدہ آمدی تو مُردی
ایمان بقرین خویش بُردی
ماندہ[۵] اسد و عنایت اللہ
در دار فنا بصد غم و آہ
ای کوکۂ بادشاہ عادل
مثل تو کسی نبود قابلدر الف و
دو رفتی از جہان تو
از شہر فنا بہ جاودان تو

(۲۴۷ب - ۲۴۸ب)

اس مرثیے میں ''ای کوکہ بادشاہ عادل'' کی ترکیب قابل توجہ ہے۔ کوکہ تُرکی زبان میں ہمشیر/رضاعی بھائی کو کہا جاتا ہے، تو کیا متوفی بادشاہِ وقت کا رضاعی بھائی تھا؟

علم نجوم سے دل چسپی:

وزیری کی مثنویوں اور قصیدوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ اسے علم نجوم سے خاص دل چسپی تھی اور اس علم کی اصطلاحیں اُس نے بکثرت استعمال کی ہیں۔ اس کی ایک بلا عنوان مثنوی بارہ بُرجوں کی وضاحت کے بارے میں ہے (۱۳۳الف-۳۵ب)۔ ساقی نامہ اور تعریف پادشاہان چغتی ہند (ورق ۲۱ب-۲۵الف) مثنوی نامہ نوشتن سلطان سکندر ذوالقرنین بہ خاقان چین (۱۹۷الف-۱۱۲ب) اور ایک بلا عنوان مثنوی (۱۱۳الف-۱۱۷ب) میں ایسے متعدد اشعار موجود ہیں جو شاعر کی علم نجوم سے دل چسپی اور اس پر دسترس سے ہمیں آگاہی دیتے ہیں۔ اکبر بادشاہ کی مدح میں کہے گئے ایک قصیدے جس کا مطلع یہ ہے:

منّت ایزد را کہ پیدا کرد از قدرت جہان
وان بقدرت شد نگہ دارندۂ نُہ آسمان

اس قصیدے میں شاعر کہتا ہے:

جوہر نامش بہ ارقام جمل کردم حساب
بیست وہفت حرفست نام این شہ صاحبقران
می کنم تقسیم یک یک را بہ یک اشیا نگر
ہستی عالم ازین اشیا ست ظاہر این بدان

اور پھر ایک ایک حرف کی علم نجوم کی رو سے وضاحت کی ہے۔

نام ہای بُرج گیرم تا بدانی یک بیک
می کنم تقسیم ہر حرفی بہ یک بُرجی ازان

(۱۲۸الف-۱۳۱الف)

مذہبی عقاید:

شاعر مسلمان، مذہب اہل سنّت و جماعت کا پیرو، امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کا پابند ہے۔ اصحابِ پیغمبرؓ کی تعریف کرتا ہے اور جو لوگ اصحابؓ کو بُرا بھلا کہتے ہیں ان کی مذمت کرتا ہے۔ شاعر تمام اہل سنت و جماعت کی طرح اہل بیتؑ اور بارہ اماموںؒ کی محبت اور احترام کا قائل ہے۔ کلامی رفلسفی عقاید میں وہ فلسفۂ قِدم کا مخالف ہے۔ شاعر کے یہ تمام عقاید جا بجا کلّیاتِ اشعار میں مذکور ہیں۔ ہم نے درج ذیل چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے:

امام اعظم امام چار ارکان
ازو محکم بنای رکن ایمان
بجز قول رسول و قول قرآن
سخنہای دگر را نیست برہان
پی اصحاب دین باید قدم زد
نباید با خلافِ شرع دَم زد
بیا اصحاب دین را پیروی کن
بنہ سر در قدمہا ، سروری کن

(مثنوی شرح عقاید در بیان حدوثِ قدم، ۱۴۸ الف رب)

آدمی از اعتقاد خویش جایی می رسد
آنکہ او را اعتقادی نیست سگ زو بہتر استبا خدا و با
رسول و جملہ اصحابِ رسول
باش ای مومن تُرا گر نور ایمان رہبر است
ہر کہ او در مذہب و ملّت خلاف شرع گفت
کافر است و ملحد است و ابلہ ست و ابتر است

آن کہ بہ اصحاب پیغمبر بگوید ناسزا
کافر است و جان آن روز جزا در آذر است

(قصیدہ، ۳۱۱ الف)

جملہ اصحاب پیغمبر بسان کوکب اند
افضل اصحاب می دان جملہ یار مصطفیٰ
منکر اصحاب دین ہر کس کہ باشد کافراست
رفتہ است از مذہب باطل چو در دارِ فنا
پیرو اصحاب دین و پیرو شرع رسول
ہر کہ شد ایمن بود از قہر حق روز جزا

(قصیدہ، ۲۹۵ ب)

افضل تر از صحابہ چو صدیقِ اکبر است
با صدقِ اعتقادِ خود از جملہ برتر است
او شد امام و جملۂ اصحاب مقتدی
ذاتش نگر کہ زینتِ محراب و منبر است
اول خلیفہ اوست ، بدان بعد او عمر
عثمان سیم ، چہارم شان شاہ صفدر استبر چار را خلیفۂ برحق بدان رھی
ہر کس کہ با خلافت این چار منکر است
با فتوی چہار امام است مبتدع
از اہلِ فسق و اھلِ فجور ست ، کافر است

(غزل، ۴۹ ب)

حامی دین محمد چار یار باصفا
دو امام و دہ جمیع اُمتان را پیشوا

می کنم مدّاحی ہر یک بجان و دل رواست
در شریعت ، در طریقت سالکان را رہنما

قِدم کے بارے میں یہ شعر:

نہ ابتدا و نہ غایت بذات حق باشد
کسی چگونہ بآن ذات ابتدا گوید

(۱۴۲ ب)

تصنیفات:

وزیری فارسی ادب کے اُن چند شعراء میں سے ایک ہے جنھوں نے نظامی گنجوی کی تقلید میں خمسہ لکھا ہے۔ خمسۂ نظامی کا تتبع کرنے والے شعرا امیر خسرو اور جامی کو اُس نے اپنا معنوی اُستاد اور نمونہ قرار دیا ہے۔ وزیری ایک پُر گو شاعر ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے ایک لاکھ (صد ہزار) اشعار کہے ہیں۔ اس نے غزلیات کے تین دیوان اور قصاید کا ایک دیوان الگ الگ مرتب کیے۔ ممکن ہے دواوین کی تدوین میں بھی اس نے امیر خسرو کی پیروی کی ہو جنھوں نے اپنے مختلف ادوار حیات میں کہے گئے اشعار کے چار مختلف دواوین مرتّب کیے تھے۔ وزیری کے اُن چھوٹے موٹے قصّوں اور مثنویوں کے علاوہ جو پیش نظر کلّیات کے نسخے میں درج ہوئے ہیں اور ان کے بارے میں ہم مضمون کے تیسرے حصّے میں لکھ آئے ہیں، وزیری کی کچھ اور تصنیفات بھی ہیں جن کے نام اس کی ایک مثنوی میں آئے ہیں۔ ان تمام معلومات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہم نے وزیری کی تصنیفات کی ایک فہرست مرتب کی ہے جو حسب ذیل ہے:

۱۔ آئینۂ فہم، ستاروں کے حال میں ہے۔

۲۔ جوہرِ عقل، ''سخن'' کے بارے میں مثنوی، مشمولہ کلیاّت۔

۳۔ دیباچۂ عشق، شاید لیلی و مجنون کا قصہ۔

۴۔ دیوان غزلیات، تین دواوین۔

۵۔ دیوان قصاید۔

۶۔ رموز الحقائق، بظاہر تصوّف اور اقوال صوفیہ پر ہے۔

۷۔ سرّ اسرار، عقاید کی تشریح میں ہے۔

۸۔ نبی نامہ، شاہنامۂ فردوسی کے جواب میں انبیاء کے قصّے لکھے ہیں۔

متعلقہ اشعار جو وزیری کی تصانیف کی طرف اشارہ کرتے ہیں، ملاحظہ ہوں (نظامی، خسرو اور جامی کی تعریف کے بعد):

مددھا بجویم من از روح شان
نبی نامہ گفتم بشیرین بیان
دگر جوھر عقل گفتم کتاب
سخنہا بگفتم ز روی صواب
بیان کردم ، احوال پیغمبران
ز احوال ھو یک یکان داستان
نہادم رہی نام دیگر کتاب
رموز الحقائق بدان چند باہقول بزرگان نہادم بنا
ثوابم رسد زو بروز جزا
بکتاب دگر سرّ اسرار نام
بکردم چو شرح عقاید تمام
دگر نامہ دیباچۂ عشق دان
خود از عشقِ مجنون بہ نیکو بیان
دگر گشت آئینہ فہم نام
ز احوال کوکب بکردم تمام
شد ابیات رنگین من صد ہزار
چو یک یک در آوردم اندر شمار

سہ دیوان غزل را بدادم قرار
بتوفیق لطف خداوندگار
چہارم تو دیوان قصیدہ بدان
بہر جا شدم پیرو شاعران

(۱۱۱ الف ر ب)

اسی مثنوی میں آگے چل کر نبی نامہ کا الگ سے بھی ذکر کیا ہے:

بتوفیق یزدان بگفتم جواب
چو شہنامہ را ثبت شد در کتاب
نبی نامہ گفتم چو شہنامہ را
بدادم شرف نامہ و خامہ را بہ شہنامہ سہ قسم کردہ سخن
ز رزم و ز بزم و ز سرو و سمن
بیک داستان این ہمہ قصہ ہا
بیان یافت ، نایافتم زین رہا

(۱۱۲ الف ر ب)

وزیری نے اپنی خمسہ سرائی کا اظہار یوں کیا ہے:

منم شاگرد و اُستادم نظامی ، خسرو و جامی
بگفتم خمسہ را از ہمت پیران مردانش
وزیری پیرو نیکان شدی صد شکر کن ہر دم
شدی در خمسہ گفتن پیروِ پیران و نیکانش

(۳۰۷ الف : ۳۰۸ الف)

ایک لاکھ اشعار کا شاعر ہونے کا دعوی اس شعر میں بھی ہے:

بدان جملہ ابیات من صد ہزار
بکردم چو در سلک نظمش قطار

(۱۳۴ ب)

شعر و شاعری کے بارے میں نظریہ:

وزیری نے شعر و شاعری کے بارے میں اپنے نظریات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ شاعری میں برجستہ گوئی ہونی چاہیے۔ وہ اپنی شاعری کو غم و اندوہ کا نتیجہ سمجھتا ہے اور غزل کے چند اشعار تب کہیں جا کر اکٹھے ہوتے ہیں جب ایک ایک شعر کے لیے خون جگر پیا جائے۔

در طریق شاعری برجستہ می باید سخن
ہر کہ او برجستہ گو شد، شاعر برجستہ شد ای وزیری شعر
را کردم شعار خویشتن
بس کہ از اندوہ بیحد خاطر من خستہ شد

(غزل، ۳۳۶ ب)

چند بیتی در غزل، چون جمع می گردد وزیر
ہر یکی حاصل ہمی گردد بصد خون جگر

(غزل، ۳۴۶ ب)

وزیری نے ایک مثنوی میں ''سخن'' کی تعریف میں تقریباً پچاس مسلسل اشعار لکھے ہیں اور ''سخن'' کو بہت اہمیت دی ہے۔

سخن پادشاہیست بی تخت و تاج
ز خاقان و قیصر گرفتہ خراج
قلم جسم بی جان، سخن جانِ اوست
جہان سر بسر زیر فرمان اوست

(۱۰۷ الف/ب)

خود ستایی:

وزیری نے اپنے کلیات میں متعدد مقامات پر شاعرانہ تعلیٰ اور خود ستایی سے کام لیا

ہے وہ کبھی اپنے آپ کو ''مانی وقت'' اور کبھی ''سلمان ثانی'' ر ''سلمانِ سخن'' (سلمان ساوجی کا ہم پلہ) کہتا ہے۔ وہ خود کو اقلیم سخن کا بادشاہ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ آج مُلکِ سخن میں اس کے نام کا سکّہ چل رہا ہے۔ اسے یہ یقین بھی ہے کہ جب تک شاعری باقی ہے اس کا نام بھی زندہ رہے گا۔ یہ اشعار اس حوالے سے ہیں:

مانی وقتم و از شعر کشم صورت خوب
مانی این نقش بہ ھر جا پی تزئین برد

(۶۶ ب)

بین بہ تعلیم سخن آرای استیلای من
رفت سلمان و منم امروز سلمان سخن

مذکورہ بالا شعر وزیری کے ایک ایسے قصیدے (۱۳۱ الف-۱۳۲ الف) سے لیا گیا ہے جو خاقانی کی پیروی میں لکھا ہے۔ اس کی ردیف ''سخن'' ہے اور یہ تمیں ابیات پر مشتمل ہے یہ تمام ابیات در مدح خود ہیں۔

مثنوی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

نام من زندہ از سخن شدہ است
سخنم شمع انجمن شدہ است
تا سخن ہست نامِ من باقیست
بزم عیش مرا سخن ساقیست

(۳۲ ب)

امروز مالک سخنم در سخنوری
صد شکر شد چو سکّہ ای دولت بنام من
من شمع انجمن سخن بستہ ام وزیر
روی سخن ہمیشہ بود شمع انجمن

(قصیدہ، ۳۰۱ ب)

سلمان شد و امروز منم ثانی سلمان
در شہر صلا است عرب را و عجم را

(قصیدہ، ۳۰۹ الف)

شاعرم ، دارم فسون سازی بشعر خود بسی
صاحب معنی نگر در شعر من افسونِ منچون وزیری در
غزل درّ سخن را سفتہ ام
لایق گوشِ شہان باشد دُر مکنونِ من

بدیہہ گوئی:

وزیری نے اپنی کئی مثنویوں، غزلوں اور قصیدوں کے اشعار فی البدیہہ کہے ہیں۔ اس سے شاعر کی قدرتِ کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔

وزیری در بدیہہ این غزل گفت
بحمد اللہ کہ او از شاعرانست

(غزل)

ہمہ شعر من شد بدیہہ تمام
بحق رسول و بحقِ کلام

(مثنوی، ۱۳۴ ب)

در بدیہہ کردہ ام انشا ہمہ ابیات را
ہم بحق سالکان و ہم بحق شاعران

(قصیدہ، ۱۳۰ الف)

کچھ غزلیں فرمایشی بھی ہیں یہ بھی فی البدیہہ کہی گئی ہوں گی۔

چون وزیری غزلی گفت بفرمودۂ شاہ
شاعران خُردہ مگیرند کہ او شاعر نیست

(۴۷ ب)

متقدم شعرا کی تقلید:

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے وزیری خمسہ کا شاعر ہے اور اس کام کے لیے اس نے نظامی، خسرو اور جامی کی روایت کو پیش نظر رکھا اور ان تینوں کی پیروی کی ہے۔ وہ بڑے کھلے دلکے ساتھ ان تینوں اساتذہ کی تعریف کرتا ہے اور ساتھ ساتھ ان کی تقلید کا اعتراف بھی کرتا ہے۔

نظامی کہ او خمسہ ترتیب داد
جہان را ازین خمسہ او زیب داد
ازین خمسہ شد نامدار جہان
شدند پیرو او ہمہ شاعران
بشد پیروش خسرو دہلوی
باین فارسی، نی بدان پہلوی
چو نوبت ز خسرو بہ جامی رسید
ز خُمِ سخن جامِ زرین کشید
شدم پیرو جملہ اندر سخن
کہ تا نَو کنم داستانِ کہن
مدد ہا بجستم ز ارواحشان
کہ از خمسہ دادند بامن نشان

(ملخصاً ۱۲۴ ب- ۱۲۵ الف)

نظامی کہ در گنج گنجینہ ماند
در آن دم کہ دامن ز عالم فشاند
گہرھا ازو ماند چون یادگار
بقیمت فزون از دُرِ شاہوار

بنا خمسہ را او ز اوّل نہاد
خدا داد در خمسہ گوی مراد
چو خسرو بہ دہلی بلندی گرفت
بقدرِ سخن ارجمندی گرفتہ جامی رسید آن مَی لعل فام
کشید آن مَی جام را چون بہ جام
منم بندۂ ہر سہ اندر سخن
کنم نو ہمہ داستانِ کہن

(ملخصاً، ۱۱۱ الف)

زندہ دل از فیضِ نظامی کنم
پیروی خسرو [و] جامی کنم

(۷۹ ب)

در روشِ شعر علیم و دبیر
خسرو دہلیست مرا پیر و میر

معتقد اوست وزیری بجان
تا کہ بود فصل بہار و خزان

(۸۹ الف/ ب)

قصیدہ سرائی:

وزیری کا ایک دیوان صرف قصاید پر مشتمل ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ زیر نظر کلّیات کے قصاید آیا اسی دیوان سے درج ہوئے ہیں یا اس سے مختلف ہیں۔ ویسے بھی اس کلّیات میں متفرق مقامات پر قصیدے ملتے ہیں۔ ان قصاید میں سے کچھ تو اساتذہ

کے قصاید کے جواب میں کہے گئے ہیں اور کچھ شاعر کی اپنی تخلیق ہیں۔ اس کلیات میں وزیری کا طویل ترین قصیدہ ایک سو دس ابیات کا ہے، یہ خاقانی کے جواب میں ہے اور اس کا مطلع یہ ہے:

معلم عشق و این دار فنا آمد دبستانش
دبیر خُردہ دانِ عقل شد طفل سبق خوانش

(۳۰۵ الف - ۳۰۸ الف)

قصاید میں وزیری کے موضوعات متنوع ہیں۔ جیسے:

الف۔ سلاطین و امرا کی مدح،

ب۔ فلسفیانہ اور کلامی مضامین،

ج۔ مذہبی تلقینات،

د۔ ادبی موضوعات (''قلم'' کی تعریف وغیرہ)،

ہ۔ ذاتی حالات

ان موضوعات پر قصاید کی کچھ مثالیں یہاں پیش خدمت ہیں۔

جلال الدین محمد اکبر کی مدح میں وزیری کے چار قصاید ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ایک سو سات اشعار کا نونیہ قصیدہ، مطلع:

منت ایزد را کہ پیدا کرد از قدرت جہان
وان بقدرت شد نگہدارندۂ نہ آسمان

(۱۲۸ الف-۱۳۱ ب)

۲۔ ایک رائیہ قصیدہ جو آخر سے ناقص ہے۔ مطلع:

بہار و گل و ساقی روح پرور
بہ جام بلو این مَی صاف و احمر

(۲۳۹ الف/ب)

۳۔ بیس اشعار کا ''انداختہ'' ردیف میں قصیدہ، مطلع:

از حیا و شرم بر رُخ تا نقاب انداختہ
زان کمند زلف را بر آفتاب انداختہ
مدحیہ شعر: خسرو غازی جلال الدین محمد اکبر است
حکم او در گردنِ شاہان طناب انداختہ

(۲۹۵ الف ب)

۴۔ بیس اشعار کا دالیہ قصیدہ یا قطعہ، مطلع:

سرور شاہان جلال الدین محمد اکبر است
داد حق او را ز لطف حق زہر نوعی مراد

اس قصیدے کے بارہویں اور تیرہویں اشعار میں بادشاہ کے ہاں فرزند ہونے کی خوشخبری اور تاریخ ولادت ہے۔

قاصد آمد مژدۂ خوش آمد از مُلک دکن
خانہ شہ دان یکی فرزند شد فرخ بزاد
چون وزیری فکر تاریخ تولد را بکرد
ہاتفش از غیب گفت این مشتری کوکب بزاد

''این مشتری کوکب بزاد'' کو اگر مادہ تاریخ لیا جائے تو اس سے ۱۰۷۳ اعداد برآمد ہوتے ہیں اور ظاہر ہے یہ اکبر کا زمانہ نہیں ہے۔ اگر ''این'' کو ہٹا دیا جائے تو ۱۰۱۲ بچتا ہے لیکن اس سال بھی اکبر کے ہاں کسی بیٹے کی ولادت کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اکبر کے بیٹے سلیم، مراد اور دانیال پہلے پیدا ہو چکے تھے بلکہ آخری دونوں بیٹے فوت ہو چکے تھے۔ (۶)

نور الدین جہانگیر — جسے وزیری شاہ سلیم بھی مخاطب کرتا ہے — کی مدح میں چار قصیدے ہیں:

۱۔ ''نرگس'' ردیف میں انتالیس اشعار کا قصیدہ سلمان ساوجی کی تقلید میں، مطلع:

بر سر خویش نہد تاج چو از زر نرگس
ورق نقرہ بپوشد پی زیور نرگس

مدحیہ اشعار:

چو شہنشاہ جہانست شہ نورالدین
شمع بزم طربش باد ہمہ تر نرگس
از غلامان درش خستہ وزیری بشمار
گفت سلمان غزل نرگس و این تر نرگس

(۲۰۹ الف-۲۱۰ الف)

۲۔ ''فتاد'' ردیف میں بارہ اشعار کا قصیدہ، مطلع:

روزی کہ ذات پاک تو اندر جہان فتاد
صد گونہ ذوق شوق خوشی درمیان فتاد

مدحیہ اشعار:

سلطان عصر شاہ سلیم آن کہ در مصاف
از ترس گرزِ او سر کوہ گران فتاد
بادا بقای عمر تو تا ہست سال و ماہ
آمین از این دعا ہمہ جا در زبان فتاد

(۲۹۳ الف/ب)

۳۔ رائیہ قصیدہ اٹھائیس ابیات کا، مطلع:

دہانِ غنچہ و گل بوسہ داد باد بہار
نسیم بر ورق لالہ ریخت مشک تتار

مدحیہ شعر:

شہی بعدل چو سلطان سلیم در عالم
ندیدہ و نشنودہ کس از صغار و کبار

مقطع: بقای عمر تو بادا مدام در عالم
ہمیشہ تا کہ بود موسم خزان و بہار

(۲۹۰ الف-۲۹۱ ب)

۴۔ ایک بائیہ قصیدہ اٹھائیس اشعار میں، خاقانی کے جواب میں، مطلع:

ببین بگردش این چرخ واژگون گرداب
ستارہ ھا ھمہ وی نمودہ ہمچو حباب

مدحیہ شعر:

شہ زمانہ شہنشاہ عصر شاہ سلیم
کہ مہر و مہ شدہ پا بوسش دو حلقہ رکاب

(۳۰۴ الف-۳۰۵ الف)

شاہ زادہ مراد کی مدح میں تین قصیدے:

ا۔ ''گوہر'' ردیف میں پچیس اشعار کا قصیدہ، مطلع:

چو گوھر سخنم نیست در جہان گوھر
مثال او نہ بہ بحر است ونی بہ کان گوھر

مدحیہ اشعار:

ز بہر بخشش سلطان عصر شاہ مراد
فلک بہ بزم بریزد ز کہکشان گوھر
بقای عمر تو بادا مدام چون خورشید
بود بہ بحر فلک ناز فرقدان گوھر

(۲۹۱ الف/ب)

۲۔ ''کشید'' ردیف میں پندرہ بیت کا قصیدہ جسے شاعر نے غزل کہا ہے، مطلع:

چون اژدھای صبح جہان را بدم کشید
خورشید خاوری چو ز مشرق علم کشید

مدحیہ اشعار:

سلطان عصر شاہ مراد آن کہ از شرف
در روزگار غاشیہ اش کف جم کشید
شاہا بقای عمر تو بادا ہزار سال
از لطف آن خدا کہ جہان از عدم کشید
در مُلک ہند گفت وزیری چنان غزل
در وصف تو کہ سر ز دیار عجم کشید

(۲۹۴ ب-۲۹۵ الف)

۳۔ ردیف ''را'' میں تیس ابیات کا قصیدہ عرفی شیرازی کے تتبع میں، مطلع:

بگرفت بکف روز غزا تیغ دو دم را
با خصم نمود از دم او راہ عدم را

مدحیہ شعر:

سلطان جہان شاہ مراد آنکہ ز جا بُرد
آوازۂ عدلش ز جہان نام ستم را

(۳۰۸ الف-۳۰۹ الف)

خان خانان کی مدح میں بتیس اشعار کا نونیہ قصیدہ، مطلع:

من ہمایم ہمتم پرواز دارد در جہان
شخص عقلم در تخیّل ہمدم افلاکیان

مدحیہ اشعار:

یا الٰہی خانخان [کذا] را در امان خویش دار
معنی انسان کامل گشتہ از ذاتش عیان
وصف او افزون تر اندازۂ فکر منست
عاجز از وصفش ہمیشہ ہست عقل خُردہ دان

فلسفیانہ خیالات پر وزیری کا ایک قصیدہ موجود ہے، مطلع:

وجہ حق باقیست غیر از وجہ حق فانی بدان
زان فنای مطلق آمد ہستی کون و مکان

(۲۹۶ الف/ب)

مذہبی تلقینات و تعلیمات پر بائیس اشعار کا الفیہ قصیدہ ہے، مطلع:

در مشیّت ھر چہ رفتہ، می کند آن را قضا
تن بتقدیر خدا دادن بوَد عین رضا

(۲۹۵ ب-۲۹۶ الف)

ادبی موضوعات مثلاً قلم کی تعریف میں انچاس اشعار کا قصیدہ، مطلع:

پیشتر از جملۂ اشیا شدہ پیدا قلم
معنی سرو صفت ، را می کند انشا قلم

(۲۹۷ الف-۲۹۸ ب)

فخرالدین عراقی کے ایک معروف قصیدے جس کا مطلع یہ ہے:

شہبازم و شکارِ جہان نیست در خورم
ناگہ بود کہ از کفِ ایام بر پرم

کے جواب میں وزیری نے اڑتیس اشعار کا ایک میمیہ قصیدہ اپنے حسب حال کہا ہے۔
لیکن اس میں ذاتی حالات کی بجائے اس طرح کے اشعار ہیں:

من صوفیم، پلاسِ فنا خرقۂ من است
زیبندہ نیست اطلس شاہی چو در برم
من عاشقم، بدرد و بلا خو گرفتہ ام
درد و بلا ست در ھمہ جا یار و یاورم

مطلع:

منت خدای را کہ زبان سخنورم
گویاست تا بہ حمد و ثنا نکتہ پرورم

مقطع:

لب بستہ بہ وزیری ازین گفت گوی شعر
از شاعران دہر چو در رُتبہ کمترم

(۲۰۲ ب-۲۰۴ الف)

قصیدہ گوئی میں وزیری نے تقریباً سبھی اکابر قصیدہ سرا فارسی شاعروں کے جواب میں قصیدے لکھے ہیں۔ اس کا دعویٰ بھی ہے اور یہ کام کر کے بھی دکھایا ہے۔

قصایدھای اُستادان پیشین را ھمہ گفتم
کشیدم من بہ سلک نظم خود دُرّ ھای غلطانش

(۳۰۷ ب)

انوری کے جواب میں اس کے قصیدے کا مطلع یہ ہے:

بر خلاف مدعا زد دورہ چرخ چنبری
با زحل واقع شدہ بنگر قران مشتری

(۱۴ الف/ب)

ظہیر فاریابی کے جواب میں اس نے ''گوہر'' ردیف میں شاہ مراد کی مدح میں قصیدہ لکھا۔

مطلع:

چو گوہر سخنم نیست در جہان گوہر
مثال او نہ بہ بحر است و نی بہ کان گوھر

تعلّی:

ظہیر کردہ چنان دعوی ای کہ کس نکشد
برشتۂ سخنم ہیچ توامان گوھر

کشیدہ ایم در آن رشتہ ای گوھر عجبی
برابر است زھر سو بریسمان گوھر

(۲۹۱ الف ر ب)

خاقانی شروانی کے جواب میں وزیری نے چار قصیدے کہے ہیں۔ کچھ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، بقیہ قصاید یہ ہیں:

مطلع:

دامن افلاک سوزد آہ گردون سای من
سرفرو نارد بہ عالم ہمت والای من
پیرو خاقانی ام در این قصیدہ ای رھی
ھست خاقانی درین طرز سخن املای من

(۱۳۱ الف-۱۳۲ الف)

مطلع:

شب دُود آہ خود بہ ثریا آورم
از جوھر سخن درّ یکتا بر آورم
مقطع: پیرو درین قصیدہ خاقانیم وزیر
زین فخر سر بہ عالم علیا بر آورم

(۱۳۶ ب-۱۳۷ ب)

وزیری نے اپنے تقریباً ہم عصر شاعر فیضی کا جواب بھی لکھا ہے۔

مطلع:

کشتی شکستہ ایم دراین بحر اخضری
در بحر کس چگونہ تواند شناوری
گفتم جواب فیضی شاعر بامتحان
آمد درین زمانہ چنین رسم شاعری

(۱۷۱ ب-۱۷۳ ب)

غزل گوئی:

وزیری نے اپنی غزلوں کے تین دو اوین مرتّب کیے۔ غزلوں کی ایک اچھی خاصی مقدار زیرِنظر نسخے میں بھی موجود ہے۔ قصیدے اور مثنوی کی طرح غزل میں بھی اس نے اساتذہ کا تتبع کیا ہے۔ اور تضمینات لکھی ہیں۔ موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ حمدیہ، نعتیہ، معراجیہ، عیدیہ، بہاریہ غزلوں کے علاوہ معتدبہ حصّہ غزل کے روایتی مضمون عشق کا حامل ہے۔ ان تمام موضاعات کے کچھ نمونے حسب ذیل ہیں:

اساتذہ کا تتبع:

وزیری نے غزل میں غالباً سب سے زیادہ تتبع خسرو دہلوی کا کیا ہے بعض جگہ تتبع کا اعلان کیا ہے اور بعض جگہ خاموشی برتی ہے، لیکن ان زمینوں میں خسرو کی غزلیں موجود ہیں۔ جیسے خسرو کی معروف غزل ''ابرمی بارد و دل می شود از یار جدا'' کی غیر اعلانیہ پیروی:

نالۂ زار کنم چون شوم از یار جدا
می کند مرغ چمن نالہ ز گلزار جدا

(۲۱۱ ب- ۲۱۲ الف)

تاہم حسب ذیل غزلوں میں تتبع کا اعتراف اور اعلان موجود ہے۔
مطلع:

ای مرغ دل تو نالۂ مرغ شبانہ گیر
دی شمع ز آہ گرمِ من امشب زمانہ گیر

مقطع:

پیرو شدہ وزیر بہ خسرو درین غزل
در طرز شعر خود روش خسروانہ گیر

(۱۶۴ الف)

مطلع:

نی درمیان آدمی ، نی در مُلک ، نی در پَری
نشنوده و نی دیده کس مثل تو زیبا پیکری

مقطع:

در وصف شاہ انس و جان گفتی وزیری این غزل
پیرو بہ خسرو گشتہ ای اینست رسم شاعری

(۲۰۴ ب)

مطلع:

باز لعل لب تو میل فسون خوانی کرد
از فسون کان نمک شدہ شکّر افشانی کرد

مقطع:

پیروی کرد وزیری غزل خسرو را
بود مشکل غزلی لیک بآسانی کرد

(۳۲۴ ب-۳۲۵ الف)

وزیری نے حافظ شیرازی کی غزلوں کی تقلید بھی کی ہے اور تضمینات بھی لکھی ہیں۔ وزیری کے یہ دو مطلع ملاحظہ ہوں جو تقلیدی غزلوں سے لیے گئے ہیں۔

مبند دل بہ اساس جہان سست نہاد
اساس او ہمہ نا محکم است و بی بنیاد

(۵۵ الف)

تا کہ از دفتر عشق تو براتم دادند
از غم و محنت ایام نجاتم دادند

(۲۳۳ الف)

وزیری نے حافظ کی دس مشہور اور مقبول غزلوں کی تضمین کی ہے۔ہم صرف ایک نمونے پر اکتفا کریں گے۔

دولتِ وصلِ بتان دل چو تمنا می کرد
زان سبب دل طلب ساغر صہبا می کرد
درد دل را بہ مَی عشق مداوا می کرد
"سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد
آنچہ خود داشت زبیگانہ تمنا می کرد"

(۳۹۹ الف-۴۰۰ ب)

کچھ غیر معروف شعرا جیسے واصلی (۲۲۱ الف، ۲۲۲ ب)، اہلی (۳۶۰ ب-۳۶۱ الف)، سہیلی (ورق ۱۷۷ الف) اور قمر (۱۸۳ الف) کی غزلوں کے جواب بھی لکھے ہیں۔

حمدیہ غزل:

مطلع:

گویا بہ نام تست زبان در دہان ما
نام بزرگ تو شدہ ورد زبان ما

(۹ الف)

مطلع:

ذات پاک تو کہ او را نبود ہیچ زوال
طوطی عقل بہ وصف تو بہ صد ناطقہ لال

(۱۸۵ ب)

مذکورہ حمدیہ غزل خواجہ کمال [خجندی] کے تتبع میں ہے۔

مطلع:

حمد می گویم ثنا بہ خالقِ کون و مکان
تابع فرمان حُکمش هم ملک ، ہم انس و جان

(۳۸۶ ب)

نعتیہ غزل:

مطلع:

شد خَلق طفیل تو ہمہ عالم و آدم
از جملۂ مخلوق وجود تو مکرّم

مقطع:

خاک رہ درگاہِ سگان تو وزیریست
در عالم اخلاص بصد مرتبہ زین کم

(۳۶۹ ب)

ایک نعت جس کے چند اشعار ہی نسخے میں موجود ہیں:

یوسف کہ بی مثال جہان بود لامثال
او سایۂ وجود مثال محمد است
شکر خدا کہ کار وزیریِ بروز و شب
مدّاحی محمد و آلِ محمد است

(۶۳ الف)

معراجیہ غزل:

از مقام لی مع اللہ نیست کس را چون خبر
ہر کسی در باب او گوید سخن رنگ دگر

عید یہ غزل :

باز عید آمد، مہ نو شد نمایان شامِ عید
با حریفان می رساند ماہ نو پیغام عید

(۲۲۴ ب و تکرار ۳۳۴ الف)

بہاریہ غزل :

شد بہار و گل شگفت و گشت صحرا لالہ زار
در مشامم بوی جان می آید از فصل بہار

(۳۴۶ ب-۳۴۷ الف)

ایک ہی مضمون کی دو غزلیں :

پہلی:

دارم از پیر خرد نکتۂ سنجیدہ بگوش
ہر چہ داری بہ مَی کہنۂ دیرینہ فروش
بادۂ عشق حلالست بہ ہر کس کہ دھند
می خورم بادہ باین خرقہ و سجادہ بدوش

(۳۵۴ الف)

دوسری:

نکتۂ خوش بشنو از در میخانہ بگوش
از زبانِ بُت ترسا بچہ ی بادہ فروش
بادۂ عشق حلالست بر اربابِ شہود
عالم از نشۂ او آمدہ در جوش و خروش

(۱۷۵ الف و تکرار ۳۵۹ الف)

مذکورہ غزلوں میں یقیناً وزیری کے پیشِ نظر مولانا جامی کا یہ مضمون رہا ہوگا:

دارم از پیر مغان نقل کہ در دینِ مسیح
بادہ چون نُقل مباح است، زہی نَقلِ صحیح

طرزِ ناہموار:

وزیری نے اپنی بعض غزلوں کو ناہموار طرز پر قرار دیا ہے:

وزیری طرز شعر شاعران ہموار می باشد
خنک شعریست کو در طرز نا ہمواری ای دارد

(۲۱۵ الف وتکرار ۳۳۳ الف)

غزلِ تنگ:

کچھ غزلیں تنگ زمین اور قافیے میں ہیں اور شاعر نے اس کا اظہار یوں کیا ہے:

وزیری این غزل اندر زمین تنگ می گوید
چو عقل خردہ دان بشنود از فکرت بہ تحسین شد

(۲۳۳ ب)

در قافیۂ تنگ وزیری غزلی گفت
احسنت سر ذکر بکند مرد سخن دان

(۱۷۷ ب وتکرار ۳۸۹ الف)

وزیری این غزل را در زمین تنگ می گوید
کہ در پایش دلش زنجیر شد زلف سمنایی

(۱۷۸ ب)

چھوٹی بحر کی غزلیں:

صرف پانچ شعروں پر مشتمل، مطلع:

ہر کس بمن گدا نشیند

باید کہ ز من سوا نشیند

(۳۱۸ ب)

آٹھ شعروں کی غزل، مطلع:

وصف تو بہر زبان نگنجد

اندر قلم و بیان نگنجد

(۳۲۵ الف)

دس شعروں کی غزل، مطلع:

چہ شیرین زبانی تو اللہ اکبر

چہ شکر دہانی تو اللہ اکبر

(۳۴۷ ب)

غزلوں سے انتخاب :

ہم نے یہاں اپنے ذوق کے مطابق وزیری کی چھ غزلوں کا انتخاب کیا ہے۔

(۱)

نگارِ من چو ز خوابِ شبانہ برخیزد

ہزار فتنہ بر اہلِ زمانہ برخیزد

بدیدہ خواب ز افسانہ شب ہمی آید

ز دیدہ خواب مرا از فسانہ برخیزد

مگر بآہ شرر بارِ من بشام فراق

چو شمع ھر نفس از وی زبانہ برخیزد

در آستان تو از دست تو چہ داد کنم

کہ خونِ بی گنہان ز آستانہ برخیزد

حجابِ وصلِ تنِ ناتوان بہانہ شد
رسد بہ وصل اگر ، این بہانہ برخیزد
قدم بہ کوی ملامت نہادہ ام ناصح
بگوش خود شنوم گر ترانہ برخیزد
دلم کہ مرغ شب آھنگ شدہ وزیر مگر
ز نالہ اش ہمہ مرغ شبانہ برخیزد

(۳۲۳ ب-۳۲۴ الف)

(۲)

از باد صبح خندۂ گل در چمن چہ بود؟
گل غنچہ را بہ پیش لب او سخن چہ بود؟
گر بادِ بوی زلف تو در حسنِ سرو بود
خون در درون نافۂ مشک ختن چہ بود؟ گر نیست قصد
بُردن دلہای عاشقان
در حلقہ ھای زلف تو چندین شکن چہ بود؟
پروانہ گردِ شمع پریدن گرفت، سوخت
مقصود زین پریدن و زین سوختن چہ بود؟
دل در خیال آن کمر مو شدہ خیال
در نیستی بگویی کہ رمز دھن چہ بود؟
برگ گلست گوش ، بنا گوش شبنم است
آبی معلق است بگو آن ذقن چہ بود؟
گشتم چنان ضعیف کہ در زیر پیرھن
آمد اجل بدید کہ در پیرھن چہ بود؟

(ملخصاً ۳۳۱ الف)

(۳)

ارادتیست دلم را بہ پیر بادہ فروش
سبو صفت شدم او را غلام حلقہ بگوش
بجام بادہ صراحی حکایتی می گفت
بزیر لب دل من کردہ آن حکایت گوش
چہ گفت؟ گفت کہ افسوس ازین جہانِ خراب
کہ بادہ بر لب و مستان ز گفتگو خاموش
دلم ز صومعہ بگرفت و سوی میکدہ رفت
نشست یک نفس در دکانِ بادہ فروش
لباس زھد گرو کرد و جام بادہ گرفت
کہ تا ز مستی خود یکدمی شود بی ھوش
کشید جام لبالب زدست ساقی جام
شنُود از لب او نعرہ ھای نوشانوش
درین غزل ہمہ اسرار بادہ نوشان گفت
چو یافت فیض وزیری ز پیر بادہ فروش

(۱۹۶ ب-۱۹۷ الف)

(۴)

خلافِ عقل بُوَد دل درین جہان بستن
بباغ و راغ و گل و سرو بوستان بستن
ازان بزلف تو بستم دلِ رمیدۂ خویش
بپای مرغ بُوَد رسم ریسمان بستن
ہزار وعدہ نمایی، یکی وفا نکنی
تو خود بگویی چسان دل توان بران بستن؟

دکان عشق کہ رختِ محبت است درو
خوشست زادِ سفر رخت ازین دکان بستن
بدرس عشق نباشد زبان قال و مقال
ازان بُوَد روشِ عاشقان زبان بستن
چو شمع سوختم از آتش فراقِ تو من
بہ یکدگر چکنم رشتہ ھای جان بستن
وزیریا بدرِ دوست از سرِ اخلاص
نشان صدق و سعادت بود میان بستن

(۱۹۴ ب-۱۹۵ الف و تکرار ۳۹۱ الف)

مندرجہ ذیل غزل کلیات وزیری میں ردیفِ نون میں ''کردن'' ردیف کے ساتھ درج ہوئی ہے (۷) جو عراقی (۸) کی مشہور غزل

نخستین بادہ کاندر جام کردند
ز چشمِ مست ساقی وام کردند

کا تتبع معلوم ہوتی ہے، غزل یہ ہے:

(۵)

چو آبِ تاک را مَی نام کردن
بہ مَی خواری مرا بدنام کردن
خمار چشم ساقی مستی آورد
بساغر تا مَی گلفام کردن
ہزاران مرغ دل شد صید آن دام
بتان از زلف بر رُخ وام کردن
جمالت صبح و زلفت شام تاریک
بہم چون جمع صبح و شام کردن

بُتان را من دعا کردم بظاهر
بزیر لب مرا دشنام کردن
خیالت بُود آرام دلِ من
ندانم از چه بی آرام کردن
خبرداری ز جمشید و زجامش
کہ او را بادہ چون در جام کردن
وفا جستند از عالم وزیری
همہ مردم مرا خیام کردن

(۲۳۷ الف)

(۶)

زلف توخم بخم شدہ ، ابرو گرہ گرہ
بسیار خوش نماست بُود مو گرہ گرہ
مرغولہ هاست در خَم گیسوی دَرهمت
چون نافہ گشتہ هم خَم گیسو گرہ گرہ
در تارهای زلف تو دیدیم چند گرہ
بندند رشتہ مردم جادو گرہ گرہ
هر یک گرہ ز بند قبای تو غنچہ است
بند قبای سُرخ بہ پهلو گرہ گرہ
هر حلقہ ای ز زلف تو یک نافہ ای بُود
در چین فتادہ نافہ ای آهو گرہ گرہ
از بوی خوش دماغ وزیری معطر است
باد صبا رساند بما بو گرہ گرہ

(۳۹۳ ب-۳۹۴ الف)

گذشتہ صفحات میں کلیات وزیری سے جو تفصیلات اور جزئیات درج کی گئی ہیں، اگر ہم ان کا خلاصہ چند سطور میں پیش کرنا چاہیں تو یہ ہوگا:

وزیر خان نام، وزیر اور وزیری تخلص ، فارسی گو شاعر جس کا آبائی وطن چین اور نسل تاتار تھی، ٹھیک گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں ہندوستان میں تھا۔ اس نے خمسہ، چار دیوان اور کچھ مختصر مثنویاں اور قصے لکھے۔ اس کی مختصر مثنویوں، غزلوں، قصیدوں، رباعیوں پر مشتمل کلیات کا ایک نسخہ ہم تک پندرہویں صدی ہجری کے پہلے ربع میں پہنچا ہے۔ باقی کلام (خمسہ، دواوین اربعہ) کا فی الحال سراغ نہیں ملا۔

کیا فارسی ادب کی مدوّن تاریخ میں مذکورہ بالا کوائف کا حامل کوئی شاعر ملتا ہے یا مخطوطات کی فہرستوں میں اس کی تصانیف کا ذکر موجود ہے؟ ان کا مختصر جواب ''نہیں'' ہے جو ہمیں متعدد تذکروں، تواریخ ادب اور فہارسِ مخطوطات کی ورق گردانی کے بعد ملا ہے۔ ہمارے پاس فارسی شعرا کے حالات کے منابع پر راہ نمائی کرنے والا اہم ترین مأخذ *فرہنگ سخنوران* مؤلفہ عبدالرسول خیامپور ہے جو خود متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تذکروں، تاریخوں کا ماحصل ہے۔ احمد منزوی کی دو تصانیف *فہرست نسخہ ھای خطی فارسی* اور *فہرست مشترک نسخہ ھای خطی فارسی پاکستان* فارسی مخطوطات کے بارے میں جامع مآخذ ہیں۔ یہ تینوں کتابیں وزیری اور اس کی تصانیف کے بارے میں خاموش ہیں۔ ہم نے مزید تفحص کرتے ہوئے کچھ اور تذکروں اور کتابیاتی مآخذ کو بھی دیکھا ہے جیسے *تذکرِ احباب* (نثاری)، *مجمع الشعراء جہانگیر شاہی* (قاطعی)، *تذکرۃ الشعراء* (مطربی)، *نسخہ زیبای جہانگیر* (مطربی)؛ *مآثر رحیمی* (نہاوندی)؛ *نشتر عشق* (حسین قلی عشق) *دانشنامہ ادب فارسی*، جلد اول و سوم (زیر نظر حسن انوشہ)؛ *کاروان ہند* (گلچین معانی)؛

Mughals in India (Marshall), *World Survey of Islamic Manuscripts* (ed. Geoffrey Roper), *Dictionary of Indo Persian Literature* (Nabi Hadi).

ان میں سے کسی ایک میں بھی گیارہویں صدی ہجری کے شاعر وزیری اور اس کی کتابوں کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ اس بنا پر ہم نہایت احتیاط کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وزیری ہمارے لیے ایک نودریافت شاعر ہے اور اس کا موجودہ کلّیاتِ اشعار کا نسخہ منحصر بفرد ہے۔ بے شک ایک فرد کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ تمام مآخذ و منابع پر نظر رکھ سکے لہٰذا اگر دوسرے محققین اور صاحبانِ نظر اس سلسلے میں کسی مختلف نتیجے پر پہنچیں تو ہم اُن کی تحقیقات سے نیاز مندی کے ساتھ استفادہ کریں گے۔

حواشی

۱۔ ملاحظہ ہو ''نسخۂ نفحات الانس از روز گارِ جامی' آیندہ، تہران، سال دہم، شمارہ ۸-۹، ۱۹۸۳ء۔ یہ نسخہ، مصنف کے نسخے سے نقل اور مقابلہ ہوا اور شعبان ۸۸۳ھ میں کتابت ہوا، اس کے حاشیے پر جامی کی تحریر موجود ہے۔ اب گنج بخش اسلام آباد شمارہ ۹۲۶۰ میں ہے۔ نیز ''مجموعۂ لطایف و سفینۂ ظرایف منبعی کہن در شعر فارسی و صنایع ادبی''، معارف، تہران، جلد ۱۶، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۹۹ء۔ یہ ۸۰۴ھ میں ہندوستان میں مرتّب ہوا اور دانشکدۂ ادبیات کابل یونیورسٹی کا مخطوطہ تھا، اب خلیل الرحمان داودی، لاہور کے پاس ہے۔

۲۔ اس مضمون کی تیاری کے بعد داودی صاحب ۲۶ جنوری ۲۰۰۲ء کو انتقال کر گئے۔ نسخہ ابھی تک اُن کے بیٹے شقایق النعمان داودی صاحب کے پاس موجود ہے۔

۳۔ نسخے میں یسرب کتابت ہوا ہے اور حاشیے میں یثرب کی جگہ بطحا لکھا ہے۔

۴۔ استانلی لین پول، *طبقات سلاطین اسلام*، فارسی ترجمہ عباس اقبال، تہران، ۱۹۸۴ء، ص ۱۲۱: محمد معین، *فرہنگ فارسی*، تہران، ج ۵، مادّہ ''ایلگ خانیان''۔

۵۔ اصل میں: ماندی۔

۶۔ شہزادہ مراد ۵ شوال ۱۰۰۷ھ اور شہزادہ دانیال ۱۰۱۲ھ میں فوت ہوا۔ جہانگیر کی ولادت ربیع الاول ۹۷۷ھ میں ہوئی۔

۷۔ اس غزل کا ردیفِ نون میں اندراج صَوتی رملفوظی املا کا نمونہ ہے، کیوں کہ ''کردند'' کی دال اس بحر رغزل میں پڑھی نہیں جاتی، نہ ہی تقطیع میں آتی ہے۔

۸۔ خود عراقی نے چھٹی صدی ہجری کے اواخر کے شاعر صفی الدین یزدی کی غزل:

چہ درد است این کہ عشقش نام کردند
وزو آشوبِ خاص و عام کردند

کا تتبع کیا ہے۔ دیکھیے عوفی، *لباب الالباب*، طبع سعید نفیسی، تہران، ۱۳۳۵ش، ص ۳۳۱

اظہار تشکر: یہ مضمون اشاعت سے قبل پروفیسر ڈاکٹر معین نظامی، استاد زبان و ادبیات فارسی اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور نے ملاحظہ کیا اور اسے بہتر بنانے کے لیے صائب مشورے دیے، اس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

ابو الکلام قاسمی

سردار جعفری کے تنقیدی رویے

ادبی تنقید، اگر تخلیقی سرگرمیوں کے بر خلاف ایک خاص شعبۂ علم یا سائنس ہے تو اس کے اصول اور معیار کو بھی تخلیقی اظہار کے مقابلے میں واضح طور پر غیر شخصی اور معروضی ہونا چاہیے۔ یوں تو ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو تنقید کو تاثر یا راست ردعمل کا نعم البدل تصور کرتے ہیں، مگر وہ بھی اپنے ردعمل کو بحیثیت ناقد معروضیت کے التباس کے ساتھ ہی پیش کرنے میں اپنی عافیت محسوس کرتے ہیں۔ تاہم جب کوئی ایسا تخلیق کار بھی تنقیدی سرگرمیوں میں مصروف ہو جو بنیادی طور پر ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت متعین کرا چکا ہو تو اس کی تنقید سے اپنے تخلیقی رویوں کا جواز فراہم کرنے کا اندیشہ بہرحال لاحق رہتا ہے —— علی سردار جعفری نہ صرف یہ کہ ایک ممتاز صاحبِ اسلوب شاعر ہیں بلکہ انھوں نے اپنے شاعرانہ اسلوب کے ذریعہ ترقی پسند اصول و نظریات کی عملی تصویریں پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اُن کو کسب فیض کے لیے جو شعری سرمایہ ملا تھا وہ میر انیس، اقبال اور جوش کے اسالیب کا سرمایا تھا۔ چنانچہ ان کی شاعری کا اسلوب عوامی یا عام فہم بننے کی کوشش میں مصروف نظر آنے کے باوجود ان کے اپنے آئیڈل شعراء کے غیر عوامی ڈکشن سے قریب اور بڑی حد تک متاثر معلوم ہوتا ہے —— سردار جعفری کے تنقیدی رویوں کو سمجھنے کی خاطر اس تمہید کی ضرورت اس لیے ناگزیر ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں پر اپنے شاعرانہ کردار کی توثیق اور اپنی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں کے لیے جواز فراہم کرنے کا

الزام بالعموم عائد کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سردار جعفری کے تنقیدی مزعومات سے ان کے اپنے شعری اسلوب کے ہم آہنگ ہونے کا تاثر قائم ہوتا ہے، مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کی تنقید کا آئیڈل محض ان کی اپنی شاعری رہی ہو۔ سردار جعفری کی ذہنی نشو ونما میں اردو کی قدیم ادبی روایت، کلاسیکی اقدار اور ان کے رچاؤ کا عمل دخل بہت نمایاں ہے، جب کہ وہ ابتدائی زمانے کی تنقید میں پرانی معاشرتی اقدار کو جاگیردارانہ اقدار، اور ماضی کی ادبی روایت کو فرسودہ اقدار پر مبنی روایت قرار دیتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے ان تضادات کو حل کیے بغیر نہ تو ان کے تنقیدی رویوں کو سمجھنا آسان ہے اور نہ ان کی تنقید کے مضمرات تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

سردار جعفری نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری کے ساتھ بعض تنقیدی مضامین سے کیا تھا، جن کی منظم اور مربوط شکل ان کی کتاب ترقی پسند ادب، میں سامنے آئی۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی برسوں میں تحریک سے وابستہ افراد کی جذباتی وابستگی، ہر تحریک یا رجحان کی ابتداء سے وابستہ شدت، اور جذباتیت کی طرح فطری اور ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ صورتِ حال اس وقت زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے جب معاملہ کسی ایسی ادبی تحریک کا ہو جس کے کچھ سیاسی مضمرات بھی رہے ہوں۔ پھر یہ کہ اگر ایسی تحریک کے کسی عام اور غیر منطقی مقلد کے بجائے سردار جعفری جیسے پختہ کار شاعر اور نظریہ ساز نقاد کی کارکردگی زیرِ بحث ہو تو اسے سرسری رائے زنی سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ سردار جعفری کو ان کے تنقیدی رویوں کے ارتقا کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے اور کسی ایک کتاب یا ایک زمانے کی تحریروں پر اکتفا کر کے جلد بازی میں رائے قائم کرنے کے بجائے ان کی تنقیدی فکر کی تبدیلیوں پر بھی نظر رکھی جائے۔

سردار جعفری کی تنقیدی تحریروں کو بڑی آسانی سے دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلا دور ترقی پسند تحریک کی ابتداء اور اس کے بعد بیس پچیس برسوں کا احاطہ کرتا ہے، جب کہ دوسرے دور میں ان کی ان تنقیدی تحریروں کو شمار کرنا چاہیے جو ترقی پسند تحریک، کی اشاعت دوئم (۱۹۵۷ء) کے بعد یعنی چھٹی دہائی کے آغاز سے ماضی قریب تک کی تقریباً

چار دہائیوں پر مشتمل ہیں۔ اس دور میں پیغمبرانِ سخن، اور اقبال شناسی، میں شامل تحریریں اور اردو اور انگریزی میں شائع شدہ تنقیدی مضامین کے علاوہ اس لیکچر کو بھی اہمیت حاصل ہے جو انھوں نے 'ترقی پسند تحریک کی نصف صدی' کے عنوان سے دیا تھا اور بعد میں اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ ادوار کی تقسیم کا سب سے بڑا منطقی جواز تو یہ ہے کہ اگر ہم ترقی پسند ادب، اور ترقی پسند تحریک کی نصف صدی، یعنی ایک ہی موضوع پر ان کی دو اہم کتابوں کا موازنہ کریں تو دونوں کے درمیان تنقیدی رویے کا نمایاں فرق محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ انھوں نے تحریک کی نصف صدی کا جائزہ لیتے ہوئے ترقی پسند ادب، میں پیش کیے جانے والے خود اپنے تصورات اور تعصبات کی اگر کوئی خاص تردید نہیں کی تو ان کی توثیق بھی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کے اندر اس اعترافی جرأت کی کمی ہے جو کسی شخص کو اپنے ذہنی ارتقاء یا تغیر پذیر فکری تبدیلیوں کے مختلف پڑاؤ کو نشان زد کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ اگر اس نوع کی تبدیلی کا مشاہدہ کرنا ہو تو اس کے لیے آل احمد سرور کے فکری ارتقاء سے اور اعتراف کی جرأت دیکھنی ہو تو محمد حسن عسکری کی تنقیدی فکر کی تبدیلی سے رجوع کرنا چاہیے۔ تاہم یہ بات بھی کم اہم نہیں کہ سردار جعفری نے اپنی تحریک کی نصف صدی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے پرانے تنقیدی تحفظات پر اصرار کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اپنی تنقید نگاری کے دوسرے دور میں وہ ادب کو نسبتاً زیادہ وسیع سیاق و سباق میں دیکھنے کی طرف مائل ہیں اور ادبی اسالیب کے متعین سانچوں اور نو آبادیاتی طرز کے روایت کی تنسیخ پر مبنی تصورات کے دائرے سے باہر نکل آئے ہیں۔

سردار جعفری نے اپنی کتاب میں ترقی پسند جمالیات کی شیرازہ بندی کا جو فریضہ انجام دیا تھا وہ بالعموم کرسٹوفر کاڈول اور لوکاچ کے تصورات سے استفادے پر مبنی تھا اور جس کی منتشر شکلیں اردو میں اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، اختر انصاری، مجنوں گورکھپوری، اور سید احتشام حسین کی تحریروں میں تلاش کی جا سکتی تھیں۔ مگر جعفری کا یہ کوئی

معمولی کارنامہ نہیں کہ انھوں نے ادب کی ماہیت، جمالیات، افادیت سے اس کے تعلق، شعر و ادب کے عوامی سروکار، براہ راست یا بالواسطہ اظہار، اور ادیب کی وابستگی یا عدم وابستگی جیسے مسائل کو بنیاد بنا کر ترقی پسند شعر و ادب کے لیے منظم، مربوط اور مدلل انداز میں ایک نوع کی شعریات کو مرتب کرنے کی اہم ذمہ داری نباہی۔ لیکن جس طرح یہ بات واضح ہے کہ ترقی پسند شعریات کو مرتب کرنے کی کوشش کسی معمولی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونا نہ تھی اسی طرح اس جمالیات سے جن ادبی اور تخلیقی اقدار کی نفی ہوتی تھی ان کے رمز شناسوں کا ہدفِ ملامت بننا بھی ایک فطری ردعمل سے دوچار ہونے کے مترادف تھا۔۔۔ اس سلسلے میں سردار جعفری نے اپنے آپ کو کبھی نقاد کے منصب پر فائز نہیں بتایا اور نہایت انکسار کے ساتھ ایک قاری یا ادبی منظر نامے میں شریک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اپنے نقطۂ نظر کو مرتب کرنے کی طرف توجہ مبذول رکھی۔ انھوں نے اپنی پہلی تنقیدی کتاب میں یہ بات واضح کی کہ:

> حقیقتاً میں نے نقاد کے فرائض انجام نہیں دیئے ہیں کیوں کہ مجھے نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ میں نے خود ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اُس تحریک کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا ہے، جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اور جس سے میرا شروع سے قریبی تعلق رہا ہے، اسے کاغذ پر منتقل کر دیا ہے۔

اس طرح بہت بعد کے زمانے میں انھوں نے پیغمبرانِ سخن کے دیباچے میں بھی اس بات کا اعادہ کیا کہ:

> میں اپنے آپ کو نقادوں کی صف میں شمار نہیں کرتا، اور میں نے پیشہ ور نقادوں کا سا رویہ بھی نہیں اختیار کیا ہے۔ میرے لیے کبیر، میر اور غالب کی شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعرگوئی کے لیے ضروری ہے۔۔۔

مختلف ادوار کے ان بیانات سے سردار جعفری کا موقف بالکل واضح ہے، لیکن ان

وضاحتوں کے باوجود اردو کی ادبی تاریخ ان کی شاعری کے ساتھ شاعری کا، اور تنقید کے ساتھ خود مکتفی تنقید کا ہی برتاؤ کرے گی۔ یہ بات درست ہے کہ معاصر ادبی منظرنامے میں شریک ادیب کو اس کے شخصی حوالوں کے بغیر سمجھنے کی روایت اردو میں ہنوز رائج نہیں ہوسکی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ سرداری جعفری کی تنقید کو جن بعض نقادوں نے موضوع بحث بنایا ہے انھوں نے بالعموم ان کی شخصیت سے سروکار اور شاعرانہ حیثیت کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ تاہم اس صورت حال کے باوجود اس بات کی کوشش تو کی ہی جاسکتی ہے کہ ان کی تنقید نگاری کے دو واضح رویوں کے فرق کو سمجھا جائے اور اسی تناظر میں تنقید نگاری میں ان کی کارکردگی کا تعین کیا جائے۔

سردار جعفری کے پہلے دور کی تقریباً تمام تنقیدی تحریریں ترقی پسند ادب، میں شامل تصورات کا واضح عکس معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے ان تحریروں میں ان کا ناقدانہ کردار انفرادی ہونے سے کہیں زیادہ تحریک کی مدافعت یا وکالت کا تنظیمی انداز لیے ہوئے ہے۔ شاید اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ جب تنقید دفاع یا وکالت کا فریضہ انجام دیتی ہے تو اس کو سب سے پہلے معروضیت اور غیر جانبداری سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ ان کی دورِ اول کی تنقیدی تحریروں میں کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ انھوں نے انفرادی انداز میں تعین قدر کرنے کے بجائے اپنی تنقید میں اجتماعی اور سماجی قدروں پر زور دیا، پرانی شعری، حتیٰ کہ اخلاقی اقدار کو ساختی اقدار سے تعبیر کیا، ادب کی ماہیت کو اس کی افادیت پر قربان کیا اور اپنے ادبی سرمایے کے بارے میں جانب دارانہ تنظیمی نوعیت کے فیصلے صادر کیے، اور اس ضمن میں ان کا عام رویہ پرانے اسالیب پر تنقید اور نئے اسالیب کی تلقین کا رہا۔ مگر تضاد کی صورت وہاں نمایاں ہوتی ہے کہ جب وہ اس عمومی رویے کے باوجود ابتدائی تحریروں میں نئی ہیئتی تبدیلی اور تجربے کو بھی ہدف تنقید بناتے ہیں۔ انھوں نے نظم کی آزاد ہیئت یا بلینک ورس کو اردو ادب کے دامن پر بدنما دھبہ قرار دیا تھا۔ لیکن ترقی پسند ادب، میں ان کے یہاں اس نوع کی شدت اور جذباتیت میں قدرے کمی آئی اور انھوں نے اپنی کتاب میں ہیئت یا صنف کے معاملے میں اس طرح کی انتہا پسندی کا

ثبوت تو کم دیا مگر اردو کے ادبی سرمائے میں موجود اجتماعی اور بنیادی رویوں کو ہدف ملامت بنانے سے باز نہ آئے۔ حالانکہ اگر انھوں نے ترقی پسند جمالیات کی ضابطہ بندی کے دوران اردو کی روایتی اور بیانیہ اصناف سخن مثلاً مثنوی، مرثیہ، واسوخت اور شہر آشوب کو بھی نظیر بنا کر پیش کیا ہوتا تو کسی طرح کا منفی رویہ اختیار کیے بغیر وہ ترقی پسند جمالیات کی تشکیل زیادہ مستحکم بنیادوں پر کر سکتے تھے۔ سردار جعفری ادب کے ماہیت کا تعین کیوں کر کرتے ہیں اور ترقی پسند شعریات کے لازمی عناصر کن چیزوں کو شمار کرتے ہیں؟ اس کا ایک خاکہ مندرجہ ذیل بیانات سے مرتب کیا جا سکتا ہے

۱- ''میرے نقطۂ نگاہ کی بنیاد یہ ہے کہ وہ کسی داخلی تعصب کے بجائے مادی، تاریخی اور عمرانی حقائق پر مبنی ہے۔''

۲- جو لوگ جمالیاتی ذوق کو وجدانی، داخلی اور بالکل انفرادی سمجھتے ہیں وہ خیال پرستی، تصوریت، عینیت اور ماورائیت کے مرتکب ہوتے ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور سے رجعت پرستی کے لیے راستے کھولتے ہیں، جن کے پیچ و خم بظاہر کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں بہرحال ہوتے ہیں خطرناک۔

۳- ہر دور کا عظیم ادب وہی ہے جس میں عوامی سچائی اور عوامی قدریں ہیں۔

۴- آج ترقی پسند ادیبوں کے سامنے بنیادی سوال عوامی ادب کی تخلیق کا سوال ہے — دنیا کا بہترین ادب ہمیشہ عوامی رہا ہے۔ عوامی قدروں کے بغیر ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔

۵- اگر تجزیہ کیا جائے تو آخر میں ہر حسین چیز انسان کے مفاد سے وابستہ نظر آئے گی۔ جو چیز مفید نہیں وہ حسین نہیں ہو سکتی۔

۶- اردو کی پرانی غزل جو اپنا رشتہ عوام سے نہیں جوڑ سکی اس کے بھی شاہکار اپنے عہد کی ایک دل دوز تنقید ہیں، خواہ ان کی لے میں میر کا سوز و گداز، تڑپ اور ٹیس ہو، خواہ غالب کا نشاط انگیز حزن و ملال ——

ان بیانات میں سردار جعفری ایک آزاد قاری یا تنقید نگار کے بجائے ایک مخصوص

تنظیم کے ترجمان اور مبلغ نظر آتے ہیں۔ ان کے بیانات سے بسا اوقات خود ان کے اپنے بعض شعری طریق کار کی نفی ہوتی ہے اور اس شعری سرمایے پر بھی خط تنسیخ کھینچنے کا انداز ملتا ہے جس سرمایے کے زیر اثر انھوں نے خود بھی اپنے اسلوب اور ڈکشن کو متعین کیا تھا۔ جہاں تک جمالیات کے معاملے میں افادیت پر اصرار کا سوال ہے تو انسان کی سرشت میں احساس جمال، جذباتی اور حسی ضرورتیں، حد سے بڑھی ہوئی مادیت اور افادیت سے اکتاہٹ اور تمام ظاہری وسائل زندگی کی فراہمی کے باوجود وجدانی، روحانی اور مابعدالطبیعیاتی رویوں کی طرف میلان، جیسے مخفی رجحانات نے جمالیات اور افادیت کے رشتے کو انسانی تاریخ میں بار بار مشتبہ اور بے معنی ثابت کیا ہے اور جہاں تک عوامی ادب کی تخلیق کا قضیہ ہے تو یہ معاملہ کچھ اس قدر اضافی نوعیت رکھتا ہے کہ تہہ دار، دوررس، جامع اور معنوی امکانات کی حامل شاعری کے مقابلے میں نسبتاً کم تہہ دار اور کم جامع، اور پھر اس کے بعد اکہری اور سپاٹ شاعری کو زیادہ عوامی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس معیار کو اگر جعفری صاحب خود اپنی بعد کی تنقیدی تحریروں میں اپناتے تو نہ وہ میر اور غالب کی تحسین کر سکتے تھے اور نہ اقبال کی۔

یوں تو سردار جعفری نے ترقی پسند ادب، کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ:

> میری کتاب کا موضوع صرف نظریاتی مباحث اور ترقی پسند تحریک کے محرکات اور رجحانات تک محدود ہے۔ اس لیے بیش تر ادیبوں اور ان کی تخلیقات کا ذکر صرف حوالوں اور مثالوں کی شکل میں آیا ہے ——

لیکن جب وہ ادیبوں اور شاعروں کا انفرادی جائزہ لیتے ہیں تو ان کی رائے تجزیاتی سے زیادہ متعصبانہ اور ضمنی سے زیادہ بنیادی نوعیت اختیار کر لیتی ہے۔ ترقی پسند ادب میں راشد، اختر الایمان، حتیٰ کہ فیض اور مخدوم پر جس طرح کے اعتراضات کیے گئے ہیں یا منٹو اور عصمت چغتائی کے بارے میں جس طرح کی رائے کا اظہار کیا گیا ہے، ان کو خود ترقی پسند حلقوں میں قبول نہیں کیا جا سکا اور ان ادیبوں اور شاعروں کی فنی اور جمالیاتی قدروں

نے اس طرح کی کسی رائے کو رائج ہونے کا موقع نہیں دیا۔ جہاں تک فیض اور مخدوم پر اعتراضات کا سوال ہے تو اس ضمن میں شعر کی بنیادی ہیئت سے ان کی چشم پوشی کا اندازہ غیر ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ محض ترقی پسند نقادوں نے بھی لگایا ہے۔ فیض کی نظم صبح آزادی پر انھوں نے لکھا تھا کہ:

> میں صبح آزادی میں استعاروں کے کچھ ایسے پردے ڈال دیئے گئے ہیں جن کے پیچھے پتہ نہیں چلتا کہ کون بیٹھا ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے ع یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر، وہ انتظار تھا جس کا وہ یہ سحر تو نہیں — اور آخری مصرع ہے ع چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی —— لیکن یہ بات تو مسلم لیگی لیڈر بھی کہہ سکتے ہیں۔
>
> ...... اس نظم میں داغ داغ اجالا ہے، شب گزیدہ سحر ہے، حسینانِ نور کا دامن، ہے۔ فضا کا دشت ہے، تاروں کی آخری منزل ہے، پکارتی ہوئی باہیں اور جلاتے ہوئے بدن ہیں۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن نہیں ہے تو عوامی انقلاب اور عوامی آزادی، غلامی کا دور اور اس کا مداوا —— ایسی نظم ایک غیر ترقی پسند شاعر بھی کہہ سکتا ہے۔ اگر ہمیں فیض کی ترقی پسندی کا علم نہ ہو تو ہم اس نظم کا کوئی مفہوم نہیں نکال سکتے۔ یہ شاعری کے سماجی مقصد سے انکار اور حقیقت پرستی کا نتیجہ ہے۔
>
> (ترقی پسند شاعری کے بنیادی مسائل) (شاہراہ)

عوامی ادب اور عوامی انقلاب کا یہ مطالبہ فیض ہی کیا خود سردار جعفری کی متعدد نظموں، مثلاً میرا سفر، تخلیق کا کرب، اور شاعر وغیرہ کے لیے درست نہیں معلوم ہوتا۔ فیض کی فنی ہنر مندی، ڈکشن کی تہہ داری اور استعاراتی جہات نے جس طرح اردو کے جدید نظم گو شعراء میں ان کو ممتاز اور سربرآوردہ بنا دیا ہے، اس کی وجہ سوائے اس کے اور نہیں کہ انھوں نے سردار جعفری کے بیانات اور ان جیسے انتہا پسند ادیبوں کی ضابطہ بندی کو ہمیشہ ناقابلِ اعتنا

تصور کیا۔ اگر سردار جعفری کو فیض کے یہاں غلامی کے احساس اور اس کے مداوا کی تلاش تھی تو انھیں راشد کی نظم 'انتقام' یا سماجی اور انسانی معاملات و مسائل سے گہرا سروکار رکھنے والی دوسری نظموں کو مسترد کرنے کے بجائے ترقی پسندی کا نمونہ قرار دینا چاہیے تھا۔ ویسے اکہرے پن پر مبنی اس قسم کے تنقیدی بیانات پر اگر ہم ایک اور غالی ترقی پسند نقاد ممتاز حسین کی رائے ملاحظہ کرلیں جو انھوں نے اقبال اور مخدوم کے بارے میں دی تھی تو اس سے سردار جعفری کے اس رویے کی تردید بھی ہو جاتی ہے اور ترقی پسند تنقید میں رد و قبول کی صورت حال کا اندازہ ہو جاتا ہے:

مخدوم کی نظم انقلاب کا یہ بند دیکھیے:

اے جان، نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سرِ رہ گذار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

میرا خیال ہے کہ مخدوم کے اس بند کو مسیحِ موعود کا انتظارِ شوق سمجھ کر کوئی بھی مسلمان پڑھ سکتا ہے لیکن اس سے اس بند کے حسن میں کمی واقع نہیں ہوتی ــــ میں خود علامہ اقبال کے مختلف اشعار کو استعمال کرتا ہوں، حالانکہ جس شعور اور اغراض کے ماتحت انھوں نے اشعار لکھے ہیں وہ میرے شعور اور اغراض سے مختلف ہیں۔ شعر میں اگر اتنی ہمہ گیری اور آفاقیت ہو کہ انسان کی اکثریت کی زبان پر چڑھ جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس سے ہماری طبقات بندی پر حرف آتا ہے۔

(ممتاز حسین) (شاہراہ)

ترقی پسند ادب میں سردار جعفری نے غزل کی صنف اور غزل کے ذریعے سامنے آنے والی روایتی اقدار کو متعدد مقامات پر اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ مگر وہ غزل کی صنف کو اپنے

ذوق وشعور کے ذریعہ سمجھنے کے بجائے غزل کے بعض نقادوں کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

> آج بھی غزل کی مخالفت میں بعض غیر ترقی پسند حضرات شامل ہیں جن میں ترقی پسند ادب کے ایک بہت بڑے مخالف کلیم الدین احمد صاحب پیش پیش ہیں، جنھوں نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہہ کر مردود قرار دے دیا۔ اس لیے اس کا سارا الزام صرف ترقی پسندوں کے سر تھوپنا صحیح نہیں ہے۔ غزل میں ایسے عناصر موجود تھے اور اب بھی ہیں جن کی شدت سے مخالفت کی ضرورت تھی اور ہے۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ جس بنیاد پر ترقی پسند ادیبوں نے غزل کی مخالفت کی تھی وہ وہی ہے جسے ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے اپنی کتاب میں غزل کا طرہ امتیاز قرار دیا ہے۔

اس بیاں میں وہ ایک طرف کلیم الدین احمؔد کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں جن کی نظر میں ان کی کتاب مارکسی رنگ کے مستعار خیالات کی بنیاد پر لکھی ہوئی غیر ہضم شدہ خیالات کی لمبی ڈکار کے مترادف ہے، اسی طرح غزل پر اعتراض کرتے ہوئے انھوں نے یوسف حسین خاں کے اس تجزیے کو بنیاد بنایا ہے جس میں انھوں نے صرف دروں بینی اور داخلیت کو غزل کی شناخت قرار دیا ہے —— چونکہ یوسف حسین خاں کا تجزیہ ناقص، اکہرا اور غزل کی زروایت کی پوری تفہیم سے عاری ہے اس لیے جعفری صاحب کی یہ بنیاد بھی غزل کی غلط تعبیر کی تردید بن جاتی ہے، جس کے لیے وہ کہتے ہیں کہ ''غزل کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے اس فلسفہ کی مخالفت ضروری ہے'' —— اگر آپ غزل پر تنقید کے اس رویے کو تاریخ میں پیچھے کی طرف لے جایئے تو اندازہ ہوگا کہ یہ وہی منطق ہے جس کے سہارے کرنل بالرائڈ اور ان کے زیر اثر محمد حسین آزاد نے غزل کی صنف کو از کار رفتہ قرار دیا تھا۔ اسی نو آبادیاتی فکر کا سلسلہ سردار جعفری تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے جو بظاہر جاگیردارانہ اقدار کے مخالف ہیں لیکن ان کو یہ اندازہ نہیں کہ اسی

نوآبادیاتی طریق کار کے ذریعہ دراصل اردو کی قدیم ادبی اقدار، اور پرانے سرمایے کو بے وقعت ثابت کرنے کا ایجنڈا بھی رو بہ عمل آ رہا ہے۔ اس لیے یہ سارا انداز سند دراصل اس ورثے کو جو عوامی، اجتماعی اور کلاسیکی شعور کا زائیدہ تھا اسے عوامی ادب کے نام پر مطعونِ قرار دینے کی طرف مائل نظر آتا ہے۔

'ترقی پسند ادب' کے ساتھ سردار جعفری کی تنقید نگاری کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کے جن تنقیدی افکار پر سخت تنقید کی ہے اور ان افکار کو ان کی ذہنی اور فکری سوانح عمری قرار دیا ہے، ان کا تعلق بھی 'ترقی پسند ادب' میں شامل بیانات اور اسی زمانے میں شائع شدہ مضامین میں سامنے آنے والے تنقیدی رویوں سے ہے۔ مگر سردار جعفری کے پرانے فیصلوں سے انحراف اور بدلی ہوئی صورت حال میں تنقید نگار کی حیثیت سے اپنے جواز کی صورتیں صحیح معنوں میں ان کی دو کتابوں 'پیغمبرانِ سخن' اور 'اقبال شناسی' میں نظر آتی ہیں۔ ان تحریروں میں مصنف کا زاویۂ نظر نسبتاً لچک دار، قدرے معروضی اور ادبی اقدار سے ہم آہنگ ہے۔ پیغمبران سخن، دراصل کبیر، میر اور غالب کے انتخابات کے تنقیدی مقدمات پر مشتمل ہے، جن میں ان تینوں شاعروں کو ہندوستانی سماج کی مخصوص صورت حال اور ادبی روایت کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہی تصوف، جو سردار جعفری کی پرانی تحریروں میں جاگیردارانہ معاشرے کی فرسودہ اقدار اور مابعدالطبیعیاتی حوالوں کے باعث وجدان اور دروں بینی کا زائیدہ نظر آتا تھا، اِن شعراء کے حوالے سے عوامی اقدار کی بنیاد بن جاتا ہے۔ مزید یہ کہ تصوف کا عوامی پہلو بعض مذہبی حوالوں سے بھی زیر بحث آتا ہے۔ اس کتاب میں کبیر کو بھگتی تحریک کا نمائندہ قرار دینے اور انسان دوستی یا ہمہ گیر عوامی اپیل کے باعث اسلامی تصوف سے قریب دکھایا گیا ہے۔ کبیر کی شاعری کے اس تجزیے میں بھگتی، ویدانت اور متصوفانہ فکر کے یکساں سرچشموں کا سراغ لگاتے ہوئے انھوں نے کبیر کا موازنہ جلال الدین رومی اور دوسرے صوفی شعراء کے افکار سے علمی اور تحقیقی بنیادوں پر کیا ہے۔ ترقی پسند ادب میں انھوں نے ''تصوف کو بے وقت کی راگنی قرار دیا تھا، اور ان کا خیال تھا کہ تصوف میں عوامی بھلائی کا کوئی تصور نہیں ملتا''۔

مگر جب وہ کبیر یا میر کے حوالے سے تصوف اور بھگتی پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کو تصوف، قرونِ وسطیٰ کی ایک اہم اور ہمہ گیر تحریک نظر آتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "جدوجہد کی سیاسی، انقلابی تحریکوں کو قرونِ وسطیٰ کی انقلابی فکر سے رشتہ جوڑنا چاہیے۔ اس منزل میں صوفیوں اور بھگتوں کی روایتوں کے ساتھ کبیر، میر اور غالب ہمارے لیے اہم ہیں"۔ سردار جعفری کی اس فکری تبدیلی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی روایت کے تئیں ان کے رویے میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بعد کے برسوں میں انھوں نے اردو کی ادبی روایت کے بنیادی عناصر کے مابین ان مخفی رشتوں کا سراغ لگا لیا ہے جن کی تفہیم کے بغیر ان کی پرانی تحریروں میں یک رخاپن پیدا ہو گیا تھا——

ویسے تو کبیر، میر اور غالب کے تنقیدی جائزے میں سردار جعفری نے ان شعراء کے تخلیقی محرکات کی بھی نشاندہی بڑی خوبی سے کی ہے اور ان کے اشعار کا جگہ جگہ تجزیہ کر کے ڈکشن، اسلوب، لہجہ اور موضوع کو ماہرانہ عملی تنقید سے گزارا ہے، مگر میر کے مطالعے میں انھوں نے خصوصیت کے ساتھ نقدِ میر کے اس ٹائپ کو بھی مسترد کیا ہے جس کو قائم کرنے میں محمد حسین آزاد، عبدالحق اور ان کے بعد کے نقادوں نے اہم رول ادا کیا تھا۔ وہ اس ضمن میں میر کے بارے میں رائج تصورات، سادگی، افسردگی، قنوطیت اور لہجے کی پستی اور انفعالیت پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں۔ اس طرح میر کی تفہیم کے سلسلے میں جعفر علی خاں اثر کی طرح سردار جعفری کو یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے کہ انھوں نے میر کے متنوع لہجوں کو دریافت کیا اور اشعار کے انتخاب اور ان کی تشریح و تعبیر کے ذریعے شاعر کی بے دماغی اور اس کے لہجے کی صلابت اور بلند آہنگی کو نمایاں کیا۔ ان کا خیال ہے:

> میر کو سمجھنے کا ایک آسان طریقہ رائج ہو گیا ہے۔ وہ بہتر نشتروں کے شاعر مشہور ہو گئے، جن کا کلام صرف آہ ہے۔ کیوں کہ کسی نے کہہ دیا کہ سودا کی شاعری واہ ہے اور میر کی شاعری آہ۔ چنانچہ تنقید بھی اسی ڈگر پر چل کھڑی ہوئی اور لوگوں کی توجہ ایسے اشعار کی طرف سے ہٹ گئی جن میں آہوں کا گزر نہیں تھا اور سپردگی، افتادگی،

معصومیت اور سادگی کے بجائے میر کی بے دماغی بول رہی تھی —
میر کی شاعری جتنی سادہ اور دل نشین ہے اتنی ہی ٹیڑھی، بانکی، ترچھی اور تیکھی بھی ہے۔ اس میں جتنی نرمی اور گداز ہے اتنی ہی تلخی اور صلابت بھی ہے ——

اس غیر مروجہ تنقیدی نقطۂ نظر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے میر کے متن کے براہ راست مطالعہ کے ذریعے میر کی تنقید کی بنیادیں نئے سرے سے متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے میر کی زبان کی نوعیت پر بھی اظہار خیال کیا ہے، اور بتایا ہے کہ میر فارسی الفاظ کے مقابلے میں ہندوستانی بول چال کی زبان کو کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ شاعری کی عوامی زبان پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے اپنی کتاب 'ترقی پسند ادب' میں بولی ٹھولی اور عوامی زبان کو شاعری کے لیے آئیڈیل قرار دیا تھا اب وہ یہاں میر کی زبان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

میر اور ان کے ہم عصر شعراء ایک طرف عام بول چال کی زبان کو شعروں میں ڈھال کر خوبصورت اور ادبی بنا رہے تھے اور الفاظ کے نئے نئے جوڑ بٹھا کر اظہار و بیان کے لیے وسعتیں پیدا کر رہے تھے اور دوسری طرف فارسی کی ادبی روایتوں سے استفادہ کر رہے تھے اور محاوروں کا اردو ترجمہ کر کے ہندی اور ریختہ میں کھپاتے جاتے تھے ——

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب سردار جعفری کو عام بول چال کی زبان اور اس زبان کو قبول عام کی سطح تک لانے کے لیے نئی ترکیبوں کی تراش خراش اور مقامی زبان سے فارسی کی ہم آہنگی کی صورتوں کا اندازہ ہو چلا ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ انھوں نے اس ضمن میں فارسی اثرات کے معاملے میں سبک ایرانی اور سبک ہندی کی تفریق قائم نہ کی۔ اگر انھوں نے سبک ہندی کی فارسی شاعری کے مزاج پر ذرا بھی توجہ صرف کی ہوتی تو انھیں بہ آسانی اندازہ ہو جاتا کہ سبک ہندی کی سب سے بڑی خصوصیت مقامی اثرات کو جذب

کرنا ہی رہی ہے۔ اس لیے سبک ہندی کی روایت سے وابستہ میر اور ان کے معاصر شعراء اس رویے کو اپنی اردو کی ساخت میں بھی برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح یہ امتیاز میر کا اکیلا امتیاز نہیں بلکہ اس عہد کی لسانی شناخت کا حصہ ہے، اور اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ میر ہی کیا، غالب تک کے زمانے کی اردو غزل بھی لسانی روایت کے لحاظ سے سبک ہندی کی فارسی روایت کا ہی تسلسل ہے۔ غالب کے معاملے میں سردار جعفری نے شروع سے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا اور غالب کو ہندوستانی اور یونانی فلسفے کی روایت کے ساتھ غیر عوامی لسانی ساخت کے وسیلے سے سمجھنے کا ثبوت دیا ہے۔ اس سلسلے میں امیجری اور حرکی پیکروں کی تخلیق اور حواس کو متحرک کرنے والی لفظیات اور تراکیب کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ان کا خیال ہے:

> غالب کی متحرک اور رقصاں امیجری تصویر گری کی معراج ہے۔ جب وہ اپنی اچھوتی تشبیہوں اور نادر استعاروں کا جادو جگاتا ہے تو ایک ایک لفظ حرکت کرنے لگتا ہے، ٹھہرے ہوئے نقوش سیال ہو جاتے ہیں اور خیال ایک پیکرِ نور بن کر سامنے آ جاتا ہے۔

اس رائے میں جہاں ایک طرف غالب کی رقصاں امیجری کو نشان زد کیا گیا ہے وہیں استعارہ سازی کو بھی اس کا لازمہ بتایا گیا ہے۔ یہ وہی استعارہ سازی ہے جس کی بدولت شاعری میں پیدا ہونے والے دھندلکے اور ابہام کو سردار جعفری اپنی ابتدائی تنقید میں سب سے زیادہ ہدف تنقید بنا چکے ہیں۔ ان کی ناقدانہ فکر کے ارتقاء اور تبدیلی کا سلسلہ پیغمبران سخن کے ابتدائی صفحات سے شروع ہو جاتا ہے جہاں انھوں نے پیش لفظ میں معنوی امکانات کی حامل شاعری کو مختلف زمانوں اور مختلف صورت حال کے قاری کے لیے بدلے ہوئے سیاق و سباق میں سمجھنے پر زور دیا ہے:

> ان مضامین میں اس مشکل کا جواب مل جائے گا کہ صدیاں گزر جانے اور حالات تبدیل ہو جانے اور زبان کے انداز بدل جانے کے بعد بھی ان بزرگ شعراء کا کلام ہمارے ذوق کی تسکین کا

باعث کیوں کر بن سکتا ہے۔ عظیم ادب کی جڑیں اس کے عہد میں پیوست ہوتی ہیں لیکن پھول پھل عہد کی حدوں کو توڑ کر نکل جاتے ہیں۔

اس نوع کے تجزیے سے جہاں ایک طرف ادب فہمی کے معاملے میں سردار کی پختہ کاری کا پتہ چلتا ہے وہیں اس بات کا بھی اندازہ ان کے پہلے دور کی تنقید میں شاعری کی تہہ داری، تفہیم اور ہمہ گیری سے صرف نظر کرنے کا انداز صحیح معنوں میں ان کے مزاج سے کہیں زیادہ تنظیمی ضرورتوں کا تابع تھا۔

پیغمبرانِ سخن کی طرح سردار جعفری نے اقبال شناسی کے مضامین میں بھی اپنے پختہ کار اور تجزیاتی تنقیدی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہی اقبال جو اشتراکیت سے متاثر، حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اور حرکت وعمل کے فلسفے کے علم بردار ہونے کے باعث اپنی ابتدائی شاعری کے حوالے سے ان کے لیے تعریف کے مستحق ٹھہرے تھے قدرے بعد کی شاعری میں مردِ کامل کے لیے شاہین کی علامت کے استعمال کے سبب ان کے معتوب ہوگئے تھے اور انھوں نے ترقی پسند ادب میں لکھا تھا کہ:

> اقبال نے اپنے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا تھا، اور اقبال کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔ یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی خالص بوژروا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشسٹ ڈکٹیٹر کا روپ دھار لیتا ہے اور یہ ڈکٹیٹر (شاہین) لہو گرم رکھنے کا بہانہ ڈھونڈھنے کے لیے جاتا ہے تو اقبال کا انسان دوست دل تڑپ اٹھتا ہے۔

اقبال شناسی کے مضامین میں جلال کو جمال اور عقل کو دل سے الگ کر کے دیکھنے کا انداز نہیں ملتا اور وہ اقبال کے مختلف ادوار کے کلام کو ایک ہی سلسلے کی کڑی تصور کرتے ہیں۔ ان کو خودی کے استحکام کے سارے عناصر ہندوستان اور ایشیاء کی مسلم بیداری کے وسائل

دکھائی دیتے ہیں اور یہ مسلم بیداری ان کے نزدیک دراصل عالمِ انسانیت کی بیداری کا حصہ ٹھہرتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

> اقبال صحیح معنوں میں عالمی شاعر تھے۔ چونکہ اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی فکری روایات اور استعارات کا استعمال کیا ہے اور قوم پرستی (نیشنلزم) کو سیاسی سطح پر قبول نہیں کیا، اس لیے بعض لوگوں نے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا جو اس عظیم شاعر کی توہین ہے۔
> اقبال کے یہاں حب الوطنی ایمان کا درجہ رکھتی ہے اور ان کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اقبال سے متعلق اپنے دو مضامین خودی اور خود شناسی، اور اقبال کا تصور وقت، میں سردار جعفری نے اعلی درجے کی عملی اور تجزیاتی تنقید کا ثبوت دیا ہے۔ خودی کی تکمیل کے عناصر کے ضمن میں انھوں نے اقبالؒ کی نظموں، غزلوں اور مابعد الطبیعیات سے متعلق ان کی کتاب کا نہایت جامع اور وسیع سیاق و سباق سامنے رکھا ہے اور تصور وقت کے معاملے میں اسلامی روایت کے ساتھ وقت سے متعلق مغربی فکر کے پس منظر میں اقبال کے تصور وقت کا عالمانہ جائزہ لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سردار جعفری کی تنقید کا بنیادی رویہ تاثراتی تنقید کے دبستان کے قریب معلوم ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی انھوں نے مارکسی تنقید کے علاوہ نئی مغربی تنقید کے طریق کار سے بھی استفادہ کیا ہے۔

سردار جعفری کی تنقیدی فکر اور نقاد کی حیثیت سے ان کے تغیر پذیر تنقیدی شعور کی روشنی میں اگر یہ بات کہی جائے تو غلط نہ ہوگی کہ ان کی ابتدائی زمانے کی تنقید دراصل ترقی پسند جمالیات کی ترتیب و تدوین کے باعث قابل قدر ہے اور قدرے بعد کی تنقیدی تحریروں میں انھوں نے شعر و ادب کے محاسن و معائب کو ایک کہنہ مشق نقاد کی حیثیت سے دیکھا ہے اور یہی تنقید ان کے تنقیدی رویوں کی معراج ہے۔

◇—◇—◇

سید تقی رضا بلگرامی

بلگرام کا ایک شہرۂ آفاق لُغوی و محدّث علّامہ سید مرتضیٰ بلگرامی الزبیدی

سید محمد صغریٰ بلگرامی کے گلشن بے خزاں کا یہ ایسا گل سر سبد ہے جس کی خوشبو سے مشامِ جانِ عالم معطّر ہے۔ یہ ایسا گوہر شب چراغ ہے جس کی چھوٹ چشم عالم کو خیرہ کیے ہوئے ہے اور یہ ایسا درِیتیم ہے جس کا آب و رنگ تاب و سنگ اس چمنستانِ عالم میں نرالے انداز سے جگمگا رہا ہے۔

علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی کا سلسلۂ نسب ابوالفرح واسطی اور سید علی عراقی سے گزر کر حضرت زید شہید بن حضرت امام زین العابدین علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ وہ سید محمد صغریٰ فاتح بلگرام کے احفاد سے تعلق رکھتے تھے۔ تفصیل اس طرح ہے:

سید مرتضیٰ بن سید محمد بن سید قادری بن سید ضیاء اللہ بن سید جان بن سید عبدالغفار بن سید تاج الدین بن سید حسین عرف دولارے بن سید حسن بن سید محمود بن سید بڈھ بن سید جمال الدین بن سید ابراہیم بن سید ناصر بن سید مسعود بن سید سالار بن سید محمد صغریٰ بلگرامی (وفات ۱۴ شعبان ۶۴۵ھ مطابق ۱۴ دسمبر ۱۲۴۷ء)۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہوئی کہ مورّخین نے علامہ کے نام اور ان کے بزرگوں کے ناموں میں

اختلاف کیا ہے۔ مثلاً رحمان علی، صاحبِ تذکرۂ علمائے ہند نے سید عبدالرزاق نام، محی الدین لقب اور ابو الفیض کنیت لکھی ہے۔ حالانکہ علامہ کا نام عبدالرزاق نہیں تھا۔ نہ کوئی لقب تھا اور نہ کنیت۔ سادات زیدی بلگرام کا نسب نامہ قلمی یا مطبوعہ ہر زمانے میں دستیاب رہا ہے۔ ان شواہد کے باوجود اس قسم کے تسامح کے بارے میں حیرت ہوتی ہے

ع ناطقہ سر گریباں ہے اسے کیا کہیے

محترم سیّد مناظر احسن گیلانی نے بھی صاحب مترجم کا نام علی مرتضیٰ کے بجائے محمد اور کنیت محمد بن محمد ابوالفیض لکھی ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی المصری نے ''عجائب الآثار فی التراجم و الاخبار'' میں اور ایڈورڈ ولیم لین نے مدالقاموس (عربی انگریزی لغت) میں علامہ بلگرامی کا نام اس طرح لکھا ہے۔ ''ابوالفیض سید محمد بن محمد بن محمد بن عبدالرزاق الشہیر بہ مرتضیٰ الحسینی الحنفی الواسطی البلجرامی الزبیدی لکھا ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عدم واقفیت اور تحقیق کی کھکھیڑ سے پہلوتہی کرنے کی وجہ سے مترجمین نے کیسے کیسے گل کھلائے ہیں اور نام، لقب و کنیت سب گھڑ لیے۔

علامہ آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں علامہ سید مرتضیٰ کے جد امجد سید قادری بلگرامی کے حالات کے تحت لکھا ہے کہ:

''وابنائے او سید علی مقتدیٰ بن سید محمد بن سید قادری (۱) مسطور کتب عربی تحصیل کردہ درحداثت سن توفیق زیارت حرمین شریفین یافتہ ۱۱۶۴ھ اسنہ اربع دستین وماتہ و الف این سعادت فائز گشتہ و دراماکن متبرکہ علم حدیث تحصیل نمودہ درین ایام درز بید (یمن) اقامت دارد و نزد شیخ عبدالحق زبیدی فن حدیث سندمی کند حق تعالیٰ او را عمر بافزاید و ترقیات دینی کرامت نماید۔''(۲)

ترجمہ: اور سید قادری کے بیٹوں میں سے سید علی مقتدی بن سید محمد بن سید قادری نے عربی درسی کتابیں پڑھیں اور ابتدائے عمر ہی

میں اللہ نے انھیں زیارت حرمین شریفین کی توفیق عطا فرمائی۔
چنانچہ انھیں ۱۱۶۴ھ میں یہ سعادت نصیب ہوئی اور مقامات مقدسہ (یعنی مکۂ مکرمہ اور مدینۂ منورہ) میں علم حدیث حاصل کیا، وہ اس زمانے میں زبید (یمن) میں قیام پذیر ہیں اور شیخ عبدالحق زبیدی سے فنِ حدیث کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور دینی مراتب عطا فرمائے۔

حضرت مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ:

''کاتب نے بجائے مرتضیٰ، مقتدیٰ لکھ دیا اور صرف اس ایک غلطی نے ہماری نگاہوں سے اس یگانہ عصر فاضل کو چھپا لیا۔''

حقیر رضا بلگرامی عرض کرتا ہے کہ کاتب نے کوئی غلطی نہیں کی۔ علامہ مبرور کا نام سید علی مقتدیٰ ہی تھا۔ ان کے دو بڑے بھائی سید غلام امام الدین اور سید علی مرتضیٰ اور ایک بہن آمنہ بی بی تھیں۔ علامہ آزاد بلگرامی نے اپنی تالیف ''شجرہ طیبہ'' جو سادات زیدی الواسطی بلگرام کا نسب نامہ ہے، علامہ مرتضیٰ کا نام سید علی مقتدیٰ ہی لکھا ہے[۳] اور صاحب ''روضتہ الکریم فی نسب و حالات زیدی الواسطی بلگرام'' نے بھی یہی نام لکھا ہے[۴] سید علی مقتدیٰ نے زبید (یمن) جا کر اپنا نام علی مقتدیٰ ترک کر دیا اور اپنے بڑے بھائی کا نام سید علی مرتضیٰ اپنا لیا لیکن شہرت ''سید مرتضیٰ'' کے نام سے ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام سید مرتضیٰ کیوں رکھا، اس کی وجہ کوئی نہیں بتا سکتا، البتہ اس امر کا امکان ہے کہ علامہ نے عقیدت کی بنا پر ''باب شہر علم'' اور ''خطیب منبر تلونی'' کے مسعود و مبارک نام کو اپنایا جس کا مقصد غالباً علم کے اعلیٰ مدارج اور دینی برکتوں کا حصول ہو۔ بعد کے حالات و واقعات بھی اس خیال کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ انھیں علم لغات، فقہ، حدیث کلام اور دیگر علوم ادب میں جو اعلیٰ مرتبہ، شہرت، عزت اور ناموری حاصل ہوئی وہ دنیائے عرب کیا پورے بسیط عالم میں کسی فرد کو نصیب نہیں ہوئی۔ آپ اس اجمال کی تفصیل اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف نے لکھا ہے کہ:

ترجمہ: ''وہ محدث، فقیہہ، لغوی، ادیب اور علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع تھے۔ دوسرے فیض یافتگان کے علاوہ سلطان عبدالحمید اول، سلطان روم اور دستور اعظم محمد پاشا[۵] صدر الوزارت نے ان سے حدیث کی اجازت لی۔ تلامذہ کی کثرت اور ان کی تصانیف ان کی زندگی ہی میں تمام دنیا میں شہرت پذیر ہونے کی بنا پر اگر ان کو تیرھویں صدی ہجری کا مجدد کہیں تو روا ہے۔''[۶]

سید مرتضیٰ کا موروثی مکان بلگرام کے ''محلّہ سیدواڑہ'' میں تھا لیکن ان کے قبیلہ ''تاجوزئی'' کے ایک بزرگ سید تاج الدین (جن کی وجاہت، تمکنت اور سطوت کی وجہ سے ان کا خاندان ''قبیلہ تا جوزئی'' کے نام سے موسوم اور شہرت پذیر ہوا اور انھی کے مبارک نام سے نسبت دے کر علامہ مرتضیٰ بلگرامی نے اپنی شہرہ آفاق لغت کا نام ''تاج العروس'' رکھا اُن کے فرزند سید عبدالغفار کی شادی سید محمد اشرف بن سید احمد عرف اچھے میاں بلگرامی کی دختر کے ساتھ ہوئی (ان کا خاندان ''پنج بھیا'' یا ''اخوان خمسہ'' کے نام سے مشہور تھا)۔ چونکہ سید محمد اشرف بلگرامی کی اولاد نرینہ نہ تھی اس لیے انھوں نے داماد کو اپنا وارث قرار دیا۔ اس وجہ سے سید عبدالغفار نے محلّہ سید والا کی سکونت ترک کر کے ''محلّہ میدان پورہ'' میں جہاں ان کی سسرال تھی، رہائش اختیار کرلی۔[۷] علامہ سید مرتضیٰ اسی محلّہ میدان پورہ میں ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں پیدا ہوئے۔ سید مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ:

''سید مرتضیٰ اگرچہ عام طور پر زبیدی کی نسبت سے مشہور ہیں لیکن آپ کی ولادت باسعادت شیراز دیار ہند کے مشہور مردم خیز قصبہ بلگرام میں ہوئی۔ بلگرام کی اسلامی آبادی اس زمانے میں دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک حصہ کو ''سید واڑہ'' اور دوسرے کو ''سیدان پورہ'' کہتے تھے۔''[۸]

''سیدان پورہ'' بلگرام میں کوئی محلّہ نہیں ہے۔ میدان پورہ صحیح ہے۔ علامہ مرتضیٰ جیسا کہ لکھا گیا، اسی محلّہ میں پیدا ہوئے۔

مآثر الکرام کے حوالے سے لکھا جاچکا ہے کہ علامہ مرتضیٰ بلگرامی ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۱ء) میں جبکہ اُن کی عمر کا انیسواں سال تھا دارالسلام بلگرام سے ادائے مناسک حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ اس فریضہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد یمن کے قصبہ زبیدہ جو اس زمانے میں مرکز علم و ادب تھا اور بڑے بڑے علماء، فقہا، محدثین اس ارض پاک میں جمع اور درس و تدریس میں شب و روز مشغول تھے، حصول علم حدیث کی خاطر ایک طویل عرصہ تک یہاں قیام فرمایا اس لیے انھیں زبیدی کہا جانے لگا اور اسی نسبت سے ان کی شہرت ہوئی چنانچہ ''تاج العروس'' کے تکملہ نویس نے لکھا ہے :

''وَ اقَامَ بذَبِیُد مُدۃ طَوِیُلہ حتّی قیلَ لہٗ الذَبیدیُ وَاشتُھرِ بذٰلک''۔

''البتہ اس نے اتنا احسان ضرور کیا کہ علامہ کے نام اور الزبیدی کی نسبت کے بعد ''البلجرامی'' بھی لکھ دیا ہے جس سے لوگ عموماً یہی تاثر لیتے ہوں گے کہ وہ اصلاً زبیدی تھے بعد میں غالباً بلگرام چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی جبکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ اگر نام کے بعد البلجرامی الزبیدی لکھا جاتا تو اس قسم کی غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان نہ رہتا۔ شیخ محمد اکرم لاہوری نے ''رودِ کوثر'' میں اس غلط فہمی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :

> ''ڈی۔ بی۔ میکڈانلڈ (D.B. Macdonald) جس نے اسلامی دینیات کی تاریخ لکھی ہے (اور اس میں اپنی واقفیت کے مطابق ایک ہندوستانی عالم کا ذکرنہیں کیا) عہد حاضر کے مذہبی اور روحانی رجحانات کا تذکرہ کرتا ہوا لکھتا ہے :
>
> ''دوسری تحریک غزالی کے اثر کا احیاء ہے۔ یہ اثر کسی وقت بھی قطعی طور پر مردہ نہ ہوا تھا اور یمن میں تو شاید خاص طور پر کارفرما رہا۔ اسلامی دنیا کے اس کونے میں صوفیا کی کئی نسلیں بلا مزاحمت

اپنا کام کرتی رہیں اور اس ملک کا ایک باشندہ سید مرتضٰی زبیدی تھا
جس نے احیائے علوم الدین پر ایک معرکتہ الآراء شرح لکھ کر
دورحاضر میں اس کتاب کو نئے سرے سے مطالعہ کرنے کی بناء
ڈالی۔ یہ شرح بڑی تقطیع پر دس جلدوں میں چھپی ہے اور اس کے
دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔''(۹)

محمد اکرام آگے چل کر لکھتے ہیں:

''سید مرتضٰی نے ثابت کر دیا کہ ذہن ہندی تو ایسا ہے کہ جن
ہندوستانیوں کو اہل زبان میں رہ کر عربی زبان حاصل کرنے کا
موقع ملتا ہے تو وہ ان کے درمیان تصنیف و تالیف کرتے ہیں اور
اہل زبان سے بھی بازی لے جاتے ہیں اور عربی زبان میں ایسی
دسترس حاصل کرلیتے ہیں کہ ''بلگرامی'' کو خود اہلِ زبان ''یمنی''
سمجھنے لگتے ہیں۔''(۱۰)

علامہ مرتضٰی بلگرامی عرب جانے کے بعد ہندوستان واپس نہیں ہوئے اور نہ اپنے وطن (بلگرام) سے کسی قسم کا ربط باقی رکھا۔ ان کے اس عمل سے یہ تاثر ملتا ہے کہ علامہ کا اصلی وطن گویا عرب ہی تھا۔ وہ ہندوستان کو بالکل بھول گئے اور بلگرام کو کچھ اس طرح بھولے جیسے کبھی اس کی گلیوں میں بڑھ پل کر جوان ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ ہندوستان کا تذکرہ اپنی کتابوں میں اس انداز سے کرتے ہیں گویا اس سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ وہ پہلے اور غالباً آخری بلگرامی تھے جنھوں نے مادر وطن کو چھوڑنے کے بعد اُس طرح رُخ نہیں کیا۔ وہ بہت بڑے محدث تھے، اتنے بڑے کہ دنیا آج تک اِس پایہ کا محدث پیدا نہ کرسکی لیکن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث کہ ''حب الوطن من الایمان'' شاید انھیں کبھی یاد نہ آئی۔ وہ اپنے ایک خط میں جو انھوں نے مصر سے ایک دوست کو بھیجا تھا، زبید کو یاد کرتے ہیں اور اس مٹی سے انس حاصل کرنے کی آرزو کرتے ہیں لیکن اپنے یمن (بلگرام) کی مٹی سے پیار کرنے اور اس سے انس حاصل کرنے کا جذبہ غالباً کبھی

بیدار نہ ہوا۔ ساتھ ہی انھوں نے اپنے خاندان کے تمام افراد کو بھی یک لخت ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور کبھی ان کی یاد اور ملنے کی تڑپ نے کوئی کروٹ نہیں لی۔ بہرحال انھوں نے کسی قسم کا کوئی تعلق غریب ہندوستان سے باقی نہیں رکھا اور اسی باعث ان کے علمی کارناموں سے پاک و ہند کی دنیا بے خبر ہے اور کسی ادیب یا مورّخ نے وضاحت سے ان کے حیات اور کارناموں کے بارے میں نہیں لکھا۔ ہاں! زبید، مصر اور لبنان (بیروت) میں چھپنے والی کتابوں میں ان کے حالات ملتے ہیں مثلاً تاج العروس کے تکملہ نوا نے آخر میں علامہ کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ مدالقاموس (عربی انگریزی لغت) اور عجائب الآثار فی التراجم و الاخبار میں بھی حالات ملتے ہیں۔ یہ کتابیں عربی میں ہیں اور پاک و ہند میں عام طور پر دستیاب نہیں ہیں۔ پاک و ہند میں لکھے جانے والے بعض تذکروں میں علامہ مرتضٰی بلگرامی کے حالات ملتے ہیں لیکن یہ حالات بھی نہایت مختصر ہیں اور اُن کی حیات اور علمی خدمات کے مختلف گوشوں پر کماحقہ روشنی نہیں ڈالتے، پھر بھی اس ضمن میں جس نے جتنی بھی کاوش کی وہ داد کی مستحق ہے۔ ایسے تذکروں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ ابجد العلوم ص ۴۵۸ تا ۴۶۱ مؤلفہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی

۲۔ اتحاف النُبلا ص ۴۰۷ تا ۴۰۸ ایضاً

۳۔ نزہت الخواطر ص ۴۷۰ تا ۴۷۹ مؤلفہ عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی

۴۔ حدائق الحنفیہ ص ۴۵۸ تا ۴۶۱ مؤلفہ فقیر محمد جہلمی

۵۔ تذکرۂ علمائے ہند ص ۴۹۱ تا ۴۹۴ مؤلفہ مولوی رحمان علی

مندرجہ بالا تراجم کے علاوہ سید مناظر احسن گیلانی مرحوم (ف) نے بھی علامہ بلگرامی کے حالات پر مشتمل ایک مقالہ قلم بند کیا ہے جس کا عنوان ہے ''علامہ سید مرتضٰی زبیدی — بلگرام کا ایک یمنی محدث، مصری صوفی اور اس کی ایک کتاب'' یہ مقالہ علامہ مرتضٰی بلگرامی کی ایک کتاب ''نفحاتِ قدسیہ فی طریقۃ العید روسیہ'' کے اردو ترجمہ کے

ساتھ مقدمہ کے طور پر شامل کیا گیا اور بعد میں رسالہ ''معارف'' اعظم گڑھ کے شمارہ فروری ۱۹۲۷ء میں بھی طبع ہوا تھا۔ یہ مقالہ میری نظر سے گزرا ہے۔ مقالہ نویس نے یہ صراحت ابتدا ہی میں کر دی ہے کہ:

''اس مقدمہ کے درج کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانان ہند کے سامنے اُن کے ایک ہم وطن فاضل جلیل کا تذکرہ پیش کرنا ہے جسے سب جانتے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جس حیثیت سے جاننا چاہیے ہندوستان کے مسلمان اس نقطۂ نظر سے بہت کم جانتے ہیں۔''(۱۱)

نواب صدیق حسن خان نے بھی ''ابجد العلوم'' میں لکھا ہے کہ:

''میں نے اس بزرگ کے حالات میں ذرا بسط سے اس لیے کام لیا ہے کہ نہ صرف عوام الناس بلکہ اہلِ علم بھی اس شخص کے حالات سے بالکل ناواقف ہیں۔''(۱۲)

ابتدائی تعلیم:

علامہ سید مرتضٰی کا ابتدائی زمانہ بلگرام میں بسر ہوا۔ وہ تاریخ پیدائش سے انیس سال کی عمر تک بلگرام میں رہے اور اپنے وطن ہی میں علماء سے فارسی و عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس دوران میں وہ بغرض حصول علم الہ آباد اور دہلی گئے اور کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد بلگرام آگئے۔ بلگرام اُس زمانے میں علوم و فنون کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ ہر طرف درس و تدریس کی مسندیں بچھی ہوئی تھیں۔ حصول علم کی چٹک ہر طالب علم کے دل میں تھی اور علماء علم کی آبیاری میں شب و روز مشغول تھے۔ علامہ مرتضٰی کا خاندان بھی علم و فضل کی روشنی سے معمور اور سلوک و معارف میں ممتاز تھا۔ آپ کے فرِجد (پڑدادا) سید ضیاء اللہ اور جدامجد سید قادری بلگرامی علم و فضل میں بلند مرتبہ اور تصوف و حقائق میں شیخ کامل تھے۔ علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا(۱۳) ہے:

''سید ضیاء اللہ نے آغازِ سن آگہی میں کلام مجید تجوید کے ساتھ حفظ کیا اور فضائل علمی کے حصول کی خاطر یورپ کے قصبات کا بحثیت طالب علم سفر کیا اور اُس زمانے کے علماء سے درسی فنون حاصل کیے۔ آپ کو سید احمد بن سید محمد کالپوی قدس سرّہ سے غائبانہ اعتقاد تھا اور یہ شعر نظم کیا:

کالپی مکہ بلگرام یمن

اے تو احمدؐ منم اویسِ قرن

وہ بلگرام میں سجادۂ خدا پرستی و تدریس علوم کی مسند پر متمکن تھے۔ انھوں نے طلباء کی کثیر تعداد کو علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ آپ کا شمار بہت بڑے متقی و پرہیز گاروں میں تھا۔ ۵ شعبان ۱۱۰۴ھ (یکم اپریل ۱۶۹۳ء) شنبہ کے دن انتقال فرمایا۔''

علامہ میر عبدالجلیل واسطی بلگرامی نے قطعہ تاریخ ارتحال نظم کی:

خورشید سپہر علم و فضل و تقویٰ

آن میر ضیاء اللہ روشن سیما

دامن افشاند برشبستانِ جہاں

تاریخ شنو ''بمزل قدس ضیاء''

۱۱۰۴ھ

علامہ آزاد بلگرامی نے علامہ مرتضی بلگرامی کے دادا سید قادری بلگرامی کو دیکھا تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''سید قادری نے اپنے والد محترم سے کلام اللہ حفظ کیا، تجوید سیکھی اور ابتدائی کتب پڑھیں، پھر انھوں نے ملا احمد جیون (۱۴) امیٹھوی سے مختلف علوم حاصل کیے۔ اس کے بعد وہ شیخ نقشبند لکھنوی (۱۵) کی خدمت میں پہنچے اور بقیہ درسی کتابیں ان سے پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق عطا فرمائی اور تین مرتبہ مناسک حج ادا

فرمائے۔ ایک مرتبہ سفرِ حج کے موقع پر ڈاکوؤں نے اُن پر حملہ کر کے زخمی کر دیا اور سازو سامان لوٹ کر لے گئے۔ اس علاقہ کا ایک بدو ازراہ ترحم اپنے گاؤں لے گیا اور تیمارداری کی۔ زخموں کے مندمل ہونے کے بعد آپ کربلائے معلیٰ تشریف لے گئے اور زیارت روضۂ امام حسین علیہ السلام سے مشرف ہوئے۔ سید قادری نہ صرف سیر و سلوک، تصوف و حقائق میں شیخِ کامل تھے بلکہ فقہ و حدیث اور تفسیر میں بھی اُن کا پایہ بہت بلند تھا۔ سید قادری نے بغرض طلبِ علم حُما (شام) کی خانقاہ قادریہ میں قیام کیا اور سید یٰسین حموی جو اس وقت سجادہ نشین تھے، کے مرید ہوئے اور سلسلۂ قادریہ کی تعلیم حاصل کی۔ وہ مصر و بغداد میں رہے اور علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی۔ انھوں نے مولانا سلطان[١٦] بن ناصر بن احمد خابوری سے بھی تجوید کی تعلیم حاصل کی اور صحاحِ ستہ و تجوید کی سند بھی حاصل کی۔ حما سے آپ ہندوستان واپس ہوئے اور دہلی پہنچ کر وہاں کچھ عرصہ قیام کیا اور بہت سے طالب علموں کو سلسلۂ قادریہ کی تعلیم دی اور داخل سلوک کیا۔ پھر وہ بلگرام آگئے اور بقیہ عمر خلوت گزینی مین بسر کی۔ صرف پانچ وقت نماز کے لیے گھر سے باہر آتے تھے اور محلّہ کی جامع مسجد میں امامت کے فرائض ادا کرتے تھے۔ قرآن مجید بڑے الحان کے ساتھ دل پذیر انداز میں پڑھتے تھے۔''[١٧]

بلگرام میں آپ کی جلالت اور عز و مرتبت کا بہت اثر تھا۔ آپ نے ۱۷ ربیع الاول ۱۱۴۵ھ (۲۸ اگست ۱۷۳۲ء) پنجشنبہ کے دن رحلت فرمائی۔ علامہ آزاد بلگرامی نے تاریخ رحلت عربی میں کہی :

رحل القادری سیّدنا صاحب الکشف و الکرامات
الہم الحق عام رحلتہ "اِنَّ لِلمتقِیْ لِجَنَّاتٍ" ۱۱۴۵ھ

علامہ آزاد بلگرامی نے ایک دوسرا تاریخی قطعہ فارسی میں بھی نظم کیا تھا، ملاحظہ فرمایئے ۔

میر سید قادری آن معدنِ فضل و کمال
در صلاح و زہد و تقویٰ رکن ایمانی بود
از پے سیرِ عرب آمد بروں از بلگرام
حج او مقبول در در گاہ سبحانی بود
کرد طوف بارگاہ رحمت للعالمین
آنکہ درخاک مزارش بوئے ریحانی بود
باز آمد بلگرام و گوشۂ طاعت گزید
عاقبت ماوائے او در باغِ رضوانی بود
گفتہ ام مصراع تاریخی بہ امداد احد
"حشر سید قادری با قطب گیلانی بود" (۱۸)

۱۱۴۴ + ۱ = ۱۱۴۵ھ

یہ تاریخ صنعت تعمیہ میں ہے۔ آخری مصرع کے اعداد میں پہلے مصرع کا لفظ احد کا ملفوظی عدد (۱) شامل کرنے سے سنہ مطلوبہ برآمد ہوتا ہے۔ نیز "بہ اعداد احد" میں صنعت توریہ بھی ہے۔

علم و عمل کی اِنھیں تابانیوں میں علامہ مرتضٰی نے آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالتے ہی پڑدادا اور دادا کی علمی اولوالعزمیوں کی داستانیں سنیں۔ ان واقعات نے یقیناً انھیں متاثر کیا ہو گا اور ان کے دل میں اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میدان علم و عمل میں آگے نکل جانے کی خواہش نے پوری شدت کے ساتھ انگڑائی لی ہو گی اور صمیم قلب سے بارگاہ احدیت میں اَللّٰھُمَّ زِدْنِی عِلْمًا کی دعا مانگی ہو گی، مجیب الدعوات نے ان کی یہ دعا

دعا قبول فرمائی اور وَمَنْ يُؤتَ الحِكْمَةَ فَقَدْ اُوتِیَ خیراً کثیراً کی نعمت سے مالا مال کر دیا۔ بس پھر کیا تھا انھوں نے علم کی دولت کو سمیٹنا شروع کیا اور بقول احسن گیلانی ''سب کچھ مل رہا تھا لیکن علم کی پیاس کسی طرح نہیں بجھتی تھی'' اس علم کی حرص میں دور دراز کے سفر بھی کیے اور جہاں کچھ بھی ملنے کی توقع ہوئی، وہاں پہنچ گئے۔ انھیں بے پناہ کاوشوں اور جان کاہیوں کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے علم کی ان بلندیوں کو حاصل کیا جن کو دیکھ کر دنیا حیرت زدہ اور انگشت بدنداں ہے اور اس فرد فرید کا مثیل ونظیر آج تک پیدا نہ ہوا۔

علامہ مرتضیٰ بلگرامی کا قد متوسط، جسم چھریرا، اعضاء متناسب، رنگ گلابی اور بات چیت کا انداز دلکش، ذہن رسا اور حافظہ طاقتور تھا۔ ان کی صورت شکل اچھی تھی۔ لباس اعلیٰ قسم کا پہنتے تھے۔

علامہ سید مرتضیٰ کی وسعت نظر کے سامنے بلگرام کا وسیع وعریض علمی میدان بھی تنگ ہو گیا۔ دادا کا نقش قدم سامنے تھا جس نے نوجوان بلگرامی کے سمند بلند حوصلہ کو مہمیز کیا اور وہ ایک ہی جست میں بلگرام کے حدود سے پرے الہ آباد پہنچ گئے جہاں اس وقت ملا فاخر[۱۹] المتخلص بہ زائر الہ آبادی کی درس و تدریس کا طوطی بول رہا تھا ان سے استفادہ کرنے کے بعد دہلی پہنچے جہاں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا غلغلہ بلند تھا اور حکیم الہند کے درس میں تحقیق و تدقیق کا دریا موجیں مار رہا تھا۔ بلگرام کا یہ نوجوان طالب علم زانوئے تلمذتہ کر کے بیٹھ گیا اور علمی جواہرات سمیٹتے رہے لیکن کب تک؟ تاریخ کے صفحات خاموش ہیں۔ سید مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ:

> ''علامہ نے اپنی ایک یادداشت میں نہایت جوش و مسرت کے ساتھ شاہ ولی اللہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر کیا ہے۔ صحیح طور پر اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ دہلی کے علمی حلقے میں علامہ کب تک رہے، تاہم اُن کی تالیفات میں جو تحقیق و جامعیت کا رنگ پایا جاتا ہے اس میں ولی اللّٰہی مذاق کو بہت کچھ دخل ہے۔''[۲۰]

سفرِ حج:

علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی کا ابھی عنفوانِ شباب ہی تھا یعنی ان کی عمر کا انیسواں سال اور ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۱ء) کا زمانہ کہ ان کے دل میں ادائے فریضہء حج کا شوق پیدا ہوا اور وہ سفر حجاز میمنت طراز پر روانہ ہو گئے۔ مناسک حج ادا کرنے کے بعد وہ ایسے چشموں کی تلاش میں مشغول ہو گئے جہاں وہ اپنی علمی پیاس بجھا سکیں۔ اسلامی علوم میں علامہ مرتضیٰ کا فطری میلان زیادہ تر حدیث اور ادب کی طرف تھا۔ دہلی کا ولی اللٰہی خاندان اگرچہ حدیث و قرآن کا عَلَم بردار تھا۔ تاہم ملک کا تمام علمی ماحول معقولی تھا جس سے علامہ بلگرامی غالباً کچھ خوش نہ تھے۔ وہ منقولی زیادہ تھے۔ اس ضمن میں سید مناظر احسن گیلانی نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''علامہ مرتضیٰ بلگرامی جب عرب پہنچے تو ان کو معقولات سے زیادہ اپنے مذاق کی چیزیں نظر آئیں۔ حدیث، ادب اور تفسیر کے بڑے بڑے ماہرین، عرب کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں درس دے رہے تھے۔ پھر کیا تھا علم کا متلاشی دھونی رما کر جم گیا۔ اگرچہ مکہٴ معظمہ اور مدینہٴ منورہ میں متعدد دارالعلوم تھے لیکن سارے عرب میں یمن کو علمی حیثیت سے امتیاز کامل تھا۔ یمن کا مشہور تعلیمی شہر زبید تھا۔ سید مرتضیٰ بلگرامی زبید کی شہرت سن کر اس طرف روانہ ہوئے۔ یہ حسنِ اتفاق تھا کہ زبید کے مشاہیر اربابِ درس میں اس وقت علامہ عبدالخالق بن زین فرحاجی بھی تھے، جنھوں نے ہندوستان کے مختلف علماء و مشائخ سے پڑھا اور فائدہ اٹھایا تھا جن میں علامہ محمد حیات سندھی، شیخ عبدالکریم ہندی اور شیخ امراللہ ہندی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس لحاظ سے شیخ عبدالخالق پر ہندوستان کا خاص حق تھا۔ بلگرام کا نوجوان طالب علم جب زبید پہنچا تو سب سے پہلے شیخ عبدالخالق ہی کے سایہ عاطفت میں اس

کو جگہ ملی، جس کی خبر ہندوستان بھی پہنچی تھی اور میر غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔''(۲۱)

آخر میں زبید کا مشہور اور قدیم علمی خاندان اَہدلیہ ان پر مہربان ہو گیا۔ اس زمانے میں اس خاندان کا درسی و افادی ریاست شیخ احمد بن محمد شریف مقبول ابدلی پر ختم ہوتی تھی جو نہ صرف علوم نقلیہ کے ماہر بصیر تھے بلکہ علوم عقلیہ مثلاً منطق، حساب، ہئیت میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ پیچیدہ مسائل کے حل میں اُن کو خاص کمال حاصل تھا۔ تقریباً یہ کمال ان کو تمام علوم متداولہ میں حاصل تھا۔ علامہ مرتضیٰ بلگرامی شیخ عبدالحق کے بعد انھیں کے فیض سے مستفیض ہوتے رہے اور زبید کی علمی دلچسپیوں میں کچھ ایسے منہمک ہوئے کہ گویا یہی ان کا وطن ہو گیا۔ تاج العروس کے تکملہ نویس کا قول لکھا جاچکا ہے یہاں پھر نقل کیا جاتا ہے:

''وَ اقام بـذَبِید مُدة طَویله حتّی قیل لُه الزَبیدی وَاشْتهر بذٰلک۔''

اور خود ان پر بھی زبید کا بہت گہرا اثر تھا۔ مصر سے ایک دوست کے نام ایک خط لکھتے ہیں، اس میں جب زبید کا ذکر آیا تو قلم سے بے ساختہ یہ جملے نکل پڑے۔

''خدائے واحد منّان سے یہ دعا ہے کہ کاش مجھے پھر اس خطۂ زبید میں پہنچاتا تاکہ اپنے پرانے گزرے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرتا اور اس سرزمین سے اُنس حاصل کرتا۔''(۲۲)

طریقۂ قدسیہ کا حصول:

علامہ مرتضیٰ بلگرامی کی زندگی میں ایک محیّر العقول انقلاب بھی آیا۔ ''سید مرتضیٰ بلگرامی نے متعدد حج کیے تھے۔ چنانچہ کسی ایک حج کے ارادے سے وہ زبید سے مکہ

مکرمہ آئے ہوئے تھے کہ خدا کے گھر میں نبوت کے گھرانے کا ان کو ایک آفتاب مل گیا۔ یہی وہ روشنی تھی جس نے سید کی حقیقت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ان کے علم کو عرفان سے، دانش کو شناختن سے بدل دیا یعنی عید روسی طریقہ کے ایک حبیب سید عبدالرحمٰن بن مصطفیٰ العید روس کی زیارت نصیب ہوئی۔ خدا جانے سید علامہ بلگرامی نے ان میں کیا دیکھا یا دکھایا گیا کہ بلگرام، الہ آباد، دہلی اور زبید (یمن) کی گلیوں میں گھوم گھوم کر جو سرمایہء علم اتنی طویل مدت میں جمع کیا تھا اس کو عید روسی درویش کے قدموں پر نثار کر دیا۔ تاج العروس کے خاتمہ نے لکھا ہے کہ:

"وَ اجتمع بالسید عبدالرحمٰن العید روس بمکّة المشّرفة ولا زمه ملازمه کلیة۔"(۲۳)

مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی اور مستقل طور پر ان کی صحبت میں رہنے لگے۔

علامہ بلگرامی خود لکھتے ہیں:

"فاِنّه مِھّن ربّانی وبلبان تادیبه غذانی۔"

سید عبدالرحمٰن بن مصطفیٰ عید روس نے اگرچہ باطنی و ظاہری کمالات کا اکتساب زیادہ تر اپنے والد مرحوم بافقیہہ سے کیا تھا تاہم ان کے زمرہ اساتذہ میں چند ہندوستانی علماء بھی تھے۔ ابجد العلوم میں لکھا ہے کہ انھوں نے شیخ محمد حیات سندھی، مولوی غلام حیدر ہندی اور سید فضل اللہ بن احمد ہندی سے بھی پڑھا تھا ممکن ہے کہ اس ہندوستانی رابطہ نے سید عید روس کی خاص توجہ علامہ مرتضیٰ پر مبذول کرا دی ہو۔ بہرحال عید روسیہ سلسلہ میں داخل ہو جانے کے بعد سید علامہ بلگرامی کا علمی ساز روحانی سوز سے بدل گیا۔ حیرت تو اسی امر پر ہے کہ سید مرتضیٰ نے مابین ہمہ تبحر و وسعت نظر سید عبدالرحمٰن عید روس سے "مختصر المعانی" سبقاً سبقاً پڑھی اور "احیاء العلوم" غزالی کا بھی ایک حصہ اپنے پیر ہی سے پڑھا۔ اس درس سے احیاء العلوم کی اُس عظیم الشان ضخیم شرح کی بنا پڑی جو 'اتحاف السادۃ المتقین"(۲۴) کے نام سے مشہور ہے۔

سفرِ مصر:

عید روسی سلسلہ میں دخل ہونے اور عبدالرحمٰن بن مصطفٰی العید روسی سے بیعت کرنے کے بعد سیّد علامہ پر دوسرا رنگ چڑھ گیا تھا، وہ اپنی مرضی اور ارادے سے دست بردار ہو چکے تھے۔ اب ان کی ہر جنبش، ان کا ہر سکون پیر کے اشارۂ چشم کے ساتھ وابستہ تھا۔ تاج العروس کے خاتمہ کا بیان ہے:

> ''سید مرتضٰی اپنے پیر کے حکم و ترغیب سے مصر کی طرف روانہ ہوئے اور ۱۹ صفر ۱۱۹۴ھ (۲۵ فروری ۱۷۸۰ء) کو قاہرہ پہنچے اور ایک زمانہ تک ''خان الصاغہ'' کی سرائے ان کی قیام گاہ تھی۔''(۲۵)

درویش پیر نے اپنے محدث و لغوی مرید کو مصر کس لیے بھیجا تھا اس کو کون جان سکتا ہے لیکن علامہ مرتضٰی بلگرامی نے اپنے قیام مصر کو غنیمت جان کر حصول علم کی مزید راہیں تلاش کیں۔ وہ ایک خط میں اپنے دوست کو لکھتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ کے مجھ پر جو احسانات ہیں اُن میں ایک بڑا احسان یہ ہے کہ میں جب مصر پہنچا تو بیکار پڑا نہ رہا بلکہ فرصت نکال کر یہاں بھی طلبِ علم میں منہمک اور اس کے رموز و اسرار کے حل میں مصروف ہو گیا۔''

علامہ سید مرتضٰی کو علم حدیث کی متعدد شاخوں میں سے مختلف النوعیت کے سند کے حصول کا بہت شوق تھا۔ وہ مصر سے زبید کے ایک عالم کے نام ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں:

> ''وہ دن گزر گئے جب اس بات کا خاص شوق تھا اور لوگ عالی سند کی تلاش میں دور دراز ممالک کا سفر اختیار کرتے تھے لیکن اب یہ شوق معدوم ہو رہا ہے۔ وہ بساط ہی اُلٹ گئی۔ ہمتیں پست ہیں۔ بگڑی کو بنانے والے، کوتاہیوں کو دُور کرنے والے وہ

بزرگانِ دین کہاں ہیں جن پر ملّت کو فخر تھا۔''(۲۶)

پھر اپنے متعلق ایک خاص مسرت و نشاط کے ساتھ لکھتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حدیث کی اس صنف کا ذوق ان پر کس قدر غالب تھا۔ ان کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

''لیکن ان گزشتہ بزرگوں کے آثار کا کچھ حصہ اب بھی باقی ہے۔ دنیا کے گوشوں میں وہ چیزیں اب بھی کہیں نہ کہیں مل جاتی ہیں اور یہ بندہ الحمد للہ ان لوگوں میں سے ہے جس نے علم حدیث اور علم اسناد کے اساتذہ کی خدمت میں بہت کچھ تگ و دو کی ہے اور ان سے حاصل کر کے اب اس نے اپنے علمی صحن میں اپنا دستر خوان بچھایا ہے۔''(۲۷)

علم حدیث کی سندعالی کی بڑی اہمیت ہے اس کی وجہ وہ اپنی تصنیف ''نفحات قدسیہ فی الطریقتہ العید روسیہ'' میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ترجمہ: ''حدیث کی سندوں میں ''سند عالی'' معتبر ہوتی ہے یعنی جس میں وسائط کم ہوں اور یہ قاعدہ ہے کہ جہاں تک واسطے کم ہوں گے جھوٹ کا احتمال کم ہوتا جاتا ہے اور جہاں تک واسطے زیادہ ہوں گے کذب کا احتمال قوی ہوتا جاتا ہے۔''

مصر جانے کے بعد شروع شروع میں ان کا مشغلہ یہی تھا کہ مشائخِ حدیث کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے پاس جو سند ہوتی اس کو حاصل کرتے۔ علمائے مصر میں ان کو ایک ایسا مورث ملا جس کی سند دیگر معاصرین کے لحاظ سے بہت عالی تھی۔ ایک خط میں خصوصیت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا ہے۔ علامہ مرتضیٰ کا شوق حصول سند قاہرہ کی حد تک محدود نہیں رہا بلکہ انھوں نے قاہرہ سے باہر کا بھی سفر کیا اور مختلف اضلاع و بلاد میں گھومتے رہے۔ انھوں نے اپنی ایک یادداشت میں ان مقامات کی تفصیل لکھی ہے جہاں وہ سند کی تلاش میں گئے۔ ایسے مقامات میں سے اسیوط، جرجان،

فرشوط، دمیاط، محلہ، سہندو، بوصیر اور مہتور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سید مناظر احسن گیلانی رقم طراز ہیں:

سب کچھ مل رہا تھا لیکن علم کی پیاس کسی طرح نہیں بجھتی تھی۔ آخر اسی سلسلہ میں (نیز بہ نیت زیارت) بیت المقدس کا بھی سفر کیا۔ ایک خط میں علامہ خود لکھتے ہیں: ''میں نے بیت المقدس کا بھی سفر کیا اور وہاں کے ارباب اسناد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بیت المقدس سے رملہ بھی اسی دھن میں پہونچا اور ہر جگہ میں نے حدیث کی سماعت کر کے سند حاصل کی۔''(۲۸)

محدثین کا دستور تھا کہ اگر کسی صاحب اسناد کے پاس خود نہیں جاسکتے تھے تو خط و کتابت کے ذریعہ سے اجازت نامے منگوایا کرتے تھے۔ سید علامہ مرتضٰی بلگرامی نے یہ طریقہ بھی اختیار کیا۔ حضرت علامہ لکھتے ہیں:

''مجھے حلب، فارس، تونس، سولا اور تلمان کے محدثین نے بھی اجازت نامے لکھ کر بھیجے ہیں۔ ماسوا اس کے مصر میں بھی مغرب اقصٰی کے چند صاحبِ اسناد محدثین کی ملاقات سے شرف اندوز ہوا اور اجازت حاصل کی۔''(۲۹)

مصر کا مستقبل قیام اور نکاح:

مناظر احسن گیلانی اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

''جس شخص نے کسب کمال میں اتنی جاں فرسا محنت کی ہو، اس کی علمی وسعت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ سیّد علامہ میں اس کے بعد جس قسم کی جامعیت پیدا ہوگئی تھی وہ اپنے زمانے میں اپنی آپ نظیر تھی۔ وہ ادیب تھے، مفسر تھے، محدث تھے، لغوی تھے، منطقی تھے، فلسفی تھے۔ آپ کو فقہ اربعہ کی اجازت حاصل تھی اور ان کی

سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ اسی عرصہ میں ایک شیخ کامل کی نظر توجہ ان کو نصیب ہوئی جس نے ان کے سارے علمی کمالات کو مرکز انابت پر گردش دے دیا تھا۔'' نہ صرف علوم بلکہ اس سیر و سیاحت میں ان کو مختلف اسلامی زبانوں پر بھی عبور حاصل ہو گیا تھا خصوصاً فارسی، ترکی نہایت آسانی کے ساتھ بولتے اور لکھتے تھے اور عربی تو گویا ان کی مادری زبان ہو گئی تھی۔ اگرچہ تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ہے لیکن بارہویں صدی ہجری کے ہندوستانی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ اُردو نہ جانتا تھا بالکل بعید از عقل ہے۔ اس لیے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ چینی اور پشتو کے سوا دنیائے اسلام کی ہر ایک زبان سے وہ واقف ہے اور اس مختلف زبان دانی نے آئندہ زندگی میں ان کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا۔ بہرحال اب سید علامہ نے کسی خاص مقام پر جم کر کام کرنے کا ارادہ کیا۔ پیر کا حکم مصر میں رہنے کا تھا، پھر مصر کے سوا کہاں جاتے۔ محلّہ عطفتہ الغال میں آپ نے ایک مکان خرید لیا اور دمیاط کے ایک بزرگ ذوالفقار دمیاطی (جو غالباً ان کے عقیدت مند تھے) کی دُختر نیک اختر سے جن کا نام 'زبیدہ' تھا، نکاح کر لیا اور تالیف و تصنیف کو اپنا خاص موزوں مشغلہ قرار دیا۔''

تاج العروس کی تالیف :

یہی وہ ''کوہِ نور'' ہے جو علامہ سیّد مرتضٰی بلگرامی کے دستارِ فضیلت پر جگمگا رہا ہے اور اس کی چھوٹ سارے جہان علم کو منور کیے ہوئے ہے۔ علامہ کا یہ ایسا عظیم کارنامہ ہے کہ وہ اگر کچھ اور نہ کرتے تو بھی وہ زندہ جاوید رہتے۔ ''تاج العروس'' عربی زبان کی مشہور لغت ''القاموس المحیط'' کی شرح ہے۔ انھوں نے شرح کا آغاز زبید کے قیام کے

زمانے میں کر دیا تھا اور بہت کچھ حصہ معرضِ تحریر میں آ چکا تھا۔(۳۰)

مناظر احسن گیلانی اس شرح سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''القاموس'' فن لغت میں گویا ایک متن متین ہے کیونکہ فیروز آبادی نے نہایت مختصر لفظوں میں زیادہ مطالب کے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ سید علامہ کی غالباً سب سے پہلی نگاہ انتخاب اس پر پڑی اور کامل چودہ سال گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر آپ نے اس ٹھوس اور جامع کتاب کی ایک ضخیم شرح نو جلدوں میں لکھی اور تقریباً ہر جلد کے صفحات پانچ سو سے کم نہیں ہیں، حالانکہ اس کتاب کا طول و عرض بہت غیر معمولی ہے۔ اگر اوسط تقطیع پر شائع کی جائے تو میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اس کی ضخامت بجائے نو جلدوں کے اٹھارہ جلدوں تک پہنچ جائے گی۔ ،

تاج العروس کے ختم کی تقریب:

اس ضمن میں مناظر احسن گیلانی کا بیان ہے:

''سید علامہ چودہ سال تک نہایت خاموشی کے ساتھ اس مہم کو سر کرنے میں مصروف رہے۔ جب کام ختم ہو گیا تو آپ نے قدیم دستور کے مطابق مصر کے تمام اعیان و اشراف کی دھوم دھام سے ایک دعوت کی، جس میں علماء، صلحاء، مشائخ، الغرض ہر طبقہ کے لوگ شریک تھے۔ دعوت کے بعد آپ نے سب کو ایک مجلس میں جمع کیا اور اپنی محنت ان کے سامنے پیش کی۔ لوگ انگشت بدنداں تھے۔ حیرت تھی کہ ہندوستان کے غریب الوطن مسافر نے یہ کیا کیا اور بالاتفاق سبھوں نے ان کی جلادت قدر کا اعتراف کیا۔ مصر کے مسلم الثبوت اساتذہ و سربرآوردہ علماء نے نہایت فراخ دلی کے

ساتھ اس پر تقریظیں ثبت کیں، اُن میں اپنے زمانے کے شیخ الکل
شیخ علی صعیدی، شیخ احمد دردیر اور شیخ ابوالانوار خاص طور پر قابل
ذکر ہیں۔''(۳۱)

مندرجہ بالا عبارت سے یہ امر بخوبی واضح ہے کہ علامہ بلگرامی نے ''تاج العروس'' کی تخلیق کی ابتداء اپنی جوانی کے زمانے میں کی۔ اس وقت ان کی عمر اندازاً ۲۸ یا ۳۰ سال سے زیادہ نہ تھی، مصر کے جید علماء اس عظیم کارنامے پر دو وجہوں سے متحیر اور ششدر تھے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ وہ غریب الوطن یعنی غیرعرب (بلگرامی) سے عربی زبان پر بے پناہ عبور حاصل کرنے اور اس زبان کے نکات و رموز پر دسترس اور عمیق نظر رکھنے کی اور وہ بھی اس حد تک کہ ایک مشکل ترین لغت کی شرح اس قدر وضاحت اور جامعیت سے قلم بند کر سکے، ہرگز توقع نہیں رکھتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ مہتم بالشان اور عظیم تخلیق اس شخص کے رشحاتِ قلم سے عالم وجود میں آئی جو اس وقت معمر نہیں تھا اور اس سے عربی ادب کا گہرا مطالعہ کرنے اور عربی زبان کا وسیع تجربہ رکھنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بہرحال مصر میں جب اس کتاب کی شہرت ہوئی تو اس کی صدائے بازگشت مصر کے باہر بھی سنی گئی، پھر کیا ہوا وہ مناظر احسن گیلانی کی زبانی سنیے:

''جس وقت اس کتاب کا غلغلہ بلند ہوا تو اطراف وجوانب سے جوق در جوق لوگ اس ندرت انگیز، حیرت خیز چیز کے دیکھنے کے لیے اُمنڈ پڑے۔ رفتہ رفتہ اس کی جلادت شان وعلو مرتبت کا شہرہ دوسرے اسلامی ممالک تک پہنچا۔ قسطنطنیہ (ترکی) سے خلیفۃ المسلمین کا فرمان آیا کہ اس کا ایک نسخہ سلطانی کتب خانے کے لیے فوراً بھیجا جائے۔ مراکش کے سلطان نے بھی اس کا ایک نسخہ طلب کیا۔ دارفور کے امیر نے بھی ایک نسخہ اپنے لیے لکھوایا حالانکہ اگر بکفایت بھی لکھوایا جاتا تھا تو ہر نسخہ کی کتابت پر کم از کم ایک ہزار ریال خرچ ہوتا تھا۔ اس سے مسلمانوں کے علمی ذوق اور

اسلامی امراء کی علم دوستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''تاج العروس'' نے مصریوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اب انھوں نے پہچانا کہ ان میں کس گھرانے کا، کس ملک کا، کون آدمی ہے۔ نہ صرف عوام الناس بلکہ ممتاز فاضلِ مصر بھی سید علامہ کی خدمت میں عقیدت کے ساتھ آنے لگے۔''(۳۲)

سید علامہ مرتضیٰ بلگرامی کی خدمت میں جو لوگ عقیدت کی بنا پر آتے تھے، ان پر ''اجازت'' کا بھی ذوق غالب تھا اور انھوں نے علامہ سے سند کا مطالبہ شروع کیا۔ حتیٰ کہ دنیائے اسلام کا سب سے بڑے علمی مرکز جامعہ ازہر بھی علامہ کے علمی مرتبہ سے متاثر ہوا اور وہاں کے شیوخ و اساتذہ بھی حصول سند کی غرض سے آپ کی خدمت میں آنے لگے، اس وقت آپ نے فرمایا کہ ''جب تک میرے سامنے حدیث سنی یا سنائی نہ جائے گی، سند نہیں دے سکتا۔'' آخر یہ طے ہوا کہ شیخون کی جامع مسجد میں جو صلیبیہ میں ہے، ہر پیر اور جمعرات کو سید علامہ حدیث کا درس دیں گے اور حلقہ درس میں جو لوگ شریک ہوں گے، اُن کو سند دی جائے گی۔ سید علامہ بلگرامی اس زمانے میں محلّہ عطفتہ الغال سے محلّہ سولقیتہ میں منتقل ہو گئے تھے، یہیں سے آپ شیخون کی مسجد میں جاتے اور درس دیتے تھے۔

آغاز درس :

درس کے لیے سب سے پہلے جس کتاب کا علامہ نے انتخاب کیا وہ صحیح بخاری تھی۔ سید حسن شیخونی قاری تھے اور دوسرے حضرات سنتے تھے۔ دنیا یہ سن کر تعجب کرے گی کہ اس درس میں جامعۂ ازہر کے مشہور اساتذہ اور معلمین بھی شریک ہوتے تھے جن میں شیخ احمد سجائی اور شیخ مصطفیٰ اطائی بہت زیادہ ممتاز تھے۔

طریق درس :

پاک و ہند میں درس حدیث کا یہ طریقہ رائج ہے کہ شاگرد کتاب پڑھتا جاتا ہے

اور استاد سنتا رہتا ہے۔ جہاں پر کوئی بات قابل ذکر ہوتی ہے اسے بتا دیتا ہے۔ درس کا یہی انداز اس زمانے میں مصر میں بھی مروج تھا لیکن سلف کا طریقۂ درس یہ نہ تھا۔ وہ املا کراتے تھے یعنی استاد متن و سند کے ساتھ حدیث کو زبانی بیان کرتا تھا اور پھر مختلف اعتبارات سے اس پر بحث کرتا تھا۔ سید مرتضٰی بلگرامی نے عام مروج طریقۂ درس کے ساتھ املا کی رسم کہن کو پھر زندہ کیا۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :

> ''میں معمولی درس کے بعد قدیم حفاظ کی طرح املا بھی کراتا ہوں جس میں متن کے ساتھ سند بھی بیان کرتا ہوں اور مطالب و معانی سے بیچ بیچ میں بحث کرتا جاتا ہوں۔ طلباء میری ان تقریروں کو قلم بند کرتے ہیں جو اس وقت متعدد جلدوں کی شکل میں مرتب ہو چکی ہیں۔''(۴۳)

اسی محولہ بالا خط میں اپنے درس میں املا کرانے کی تفصیل و توضیح کے ضمن میں ''اُمِ زرع'' کی مشہور حدیث (جو صرف بیس یا بائیس سطروں پر محیط ہے) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''اُمِ زرع پر میں نے سات جزوں میں املا کرایا ہے۔ اس حدیث کی شرح چودہ مجلسوں میں ختم ہوئی۔ طلباء اس کی نقلیں لے رہے ہیں اور مختلف ممالک میں پھیلا رہے ہیں۔''(۴۴)

سید علامہ مرتضٰی بلگرامی کی فضیلت علمی اور جلادت کا شہرہ بلاد اسلامیہ اور ہندوستان میں

یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ''تاج العروس'' کے منصۂ شہود پر آتے ہی لوگ اس عجیب وغریب چیز پر ٹوٹ پڑے اور بیرون مصر بھی اس کی شہرت ہوئی تو ''ھات الصبوح حیّوا یاایھا السُّکارا'' کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہوئیں۔ گو صاحب تاج کی عظمت و

جلادت کا پرچم ہر طرف لہرا رہا تھا لیکن حدیث شریف کے انوکھے طریقۂ درس نے آپ کی شان اور مرتبہ کو دوبالا کر دیا۔ عوام اور خواص ہر ایک آپ کا ثنا خوان اور عقیدت مند تھا۔ امراء اور اعیان دولت جوش عقیدت کے ساتھ آپ کو اپنی محل سراؤں میں بلاتے اور اس تقریب سے عظیم الشان دعوتیں کرتے۔ میں اس اجمال کی تفصیل مناظر احسن گیلانی کی زبانی سناتا ہوں۔

> ''سید علامہ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی امیر کے یہاں سے دعوت آتی تو آپ اپنے طلباء، کاتب نیز دیگر متوسلین کو لے کر اس کے مکان پر پہنچتے۔ داعی اپنے مکان کو ہر قسم کی آرائشوں سے سجاتا۔ گھر کے لوگ نئے کپڑے پہنتے۔ مردوں کا مجمع سامنے ہوتا۔ عورتیں اور بچیاں پردے کے پیچھے ہوتیں۔ عود، بخور اور ہر قسم کی خوشبودار چیزیں جلائی جاتیں، اس کے بعد سید علامہ صحیح بخاری یا کسی دوسری کتاب کی چند حدیثیں سند کے ساتھ سناتے۔ پھر سب مل کر درود شریف پڑھتے۔ اس کے بعد کاتب اٹھتا اور تمام حاضرین خواہ مرد ہوں یا عورت بلکہ بچوں کے نام بھی لکھتا، پھر اس پر تاریخ و وقت درج کرتا اور سید علامہ کی خدمت میں لاتا۔ سید ان پر ''صح ذالک'' لکھ دیتے جو محدثین کا قدیم دستور تھا۔''(۳۵)

حضرت گیلانی مرحوم آگے چل کر لکھتے ہیں:

> میں کہہ چکا ہوں کہ ''تاج العروس'' کی شہرت اسلامی دنیا کے سلاطین تک پہنچ چکی تھی۔ اب اس کے ساتھ علامہ کے درس حدیث کی خوشبو مصر کی دیواروں کو پھاند کر غیر ممالک میں پہنچی۔ اکثر اقطار و امصار سے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور جو نہیں آسکتے تھے وہ تحریر کے ذریعے سند اور اجازت نامے

منگوایا کرتے تھے۔ سیّد علامہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس وقت میں نے غزہ (شام) دمشق، حلب، عین تاب (موصل) آذر بائیجان (ایران) تونس، الجزائر، دیار بکر، مدراس (ہندوستان) میں اپنی سند اور اجازت نامے بھیجے۔''(۳۶)

''تاج العروس'' کے خاتمہ نگار کا بیان ہے کہ:

''صرف انھی ممالک سے نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ سے روزمرہ آپ کے پاس درخواستیں پیش ہوتی تھیں اور عوام بھی نہیں بلکہ ان ممالک کے امراء وسلاطین بھی خطوط لکھتے اور نہایت نیاز مندی کے ساتھ اجازت نامے یا سند طلب کرتے۔ شام، ہندوستان، بصرہ (عراق) مراکش، سوڈان، قزان، الجزائر غرض ہر طرف سے شدید تقاضے آتے رہتے تھے۔''

سلطان عبدالحمید اول خلیفۂ ترکی بن سلطان احمد سوم کی دعوت ملاقات:

سید مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں کہ علامہ بلگرامی کی تصنیف ''تاج العروس'' نے انھیں نہ صرف مصر بلکہ تمام اسلامی ممالک میں وہ شہرت، عظمت اور جلادت بخشی تھی جو اس سے قبل کسی بڑے سے بڑے عالم اور صاحبِ فضیلت کو حاصل نہ ہوئی تھی۔ اس غیرمعمولی منزلت کے پیشِ نظر خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالحمید اوّل نے آپ کو قسطنطنیہ آنے کی دعوت دی اور آپ نے منظور بھی فرما لیا تھا لیکن پھر خدا جانے کیا مواقع پیش آئے کہ نہ جاسکے۔ سلطان نے اس کے بعد یہ درخواست پیش کی کہ پھر وہیں سے مجھے اپنی سندوں اور حدیثوں کی کتابوں کی اجازت لکھ بھیجیے۔ چنانچہ علامہ نے اپنے ہاتھ سے اجازت نامہ لکھ کر بارگاہ سلطانی میں بھیجا۔ سلطان کے ساتھ ترکی کے مشہور فاضل خبیر صدر اعظم علامہ راغب(۳۷) پاشا نے بھی آپ سے سند اور اجازت نامہ حاصل کیا۔

اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید مناظر احسن گیلانی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

''ایک مسلمان عالم کا یہ آخری نقطۂ عروج تھا جو ایک غریب الوطن بلگرامی عالم کو دوسرے ملک میں حاصل ہوتا۔''

یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ عید روسی سلسلہ میں داخل ہونے کے بعد سید علامہ کا ہر عمل اب پیر سید عبدالرحمٰن کے حکم کا پابند تھا۔ مصر میں علامہ کا قیام پیر ہی کے حکم کی بنا پر تھا۔ وہاں حدیث، تفسیر یا جس چیز کا درس دیتے، سب میں بجائے درس کے، تلقین و ذکر کی شان زیادہ غالب تھی۔ اپنے درس میں اخلاقیات و جدلیات سے زیادہ حقائق و معارف، فضائل اعمال کی حدیثوں پر زور دیتے تھے۔ طالبان حدیث، کی اس طرف بھی راہنمائی فرماتے تھے۔ ''تاج العروس'' کا خاتمہ نگار لکھتا ہے ''ویحبیر ھم باوراد و أحزاب۔''(۳۸) (ان کو قرآن مجید کی مخصوص آیتوں کے ورد پر زور دیتے)۔

جناب خورشید احمد فارق سابق پروفیسر عربی، دہلی یونیورسٹی تحریر کرتے ہیں:

''تاج العروس'' کی اہمیت، یہ ہے کہ اس نے بہت سی عربی ڈکشنریوں کے مطالعے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس کے سینے میں مفردات لغت سے متعلق وہ ساری شرحی تفصیلات محفوظ ہیں جو عربی ڈکشنریوں میں مروج ہیں۔ اس کی دوسری امتیازی فضیلت یہ ہے کہ قاموس کے مؤلف سے شرح کیے ہوئے الفاظ سے مشتق جو نام اور نسبتیں یا اعلام چھوٹ گئے تھے بلگرامی نے ہر لفظ کی شرح کے آخر میں ''مِمَّا لیتدماع علیہ'' کا باب باندھ کر ان کا صحیح تلفظ متعین کر دیا ہے۔ اسی طرح دوسرے یا تیسرے درجے کے محدثوں کے نام یا نسبتیں جو شرح کیے ہوئے لفظ سے مشتق ہیں اور جنھیں فیروز آبادی نے نظر انداز کر دیا تھا، بلگرامی نے مع سنہ وفات بیان کر دیئے ہیں۔ اجنبی اعلام اشخاص و الکنیہ جو کسی دوسرے قاموس میں دستیاب نہیں ہوئے بلگرامی نے ان میں سے بیشتر کی باب استدراک میں تلفظ متعین کر کے وضاحت کر دی

ہے۔(۳۹)

جناب خورشید احمد فارق اپنی تالیف ''جائزے'' میں تاج العروس کی دسویں جلد کے آخر میں بلگرامی کے متعلق ایک تعارفی نوٹ کی عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامہ مرتضیٰ بلگرامی علم میں ڈوبی ہوئی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ شاندار لباس پہنتے تھے۔ اکابرو اعیان سے ان کے روابط تھے۔ بہت جلد تاج العروس کے ہرطرف چرچے ہوتے ہیں۔ عثمانی خلیفہ نے ان سے ایک نسخہ کی فرمائش کی۔ سلطان دارفور، ٹونیشیا، الجیریا، مراکش نے بھی اس کے نسخے طلب کیے اور امیرالامراء محمد بک نے جس کا لقب ''ابو ذھب'' تھا، اس کا ایک نسخہ حاصل کیا اور اسے اپنے کتب خانے میں، جسے اس نے ازہر کے قریب بنوایا تھا جگہ دی اور قدردانی کے طور پر بلگرامی کو ہزار ریال کا عطیہ دیا۔ تاج العروس کے علاوہ بلگرامی کی بہت سی تالیفات ہیں جن کی تعداد سو سے زیادہ ہے اور جس کا انھوں نے اپنی فہرست میں ذکر کیا ہے۔ ان میں سے دو اہم کتابیں احیاء العلوم غزالی کی شرح اور قاموس کا تکملہ ہیں ۔ ۱۱۸۹ھ میں وہ محلہ سولقیۃ الالا منتقل ہو گئے جہاں امراء و رؤسا رہتے تھے اس محلے کے اعیان و اکابر کی نظر میں انھوں نے اونچا مقام حاصل کرلیا۔ وہ بلگرامی سے ربط ضبط رکھنے اور ان کے مصاحب بننے کے خواہشمند ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کا ڈیل ڈول اور صورت اچھی تھی۔ بات چیت انداز، مزاج اور اخلاق پرکشش تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے لوگوں سے ملا کرتے تھے ان کے طور طریق پر خودداری اور وقار کی مہر لگی ہوئی تھی۔ وہ اہلِ مکہ کی طرح عمامہ باندھتے، سفید کپڑے کا جس کا سرا

پیچھے لٹکتا ہوتا اور اس میں بقدر دو انگل ریشم کا پھندنا لگا ہوتا تھا بلگرامی میانہ قد آدمی تھے۔ جسم چھریرا اور رنگ سونے کی طرح دمکتا ہوا، اعضاء متناسب، داڑھی درمیانہ جس کے اکثر بال سفید تھے، لباس بڑھیا پہنتے تھے۔ انھیں ادبی و علمی لطیفے یاد تھے برجستہ جواب دیتے تھے اور برمحل گفتگو کرتے تھے۔ عقل رسا پائی تھی۔ معلومات کا دائرہ وسیع تھا، ترکی اور فارسی زبان سے واقف تھے، اکابر و رؤسا کے اس محلے کے لوگ ان سے مانوس ہو گئے اور ان کی قدر و منزلت کرنے لگے۔ بلگرامی ان کے سامنے وعظ کہتے تھے۔ ان کی سیرت اور کردار سنوارنے والی باتیں کرتے تھے اور انھیں اوراد احزاب (مخصوص قرآنی آیات) کی تلقین کرتے تھے۔ اس طرح بلگرامی بہت مشہور ہو گئے اور دور دور ان کا چرچا ہونے لگا۔ لوگ ہر سمت اور ملک سے ان کے پاس آنے لگے۔ اب انھوں نے سلف کے طریقہ پر حدیثیں بیان کرنا اور املا کرانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے حافظے سے رواۃ کے نام اور مختلف اسناد سے حدیثیں بیان کرتے تھے۔''

حدیث کے درس کے زمانے میں ازہر کے کچھ عالم ان سے ملے اور حدیث میں اجازہ (سرٹیفیکیٹ) ان سے مانگا تو انھوں نے کہا کہ اجازہ اس وقت دوں گا جب آپ لوگ اوائل کتب حدیث میری نگرانی میں پڑھ لیں گے۔ اس کے لیے طے ہوا کہ ہر پیر اور جمعرات کے دن شیخوں کی جامع مسجد میں اجتماع ہوا کرے۔ بلگرامی نے وہاں صحیح بخاری سے ابتداء کی۔ اس درس میں ازہر کے دوسرے علماء بھی شریک ہونے لگے۔ صحیح بخاری کی چند حدیثوں کے درس کے بعد وہ فضائل اعمال کے متعلق کچھ حدیثیں

اور ان کی اسناد حافظے سے بیان کرتے، پھر علماء کو کچھ اچھے شعر بھی سناتے۔ حاضرین ان کی لیاقت، خوش بیانی اور علمی نظر پر سر دھنتے۔ ان کی شہرت، وجاہت اور قدر و منزلت میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ اس محلے کے اکابر و اعیان کے علاوہ دوسرے محلوں کے عوام اور بڑے لوگ بھی ان کے درس میں شریک ہونے لگے۔ بہت سے ممتاز اور بااثر لوگوں نے انھیں اپنی کوٹھیوں اور محلوں میں بلانا شروع کر دیا اور ان کے اعزاز میں بڑی بڑی دعوتیں کرنے لگے۔ وہ اپنے طلباء،(۴۰) قاری، مستملی اور کاتب کے ساتھ دعوتوں میں جاتے اور بخاری وغیرہ کی کچھ حدیثیں تلاوت کرتے۔ مجمع میں میزبان، ان کے دوست احباب، اقرباء اور بچے حتیٰ کہ بیویاں اور لڑکیاں تک پردے کے پیچھے سے بلگرامی کے افادات ذوق وشوق سے سنتیں۔ عنبر اور اگربتیوں کی خوشبو ہر طرف فضا کو مہکاتی حدیث کی تلاوت کے بعد مصر میں مروجہ دستور کے مطابق رسول اللہ صلعم پر درود بھیجنے کی تقریب ہوتی۔ بلگرامی کا کاتب حاضرین کے نام ایک رجسٹر میں ثبت کرتا۔ بچیوں، لڑکیوں اور عورتوں تک کے نام، دن اور تاریخ بھی۔ اس کے بعد بلگرامی ''صح ذلک'' لکھ کر تحریر کی توثیق کرتے۔(۴۱)

اسی تعارفی نوٹ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے جناب خورشید احمد فارق مزید لکھتے ہیں:

''جب بلگرامی کی شہرت بام کمال کو پہنچ گئی اور خاص و عام میں انھوں نے ایسی عزت و وجاہت حاصل کرلی جس سے زیادہ ممکن نہ تھا تو وہ پبلک زندگی سے کنارہ کش ہوکر خانہ نشین ہو گئے۔ دوست، احباب اور قدردانوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ گھر کے

دروازے ملاقاتیوں کے لیے بند کر دیے اور درس و تدریس، وعظ و تلقین اجازہ اور اوراد سب سے منہ موڑ لیا۔ اس حال میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ انھیں طاعون نے آ پکڑا۔ وہ اپنے مکان کے سامنے والی مسجد کُردی میں جمعہ کی نماز ادا کر کے گھر آئے تو طاعون میں مبتلا تھے۔ رات میں ان کی زبان بولنے سے بھی قاصر ہوگئی۔ اگلے دن شعبان ۱۴۰۵ھ کو نپولین کی آمد اور نئے انقلاب انگیز تمدن کے داخلے سے چند سال پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے نہ کوئی لڑکا تھا نہ لڑکی۔ کسی شاعر نے ان کا مرثیہ نہیں کہا اور طاعون کی تباہ کاری کے باعث ازہر کے علماء کو بھی ان کی موت کی خبر نہ ہوسکی۔ قاہرہ سے باہر سیدہ رقیہ کے مزار کے پاس انھیں اس قبر میں دفن کر دیا گیا جسے اپنی زندگی میں انھوں نے بنوا لیا تھا۔'' (۴۲)

جناب خورشید احمد فارق مصری عالم علی طنطاوی کے حوالے مزید رقم طراز ہیں:

''مصر میں بلگرامی کا ستارہ چمکا، نام روشن ہوا اور انھوں نے اعلیٰ مرتبہ پایا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اول اول ان کا رابطہ امیر اسمٰعیل کتخدا سے قائم ہوا۔ خدا نے بلگرامی کی محبت اور قدر و منزلت اس کے دل میں ڈال دی اور اس نے بلگرامی کو ایک اچھا عہدہ دیا۔ یہ دیکھ کر اسمٰعیل نے بلگرامی کو عہدہ دیا اور وہ ان کے قدرداں ہیں، لوگ بلگرامی کی طرف ٹوٹ پڑے۔ ان کے درس میں شرکت کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھے اور انھیں شاندار عطیے اور عمدہ تحفے دینے لگے۔ بلگرامی خوش حال ہو گئے اور اعلیٰ قسم کا لباس پہننے لگے اور سواری کے لیے خوبصورت قیمتی گھوڑے خرید لیے۔ ان کا جسم چھریرا تھا، قد میانہ، چہرہ گلابی،

اعضا سڈول۔ وہ حجازی لباس پہنتے تھے جو علمائے ازہر کے لباس سے مختلف تھا۔ ان کا عمامہ حجازی طرز کا تھا۔ لوگ علمائے ازہر سے مختلف اور زیادہ بارعب لباس سے بھی ان کی طرف مائل ہونے لگے۔ دولت و وجاہت حاصل کر کے وہ سویقتہ اولالاء منتقل ہو گئے۔ یہ اس زمانے میں بڑے لوگوں کی رہائش کا علاقہ تھا۔ یہاں آکر انھوں نے اپنے گھر کے دروازے کھول دیے۔ وہ دعوتیں کیا کرتے اور جو لوگ انھیں تحفے دیتے انھیں خود بھی تحفے دیتے۔ وہ جہاں جاتے لوگ انھیں گھیر لیتے اور علم کے طالبین علماء کے ان کے پاس ٹھٹ لگ جاتے۔ امراء، کبراء اور حکمران طبقے کے اعیان میں ان کی دعوتیں اور اعزاز و اکرام کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی دوڑ سی رہتی تھی۔ انھوں نے ڈیلٹائے نیل کے شہروں کا بارہا دورہ کیا جیسے دمیاط، رشید اور منصورہ۔ پھر انھوں نے شادی کرلی اور اپنی بیوی سے انھیں ایسی محبت ہوئی جیسی قیس کو لیلیٰ اور عباس کو زبیدہ سے بھی نہیں ہوئی ہو گی۔ اس کے ساتھ بلگرامی ایسی پرسکون زندگی گزارتے تھے جیسی جنت ہی میں میسر ہوسکتی ہے۔ جب شرح (تاج العروس) مکمل ہوئی تو انھوں نے شان دار دعوت کی جس میں علماء اور بڑے بڑے لوگوں کو مدعو کیا یہ بہت بڑی تقریب تھی جس کے مدتوں چرچے ہوتے رہے۔

جب محمد بک ابو ذھب نے مشہور مسجد ازہر کے قریب بنوائی تو اس میں ایک کتب خانہ بھی قائم کیا جس کے لیے وہ نادر کتابیں خرید کرتا تھا۔ اس نے تاج العروس کے پہلے نسخے لیے۔ بلگرامی کو ایک لاکھ درہم کا عطیہ دیا۔ وسیع دنیوی اعزاز اور مال و دولت بلگرامی کو علم کے جادہ سے نہ ہٹا سکے۔ وہ تصنیف و تالیف میں لگے رہے۔ طلباء کو

پڑھاتے رہے اور ان علوم کو تازہ کرتے رہے جو بھلائے جا رہے تھے جیسے علم نسیب، اسانید اور تخریجِ احادیث بلگرامی کی تشریح حدیث میں فقہ، ادب اور تاریخ کی بھی چاشنی ہوتی تھی جن کا مشائخ ازہر کے درس میں فقدان تھا۔

مصر کے کچھ بڑے امیروں سے بلگرامی کے دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے جیسے مصطفیٰ بک اسکندرانی، اور ایوب بک۔ یہ لوگ ان کے گھر آتے تھے اور بڑے بڑے عطیے لاتے تھے۔ بلگرامی کی شہرت ترکی تک جا پہنچی۔ انھیں عثمانی پایۂ تخت استنبول آنے کی دعوت دی گئی لیکن وہ گئے نہیں۔ انھیں خلیفہ کی طرف سے بڑے بڑے عطیات اور تحفے بھیجے گئے۔ ترکی، حجاز، یمن، ہند، شام، عراق، شمالی افریقہ، سوڈان اور جزائر بحرِ متوسط کے حاکموں، امراء، رؤسا نے ان سے خط و کتابت کی اور ان ملکوں سے بکثرت وفود ان کے پاس آئے اور عجیب و غریب تحفے لے کر۔ بلگرامی کو بڑے لوگوں سے احترام کرانے کا گر معلوم تھا۔ جب حسن پاشا عثمانی خلیفہ کی طرف سے گورنر ہو کر مصر آیا تو ہر بڑا آدمی اسے سلام کرنے گیا لیکن بلگرامی نہیں گئے۔ انھوں نے چند نمائندے بھیجے جنھوں نے حسن پاشا کو بلگرامی کی عظمت اور تقدس سے روشناس کر کے ان کی زیارت کرنے کا مشورہ دیا، حسن پاشا ان کے گھر آیا۔ اس موقع پر بلگرامی نے ایک پوستینی جبہ جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا بطور خلعت، ایک تیز رفتار گھوڑا مع طلائی زین اور ایک عبا جس کی قیمت اس وقت ہزار دینار تھی، حسن کو عطا کی۔ یہ تحفے لے کر حسن پاشا کے دل میں شیخ (بلگرامی) کی عظمت و احترام کے سوتے کھل گئے۔ ان کی کوئی سفارش وہ نامنظور نہیں کرتا تھا۔ بلگرامی اگر اسے کوئی کتاب یا خط بھیجتے تو وہ اسے پہلے ادب سے چومتا اور خط میں بلگرامی کی جو فرمائش ہوتی اسے پورا کر دیتا۔ شام کے امیر (حاکم) احمد بک جزار کے دل میں شیخ (بلگرامی) کی عظمت اور جلادت اس قدر زیادہ تھی کہ جو بڑا آدمی مصر سے آکر احمد جزار سے ملتا، اس سے بلگرامی کے بارے میں پوچھتا۔ اگر وہ کہتا کہ میں ان سے واقف ہوں، ان کی خدمت میں حاضری دے چکا ہوں اور ان کی تعریف کرتا تو احمد جزار اس کی آؤ بھگت کرتا اور اسے عمدہ عطیہ دیتا ورنہ اسے

دھتکار دیتا چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہوتا۔

بلگرامی نے جب شرح احیاء العلوم لکھنا شروع کی تو اس کے کچھ ابتدائی حصے ترکی، شام اور شمالی افریقہ کے سلاطین کو بھیجے تا کہ اسے بھی وہ شہرت حاصل ہو جائے جو تاج العروس شرح قاموس کو ہوئی تھی۔

وہ مزید لکھتے ہیں :

بلگرامی پر ایک حادثہ نازل ہوا جس نے ان کی زندگی کا رُخ بدل ڈالا اور ان کی اجتماعی زندگی پر جو چہل پہل تھی اور رونق کے باعث ضرب المثل بنی ہوئی تھی، عزلت و تنہائی کا پردہ ڈال دیا۔ یہ حادثہ ان کی چہیتی بیوی کی موت تھی۔ اس حادثے نے ان کے شعور و وجدان میں سخت چوٹ لگائی۔ وہ یہ حدیث بھی بھول گئے جس کی وہ خود روایت کیا کرتے تھے کہ پکی قبریں اور ان پر گنبد بنوانا مکروہ ہے۔ انھوں نے بیوی کو اس قبر کے پاس دفن کیا جو قاہرہ کے باہر سیدہ رقیہ کی طرف منسوب ہے اور بیوی کی قبر پر گنبد بنوایا، اس سے ملحق اپنے لیے ایک کمرہ جس میں پردے اور قندیلیں آویزاں کرائیں اور ایک مدت تک دیوانہ وار قبر کے مجاور بنے رہے۔ قبر کے برابر انھوں نے ایک گھر بنوا کر اس میں اپنی والدہ(۴۳) کو بسایا اور ایک بڑا فنڈ قائم کیا جس سے ان شعراء کو عطیات دیئے جاتے تھے جو بیوی کا مرثیہ یا اس کی تعریف میں قصیدہ نظم کرتے۔ بلگرامی گھر میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ وہ تحائف لینا بند کر دیئے جو ان کے پاس آتے رہتے تھے۔''(۴۴)

خورشید احمد فارق مزید لکھتے ہیں :

بلگرامی نے بیوی کے ماتم میں بہت سے بھڑکا دینے والے شعر

کہے۔ اگر کسی طالب علم کے دل میں ایسے شعراء پر ریسرچ کرنے کا داعیہ پیدا ہو جنھوں نے بیویوں پر مرثیے لکھے ہیں تو میرا مشورہ ہے کہ وہ شارح قاموس کو فراموش نہ کرے۔ انھوں نے علامہ بلگرامی کے ایک مرثیے کے چند اشعار نقل کیے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے۔

۱۔ زبیدہ (بیوی) نے منگل کے دن ''کاہی لباس'' میں دنیا سے کوچ کیا۔

۲۔ وہ دلھن کی طرح اٹھلاتی تھی اور قمیض اور غرارے میں اکڑ کر چلتی تھی۔

۳۔ جیتے جی میں اس کا ماتم کرتا رہوں گا اور موت کے بعد میری ہڈیاں اور پسلیاں اس کا ماتم کریں گی۔

۴۔ میں اس کے سوگ میں سارے آنسو بہا دوں گا اور صبر کر کے کبھی سکون طلب نہیں کروں گا۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ شیخ عبدالرزاق بیطار نے اپنی غیر مطبوعہ تاریخ میں بلگرامی کے حالات نقل کیے ہیں اور یہ تصریح کی ہے کہ:

''میں نے دیکھا کہ ان کی بیوی کے رشتہ داروں نے ان کے صندوق اور پیٹیاں کھولیں اور وہ گرانقدر تحائف نکال کر لے گئے جو اکابر انھیں بھیجا کرتے تھے، ان میں نفیس کپڑے کے تھان، مختلف اقسام کی کشمیری شالیں، پوستینی جُبے، عبائیں اور نادر سامان شامل تھا۔ میں نے قیمتی جیبی گھڑیوں کے ڈبوں کا ڈھیر دیکھا جن سے گھڑیاں کبھی نکالی تک نہیں گئی تھیں۔ شیخ (بلگرامی) نے آنکھیں کھولیں اور یہ سین دیکھا تو اشارہ کیا، گویا کہہ رہے ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔''(۴۵)

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن– اِنَّ تقبل مِنَّا وَ اَنت غَفُوۡرُ الرَّحِیۡم۔

۞ ۞ ۞

حواشی

۱۔ اصل نام ہے۔ سلسلہ قادریہ سے نسبت نہیں ہے لیکن انھوں نے حُما (شام) کی خانقاہ قادریہ کے سجادہ نشین سے طریقۂ قادریہ کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔

۲۔ مآثر الکرام ص ۱۴۹ مطبوعہ آگرہ ۱۶۱۰ء باہتمام کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن۔

۳۔ "شجر طیّبہ" (قلمی) ص ۳۰۷ مملوکہ حقیر محرر سطور ہذا۔

۴۔ روضتہ الکرام ص ۵۱ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۴۰ء وصی الحسن بلگرامی ڈپٹی کلکٹر۔

۵۔ مناظر احسن گیلانی نے راغب پاشا نام لکھا ہے۔

۶۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ از ڈاکٹر محمد ایوب قادری) ص ۳۹۴۔

۷۔ "شجرہ طیبہ" (قلمی) ص ۴۶۳ آزاد بلگرامی۔

۸۔ "معارف" ص ۱۰۱ ۱۹۲۷ء۔

۹، ۱۰۔ "رود کوثر" ص ۶۱۳، ۶۱۴ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۹ء۔

۱۱۔ "معارف" ص ۹۹، ۱۹۲۷ء

۱۲۔ ابجد العلوم ص ۴۵۸ مطبوعہ سنہ۔

۱۳۔ مآثر الکرام ص ۲۳۱۔ ۱۹۷۱ء لاہور ایڈیشن۔

۱۴۔ شیخ احمد عرف مُلّا جیون بن شیخ ابو سعید صدیق ساکن قصبہ امیٹھی (مضافات لکھنؤ) دوسرے علمائے پورب کے علاوہ ملا لطف اللہ کوروی کے خاص شاگرد تھے۔ "تفسیر احمدی" اور "نور الانوار" (شرح منارالانوار مؤلفہ شیخ ابوالبرکات نسفی) ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ حافظہ اس قدر قوی تھا کہ طویل قصیدہ صرف ایک مرتبہ سننے کے بعد یاد ہو جاتا تھا (مآثرالکرام ۲۰۷)۔ ان کی وفات ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) میں ہوئی۔

۱۵۔ شیخ غلام نقشبند بن شیخ عطاء اللہ: آپ کا وطن ضلع جونپور کا قصبہ گھوسی تھا لیکن چونکہ میر محمد شفیع قدس سرہ سے لکھنؤ میں تعلیم و تربیت حاصل کی اور وہیں سکونت اختیار کرلی، اس لیے لکھنوی مشہور ہو گئے۔ انھوں نے ۱۷ سال کی عمر میں تمام فنون ادب میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ ۳۰ رجب ۱۱۲۶ھ (۳۰ اگست ۱۷۱۴ء) کو وفات پائی اور لکھنؤ میں آخری آرام گاہ ملی۔ علامہ میر عبدالجلیل واسطی بلگرامی نے لکھنؤ میں رہ کر ان سے پانچ سال تک تمام علوم منقولات و

معقولات خصوصاً تفسیر، لغات، فنون عربیت، اسماء الرجال، تاریخ اور موسیقی وغیرہ میں کمال حاصل کیا۔

۱۶۔ بغداد کے فاضلوں میں سے تھے۔ فوت ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵ء) ''الخبور'' ان کے عظیم قبیلہ کا نام جو نہر خابور کے ساحل پر آباد تھا۔

۱۷۔ مآثر الکرام ص ۱۲۸-۱۳۳، ۱۹۷۱ء لاہور۔

۱۸۔ روضۃ الکرام ص ۱۶۵ مطبوعہ ۱۹۴۰ء لکھنؤ۔

۱۹۔ ملا فاخر خلف الصدق شیخ محمد یحییٰ المعروف بہ شیخ خوب اللہ الہٰ آبادی۔ متعدد کتب و رسائل کے مصنف تھے (رحلت دوشنبہ ۱۱ جمادی الاول ۱۱۴۴ھ) (۳ اکتوبر ۱۷۳۱ء) ملا فاخر شریعت کے سے پابند تھے۔ وہ اپنے اور بیگانے سب کے ساتھ دامے درمے خوب احسان کرتے۔ عنفوانِ شعور سے اپنے والد ماجد اور بڑے بھائی شیخ محمد طاہر سے درسی کتابیں پڑھیں او کمالات حاصل کیے۔ حج کی سعادت اور مدینۂ منورہ میں روضۂ رسولؐ کی زیارت سے مش ہوئے۔ وہاں انھوں نے شیخ محمد حیات سندھی المدنی سے علم حدیث کی سند حاصل کی۔ و انتہا ذکی الطبع تھے جس کے باعث علمی گتھیوں کو بہت جلد سلجھادیتے تھے۔ علامہ عبد بلگرامی اور علامہ آزاد بلگرامی کے فاخر الہ آبادی سے نہایت گہرے اور قریبی تعلقات آزاد بلگرامی کے اہل خانہ اور دیگر اعزا ان کے پاس الہ آباد میں برسوں قیام کرتے تھے فاخر الہ آبادی علامہ آزاد سے چار سال چھوٹے تھے اور خلوص و محبت کے رشتے اُستوار فاخر الہ آبادی ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں پیدا ہوئے اور آزاد بلگرامی یکشنبہ ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ (۱۸ ۱۷۰۴ء) کو۔ ان دونوں میں کئی قدریں مشترک تھیں مثلاً دونوں نے ایک ساتھ مناسک کیے۔ دونوں شیخ محمد حیات سندھی المدنی قدس سرہ کے شاگرد تھے۔ دونوں کا سلسلۂ ط سید محمد کالپوی قدس سرہٗ سے متصل تھا۔ فاخر الہ آبادی نے ۱۱۶۴ھ ۱۷۵۱ء میں رحلت ف آزاد بلگرامی نے ان کی پیدائش کا مادہ تاریخ ''خورشید'' اور وفات کا مادہ تاریخ ''زوال حاصل کیا۔ زائر الہ آبادی ایک اچھے شاعر اور صاحبِ دیوان تھے۔

۲۰۔ معارف ص ۱۰۲ فروری ۱۹۲۷ء اعظم گڑھ۔

۲۱۔ معارف ۱۰۳۔

۲۲۔ بحوالہ معارف ص ۱۰۳۔

۲۳۔ تاج العروس جلد ۱۰ ص ۔

۲۴۔ اتحاف السادۃ المتقین مصر میں چھپی ہے۔ یہ شرح ۱۰ جلدوں پر محیط ہے۔

۲۵۔ تاج العروس جلد دس ص ۔

۲۶،۲۷۔ معارف ص ۱۰۶ ، ۱۹۲۷ء۔

۲۸۔ معارف ص ۱۰۷ ، ۱۹۲۷ء۔

۲۹۔ بحوالہ معارف ص ۱۰۷۔ ۱۰۸ ، ۱۹۲۷ء

۳۰۔ نام محمد بن یعقوب مجدالدین الشیرازی الفیروز آبادی اللغوی القریشی التمیمی البکری الشافعی۔ سلسلۂ نسب اس طرح ہے : محمد بن یعقوب بن ابراہیم بن عمر بن ابی بکر بن احمد بن محمود بن ادریس بن فضل اللہ بن شیخ الاسلام ابی اسحاق الگا ذرونی۔ فیروز آبادی گاذرون میں ربیع الاول۔۷۲۹ھ (اپریل ۱۳۲۹ء) میں پیدا ہوئے۔ وہ رمضان المبارک ۷۹۶ھ (جولائی ۱۳۹۷ء) میں زبید آئے اور ۲۰ شوال ۸۱۷ ھ (۱۴۱۵ء) میں رہگرائے عالم بقا ہوئے (''اتحاف النبلا'' ص ۳۹۵ نواب صدیق حسن خاں قنوجی) وہ ۱۳۵۱ھ اور ۱۳۸۸ء کے دوران دو مرتبہ ہندوستان سے گئے، پہلی مرتبہ فیروز شاہ تغلق اور دوسری مرتبہ محمود شاہ تغلق کے عہد میں۔ جملہ تصانیف (۴۲) ہیں۔

۳۱۔ معارف ص ۱۰۸، اعظم گڑھ۔

۳۲۔ معارف ص ۱۰۸۔

۳۳،۳۴۔ معارف ص ۱۱۰۔۱۱۱، ۱۹۲۷ء۔

۳۵۔ معارف ص ۱۱۱ ، ۱۹۲۷ء۔

۳۶۔ معارف ص ۱۱۲، ۱۹۲۷ء۔

۳۷۔ پیدائش ۱۱۳۷ھ ۱۷۲۵ء۔ تخت نشینی ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۳ء) وفات ۱۲۰۲ء۔

۳۸۔ معارف ص ۱۱۳ ، ۱۹۲۷ء۔

۳۹۔ ''جائزے چوتھا حصہ'' ص ۱۸۴۔ ۱۸۵ مطبوعہ ۱۹۸۷ء علی گڑھ۔

۴۰۔ مستملی یعنی ڈکٹیشن لینے والا۔

۴۱۔ جائزے حصہ چہارم ۲۱۴۔

۴۲۔ ''جائزے، چوتھا حصہ'' ص ۱۹۹ تا ۲۹۰۔

۴۳۔ علامہ بلگرامی ۱۱۶۴ھ میں حج کو جاتے ہوئے اپنی والدہ معظمہ کونہیں لے گئے تھے اور نہ دوبار
ان کے بلگرام آنے اور اپنی والدہ کو مصر لے جانے کے بارے میں تاریخی شواہد ہیں۔ والد
مصر کیسے پہنچیں واللہ اعلم۔

۴۴۔ ''جائزے چہارم'' ص ۱۹۹ تا ۲۰۴ بحوالہ ''رجال من التاریخ'' ص ۲۶۴ تا ۲۷۰۔

۴۵۔ ''جائزے حصہ چہارم'' ص ۲۰۵۔

ڈاکٹر ضیا الحسن

اردو شعراء کے تذکروں کی عمرانی جہت

اردو تذکرہ نگاری کا جائزہ لینے سے قبل ضروری ہے کہ پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ تذکرہ نگاری کیا ہے اور اردو تذکروں میں کن کن موضوعات پر لکھا گیا ہے تا کہ یہ طے کرنے میں آسانی ہو کہ ہم نے ان میں سے کن مباحث پر بات کرنی ہے۔ ہمارے موضوع کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اردو تذکرہ نگاری کے عمرانی پہلوؤں کو اجاگر کریں۔

مختلف لغات میں تذکرہ نگاری کے ضمن میں جو کچھ ملتا ہے اس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ایسی کتاب جس میں شعراء کا حال لکھا جائے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اردو میں صرف شعراء کے تذکرے ہی نہیں لکھے گئے بلکہ مختلف علوم مثلاً طب اور تصوف کے حوالے سے بھی تذکرے لکھے گئے ہیں۔ شعراء کے تذکرے عموماً صاحب تذکرہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ تذکرہ ایسی کتاب کو کہتے ہیں جس میں متعلقہ علم کے حوالے سے کام کرنے والوں کے مختصر حالات بیان کیے جاتے ہیں۔

اردو میں دیگر اصناف ادب کی طرح تذکرہ نویسی کا علم بھی فارسی کی معرفت سے رواج پذیر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کے تذکروں کی زبان بھی فارسی ہے۔ ۱۸۰۱ء میں پہلا اردو تذکرہ گلشن ہند کے نام سے مرزا لطف علی نے تحریر کیا۔ اس سے قبل اور بعد میں بھی بیشتر تذکروں کی زبان فارسی ہے۔ ۱۸۴۴ء میں کریم الدین کے تذکرہ گلدستۂ نازنیناں سے تذکروں نے اردو زبان کا پیراہن پہنا تو آب حیات (۱۸۸۰ء)

تک چند تذکروں کو چھوڑ کر زیادہ تر تذکروں کی زبان اردو ہے۔ ہمارا موضوع چونکہ اردو تنقید سے متعلق ہے۔ اس لیے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم صرف اردو میں لکھے گئے تذکروں کو زیرِ بحث لاتے لیکن فارسی میں لکھے جانے والے تذکرے بھی اردو شاعری سے متعلق ہیں، اس لیے کم از کم اہم تذکروں پر بات کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں کیونکہ تذکرہ نگاری خصوصاً اور اردو تنقید عموماً ان تذکروں کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے۔ اردو تنقید کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے ہمیں تذکرہ نگاری کا بحیثیت مجموعی جائزہ لینا پڑے گا۔

تذکرہ نگاری کی عمرانی جہت کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس امر کا تصفیہ ہونا بھی ضروری ہے کہ آیا تذکرہ نگاری کو تنقید کے زمرے میں رکھا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ تذکروں پر قدیم اور جدید دونوں ادوار میں اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں۔ قدیم دور میں زیادہ تر اعتراضات دیگر تذکرہ نویسوں کی طرف سے ہوتے رہے ہیں۔ ان کا آغاز اردو شاعری کے پہلے تذکرے ''نکات الشعراء'' سے ہی ہو گیا تھا۔ نکات الشعراء میں میر تقی میر کا انداز جارحانہ رہا ہے جو اس زمانے کی عام روش سے ہٹا ہوا ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ پسند نہیں کیا گیا۔ نتیجتاً نکات الشعراء پر اعتراضات کا سلسلہ فتح علی حسینی کے ''تذکرۂ ریختہ گویاں'' (۱۷۵۳) سے محمد حسین آزاد کے تذکرے ''آبِ حیات'' (۱۸۸۰) تک پھیلا ہوا ہے۔ فتح علی حسینی نے میر کی تنقید کو ''خردہ گیری'' اور ''عیب چینی'' قرار دیا۔ حکیم قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرے ''مجموعۂ نغز'' میں میر صاحب کو متکبر و بددماغ بنا دیا۔ بعد کے تذکرہ نگاروں نے زیادہ تر انھی آرا کی روشنی میں ہی میر صاحب پر تنقید کی ہے۔ ''گلشن بے خار'' اور گلشن ہند پر دہلی نوازی کے الزامات ہیں۔ قدیم و جدید ادوار میں تذکروں پر جو گرفت کی گئی اور جو اعتراضات کیے گئے، انھیں ہم مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں۔

۱- سوانح اور ماحول سے متعلق معلومات بے حد مختصر ہیں۔

۲- تاریخ کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا۔

۳- اکثر تذکروں میں تقلید و تکرار کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔

۴- شاعری پر تنقید کو تنقید نہیں کہا جا سکتا۔

۵- بیشتر مقامات پر جانبداری سے کام لیا گیا ہے۔

ان اعتراضات میں جہاں تک تذکرہ نگاروں کے تذکرہ نگاروں پر اعتراض کا تعلق ہے، تو ان کی ادبی اہمیت زیادہ نہیں ہے۔ ان اعتراضات کے پیچھے کہیں معاصرانہ چشمک اور مخصوص ادبی گروہ بندیوں کے تعصبات کارفرما ہیں تو کہیں علاقائی تعصّبات، ظاہر ہے کہ جہاں معاملہ غیر ادبی تعصبات کا ہوگا تو ایسے نتائج ضرور سامنے آئیں گے۔ پھر ان میں ایک عنصر اپنی تذکرہ نگاری کو دیگر تذکرہ نگاروں کے کام پر فوقیت دینے کا بھی ہے اور یہ رویہ بھی خالص ذاتی تفاخر سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ ادبی تنقید سے۔ اس لیے ان اعتراضات کی وضاحت غیر ضروری ہے۔ البتہ جدید نقادوں نے تذکرہ نگاری پر اعتراضات کرتے ہوئے تنقید کے جدید اصولوں کو مدنظر رکھا اور اس کی وضاحت ضروری ہے تاکہ تذکروں کی تنقیدی جہت کی وضاحت ہو سکے۔ جدید نقاد تذکرہ نگاری کو جدید دور کے تنقیدی نظریات کی روشنی میں پرکھتے ہیں تو انھیں ان میں تنقیدی بصیرت مفقود نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ انھیں یکسر مسترد کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان تذکروں کی اہمیت زیادہ سے زیادہ تاریخی اہمیت کی حامل تو ہو سکتی ہے، تنقیدی حوالے سے یہ تذکرے بے معنی اور فضول ہیں۔ ان سے نہ تو قدیم دور کی شاعری کے بارے میں بات واضح ہوتی ہے اور نہ ہی ان ادوار کی ادبی صورت حال کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ تذکرہ نگاری پر ان اعتراضات کی شدید شکل کلیم الدین احمد کے ہاں نظر آتی ہے۔ یہاں ہم ان کی رائے نقل کر دیتے ہیں۔ تاکہ جدید تنقید کا تذکرہ نگاری کے بارے میں نقطۂ نظر واضح ہو سکے۔ ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ تنقید محض سطحی ہے۔ اس کا تعلق زبان، محاورہ اور عروض سے ہے۔ لیکن یہ شاید کہنے کی ضرورت نہیں کہ تنقید کی ماہیت اور اس کے مقصد اور اس کے صحیح اسلوب سے بھی تذکرہ نویس واقفیت نہ رکھتے تھے۔ ان تذکروں کی اہمیت تاریخی ہے اور دنیائے ادب میں

ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ تاریخی اہمیت اور تنقیدی اہمیت میں مشرقین کا فرق ہے۔ اب ادبی دنیا اس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ ہمیں تذکروں سے کچھ سیکھنا نہیں ہے۔ جہاں تک تنقید کا واسطہ ہے۔ ان تذکروں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔''(۱)

تذکرہ نگاری کے بارے میں یہ رائے صرف کلیم الدین احمد کی نہیں ہے بلکہ کلیم الدین احمد کی رائے اپنے اندر بہت سے جدید نقادوں کی رائے کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے تین جوابات ہیں، ایک وہ جو ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے دیا۔ ایک نقطۂ نظر سیّد عابد علی عابد کے ہاں نظر آتا ہے اور ایک نقطۂ نظر دیگر کئی نقادوں نے وضع کیا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نہایت تفصیل سے جدید نقادوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے جدید نقادوں نے قدیم تذکروں کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا اور چند تذکروں پر سرسری نظر ڈال کر رائیں قائم کر لی ہیں، ورنہ کم از کم انھیں اس بات کا اندازہ ضرور ہو جاتا کہ تذکروں پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ ہر ایک پر منطبق نہیں ہوتے۔ ان میں یقیناً ایسے تذکرے بھی ہیں جن میں سوانح کے باب میں کچھ زیادہ احتیاط و توجہ سے کام نہیں لیا گیا۔ لیکن ان تذکروں میں ایسے بھی موجود ہیں جن میں شعرا کے حالات کو احتیاط سے جمع کرنے، شعراء کے ادوار قائم کرنے، ہر دور کی خصوصیات اجاگر کرنے، شعراء کی ولدیت اور سکونت کی نشاندہی کرنے، ان کے اساتذہ و تلامذہ کے نام دینے اور ان کے سنین وفات و پیدائش کے اندراج کرنے میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ ایسے تذکروں میں گلزار ابراہیم، گلشن ہند، گلستان سخن، شمیم سخن اور خزینۃ العلوم کے نام آسانی سے لیے جا سکتے ہیں۔ تنقیدی

راویوں کے سلسلے میں ''نکات الشعراء''، ''گلشن بے خار'' اور ''آب حیات'' کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں تذکروں کی جو کمزوریاں اور گنوائی گئی ہیں وہ کسی ایک تذکرے میں مجتمع نہیں ہیں بلکہ متعدد تذکروں میں بٹی ہوئی ہیں۔ بعض میں اشعار کے انتخاب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ بعض میں حالات زندگی کو اہمیت دی گئی ہے۔ بعض میں ولدیت وسکونت کا ذکر ضرور کیا گیا ہے۔ بعض میں استاد و شاگرد کے نام خصوصیت سے درج کیے گئے ہیں۔ بعض میں شعراء کے کلام پر رائیں ضرور دی گئی ہیں۔ بعض میں معاصرانہ ادبی فضا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طرح اگر کسی خاص شاعر کے متعلق مختلف تذکروں کے اقتباسات جمع کریں تو ہمیں یقین ہے کہ اس کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آ جائے گی۔''(۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نہایت تفصیل سے ان معترضین کا جواب دیا ہے۔ اس سے ایک رخ سامنے آتا ہے کہ ان جدید نقادوں نے تذکرہ نگاری پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کی ایک بنیادی وجہ ہے کہ ان میں مختصراً تنقید سے کام لیا گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان میں تنقید سے زیادہ تنقیدی اشارے ہیں۔ یہ انداز تنقید ہمارے لیے اتنا قابل قبول نہیں ہے لیکن ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں جبکہ اردو ادب جدید تنقیدی نظریات سے آشنا نہیں تھا، تنقید کی یہ ابتدائی شکل ادب اور تنقید کے ارتقاء میں کس قدر اہمیت کی حامل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب تنقید تو تنقید، اردو نثر بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ پھر اس زمانے کے خلاق ذہنوں کے سامنے کون سے تنقیدی نمونے تھے۔ فارسی تذکرہ نویسی کے علاوہ ان کے پاس کوئی تنقیدی معیار نہیں تھا۔ عربی اور فارسی میں تنقید زیادہ تر زبان، علم بیان اور صنائع بدائع تک محدود تھی۔ زبان اور شاعری دونوں ہی ارتقائی مراحل میں تھے۔ ایسے میں اردو ادب کی پرکھ کا یہی معیار ہی اس کے لیے زیادہ مناسب تھا۔ جس طرح ہم تذکرہ نگاری کے اصول تنقید سے موجودہ

شاعری کو نہیں پرکھ سکتے، اسی طرح ہم جدید تنقیدی نظریات کی روشنی میں قدیم ادب کا جائزہ بھی نہیں لے سکتے۔ یہ کام جب بھی ہوا ہے، ادب کی صحیح صورت سامنے لانے کے بجائے ہم نے یہ رویہ اختیار کر لیا کہ کلاسیکی ادوار میں تو شاعری تھی ہی نہیں۔ یہی صورت تذکرہ نگاری کے ساتھ بھی پیش آئی۔ ہر زمانے کے ادب کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں اور اس ادب کو پرکھنے کے اپنے ضوابط ہوتے ہیں۔ کسی بھی دور کے ادب کا درست تجزیہ صرف اس وقت ممکن ہے جب ہم اس دور اور اس کے ادب کو اس کی صورت حال میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس حوالے سے نور الحسن نقوی اپنی کتاب ''فن تنقید اور اردو تنقید نگاری'' میں لکھتے ہیں۔

> ''شعرائے اردو کے تذکرے ہمارا قدیم اور بیش قیمت ادبی سرمایہ ہیں اور ہماری زبان میں تنقید کی بنیاد انہی کے ذریعے پڑی۔ ان تذکروں میں تنقید کے جو نمونے ملتے ہیں انھیں باقاعدہ تنقید کہنا تو مشکل ہے البتہ انھیں اردو تنقید کا پہلا نقش ضرور کہا جا سکتا ہے۔ تذکرے میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی عام طور پر تذکرہ نگار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ شاعروں کو اپنے تذکرے میں جگہ دے، اس لیے وہ مجبور ہوتا ہے کہ شاعر کا مختصر تعارف کرائے، چند لفظوں میں اس کے کلام پر رائے اور آخر میں نمونے کے طور پر دو چار شعر پیش کر دے۔ چنانچہ تذکرہ نگار سے شاعر کی مفصل سوانح، مکمل سیرت اور بھرپور تنقید کی توقع عبث ہے۔''(۳)

گویا تذکرہ نگاری میں جو تنقیدی اشارے ملتے ہیں، ان سے واقفیت ضروری ہے۔ اگر ان کو سمجھ لیا جائے تو نہ اختصار کا شکوہ رہے گا اور نہ تنقیدی بصیرت کی کمی کا۔ ان اشارات کو سمجھنے کے لیے عربی اور خصوصاً فارسی ادب کی روایت سے کسی نہ کسی حد تک آگاہی ضروری ہے کیونکہ یہ تنقیدی اشارے بھی وہیں سے آئے ہیں۔ فارسی ادب میں علم بیان، علم بدیع، علم عروض اور علم قافیہ کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ قدیم اردو تنقید نے بھی

انہی پیمانوں کو اپنا معیار بنایا۔ اسی لیے تذکرہ نگاری میں تنقید کے زمرے میں فصاحت بلاغت، تشبیہ، استعارہ، صنائع بدائع، سلاست، روانی، خوش لہجگی، شیریں کلامی، جادو بیانی جیسی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ جدید نقاد انھیں محض الفاظ اور فضول عبارت آرائی قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ مبہم اشارات ہیں یا محض لفاظی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج ہم اپنی روایت سے دور نکل آئے ہیں اور کسی حد تک اس سے کٹتے جا رہے ہیں۔ ہم مغربی نظریات اور تنقیدی اصولوں کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارا مشرقی سرمایۂ ادب ہمارے لیے باعث شرم ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ محض ہماری ذہنی کم مائیگی کی دلیل ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں جدید نظریات کو قبول نہیں کرنا چاہیے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم اپنی روایت شعر و تنقید کو بالکل ہی مسترد کر دیں۔ ہمیں اپنے لیے کوئی متوازن صورت حال دریافت کرنی پڑے گی تا کہ جدید نظریات کے ساتھ ساتھ اپنے کلاسیکی سرمائے سے بھی فائدہ اٹھا سکیں اور اس کا مناسب ترین طریقہ یہ ہے کہ ہم ماضی کے ادب کو ماضی کے ماحول اور پیمانوں سے دیکھیں اور جدید ادب کو جدید نظریات کی روشنی میں۔ ہمیں تذکرہ نگاری کے تنقیدی اشارات کو مہمل لفاظی قرار دے کر آگے بڑھنے کے بجائے انھیں تنقیدی اصطلاحات کا درجہ دینا ہوگا جن کے پیچھے معنی کی ایک وسیع کائنات پوشیدہ ہے۔ تذکرہ نگاروں نے ایجاز و اختصار کی غرض سے یہ اصطلاحات وضع کیں تا کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہا جا سکے۔ سیّد عابد علی عابد اصول انتقاد ادبیات میں لکھتے ہیں۔

> ''تذکرہ نگار نے اختصار کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ تذکروں میں جہاں انتقادی اشارے پائے جاتے ہیں یا فیصلے صادر کیے جاتے ہیں وہاں پڑھنے والوں کی بہت بڑی تعداد اس امر سے آگاہ بھی نہیں ہوتی کہ تذکرہ نگار نے انتقاد کا فریضہ ادا کر دیا۔ یہ بظاہر بڑی عجیب و غریب بات معلوم ہوتی ہے لیکن ہے درست۔ قصہ یہ ہے کہ اردو کے قدیم تذکرہ نگاروں نے انتقاد ادبیات کے سلسلے میں یہ

بات فرض کر لی ہے کہ پڑھنے والے فارسی اور عربی کی ان کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں جن میں اصول انتقاد کا ذکر بہ تفصیل کیا گیا ہے۔ تذکرہ نگاروں نے یہ بھی فرض کیا ہے کہ پڑھنے والے ان تمام اصطلاحات سے آگاہ ہیں جو بیان، معانی اور بدیع سے متعلق ہیں اور جن پر عبور حاصل کیے بغیر تذکروں کا مطالعہ عملاً بیکار ہے۔ تذکرہ نگار جب فصاحت و بلاغت کے کلمات استعمال کرتے ہیں تو وہ ان کا اصطلاحی مفہوم مراد لیتے ہیں۔ ہم ان کلمات کو اکثر محض عبارت آرائی تصور کرتے ہیں۔''(۴)

ان بحثوں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اردو شعراء کی تذکرہ نگاری میں نہ صرف یہ کہ تنقیدی عناصر موجود ہیں بلکہ تنقید پر عمرانیات کے حوالے سے کام کرنے کے لیے بھی کافی مواد موجود ہے۔ تذکرہ نگاری کے عمرانی پہلوؤں پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم تذکرہ نگاری کے عمرانی محرکات کا جائزہ لے لیں تا کہ تذکرہ نگاری کی تفہیم میں مزید آسانی پیدا ہو جائے۔ چونکہ تذکرہ نگاری پر سب سے زیادہ تفصیلی کام ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ہے، اس لیے اس سلسلے میں بھی ہم پہلے انہی سے رجوع کرتے ہیں۔
فرمان صاحب نے تذکرہ نگاری کے چھ محرکات بتائے ہیں۔

۱- فارسی تذکرہ نگاری کی روایت کا تسلسل
۲- اپنی یادگار چھوڑ جانے کا فطری جذبہ
۳- بیاض نگاری اور انتخاب اشعار کا شوق
۴- شعرا کی معاصرانہ چشمک
۵- مشاعروں کا رواج
۶- اردو شاعری کی مقبولیت اور ارتقاء

ان محرکات پر اگر غور کیا جائے تو محسوس ہو گا کہ پہلے تین محرکات ذاتی اور روایتی نوعیت کے ہیں جبکہ آخری تین محرکات در اصل عمرانی نوعیت کے محرکات ہیں۔ ضروری

ہے کہ ان کا مختصر جائزہ لے کر ان کے عمرانی پہلوؤں کی وضاحت کر دی جائے۔

شاعروں کی معاصرانہ چشمک کچھ قدیم ادوار سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ میر و سودا، غالب و ذوق اور انیس و دبیر سے چلتی ہوئی ہمارے زمانے تک پہنچی ہے۔ یہ چشمکیں کبھی تو منفی رجحانات کی حامل رہی ہیں لیکن اکثر اوقات اعلیٰ شاعری کی تخلیق کا باعث رہی ہیں۔ پھر یہ چشمکیں دو افراد کی ذاتی لڑائی نہیں ہوتی تھی بلکہ دو دبستانوں اور دو نظریات شعر کی نظریاتی جنگ ہوتی تھی۔ مثلاً سودا سے مراد صرف سودا ہی نہیں ہیں بلکہ اس میں سودا کے شاگرد اور سودا کے اسلوب سے متاثر سب شاعر مراد ہیں اور یہی صورت میر کے ساتھ ہے۔ سودا کا اسلوب پر شکوہ اور میر کے انداز میں سادگی ہے۔ سودا لفظی تصویریں بناتے ہیں اور میر جذبہ کی عکاسی کرتے ہیں۔ سودا قصیدے اور ہجو کے بادشاہ ہیں، میر کے ہاں غزل اوج کمال پر نظر آتی ہے۔ میر نے اپنے تذکرے نکات الشعراء میں اپنے ہم عصر شعراء کی شاعری پر کڑی تنقید کی ہے۔ لیکن اس کا منفی اثر ہونے کی بجائے مثبت اثر ہوا۔ اگر یہ تنقید ذاتی رنجش کی بنیاد پر ہوتی تو اس کے نتیجے میں ان کے ہم عصر تذکرہ نگار ان کی شاعری میں مین میخ نکالتے لیکن میر کی شاعرانہ عظمت کے پیش نظر ان کی شاعری پر جس کسی نے بھی لکھا، ان کے کلام کا معترف نظر آیا۔ اگرچہ فتح علی حسینی نے سودا سے موازنہ کرتے ہوئے سودا کی شاعری کو دریا اور میر کی شاعری کو نہر سے تشبیہ دی لیکن وہ بھی میر کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں کر سکے۔ میر کی تنقیدی رایوں کے تجزیے مختلف نقادوں نے کیے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ ''شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن'' میں لکھتے ہیں۔

> ''نکات الشعراء میں میر صاحب نے جو پوسٹ مارٹم کیے ہیں ان کے مضر پہلوؤں سے قطع نظر ان کا ایک مفید پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ نکات الشعراء کی ''قاتلانہ'' تنقیدوں نے ارزاں اور کم مایہ ادب کو بڑھنے سے روک دیا۔ اس کے زیر اثر بڑے بڑے شعراء کو اپنی شاعری پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی اور میر جیسے نقادوں کے

جائزہ سے پہلے انھوں نے خود اپنے دیوانوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اس میں شک نہیں کہ نکات میں ادبی گروہ بندی اور عصبیت کے آثار بھی ملتے ہیں۔ لیکن نکات نے تنقیدی ذوق کی تربیت میں جو نمایاں حصہ لیا اس سے ادب اور شاعری کو معتد بہ فائدہ پہنچا۔"(۵)

ڈاکٹر شارب ردولوی جدید اردو تنقید، اصول و نظریات میں لکھتے ہیں:

"میر کے سخت اور بے رحمانہ اعتراضات سے غیر معیاری شاعری کو دھکا لگا اور شعراء نے خود بھی اپنے کلام کے نقائص اور معائب پر غور کرنا شروع کیا۔ یعنی ایک صورت میں میر نے اپنی بے لاگ تنقید سے لوگوں میں تنقیدی شعور کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کیا اور انھیں عمل کے راستے پر لگایا۔"(۶)

نور الحسن نقوی لکھتے ہیں:

"میر کی اس کڑی تنقید کا ایک روشن پہلو بھی ہے۔ جس طرح مالی چمن سے خس و خاشاک کو دور کر دیتا ہے، اسی طرح تنقید نگار کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ گھٹیا ادب کی پیداوار کو روکے۔ میر نے اپنی سخت تنقید سے یہ خدمت انجام دی۔ فرومایہ شاعروں نے ان کی تنقید کے خوف سے شاعری سے کنارہ کر لیا اور با صلاحیت شاعر بھی محتاط ہو کر شعر کہنے لگے۔ اردو تنقید کی تاریخ میں نکات الشعراء کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس نے بعد کے تذکرہ نگاروں کی تربیت کی اور تنقید کا ذوق پیدا کیا۔"(۷)

میر کی بے لاگ تنقید کے مثبت عناصر کے حوالے سے ہم نے تین مختلف الذہن نقادوں کی آرا نقل کر دی ہیں۔ یہی نتائج چند دیگر نقادوں نے بھی اخذ کیے ہیں لیکن ہمارا مقصد محض اقتباسات کی بھر مار نہیں ہے بلکہ مسئلہ کی تفہیم ہے، اس لیے یہی آراء کافی

ہیں۔ میر کی تنقیدی بصیرت کے پیچھے بعض سماجی محرکات بھی کارفرما ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ ادب کی ترقی اور فروغ کی صورت میں ظاہر ہوا جس کا ثبوت میر کے دور اور بعد کے ادوار کے شعری ارتقاء کی شکل میں موجود ہے۔ میر کی تنقید کے گہرے اور دور رس اثرات بھی جدید نقادوں کے اعتراضات کا شافی جواب ہیں کیونکہ ایک نکات الشعراء کے وہ اثرات اپنے عہد اور بعد کی شاعری پر مرتب ہوئے جو ہمارے زمانے میں پوری پوری تحریکیں مرتب کرتی ہیں۔ اس تنقید میں اختصار ضرور ہے لیکن قدیم ادوار میں اس اختصار و ایجاز کے اعجاز سے سبھی اہل ادب واقف تھے اور اس واقفیت کا اظہار ان کی شاعری سے کماحقہٗ، ہو جاتا ہے۔

تذکرہ نگاری کا دوسرا اہم محرک مشاعرے کا معاشرتی ادارہ بھی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مشاعرہ اور تذکرہ نگاری دونوں کے سماجی محرکات میں اس دور کی سیاسی فضا کو بے حد اہمیت دیتے ہیں۔ تذکرہ نگاری کی ایک وجہ مشاعرہ ہے اور مشاعرہ کی ایک وجہ مسلمانوں کا سیاسی زوال اور سماجی ضرورت تھی۔ مسلمان مارشل ریس کے طور پر جانے پہچانے جاتے تھے۔ مسلمانوں کی تاریخ دراصل رزم گاہوں کی تاریخ ہے لیکن مغل عہد کے آخر زمانے میں انھوں نے میدان جنگ سے رخ پھیر کر بزم گاہیں آباد کرلیں۔ معاشرتی محفلوں کے دیگر مشاغل کی طرح مشاعرہ بھی معاشرتی زندگی کا اہم جزو تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب خاص طور پر دہلی اور لکھنو کے اشراف سے عوام تک تمام ہی طبقے شاعرانہ سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ موجودہ زمانے میں تو ہم ادبی روداوں کی اشاعت کے ذریعے اس کی عکاسی کر لیتے ہیں لیکن ان ادوار میں پرنٹ میڈیا اپنی ابتدائی شکل میں تھا اس لیے اخبار وغیرہ کی سہولت نہیں تھی۔ نتیجتاً مشاعروں کی اس فضا کی عکاسی کے لیے بھی تذکرہ نگاری کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ دیکھا جائے تو ابتدائی تذکروں کا انداز تقریباً مشاعروں جیسا ہے۔ اگر ابتدائی مختصر تعارف کو نکال دیا جائے تو انتخاب شعر ہی رہ جاتا ہے اور مشاعرے بھی ایک طرح سے انتخاب شعر ہی کی محفل سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے تذکرہ نگاری کی طرف شعراء اور صاحبان ذوق کا ذہنی رجحان غالب ہوا۔

تذکرہ نگاری کے آغاز و ارتقاء میں اردو شاعری کے ارتقا کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ابتدا میں اردو شعر کہنے والوں کی تعداد بہت محدود تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہونے لگا۔ شروع میں خان آرزو کے یہاں ریختہ کے مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ بعد میں خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے ہاں بھی مشاعرے ہونے لگے لیکن ان مشاعروں میں عام شاعروں کو پڑھنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ جبکہ اردو شاعری کی طرف رجحان بہت تیزی سے بڑھنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گلی گلی اور گھر گھر مشاعرے کی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ اردو شاعری کی اس مقبولیت کا اندازہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ تذکروں میں شاعروں کی تعداد سے کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''ملکی زبان کی کشش اور قبول عام اور اس میں شعر لکھنے کی آسانیوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ شعرائے ریختہ کی تعداد بڑھتی گئی اور تذکرہ نویسوں کو ان کے متعلق مستقل تذکرے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی ...... جیسا کہ قدرتی طور پر ہونا چاہیے، ابتدا میں شعرائے ریختہ کی تعداد بہت کم تھی لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، شاعروں کی تعداد بڑھتی گئی۔ میر کے تذکرہ نکات الشعراء میں تقریباً سو شاعروں کا حال بیان ہوا ہے۔ گردیزی کے تذکرے میں بھی تعداد اتنی ہی ہے، قائم کے تذکرے مخزن نکات میں ۱۱۰ ہے۔ تذکرہ شورش (غلام حسین) جو (۱۷۸۰) میں مرتب ہوتا ہے، شعراء کی تعداد ۳۱۴ تک پہنچتی ہے۔ عمدۂ منتخبہ (۱۸۱۰) کم و بیش بارہ سو شعراء کے حال پر مشتمل ہے۔ اسی زمانے میں عیار الشعرا خوب چند ذکا جو ۱۲۰۸ھ اور ۱۲۴۷ھ کے درمیان لکھا جاتا ہے۔ ۱۵۰۰ شعرا کے حالات قلمبند کرتا ہے۔''(۸)

اس زمانے میں چونکہ ہر شاعر کے دواوین کا شائع ہونا ممکن نہیں تھا، اس لیے چند سرکردہ لوگوں نے ان کے کلام اور مختصر حالات کو محفوظ کرنے کے لیے تذکرہ نگاری کا آغاز

کیا تاکہ آنے والے ادوار میں قدیم شاعری کا درست اندازہ لگایا جاسکے۔ مندرجہ بالا اقتباس سے وقت کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی مقبولیت اور شاعروں کی تعداد میں اضافے کا اندازہ ہوتا ہے۔ گارساں دتاسی نے ۳۰۰۰ ہزار شاعروں کا ذکر کیا ہے، جس میں سے ۸۰۰ کو اس نے اپنی تاریخ ہندوستانی ادب میں منتخب کیا۔ ہزاروں شاعروں کے کلام اور حالات کا محفوظ رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ ضروری تھا کہ کم از کم اس شاعری کا بہترین حصہ محفوظ کرلیا جائے۔ اس مقصد کے لیے تذکرہ نگاری جیسی صنف کی ضرورت تھی۔ اس لیے ابتداء ہی سے تذکرہ نگاری کا آغاز ہوگیا تھا۔

مندرجہ بالا تمام مباحث کو مدنظر رکھتے ہوئے تذکرہ نگاری کے حوالے سے جو صورت حال ہمارے سامنے آتی ہے، وہ کچھ یوں ہے۔

۱- تذکرہ نگاری کے پس منظر میں برصغیر کے سیاسی اور سماجی حالات کارفرما تھے۔

۲- تذکرہ نگار ایجاز و اختصار سے تنقیدی، اشارات مرتب کرتا ہے۔

۳- تذکرہ نگاری میں موجود تنقید کو ہم تاثراتی یا جمالیاتی تنقید کے ضمن میں رکھ سکتے ہیں۔

۴- تذکرہ نگار شاعروں کے مختصر سوانحی خاکے بناتا ہے لیکن مختلف تذکروں سے قدرے ایک مکمل تصویر سامنے آسکتی ہے۔

۵- تذکروں میں شاعر کے سنین پیدائش و وفات کا اہتمام کیا جاتا تھا جس سے شاعر کے دور کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ ادبی تاریخی اشارات کے ساتھ بعض تذکروں میں معاشرتی اور سیاسی تاریخ کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔

۶- شاعر کی استادوں اور درباروں سے وابستگیوں کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔

۷- شاعر کے خاندانی پس منظر کے بارے میں بھی اشارات مل جاتے ہیں۔

تذکروں میں جو تنقید ملتی ہے، اگرچہ ہم اسے تاثراتی اور جمالیاتی تنقید کے زمرے میں رکھیں گے لیکن اس تاثراتی و جمالیاتی تنقید کے محرکات خالصتاً عمرانی و سماجی ہیں۔ ہم

اسے محض فارسی و عربی تنقیدی روایت کے اثرات کہہ کر فارغ نہیں ہو سکتے۔ ان عمرانی محرکات کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اس دور کی سیاسی اور معاشرتی صورت حال سے آگاہی حاصل کی جائے جو پس منظر میں موجود تھی۔

تذکرہ نگاری ۱۷۵۲ء نکات الشعراء کے منظر عام پر آنے سے شروع ہوئی اور اس کا خاتمہ آب حیات ۱۸۸۰ء پر ہوا۔ آب حیات میں تذکرہ نگاری، تاریخ نگاری اور تنقید نگاری تینوں کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ اس کے بعد اردو میں تذکرہ نگاری کا دور ختم ہو جاتا ہے اور تاریخ و تنقید کی باقاعدہ کتابیں تصنیف ہونے لگتی ہیں۔ یہاں ہم مختصراً تقریباً سوا سو سال کے سیاسی اور معاشرتی حالات درج کرتے ہیں۔ تاکہ ہم اس پس منظر سے آگاہ ہوسکیں جو تذکرہ نگاری اور اس میں موجود جمالیاتی تنقید کا باعث ہوئے۔

اورنگ زیب کے انتقال کے ساتھ ہی ہندوستان پر مغلوں اور ان کے ساتھ ہی مسلمانوں کا دور زوال شروع ہو گیا۔ فرخ سیر ۱۷۱۹ء تک حکمران رہا۔ اسے سیّد برادران کی مدد سے حکومت ملی تھی جو اسے کٹھ پتلی بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ اس نے ان کا اقتدار کم کرنا چاہا تو حسین علی نے مرہٹوں سے مل کر اسے معزول کر دیا۔ فروری ۱۷۱۹ء سے اگست ۱۷۱۹ء تک تین بادشاہ بدلے گئے۔ ۱۷۲۰ء میں محمد شاہ تخت نشین ہوا اور ۱۷۴۷ء تک حکومت کی۔ اس کے زمانے میں نظام الملک آصف جاہ نے نظام سلطنت کو مضبوط بنانے کی کوشش کی لیکن محمد شاہ رنگیلے نے یہ اصلاحات گوارا نہیں کیں۔ نظام الملک دکن چلا گیا اور حکومت آصفیہ کی بنیاد رکھی۔ ادھر دہلی میں مرہٹوں، روہیلوں اور جاٹوں کی بغاوتوں کی وجہ سے حکومت کمزور ہو گئی۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے حملہ کیا اور جی بھر کے دہلی کو لوٹا اور قتل کا بازار گرم کیا۔ اس حملے کی وجہ سے مرکز اور کمزور ہو گیا۔ بنگال، دکن اور اودھ کے صوبے خود مختار ہو گئے۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ مرکز سازشوں کا گڑھ بن گیا۔ ۱۷۵۴ء میں احمد شاہ کو اندھا کروا کے عالم گیر ثانی کو تخت پر بٹھایا گیا لیکن پانچ سال بعد اسے بھی مروا دیا گیا۔ شاہ عالم کے دور میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کو شکست دی۔ ۱۷۵۷ء میں بنگال انگریزوں کے قبضے میں

چلا گیا تھا۔ پھر مشرقی صوبے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مل گئے۔ شمالی ہندوستان پر مرہٹے چھا گئے۔ اگرچہ احمد شاہ ابدالی نے ان کی قوت ختم کر دی تھی اور وہ انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے لیکن کمزور مغل بادشاہوں کے لیے کافی تھے، غلام قادر روہیلے نے بغاوت کی اور بادشاہ کو اندھا کر دیا۔ مرہٹوں نے روہیلوں کو شکست دے کر شاہ عالم کو پھر تخت پر بٹھا دیا۔ ۱۸۰۵ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا لیکن شاہ عالم کو ہی بادشاہ رہنے دیا۔ ۱۸۰۹ء سے ۱۸۳۷ء تک اکبر شاہ ثانی اور ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بہادر شاہ دہلی کے تخت پر براجمان رہے۔ لیکن ان کی حکومت لال قلعے کی حدود تک ہی تھی۔ پنجاب، پشاور اور کشمیر پر سکھوں کا قبضہ ۱۸۴۹ء تک رہا۔ ان حالات میں صرف دکن اور اودھ پر مسلمانوں کا اقتدار باقی رہ گیا،خزانہ خالی تھا۔ مال گزاری کی وصولی کا کوئی نظام نہیں تھا۔ حکومتی اہل کاروں کو تنخواہیں دینا ممکن نہ رہا۔ راجپوتوں، سکھوں، مرہٹوں، جاٹوں کے ساتھ حکومت کی جہد و پیکار کی وجہ سے مقامی قوتیں کمزور ہو گئیں۔ فوج میں وفاداری، جانثاری اور بہادری کے اوصاف باقی نہ رہے۔ اشراف سے لے کر عوام تک سبھی اخلاقی گراوٹ، مفاد پرستی اور خود غرضی کا شکار تھے۔

اس سیاسی زوال کے ہندوستان کے معاشرے پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ مضبوط حکومتوں کی موجودگی میں یہاں مختلف فرقوں اور مذاہب کے لوگ ایک اخوت، یگانگت اور بھائی چارے کی فضا میں رہ رہے تھے۔ حکومتیں کمزور ہوئیں تو فرقہ واریت اور مذہبی عصبیت کا جن بوتل سے باہر آ گیا اور نوبت جدال و قتال تک جا پہنچی۔ اس پورے دور پر، مذہب اور تصوف چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سماجی زندگی تلخ ہوئی تو فرار آمادہ اذہان نے ان کے پیچھے پناہ تلاش کر لی۔ تصوف کی جتنی تحریکیں اس دور میں نظر آتی ہیں، چاہے وہ بھگتی تحریک ہو، قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ صوفیوں کے سلسلے ہوں، سب نے صرف باطنی اصلاح پر زور دیا۔ مذہبی تحریکیں بھی عبادات و روحانیات تک محدود تھیں۔ کسی تحریک نے خارجی اصلاح اور معاشرتی انقلاب لانے کی کوشش نہیں کی جس کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ برصغیر کی مضبوط فکری، معاشی اور سیاسی بنیادیں کمزور

ہو گئیں۔ دیہی معیشت جس پر ملک کی خوشحالی کا انحصار تھا، ختم ہو کر رہ گئی۔ یہ مذہبی اور صوفیانہ تحریکیں اگر وقت کے تقاضوں پر نظر رکھتیں تو ممکن تھا کہ کوئی بڑی سیاسی تنظیم سامنے آ جاتی لیکن خواص و عوام سمیت سبھی طبقے اس ضرورت سے غافل رہے۔ مذہب سطحیت، تصوف رہبانیت اور معاشرہ انفرادیت کا شکار تھا۔ زندگی کی سختیوں سے آنکھیں پھیرنے اور فرار حاصل کرنے کے لیے معاشرہ رسوم پرستی اور عیش پرستی کی طرف مائل تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''درباروں میں عیش و عشرت کا بازار گرم تھا۔ دربار سے متعلق امرا اس کی پیروی میں اپنی استطاعت کے مطابق دادِ عیش دیتے تھے۔ ان کی نقل میں عوام بھی پیچھے نہیں تھے، جس کی وجہ سے سماج میں غیر اخلاقی اثرات راہ پا رہے تھے۔ کسی شخص کی ریاست اور امارت کا اندازہ اس کی محفل میں موجود طوائفوں کی تعداد سے کیا جاتا تھا۔ ذہن اور اخلاق کی پستی کے ساتھ جسم بھی کمزور ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے تلوار و قلم کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی تھی۔ اس عیش پرستی نے حکومت کی بنیاد بالکل کھوکھلی کر دی تھی۔'' (۹)

اگرچہ اس تمام صورت حال کی عکاسی کسی نہ کسی حد تک اس دور کے ادب مثلاً میر کی شاعری، آپ بیتی، سودا کے شہر آشوبوں اور ہجویات میں ہوئی ہے لیکن مجموعی طور پر اس پر تصوف کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ معاشرے پر چونکہ عیش پرستی اور جمال پرستی کا غلبہ تھا، نتیجتاً تذکروں میں موجود تنقیدی اشارات بھی جمالیاتی نوعیت کے ہیں۔ ہر دور کے ادبی رجحانات پر دیگر عناصر کے ساتھ اس دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے بڑے گہرے اثرات ہوتے ہیں اس لیے صاف نظر آتا ہے تذکرہ نگاری کی تنقیدوں میں جمالیاتی عناصر کے پیچھے اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات بھی کارفرما تھے۔

عمرانی تنقید ادیبوں اور شاعروں کے حالات زندگی میں گہری دلچسپی لیتی ہے کیونکہ تخلیق کار کے شخصی حالات کا عکس اس کی تخلیقات میں بھی نظر آتا ہے۔ کوئی تخلیق کار سماجی

حوالے سے کس قسم کی زندگی گزارتا ہے، اس کا کس طبقہء زندگی سے تعلق ہے، اس کا ذریعہ معاش کیا ہے، اس کے لوگوں سے تعلقات کس نوعیت کے ہیں، اس کے عقائد کیا ہیں، اس کا نظریۂ حیات کیا ہے۔ یہ اور اس نوعیت کے دیگر سوالات کے جوابات کسی ادیب کی تخلیقات کے کئی گوشوں کی تفہیم میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی ادیب درویش منش اور گوشہ گیر انسان ہے تو اس کی تخلیقات میں خارج کی تصویریں نہیں ہوں گی اور اگر ہوں گی بھی تو بہت کم یا ان میں حقیقت کی عکاسی کم ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی ادیب کے کام کا تنقیدی مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس کے حالات زندگی کا بھی بطور خاص جائزہ لیا جاتا ہے۔

اردو شاعری کے تذکروں خصوصاً ابتدائی تذکروں میں سوانحی خاکے بہت مختصر ہیں۔ ان سوانحی خاکوں میں ہمیں ان کی زندگی کے بارے میں چند اشارات ملتے ہیں لیکن اس کے باوجود آج بھی قدیم ادیبوں پر کیے جانے والے سوانحی کام کے لیے بنیادی مآخذ یہی تذکرے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک اردو شعراء کے حالات زندگی جس قدر ہم تک پہنچے ہیں، ان میں تذکرہ نگاروں کی کاوشوں کا بڑا حصہ ہے۔ ولی، حاتم، سودا، آرزو، مظہر، میر، یقین، قائم، مصحفی، انشا، آتش، ناسخ، جرات، ممنوں، میر حسن، تاباں، غالب، ذوق، مومن، نسیم، انیس، دبیر اور ظفر کے علاوہ کتنے ہی ایسے شاعر ہیں جو تاریخ ادب اردو میں تو مقام نہیں پا سکے لیکن تذکروں میں ان کا ذکر مل جاتا ہے۔ ان میں ایسے شاعر بھی ہیں جن کا کلام اگر تذکروں میں محفوظ نہ ہوتا تو آج ہماری رسائی سے باہر ہوتا۔ اسی طرح ان کی سوانح کے بارے میں جو چند اشارات ان تذکروں میں محفوظ ہیں، ہم ان کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جانتے۔ اس لیے قدیم اردو شاعروں کی سوانح کے حوالے سے ہمیں ان تذکرہ نگاروں کا شکر گزار ہونا ہی پڑتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان شاعروں کی سیرت کے حوالے سے بعض مقامات پر اعتدال کی کمی نظر آتی ہے۔ کہیں ذاتی تعلق کی بنا پر تعریف ہے تو کہیں معاصرانہ چشمک کے حوالے سے تنقیص، لیکن یہ الزام سارے تذکرہ نگاروں پر نہیں لگایا جا سکتا۔ ان تذکرہ

نگاروں میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر، شعرا کے حالات زندگی کے بارے میں اہم اشارے دیے ہیں۔ میر تقی میر تو اپنی اس بے باکی کی وجہ سے کافی مطعون رہے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں:

''اس تمام گروہ میں میر تقی میر ہی ایک ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے بعض شعراء کے متعلق تلخ لب و لہجہ اختیار کیا ہے اور اپنے زمانے کے چند شاعروں کے کلام اور سیرت پر سخت حملے کیے ہیں۔ چنانچہ میر صاحب اس وجہ سے معاصرین کی طرف سے نشانۂ ملامت بھی بنے اور ان کے خلاف وہ طوفان اٹھا جس کا مدو جزر آپ گزشتہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں۔ میر صاحب نے جو طریقہ اختیار کیا وہ زمانے کی سپرٹ کے خلاف تھا ورنہ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بقول مولانا عبدالحق ''میر صاحب، نے حق گوئی سے کام لیا مگر لوگ اس حق گوئی کے عادی نہ تھے ......کاش میر صاحب کا لہجہ ذرا نرم اور ہمدردانہ ہوتا۔''(۱۰)

میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں شعراء کے جو سوانحی اشارے مرتب کیے ہیں ان سے اختلاف کم ہی کیا گیا ہے۔ زیادہ اختلاف ان کے لب و لہجہ سے پیدا ہوا کہ کہیں اس میں طنز کی کاٹ ہے، کہیں مضحکہ اڑانے کی کوشش کی ہے اور کہیں ان کے لہجہ میں تلخی در آئی ہے۔ یہ انداز چونکہ میر کے دور میں عموماً اختیار نہیں کیا جاتا تھا اس لیے اس پر اس قدر لے دے ہوئی۔ اس دور کے لوگوں کے مزاج میں ایک خاص طرح کی وضع داری پائی جاتی تھی اور یہ انداز اس وضع داری کی نفی کرتا تھا۔

میر تقی میر کے برعکس بیشتر تذکرہ نگاروں کے انداز میں ''ہر کسے را بہ نیکی یاد کردن'' والی کیفیت نظر آتی ہے۔ یہ تذکرہ نگار اپنے ممدوحین میں نیکی، شرافت، پابندیٔ وضع، خوش اخلاقی اور دیگر اوصاف حسنہ کو بہ طور خاص نمایاں کرتے ہیں۔ ان تذکروں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس عہد کے شرفا کی خصوصیات میں اخلاق، زندہ دلی، محبت، وفا،

ذوق علم و فن، سپہ گری، خودداری اور وضع داری شامل تھیں۔ تذکرہ نگار شخصی خاکے مرتب کرتے ہوئے بطور خاص ان خصوصیات کے وجود و عدم پر نگاہ رکھتے تھے۔ یہ تذکرہ نگار غلط طور پر مندرجہ بالا اوصاف کو ان شاعروں سے منسوب نہیں کرتے تھے بلکہ اس معاملہ میں انتہائی راست بازی سے کام لیتے تھے۔ جن لوگوں میں یہ اوصاف یا ان میں جو اوصاف پائے جاتے تھے، ان کے حوالے سے تحریر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں مختلف شاعروں میں مختلف کرداری خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اگر کوئی اعلیٰ پائے کا شاعر ہے اور اس میں انسانی کمزوریاں موجود ہیں تو اس کی شاعری کی تعریف کرتے لیکن ان کی خامیوں پر بھی گرفت کرتے۔ اسی طرح اگر کوئی شاعر شاعری میں تو کمتر ہوتا اور کردار و سیرت کی خوبیوں کا حامل ہوتا تو اس کی شاعری کی تنقیص اور کردار کی تعریف کی جاتی تھی۔ مثلاً میر تقی میر نے ''نکات الشعراء'' میں یقین کی شاعری کو بے مصرف قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی شرافت اور بزرگی کا اقرار کیا ہے۔ اسی طرح میر علی تقی کے کلام کو ''اوباشانہ'' قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی بزرگی اور بزرگ زادگی کا اعتراف کیا ہے۔ تذکرہ نگار دوستوں کا تو کیا ذکر، مخالفوں کے بارے میں لکھتے ہوئے بھی احتیاط اور انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ گروہی تعصّبات، رقابتیں، رنجشیں اور معاصرانہ چشمکیں اپنی جگہ، اس سے ان کی منصفانہ رائے متاثر نہیں ہوتی تھی۔ میر و سودا کے معرکے ہم سب جانتے ہیں لیکن میر صاحب نے جب سودا کا ذکر کیا تو نہ صرف ان کے کلام کی بے حد تعریف کی بلکہ ان کے اوصاف حمیدہ کو بھی خوب نمایاں کیا۔ اسی طرح مصحفی اور انشا کی چشمک کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن مصحفی تذکرہ ہندی اور ریاض الفصحاء میں انشاء کی خوبیوں کو بالکل نہیں چھپاتے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''ان (تذکروں) میں جو کچھ لکھا گیا ہے اکثر بے رو رعایت لکھا گیا ہے۔ علاقائی لگاؤ، رشتہ شاگردی و استادی، گروہ بندی اور معاصرانہ نوک جھونک کے باوجود ان کی رایوں میں توازن پایا جاتا ہے۔ وہ بے سبب ہر جگہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے یا دوستوں کو

اوپر اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ دوستی یا دشمنی کے باوجود وہ عموماً خدا لگتی کہتے ہیں۔ سودا و میر کی چوٹیں، مصحفی و انشا کے معرکے کس سے چھپے ہوئے ہیں لیکن میر و مصحفی نے اپنے تذکروں میں انشا و سودا کے متعلق کوئی بات نہیں کہی جو ان کے مرتبۂ شاعرانہ کے منافی ہو۔''(۱۱)

ہمارے دور کے برعکس تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں جہاں اپنا ذکر کیا ہے وہاں بے حد انکسار سے کام لیا ہے۔ اپنے لیے احقر، کمترین، خاکسار، فقیر، حقیر، عاجز اور بے نوا جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے تذکرہ نگار غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر پر سختی سے کار بند تھے جس کے بغیر سوانح و تاریخ نگاری کو مقام اعتبار حاصل نہیں ہوتا۔ ''نکات الشعراء'' میں میر صاحب نے اپنے بارے میں صرف یہی ایک جملہ لکھا ہے۔ اس جملہ کا انکسار اور اختصار اس بات کا ثبوت ہے کہ میر صاحب نہ غیر متوازن مزاج انسان تھے اور نہ ہی متکبر و مغرور۔

''فقیر حقیر میر تقی میر مولف این نسخہ متوطن اکبر آباد است، بہ سبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہاں آباد است''(۱۲)

تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں اپنے عہد کے شاعروں کے جو سوانحی نقوش بنائے ہیں وہ بنیادی اور حقیقی معلومات پر مبنی ہیں۔ گزشتہ شاعروں کا ذکر بھی جہاں کیا ہے، وہاں بے حد تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ انھوں نے صرف انہی شعراء کی تفصیل دی ہے جن سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے یا ان سے واقفیت کے ذرائع معتبر تھے۔ جن سے واقف نہیں تھے ان کے بارے میں نہایت بے باکی اور دیانت داری سے لکھ دیا کہ ان کے حال سے واقف نہیں۔ صرف نام اور تخلص کے ساتھ اگر میسر ہوں تو چند اشعار درج کر دیے ہیں وگرنہ وہ بھی نہیں ہیں۔ یہ کام بھی ان مشکلات کے درمیان کیا ہے کہ سیر و سفر اور ابلاغ کے ذرائع بے حد محدود تھے۔ ذاتی اور قریبی دوستوں کی کاوشوں کے علاوہ معلومات کے ذرائع نہیں، دیکھا جائے تو ان تذکروں کی اصل وقعت بھی یہی ہے کہ ان

میں فرسٹ ہینڈ معلومات ملتی ہیں جن کے بارے میں کسی قسم کے شکوک یا ابہام نہیں۔ پھر یہ کہ اپنے تمام تر اختصار کے باوجود شاعری کی تفہیم میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جو مثال پیش کی ہے، اس سے آگاہی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اپنی بات کی دلیل میں ہم اسے یہاں نقل کر دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

> ''حقیقت یہ ہے کہ اردو تحقیق کی اکثر گتھیاں انھیں تذکروں نے سلجھائی ہیں۔ مثال کے طور پر میر تقی میر کی شاعری داخلی طور پر صاف پتہ دے رہی تھی کہ وہ کسی پری تمثال کے تیر عشق کے گھائل تھے لیکن خارجی شہادت کے بغیر کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس صوفی منش شاعر پر عشق بازی کی تہمت لگاتا۔ نتیجتاً دوسرے غزل گو شعرا کی طرح ان کے رنگ مجازی کو بھی حقیقت کا ایک رخ خیال کیا جاتا تھا لیکن جب ایک تذکرہ نگار نے میر کے متعلق یہ انکشاف کیا کہ :
>
> ''میر با پری تمثالے کہ از عزیز انش بود در پردہ تعشق طبع میل خاطر داشت''
>
> تو میر کی شاعری کا مفہوم ہی بدل گیا۔ اس کی شاعری زندگی سے فرار کا نتیجہ خیال کی جاتی تھی لیکن تذکروں کے مطالعے کے بعد اس کا ہر شعر زندگی کے مسائل میں گتھا ہوا نظر آنے لگا۔''(۱۳)

اسی طرح دوسرے شعراء کی نجی زندگی کے بارے میں بھی تذکرہ نگاروں نے ایسے ایسے انکشافات کیے ہیں جن کا واحد ذریعہ تذکرے ہی ہو سکتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے اس ضمن میں کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا لیکن بیان کا ایسا انداز بھی عموماً اختیار نہیں کیا جو دل آزاری یا شخصیت کو مسخ کرنے والا ہو۔ عشق پیشگی تو اس دور میں ایک مثبت خوبی سمجھی جاتی تھی۔ شعراء کی زندگی کے ایسے گوشے ان کی شاعری کی تفہیم میں ایک ذریعہ ثابت ہوئے۔ چند مزید مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱- سراج تخلص، سراج الدین علی سراج کا ہے۔ صاحب عقل اور علم تھا۔ نقل کرتے ہیں کہ ایک روز راہ میں یہ سراج چلا جاتا تھا۔ ایک عورت اہل ہنود کی دیکھی۔ پروانہ وار اس کا عاشق ہو گیا۔ چونکہ مخالفت مذہب کی درمیان ہے اس لیے مدت تک شعلہ اس کے عشق کا اس کے تن میں بے سوجلا کیا۔ آخر تاثیر عشق نے اس عورت کے باپ کے گرو کے دل میں اثر کیا۔ اس نے اس عورت کے والد کو فہمائش کی اور کہا کہ دونو آتش فراق کے جلے ہوئے ہیں۔ وہ بسبب اعتقاد کامل کے پیر کے کہنے سے اعراض نہ کر سکا۔ اسی وقت شمع کو سپرد پروانہ کے کیا یعنی اپنی لڑکی کو سراج دیوانہ کے سپرد کیا۔ چونکہ کام پروانہ کا وصل جاناں، غیر جاں سپاری کے اور کچھ نہیں اس لیے سراج پروانہ کے مانند گرد چراغ محفل، حسن اس کے گھوم کے جاں بحق ہوا۔ وہ عورت بھی شمع کے مانند اس پروانہ جلے ہوئے کی خاک پہ رو کر مر گئی۔ یہ قصہ عجائبات ہے۔"(۱۴)

(طبقات شعرائے ہند، کریم الدین)

۲- "میر حسن کو بہ سبب تقاضائے جوانی محل کی ایک عورت سے محبت و موانست ہوئی۔ چونکہ طبیعت موزوں تھی بہ پاس خاطر معشوقہ مثنوی بے نظیر تصنیف کی۔"(۱۵)

(خوش معرکۂ زیبا، سعادت خان ناصر)

۳- صاحب تخلص نامش امتہ الفاطمہ بیگم مشہور بہ صاحب جی کہ ماہ آسماں نکوئی است۔ آفتاب صفت از مشرق بجانب مغرب آمدہ بتقریب مداوا بامومن خان کارش افتاد، ماہی چند کارہا درد و دوا بود۔ سالہا بود کہ باز بہ لکھنو رفت۔ مثنوی قول غمیں، کہ از مصنفات خان معزے الیہ است شرح نسخہ حسن و جمال ہماں موزوں قد است، القصہ بہ فیض صحبت شاں دلش بہ شعرو شاعری میل کرد۔"(۱۶)

(گلشن بے خار، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ)

۴- نزاکت تخلص ایک رنڈی پری زاد رجو نام کا ہے۔ اصل اس کی بلدہ نارنو ہے۔

وہ بچہ پن سے جلوہ فرمائے شاہجہاں آباد اور رونق بخش اس بلدہ فرخندہ بنیاد کی ہے۔ اپنے وقت میں یہ لونڈی بہت خوبصورت اور حسین اور نمکین تھی۔ شاہجہاں آباد میں اس کے حسن کا چرچا تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی آشنا تھی۔" (۱۰) (طبقات شعرائے ہند۔ کریم الدین)

اوپر ہم نے جو مثالیں درج کی ہیں، ان میں سے میر تقی میر، میر حسن اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے خود بھی تذکرے تالیف کیے ہیں لیکن انھوں نے اپنے تذکروں میں اپنے معاملات عشق کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں کیا۔ ان کی زندگی کے اس گوشے تک ہماری رسائی دیگر تذکروں کے ذریعے ممکن ہوئی۔ جیسا کہ میر کے ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے کہ اس حقیقت کے معلوم ہونے کے بعد ان کی شاعری کا ایک نیا مفہوم سامنے آیا ہے۔ اسی طرح دیگر شاعروں کے بارے میں یہ معلومات بھی ان کے معاملات شعری کی تفہیم میں مددگار ثابت ہوئیں اور صرف یہ نہیں کہ اسی طرح کے معاملات ہی شاعری کی تفہیم کرتے ہیں بلکہ شاعروں کی زندگی اور سیرت کے سبھی گوشے ان کی شاعری کے کسی نہ کسی حصے پر روشنی ضرور ڈالتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ہم مثال کے طور پر مختلف تذکروں سے مختلف اہم شاعروں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں سے ان کی سوانحی حصے درج کر دیتے ہیں تاکہ یہ جاننے میں آسانی ہو کہ ان اہم شاعروں کی زندگی کے کن کن گوشوں کو ان تذکروں نے ہم تک پہنچایا ہے اور مختلف تذکرہ نگاروں کی سوانح نگاری میں کیا فرق ہے۔

۱- "ولی شاہ ولی اللہ ولی تخلص، شاعریست مشہور مولدش گجرات است گویند بہ نسبت فرزندی شاہ وجیہ الدین گجراتی کہ از اولیائے مشاہیر است افتخار ہا داشت۔ درسن چہل و چہار از جلوس عالم گیر بادشاہ ہمراہ میر ابو المعالی نام سیّد پسرے کہ دلش فریفتہ اوبود بہ جہان آباد آمدگاہ گاہ بزبان فارسی دوسہ بیت در وصف خط و خالش می گفت، چوں در آنجا بسعادت ملازمت حضرت شیخ سعد اللہ گلشن قدس سرہ، مستعد گردید بگفتن شعر بزبان ریختہ امر فرمودند و ایں مطلع تعلیما

موزوں کردہ حوالہء اونمودند: (مخزن نکات۔ محمد قیام الدین قائم)

خوبی اعجاز حسن یار گر انشا کروں

بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں (۱۸)

۲- ''سودا تخلص مرزا محمد رفیع ولد مرزا محمد شفیع شاگرد شاہ حاتم وطن ان کا کابل مولد دہلی، ایام شباب میں لکھنو جا کر نواب آصف الدولہ بہادر کے مقربوں میں منسلک ہو کر ملک الشعراء کا خطاب پایا۔ ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا۔''(۱۹)

(سخن شعراء۔ عبدالغفور نساخ)

''معہذا دیگر اوصاف و کمالات آں بے عدیل کہ بانفس شریف خود جمع داشت چہ گویم از آداب صحبت ملوک و سلاطین و آگاہی بہ علم موسیقی و طرح نہادن بر سلام و مرثیہ ہائے گفتہ خود و تہذیب اخلاق، و تالیف قلوب و علم مجلس و غیرہ چہ ہنر ہا کہ در ذات کامل الصفات اونمودند، مدام بہ صحبت امرا و وزرا گزرانید ہمیشہ بخلاع ثمین و جائز ہائے سنگین از خدمت این ہا سرفراز بود۔''(۲۰)

(دستور الفصاحت۔ سیّد احد علی یکتا)

''جوانے است خوش خلق و خوش خوے، گرم جوش، یار باش، شگفتہ روئے، مولد شاہجہاں آباد است، نوکر پیشہ''(۲۱)

(نکات الشعراء، میر تقی میر)

۳- ''میر تخلص محمد تقی نام اہل اکبر آباد خواہر زادہ سراج الدین علی خاں آرزو...... مشہور است کہ بہ شہر خویش باپری تمثالے کہ از عزیز انش بود در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشتہ آخر عشق او خاصۂ مشک پیدا کرد۔ می خواست کہ بخیہ بہ چار سوئے رسوائی بہ شکند و حسن بے پردہ بہ جلوہ گری در آید از ننگ افشانی راز و طعن اقربا بادل بغل پروردہ حسرت و با خاطر ناشاد دست و گریباں قطع رشتہء حب وطن ساختہ۔ از اکبر آباد بعد از خانہ براندازی ہا بہ شہر لکھنو رسید و سنگ

شکیبائی بہ رشتہ زدہ از آوارہ گردی ہا آرمید وہمیں جا بہ صد حسرت جاں کاہ جلا وطنی وحرماں نصیبی از دیدار یار ودیار جاں بہ جہان آفریں داد۔ تامقید رشتہ حیات بود طوق محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بہ پاداشت از کلام عاشقانہ و درد انگیزش (پیداست) کہ صد آرزو بہ خاک برد''(۲۲)

(بہار بے خزاں۔ احمد حسین سحر)

۴- ''اسد تخلص اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ اصلش از سمرقند مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد جوان قابل ویار باش وورد مند، ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ، ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن غم ہائے عشق مجاز، تربیت یافتہء غم کدۂ نیاز، درفن سخن سنجی منبع محاورات میرزا عبدل قادر بیدل علیہ الرحمۃ وریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند۔''(۲۳) (عمدہ منتخبہ۔ میر محمد خاں سرور)

مندرجہ بالا مثالیں اگرچہ کم ہیں لیکن بے جا طوالت کے خوف سے ہم نے مزید مثالیں درج کرنے سے احتراز کیا ہے۔ کیونکہ ان مثالوں سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں نے شخصی خاکوں کے لیے محض چند لفظوں کی تکرار نہیں کی ہے بلکہ ہر ایک شاعر کے سوانحی خاکے کی جزئیات مختلف ہیں اور ان جزئیات سے اس شاعر کے بارے میں کم از کم اتنی معلومات ضرور حاصل ہو جاتی ہیں کہ جن سے اس کی شاعری کے سمجھنے میں اہم مدد حاصل ہو جاتی ہے۔ اردو شاعری کے تقریباً سو سے زیادہ تذکرے تالیف کیے گئے ہیں۔ ان تذکروں میں سے ایسی معلومات جو سب نے درج کی ہیں اور ایسی معلومات جو مختلف تذکروں میں مختلف ہیں' اگر ان تمام معلومات کو یکجا کر لیا جائے تو کسی شاعر کی اس سے بھی جامع تصویر ہمارے سامنے آ سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے بے حد کدوکاوش کی ضرورت ہے اور اس حوالے سے الگ سے ڈاکٹریٹ کا ایک مقالہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔ اس کی کچھ جھلک مولانا حکیم سیّد عبدالحئی صاحب کے تذکرۂ شعرائے اردو موسوم بہ گل رعنا مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ طبع سوم ۱۳۶۴ھ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ تذکرہ اردو کے اہم شاعروں کے حوالے سے ہے۔ کسی بھی شاعر کے سوانحی خاکہ کا آغاز

دیگر تذکرہ نگاروں کی تین چار آرا سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس شاعر کے تفصیلی حالات کم از کم تین چار صفحات میں دیے گئے ہیں۔ یہ مختلف تذکروں کو یکجا کرنے کی ابتدائی صورت ہے ورنہ اگر تمام تذکروں کو مدنظر رکھ کر ایک تذکرہ مرتب کر دیا جائے تو اس سے قدیم شاعروں کی سوانح کا زیادہ مفصل حال ہمارے سامنے آ سکتا ہے۔

قدیم تذکرہ نگار تذکرہ نگاری کو بھی تاریخ نگاری کا ہی ایک شعبہ سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کے تذکروں میں تاریخ نگاری کے کچھ عناصر بھی در آئے ہیں۔ اگر چہ معدودے چند مثالوں کو چھوڑ کر بیشتر ان تذکروں میں سنین اور ادوار قائم کرنے کے سلسلے میں زیادہ کاوش سے کام نہیں لیا گیا، واقعات کی ترتیب بھی تاریخی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان تذکروں میں قدیم ادوار کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات ضرور مل جاتی ہیں۔ ان تذکروں میں تذکرہ نگاری کے ارتقا کے ساتھ ساتھ شاعری اور زبان کے ارتقا کے بارے میں بھی چند اشارات ضرور مل جاتے ہیں۔ سب سے پہلے محمد قیام الدین قائم نے اپنے تذکرے مخزن نکات مولفہ ۱۱۶۸ھ میں شعراء کے طبقات قائم کیے۔ اس نے اپنے تذکرے کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔

طبقۂ اول: در بیان، اشعار شعرائے متقدمین،

طبقۂ دوم: در ذکر کلام سخنوران متوسطین

طبقۂ سوم: در بیان اشعار و احوال سخن طرازان متاخرین، اس تقسیم سے شعرا کے عہد کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ میر حسن نے حروف تہجی کو برقرار رکھتے ہوئے ہر حرف میں شعرا کے تین ادوار، متقدمین، متوسطین اور متاخرین قائم کیے۔ اس سے بھی شعرا کے زمانے کا کسی حد تک تعین ہو جاتا ہے۔

گلزار ابراہیم ۱۱۹۸ھ اور گلشن ہند ۱۲۱۵ھ میں تاریخ نگاری کے عناصر مزید نمایاں نظر آتے ہیں۔ گلزار ابراہیم کے مولف نے تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات اور شعرا کے حالات جمع کرنے کے سلسلے میں کافی محنت سے کام لیا ہے۔ وہ چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم تھے اور شاعروں کے حالات زندگی کی فراہمی کے لیے بہتر وسائل رکھتے تھے، اس

لیے ان کے تذکرے میں تاریخ نگاری کے جوہر زیادہ نمایاں ہیں۔ گلشن ہند چونکہ گلزار ابراہیم کا ترجمہ ہے، اس لیے اس میں بھی یہ خوبی موجود ہے۔ گلستان سخن ۱۲۷۱ھ انتخاب دواوین ۱۲۶۰ھ اور خزینۃ العلوم ۱۲۸۸ھ کے دیباچے تاریخ نگاری کے حوالے سے زیادہ اہم ہیں۔ ان میں مختلف ادوار میں اسلوب اور زبان و بیان کے حوالے سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان پر بحثیں ملتی ہیں۔ ان تذکروں سے ہمیں مجموعی طور پر شعراء کی تاریخ پیدائش وفات، سکونت، ولدیت، شاگردی، استادی، مزاج، شاعرانہ رتبہ، اسلوب، پسندیدہ اصناف اور اندازِ سخن کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ بعد کے تذکروں مثلاً طبقات الشعرائے ہند ۱۲۶۳ھ، شمیم سخن ۱۲۸۹ھ اور آب حیات ۱۲۹۷ھ میں تذکرہ نگاری اور تاریخ نگاری کی سرحدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔ طبقات الشعرائے ہند کے حوالے سے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں۔

> ''طبقات شعرائے ہند اردو شاعری کی تاریخ کی باقاعدہ تدوین کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس کی ترتیب نیم تاریخی ہے اور مصنف کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاعری کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا سارا دائرہ عمل زیرِ بحث آ جائے۔''(۲۴)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''تذکروں کا تاریخی مواد صرف شعرا کے حالات زندگی یا ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ تک محدود نہیں ہے۔ ان میں بعض تحریکوں، ادبی روایتوں، شعری محفلوں، سماجی رسموں اور اخلاقی قدروں کا سراغ بھی ملتا ہے۔''(۲۵)

ان کے علاوہ ان تذکروں سے ہمیں قدیم عہد کی معاشرتی صورت حال سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کی ہندوستان پر عملداری سے قبل ہندو مسلم دونوں قوموں احساس یگانگت و اخوت سے رہتی تھیں۔ شعراء مذہب و ملت کے احساس سے بالاتر ہو کر شعر کہتے تھے۔ شاعروں میں بھی سپاہیانہ خوبی موجود تھی۔

غالب کا یہ مصرع اپنی عملی صورت میں نظر آتا ہے کہ ''سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری'' شاعروں میں درویشانہ خصائل بھی موجود تھے۔ شاعری اور تصوف کی حدیں قدیم دور میں مل گئی تھیں۔ سیاسی انحطاط اس دور کی معاشرت پر چھایا ہوا نظر آتا ہے جس کا اظہار شہر آشوب، ہجو اور ہزل کی صورت میں نظر آتا ہے۔ مشاعرے اس دور کی معاشرت کا جزو لاینفک بن گئے اور انھیں ایک اہم معاشرتی تقریب کا درجہ حاصل تھا۔

ان تذکروں کے مطالعے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف تذکروں میں مختلف کمالات موجود تھے۔ نکات الشعراء شاعروں کے سوانحی خاکوں کے حوالے سے منفرد مقام کا حامل ہے۔ تذکرہ میر حسن اور تذکرہ قائم شاعری کو طبقات میں تقسیم کرنے کی وجہ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ گلزار ابراہیم اور گلشن ہند میں سنین کا خیال رکھا گیا ہے اور طبقات شعرائے ہند میں معاشرتی اور سیاسی تاریخ کی جھلکیاں اسے منفرد بناتی ہیں۔ طبقہء متقدمین کی قسم اول میں ہندو شاعروں خصوصاً گرو رام راو کے حوالے سے ہندو مذہب، رسوم و رواج اور معاشرت کے بارے میں[۹] اہم معلومات درج ہیں جو ان شاعروں کی تفہیم میں بے حد معاون ہیں۔ مسلمان حکمرانوں، شہزادوں اور شہزادیوں، وزیروں اور امیروں، مثلاً عمدۃ الملک نواب امیر خان امیرؔ، جان علی جانؔ، نواب عماد الملک غازی الدین نظامؔ، شاہ عالم آفتابؔ اور نواب محمد یار خاں بہادر امیرؔ کے حوالے سے مولوی کریم الدین نے اس دور کی سیاسی تاریخی، منافقتوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا حال تفصیل سے رقم کیا ہے۔ شاہ حاتم اور اس طرح کے دیگر شعراء جن کی بزرگی اور درویشی مسلم تھی، کے حوالے سے تصوف کے معاشرے میں اثر و رسوخ کی تصویر کشی کی ہے۔ میر عبدالحئی تاباں کے حوالے سے اغلام بازی اور امرد پرستی کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ اس حوالے سے گارساں دتاسی اپنے خطبات میں لکھتے ہیں:

> ''یہ درحقیقت میری تاریخ کی پہلی جلد سے حذف و اضافہ کے ساتھ تالیف کی گئی ہے جس سے وہ ایک نئی کتاب ہوگئی ہے اور اسناد کے لیے کارآمد ہے۔ اضافہ تقریباً تمام کا تمام یا تو خاندانِ

تیموریہ کے شہزادوں کے حالات کا ہے جو اپنا وقت بہلانے کے لیے شاعری کیا کرتے تھے یا دہلی کالج کے پروفیسروں کے حالات کے متعلق ہے۔''(۲۶)

یہاں ہم نے تنقید، سوانحیت اور تاریخیت کے عمرانی پہلوؤں کے حوالے سے جو بحث کی ہے اور جو مثالیں درج کی ہیں، ان سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان تذکروں میں بس اتنا ہی عمرانی حوالہ پایا جاتا ہے۔ ہم نے بے جا طوالت سے بچنے کے لیے اور محض اپنے موقف کی وضاحت کے لیے جس قدر ضرورت تھی اتنی ہی مثالیں یہاں پیش کی ہیں۔ ورنہ اگر تفصیل سے لکھا جائے تو تذکروں کا بیشتر مواد ہمارے نقطۂ نظر کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہر تذکرہ نگار نے اپنے عہد کی معاشرت اور ادبی فضا کو اپنے تذکرے میں پیش کیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان تذکروں میں خامیاں بھی موجود ہیں لیکن اس کے باوجود اردو ادب، اردو شاعری، اردو تنقید اور عمرانی تنقید کے حوالے سے بھی ان تذکروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو ادب کے ارتقاء کو سمجھنے کے لیے اس کی قدر و قیمت کے تعین کے لیے اور اپنی ادبی روایت کے تسلسل کے حوالے سے ان تذکروں کی اہمیت کبھی بھی ختم نہیں ہوگی بلکہ جوں جوں ان پر تنقیدی کام زیادہ ہوگا، ان کی اہمیت اتنی ہی بڑھ جائے گی۔ کلاسیکی ادوار میں ہونے والے ادبی کام کے بارے میں بنیادی معلومات ہمیں انہی تذکروں کے ذریعے حاصل ہوئی ہیں اور اس حوالے سے جب بھی کبھی کوئی کام کیا جائے گا، ان سے رجوع کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی نسبت جدید ادوار میں تذکروں کے حوالے سے تحقیقی اور تنقیدی کام کی اہمیت بھی زیادہ ہوگئی ہے اور کام کی رفتار بھی بڑھ گئی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱- کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، س: ن، ص ۲۸، ۲۹

۲- ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلس ترقی ادب لاہور۔ طبع اول، نومبر ۱۹۷۲ء، ص: ۷۷، ۷۸

۳- نور الحسن نقوی، فن تنقید اور اردو تنقید نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، بار اول ۱۹۹۰ء، ص: ۹۸

۴- سیّد عابد علی عابد، اصول انتقاد ادبیات، مجلس ترقی ادب لاہور، ص: ۲۳۹

۵- ڈاکٹر سیّد عبداللہ، شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، مکتبہ خیابان ادب، لاہور۔ طبع ثانی، دسمبر ۱۹۶۸ء، ص: ۲۵-۲۶

۶- ڈاکٹر شارب ردولوی، جدید اردو تنقید، اصول ونظریات، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو۔ چوتھی بار، ۱۹۹۴ء، ص: ۱۵۴

۷- فن تنقید اور اردو تنقید نگاری، نور الحسن نقوی ص ۱۰۳

۸- ڈاکٹر سیّد عبداللہ، شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ص: ۲، ۳

۹- ڈاکٹر شارب ردولوی، جدید اردو تنقید، ص: ۱۱۸

۱۰- ڈاکٹر سیّد عبداللہ، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ص: ۹۷

۱۱- ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ص: ۸۶

۱۲- میر تقی میر، نکات الشعرا، مرتبہ: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ۱۹۳۵ء

۱۳- اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص: ۸۸

۱۴- کریم الدین، طبقات شعرائے ہند، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۸۳ء

۱۵- سعادت خان ناصر، خوش معرکہ زیبا، مرتبہ مشفق خواجہ، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۰ء

۱۶- نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، گلشن بے خار، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو ۱۹۸۲ء

۱۷- کریم الدین، طبقات شعرائے ہند، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۸۳ء

۱۸- محمد قیام الدین قائم، مخزن نکات، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۹۶ء، ص: ۶۳

۱۹- عبدالغفور نساخ، سخن شعرا، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۸۲ء، ص: ۲۱، ۲۲

۲۰- سیّد احد علی یکتا، دستور الفصاحت، مرتبہ مولانا عرشی، مطبوعہ رام پور ۱۹۴۳ء، ص: ۲۱-۲۲

۲۱- میر تقی میر، نکات الشعرا، مرتبہ: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۵ء

۲۲- احمد حسین سحر، بہار بے خزاں، علمی مجلس دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۹۹

۲۳- میر محمد خاں سرور، عمدہ منتخبہ، مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی لکھنو ۱۹۶۱ء، ص: ۲۲۲

۲۴- صحیفہ لاہور، مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی، مجلس ترقی ادب لاہور، جولائی ۱۹۶۷ء، ص: ۱۲

۲۵- ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ص ۹۲

۲۶- گارساں دتاسی خطبات، مرتبہ: مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۷۹ء، ص ۹۶

ایڈورڈ سعید

مترجم : ڈاکٹر تحسین فراقی

تعریفوں کا تصادم ☆

ایڈورڈ سعید (یکم نومبر ۱۹۳۵ء — ۲۵ ستمبر ۲۰۰۳ء) یروشلم میں مقیم اپنے خاندان کے دو منزلہ مکان میں پیدا ہوا۔ یہ مغربی یروشلم کا وہ علاقہ ہے جہاں صرف فلسطینی عیسائی رہتے تھے۔ وہ چار بہنوں کا اکلوتا بڑا بھائی تھا۔ اس کی والدہ نے قاہرہ میں ایک بچے کو جنم دیا جو پیدا ہوتے ہی فوت ہوگیا تھا، تب اس نے عہد کیا کہ اس کا اگلا بچہ یروشلم میں پیدا ہوگا۔ چنانچہ اس کا خاندان قاہرہ سے جہاں وہ کافی عرصے سے مقیم تھا، مہاجرت کر کے یروشلم میں اپنے عزیزوں کے گھر آباد ہوا۔ دراصل سعید کا والد ودیع (Wadie) یروشلم کا باشندہ تھا جو ۱۹۲۹ء میں قاہرہ چلا گیا تھا تاکہ وہاں اسٹینڈرڈ اسٹیشنری کمپنی کو منظم کرسکے۔ ۱۹۳۲ء میں سعید کے والد نے اس کی والدہ حِلدیٰ موسیٰ سے شادی کی۔ حِلدیٰ، ناصرہ (Nazareth) میں پیدا ہوئی تھی۔ سعید کی والدہ لبنانی تھی۔ سعید کا سخت گیر والد تعلیم کی قدر و قیمت سے آگاہ اور امریکہ کا بے آمیز مداح تھا۔ فطری طور پر والد سے زیادہ سعید کو والدہ سے ذہنی اور جذباتی قربت تھی۔ جس کے بارے میں اس نے لکھا ہے: ''میری زندگی کے پہلے

☆ ایڈورڈ سعید کا یہ مقالہ "The Clash of Definitions" کے زیرِ عنوان اس کے مجموعہ مقالات "Reflections on Exile" میں شایع ہوا۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۵۶۹-۵۹۰

پچیس برس کی میری نہایت قریبی اور گہری رفیق۔'' اگرچہ اس کی تربیت میں اس کے باپ کا بھی حصہ ہے مگر نوجوان سعید کی جمالیاتی تربیت اصلاً اس کی والدہ کی مرہون منت رہی۔ جب ایڈورڈ سعید ابھی نو برس کا تھا تو وہ اور اس کی والدہ مل کر شیکسپیئر کے شہرۂ آفاق ڈرامے ''ہیملٹ'' کا مطالعہ کرتے تھے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ سعید کے والد اور والدہ دونوں کا امریکہ سے ایک تاریخی رشتہ تھا، تاہم سعید کی والدہ نے کبھی امریکی شہریت اختیار نہ کی۔

ایڈورڈ سعید مغرب میں فلسطینیوں کا نہایت اہم نمائندہ تھا۔ اس نے کتابیں اور مقالے لکھے، وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مذاکروں میں باقاعدہ حصہ لیتا رہا اور فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم اور ان سے روا رکھی جانے والی ناانصافی سے امریکی اور مغربی سامعین کو مسلسل آگاہ کرتا رہا۔ اس پیہم جدوجہد کی اسے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ مقبولِ عام صحافت میں اس کے خلاف بدنام کار مہم چلتی رہی، اسے ''دہشت گرد پروفیسر'' اور ''نیویارک میں یاسر عرفات کا آدمی'' جیسے القابات سے نوازا جاتا رہا۔ کولمبیا یونیورسٹی میں جہاں وہ انگریزی اور تقابلی ادبیات کا پروفیسر رہا، اس کے دفتر پر حملہ کیا گیا اور اسے مسلسل موت کی دھمکیاں دی جاتی رہیں۔

سعید کی پہلی کتاب ''جوزف کونزیڈ اور خودنوشت سوانح کا افسانہ'' (۱۹۶۶ء) کونزیڈ کے فکشن اور اس کی خط کتابت کے باہمی تعامل کے مربوط، متعین اور گہرے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔

جس زمانے میں امریکی دانشوروں کا بڑا طبقہ متنی مباحث میں جتا ہوا ''آفاقی حقائق'' تلاش کر رہا تھا سعید نے ''استشراق'' (Orientalism) جیسی کتاب لکھ کر ۱۹۷۸ء میں دھماکہ خیز صورتِ حال پیدا کر دی تھی جس کے باعث ہر سطح کے اہلِ علم کو اپنے علمی کاموں پر نظرثانی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس کتاب پر مستشرقین کے جتھے اور استشراق کا دفاع کرنے والوں نے شدید حملے کیے۔ برنارڈ لوئس نے سعید پر الزام لگایا کہ اس نے ''استشراق'' کے مطالعات میں زہر ملا دیا ہے۔ لوئس نے سعید کو غیر محتاط، آمر، اہلا گہلا اور غضب ناک قرار دیتے ہوئے لکھا کہ سعید نے

بعض عرب، مسلم اور مارکسی نقادوں سے مل کر ''استشراق'' کو آلودہ کر دیا ہے —— مختصر یہ کہ اس نے ایک معصوم علمی طریقِ کار کو سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

''مسئلہ فلسطین'' نامی کتاب سعید کی علمی زندگی کا ایک اور سنگ میل تھی جس سے پتا چلتا ہے کہ یورپی سامراجیت، صہیونیت اور امریکی سیاست سب نے مظلوم فلسطینیوں کو بڑے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنے وطن سے دور رکھا ہوا ہے۔

''ثقافت اور سامراج'' میں اس نے سامراجی نظریے اور ثقافت کے طرزِ عمل کے باہمی رشتوں کو واضح کرتے ہوئے بتایا کہ جین آسٹن جیسی بڑی ادبی شخصیت کی تخلیق کردہ دنیا میں بھی یورپی نوآبادیاتی کدو کاوش کے عناصر نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں اس کا ناول ''مینسفیلڈ پارک'' قابل توجہ ہے۔

ایک خیال جس نے سعید کی شخصیت کا احاطہ کر رکھا تھا، یہ تھا کہ معاشرے اور دنیا میں دانشور کا حقیقی نصب العین اور طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ ''دنیا، متن اور نقاد'' نامی اس کی کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ تنقید کو حیات افزا ہونا چاہیے اور اسے ظلم، جبر اور استحصال کی ہر قسم اور ہر صورت کی مخالف ہونا چاہیے۔

۱۹۷۹ء میں سعید نے "Covering Islam" کا آغاز کیا۔ یہ ''استشراق'' والے سلسلے کی تیسری کتاب ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب امریکہ ایک بڑے بحران کی گرفت میں تھا جس کا سبب ایرانی طلبہ کا ۴ نومبر ۱۹۷۹ء کو تہران میں واقع امریکی سفارت خانے کا محاصرہ کرنا تھا۔ ان طلبہ کا امریکی حکومت سے یہ تقاضا تھا کہ وہ مفرور محمد رضا شاہ پہلوی کو مقدمہ چلانے کے لیے ایران کے حوالے کرے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب ذرائع ابلاغ ''احیائے اسلام'' کے مسئلے کو خصوصی بحث کا موضوع نہ بناتے ہوں۔ سعید کا موقف یہ تھا کہ رپورٹروں اور تجزیہ نگاروں کو چاہیے کہ وہ بین الاقوامیت اور عالمی شعور کا احساس اپنے اندر پیدا کر کے امریکہ کے مصدق حکومت کا تختہ الٹنے اور امریکہ کی تربیت یافتہ ایرانی خفیہ پولیس ساواک کی وحشت و بربریت کے وسیع سیاق و سباق میں ایران میں ہونے والے واقعات کا جائزہ لیں۔

سعید کی پہلی اہم خود نوشت فکری سوانح ''آخری آسمان کے بعد'' (After the Last Sky) ایک خاص سیاسی صورتِ حال کے ردِعمل کے طور پر لکھی گئی تھی۔ یہ صورتِ حال ۱۹۸۳ء میں جینوا میں ہونے والی اقوامِ متحدہ کی ایک کانفرنس کے موقع پر پیدا ہوئی تھی۔ اس کی وجہ اس حقیقت کا ادراک تھا کہ اقوامِ متحدہ نے ژاں موہر (فوٹو گرافر) کو فلسطینیوں کی تصویریں چھاپنے کی اجازت تو دے دی مگر ان تصویروں پر لگائی گئی سعید کی سرخیوں کو چھاپنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ سعید کی تصنیف ''آخری آسمان کے بعد'' ایک سیاسی کاوش تھی جس کا مقصد فلسطینیوں کے تجربات کا بیان اور ان کی زندگیوں کی تشکیل نو تھا۔ اس کتاب کے زیادہ تر موضوعات زیاں اور جلاوطنی ہیں۔ جرمن فلسفی تھیوڈور اڈورنو نے کہا تھا:

> ''اپنے گھر میں ہونے کے باوجود اپنے گھر میں نہ ہونے کا احساس، اخلاقیات کا ایک حصہ ہے۔''

یہی ''بے گھری کا احساس'' ایڈورڈ سعید کو بھی گھیرے ہوئے تھا۔ سعید کا خیال تھا کہ اکثر لوگ اصولی طور پر صرف ایک ثقافت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ جلاوطن کم از کم دو ثقافتوں سے واقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سے انھیں بیک وقت ان متعدد ابعاد کا اندازہ ہوتا ہے جن کا متعین فرد کو احساس نہیں ہوتا۔

ایڈورڈ سعید کو پڑھنا دو جہتوں سے اہم ہے۔ ایک تو یہ کہ غالب سیاسی قوت ہر جگہ بنیادی انسانی حقوق کی نفی کرتی ہے۔ دنیا بھر کے لوگ ایسے افکار کے متمنی ہیں جو یورپی استعمار یا مقامی نظریات کے دفاعی ردِعمل کو چیلنج کر کے ان کا قلع قمع کر سکیں۔ چنانچہ ''ہم'' اور ''وہ'' (Us & Them) کی آویزش پر مبنی تقسیم کو چیلنج کرتے ہوئے سعید نے اپنے قارئین کا ایک بڑا حلقہ تشکیل دیا، جس سے نہ صرف اس کے افکار کی قوت کا پتا چلتا ہے، بلکہ انصاف اور انسانی وقار کے مستقبل کے ان امکانات کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو ان افکار کے رگ و پے میں رواں دواں ہیں۔ عالمی سیاسی حالات پر سعید کی نظر بہت گہری تھی۔ اس سلسلے میں امریکہ کا کردار بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے: ''امریکی اچھائی کے (اس) تصور کا مطلب یہ ہے کہ ''ہم امریکی''

انسان دوستی پر مبنی جنگیں لڑتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ''ہم'' دوسروں کے بھلے کے لیے مہم چلاتے ہیں، وغیرہ اس اسطور کا خاتمہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی جگہ طاقت کا صحیح مفہوم سامنے لانا ہوگا اور یہ بات اس ملک (امریکہ) کے بہت سے اختلافِ رائے رکھنے والے ادیبوں کے ہاں بھی ملتی ہے مثلاً موجودہ دور میں ولیم اپیل مین ولیمز سے لے کر گیبریل کولکو اور نوم چومسکی تک کے ہاں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم انسان دوستی کا ایک نیا تصور دریافت کریں جس کی بنیاد ایک نئے نظریے پر ہو اور اس سلسلے میں قدیم روایات سے بھی استفادہ کرنے کی ضرورت ہے، بشمول اسلامی روایات کے۔''

خون کے سرطان جیسی مہلک بیماری کے باوجود سعید زندگی کی اَن تھک دوڑ میں پوری طرح شریک رہا۔ چنانچہ اس کا تدریس، تحریر، موسیقی نوازی، محاضرات، مظلوم طبقات کی وکالت، بحث مباحثہ اور تحقیق و تفتیش کا سفر ناقابلِ شکست قوت کے ساتھ جاری رہا۔ اس کی شدید بیماری اس کے بڑے آدرشوں اور جذبوں کے مابین حائل نہ ہوسکی۔ اس کے مرض کی تشخیص ہو چکی تھی مگر اس سب کے باوجود وہ زیادہ جذبے اور تیزی سے اپنے محاذ پر کام کر رہا تھا۔

اپنی زندگی میں سعید کو بڑی پذیرائی ملی۔ وہ کولمبیا یونیورسٹی کے آٹھ پروفیسروں میں سے ایک تھا اور کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہونا بڑے امتیاز کی بات ہے۔ اس کی بیس کتب شایع ہوئیں جن کا دنیا کی اکتیس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ دو سو سے زیادہ یونیورسٹیوں نے اس کے لیکچر سنے۔ اس کے بی بی سی کے لیے ریتھ لیکچر، کیمبرج یونیورسٹی کے لیے ایمپسن لیکچر، کیلیفورنیا اِروِن یونیورسٹی میں رینے ویلک یادگاری لیکچر، پرنسٹن یونیورسٹی میں ہنری سٹیفورڈ للل لیکچر، کیپ ٹاؤن (جنوبی افریقہ) یونیورسٹی میں ٹی بی ڈیوی اکیڈیمک فریڈم لیکچر، کالج دے فرانس میں متعدد لیکچر اور کئی علمی اداروں میں بہت سے دیگر موضوعات پر لیکچر یادگار ہیں۔ وہ امریکن اکیڈیمی آف آرٹ اینڈ سائنسز، دی رائل سوسائٹی آف لٹریچر کا رکن اور کنگز کالج کیمبرج کا اعزازی رکن رہا۔ اسے متعدد اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں سے بھی نوازا

گیا۔ مثلاً شکاگو یونیورسٹی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، مشیگن یونیورسٹی، بیرزیت یونیورسٹی (مغربی کنارہ)، قاہرہ کی امریکی یونیورسٹی اور قومی یونیورسٹی آئرلینڈ نے اسے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگریاں دیں۔

ایڈورڈ سعید کے بعض خیالات سے اتفاق ممکن نہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ کسی بڑے سے بڑے دانشور کے تمام افکار و خیالات سے مکمل اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ سعید کے نزدیک سامراجی نظام کے تحت بعض ملکوں مثلاً برعظیم، قبرص اور آئرلینڈ کی تقسیم جبر و تشدد کے خاتمے کے بجائے اس کا منبع اور محرک بنی۔ برعظیم کے حوالے سے اس خیال کا اگر تو یہ مطلب ہے کہ اس کی تقسیم سے برطانوی سامراج کی سازش کی وجہ سے کشمیر کے پاکستان سے الحاق نہ ہونے کے نتیجے میں جبر و تشدد اور خون ریزی کا نامختتم سلسلہ شروع ہوا تو یہ یقیناً درست ہے، لیکن اس سے اگر یہ سمجھا جائے کہ خود برعظیم کی تقسیم ہی کا کوئی جواز نہ تھا تو اس سے ہرگز اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوسرے قیاس کو اس امر سے تقویت ملتی ہے کہ سعید ملی جلی سرحدوں (Porous Borders) کے تصور کا زبردست علمبردار رہا۔ اسی طرح اس کا فلسطین کے ضمن میں دو ریاستی تصور بھی بہ حالتِ موجودہ قابلِ عمل نظر نہیں آتا۔

سعید کا موقف یہ تھا کہ تمام انسانی اختلافات کی بنیاد تاریخی ہے، نسلی یا مابعدالطبیعیاتی نہیں، چنانچہ کسی ایک بڑے گروہ سے بعض قدروں کو منسوب کر دینا اس کے نزدیک بہت حد تک مشکوک تھا۔ ''مشرق بمقابلہ مغرب'' کہہ دینا کوئی سادہ نہیں نہایت پیچیدہ بات ہے کیونکہ اگر مثال کے طور پر ان اقدار کا گہرا تجزیہ کیا جائے جو مغربی کہلاتی ہیں مثلاً انسانی آزادی، ہمدردی، وقار —— تو حقیقت یہ ہے کہ یہ نوعِ انسانی کا مشترکہ ورثہ ہیں۔ انھیں محض مغربی اقدار کہنا صرف خطابت بازی ہے۔

پیشِ نظر مقالہ ''تعریفوں کا تصادم'' ایڈورڈ سعید کی کتاب "Reflections on Exile" سے لیا گیا ہے اور اپنے موضوع پر معاصر تہذیبی صورتِ حال کے حوالے سے حد درجہ اہم ہے۔

ایڈورڈ سعید کے بارے میں مندرجہ بالا معلومات کے مآخذ درج ذیل ہیں :

۱- مقدمہ ''ایڈورڈ سعید ریڈر'' (گرانٹا بکس لندن، ۲۰۰۰ء)۔

۲- ایڈورڈ سعید کے ساتھ ایک مصاحبہ، ۱۹۹۹ء مشمولہ کتاب مذکور۔

۳- "Out of Place" ـــــ از ایڈورڈ سعید۔

۴- Selves & Others (از عقیلہ اسماعیل) شایع شدہ ڈان، کراچی، ۵ اکتوبر ۲۰۰۳ء۔

❁ ❁ ❁

تعریفوں کا تصادم

سموئیل پی ہنٹنگٹن کا مضمون '' تہذیبوں کا تصادم'' ۱۹۹۳ء کے گرما کے ''فارن افیرز'' نامی شمارے میں شایع ہوا جس کے پہلے جملے میں اعلان کیا گیا تھا کہ عالمی سیاست ایک نئے عہد میں داخل ہو رہی ہے۔ اس جملے سے اس کا مطلب یہ تھا کہ ماضی قریب میں جہاں عالمی تصادم نظریاتی گروہوں کے مابین ہوتے تھے، جو پہلی دوسری اور تیسری دنیا کو برسر جنگ جماعتوں کی شکل میں منظم کرتے تھے، وہاں سیاست کا نیا اسلوب ایسے تصادموں کو جنم دے گا جو مختلف اور امکانی طور پر متعارض تہذیبوں کے مابین ہوں گے یعنی ''نوعِ انسان کے مابین پائی جانے والی بڑی تقسیموں اور تصادم کا غالب منبع ثقافتی ہوگا ـــ تہذیبوں کا تصادم عالمی سیاست پر غالب رہے گا۔'' آگے چل کر ہنٹنگٹن وضاحت کرتا ہے کہ بڑا تصادم مغربی اور غیر مغربی تہذیبوں کے مابین ہوگا۔ مصنف اپنے وقت کا بیشتر حصہ اصلاً ایک جانب مغربی اور دوسری جانب اسلامی اور کنفیوشسی تہذیبوں کے بنیادی اختلافات پر، خواہ وہ حقیقی ہیں یا مخفی، صرف کرتا ہے۔ تفصیل میں جاتے ہوئے مصنف کسی بھی تہذیب کے مقابل، بشمول مغربی تہذیب کے، اسلام پر زیادہ توجہ صرف کرتا نظر آتا ہے۔

ہنٹنگٹن کے مضمون اور بعد ازاں ۱۹۹۵ء میں شایع ہونے والی اس کی بے لطف اور بے تاثیر کتاب[۱] میں لی جانے والی دلچسپی کا بڑا سبب میرے نزدیک اس کے حقیقی نقطۂ نظر سے زیادہ اس کا ایک مخصوص وقت پر ظہور میں آنا تھا۔

جیسا کہ ہنٹنگٹن نے خود لکھا ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے سے لے کر اب تک نئی ظہور میں آنے والی عالمی صورتِ حال کے امکانی جائزے کے لیے بہت سی فکری اور سیاسی کوششیں کی گئی ہیں انھی میں فرانسس فوکو یاما کی تاریخ کے خاتمے کا نظریہ بھی شامل ہے اور بش انتظامیہ کے بعد کے زمانے میں اس کا پیش کیا جانے والا نئے عالمی نظام کا نام نہاد تصور۔ بالکل حال ہی میں پال کینیڈی، کونر کروئز، او برائن اور ایرک ہوبز بام جیسے دانشوروں نے، جنھوں نے نئی ہزاری کے امکانات پر نظر ڈالی ہے، مستقبل کے تصادمات کے امکانات پر خاصی توجہ صرف کی ہے اور اس کے نتیجے میں ان سب میں ایک تشویش پائی جاتی ہے۔ ہنٹنگٹن کی پیش قیاسی کا بنیادی نکتہ (جو کوئی نیا نقطۂ نظر نہیں ہے) ایک نامختتم تصادم سے عبارت ہے — تصادم کا ایک ایسا تصور جو تقریباً سہولت کے ساتھ اسی سیاسی خلا میں جا پھسلتا ہے جو افکار و اقدار کی (بظاہر) نامختتم دو قطبی جنگ اور تأسف کو جنم نہ دینے والی سرد جنگ کے خاتمے کے نتیجے میں پیدا ہوا۔

چنانچہ اس امر کی نشاندہی کرنا غلط نہ ہوگا کہ ہنٹنگٹن اپنے اس مضمون میں، جس کا تخاطب واشنگٹن کے پالیسی سازوں اور آراء سازوں سے ہے جو ''فارن افیئرز'' جیسے رسائل کے تجزیوں سے، جو خارجہ پالیسی کے مباحث کے باب میں صف اول کا امریکی رسالہ ہے، اتفاق کرتے ہیں، جو تصور پیش کرتا ہے وہ اصلاً سرد جنگ کے نظریے ہی کا نقش ثانی ہے جس کی رو سے آج اور کل کی دنیا کے تصادم اپنی اصل میں نہ تو معاشی رہیں گے نہ سماجی بلکہ نظریاتی ہوں گے اور اگر ایسا ہی ہے تو ایک ہی آئیڈیالوجی — یعنی مغربی آئیڈیالوجی ہی وہ نقطۂ ساکت یا متعین مقام ہے جس کی جانب ہنٹنگٹن کے نزدیک باقی تمام قوموں کو اپنا رخ پھیرنا ہوگا۔ تو گویا دراصل سرد جنگ جاری ہے مگر اس دفعہ اس کے محاذ کئی ہیں اور افکار اور اقتدار کے زیادہ بنیادی اور سنجیدہ نظام (مثلاً اسلام

اور کنفیوشنزم) متعدد ہیں جو مغرب پر برتری بلکہ غلبہ پانے کے لیے کوشاں ہیں۔ چنانچہ یہ بات تعجب خیز نہیں کہ ہنٹنگٹن اپنے مضمون کا خاتمہ اس مختصر جائزے پر کرتا ہے کہ مغرب خود کو مضبوط اور اپنے مفروضہ حریفوں کو کمزور اور منقسم رکھنے میں کیا کیا تدبیریں کرسکتا ہے (مثلاً یہ کہ ''مغرب کو کنفیوشسی اور اسلامی ملکوں کے مابین اختلافات اور تصادمات کو ہوا دینی چاہیے ـــــ دوسری تہذیبوں کے ان گروہوں کی مدد کرنی چاہیے جو مغربی اقدار و مفادات سے ہمدردی رکھتے ہیں ـــــ ان بین الاقوامی اداروں کو مضبوط بنانا چاہیے جو مغربی اقدار و مفادات کے عکاس اور ان کا دفاع کرتے ہیں اور غیر مغربی اقوام کی ان اداروں میں دلچسپی کو بڑھانا چاہیے۔'' (ص ۴۹)

ہنٹنگٹن کا یہ خیال، کہ دیگر تہذیبیں لازماً مغرب سے متصادم ہیں، اس قدر پختہ اور اصرار آمیز ہے اور اس کا تجویز کردہ نسخہ، کہ مغرب کو اپنی مسلسل جیت کے لیے کیا کرنا چاہیے، اس قدر بے تکان طور پر جارحانہ اور جنگ جُویانہ ہے کہ ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ وہ موجودہ عالمی منظر نامے کی تفہیم کے تصورات کو آگے بڑھانے اور مختلف ثقافتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے اسباب کو ترقی دینے کے بجائے اصلاً سرد جنگ کے تسلسل اور پھیلاؤ کے ذرائع سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس سے کہیں بھی اس کا ذرہ برابر شک یا بے اعتقادی ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ پہلے ہی صفحے پر کہہ ڈالتا ہے کہ تصادم نہ صرف بڑھے گا بلکہ یہ کہ تہذیبوں کے مابین تصادم جدید دنیا میں تصادموں کا تازہ ترین مرحلہ ہوگا۔ ہنٹنگٹن کے اس مضمون کو امریکیوں اور دیگر اقوام کے ذہنوں میں جنگ کے خیال کو مسلسل تازہ رکھنے کے فن کے باب میں ایک نہایت مختصر اور کسی قدر کھردرے پن سے اظہار کردہ رہنما نسخہ تصور کرنا چاہیے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ یہ مضمون پینٹیگون کے منصوبہ سازوں اور دفاعی صنعت کے افسروں کے زاویۂ نگاہ سے لکھا گیا ہے جو سرد جنگ کے خاتمے کے نتیجے میں شاید عارضی طور پر اپنے مفوضہ پیشوں سے محروم ہوگئے ہوں اور جن پر اب اپنے لیے ایک نئی ''ذمہ داری'' کا انکشاف ہوا ہے۔ ہنٹنگٹن کم از کم مختلف ملکوں، روایتوں اور قوموں کے مابین ثقافتی عنصر

کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی صلاحیت ضرور رکھتا ہے۔
اس کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ''تہذیبوں کا تصادم'' مختلف سیاسی اور معا
مسائل کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے اور انھیں ناقابل گرفت بنانے کا ایک مفید حربہ ہ
مثال کے طور پر مغرب میں جاپان پر مسلسل شدید تنقید کی روش کو جاپانی ثقافت
بُرے اور خطرناک پہلوؤں کو نمایاں کرکے، جیسا کہ حکومت کے نمائندے کر رہے ہیں
جلتی پر تیل کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ''زرد خطرے'' کے پرانے حربے کو کوریا ا
چین کے ساتھ پیش آمدہ مسائل کے ضمن میں متحرک کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح
صورت حال مغرب شناسی کے باب میں تمام ایشیا اور افریقہ میں ہے جہاں ''مغرب''
کسی اکڈال گروہ میں تبدیل کرکے غیر سفید، غیر یورپی اور غیر عیسائی لوگوں کو دشمن گر
جاتا ہے۔
میری رائے میں ہنٹنگٹن جو کہتا ہے اور جس طرح معاملات کو پیش کرتا ہے بہ
گمراہ کن ہے کیونکہ لگتا ہے کہ وہ تاریخ یا ثقافتی تشکیلات کے محتاط تجزیے کے بجا
پالیسی سازی کے ضمن میں نسخے پیش کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کے دلائل
بڑا حصہ ان دوسرے اور تیسرے درجے کی رائے پر انحصار کرتا ہے جو ثقافتوں کی نظ
اور ٹھوس تفہیم کے سلسلے میں ظہور میں آنے والی اس عظیم پیش رفت سے سرسری طور
گزر جاتی ہے جس کے تحت یہ دیکھا جاتا ہے کہ ثقافتیں کیا طریق کار اپناتی ہیں،
بدلتی ہیں اور انھیں کس طرح بہترین انداز میں سمجھا اور گرفت میں لایا جاسکتا ہے۔
آراء اور افراد کے حوالے وہ دیتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم اور نظری مبا
کے بجائے اس کے بڑے منابع صحافت اور مقبول عام جذباتی خطابت ہیں، کیونکہ
آپ چالس کروتھیمر، سرگائی سٹینکوچ اور برنارڈ لوئس جیسے خاص طرح کا میلان ر
والے تشہیر کاروں، عالموں اور صحافیوں سے حوالے دیں گے تو گویا آپ ابتدا ہی
اپنے دلائل کو تعصب سے آلودہ کر کے سچی تفہیم اور ہمارے سیارے پر بسنے والی
کے باہمی تعاون کے بجائے اسے باہمی تصادم اور بحثا بحثی کی طرف جھکا دیں

ہنٹنگٹن کے اصل حوالے ثقافتیں نہیں بلکہ اس کے چنے ہوئے وہ مٹھی بھر لوگ ہیں جو کسی ثقافت کے بارے میں کسی ایک یا دوسرے نام نہاد نمائندے کے ایک یا دوسرے بیان میں مضمر تصادم پر زور دیتے ہیں۔ میرے لیے تو اس کے مضمون کا عنوان ''تہذیبوں کا تصادم'' ہی ایک اتفاقی افشائے راز کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ ہنٹنگٹن کی نہیں برنارڈ لوئس کی ساختہ ترکیب ہے۔ لوئس کے مضمون ''مسلم غیظ و غضب کے اسباب'' کے آخری صفحے پر، جو ''اٹلانٹک منتھلی'' کے ستمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں شایع ہوا تھا— یہ وہ پرچہ ہے جس نے بعض اوقات ایسے مضامین شایع کیے ہیں جن کا مقصد عربوں اور مسلمانوں کے ''خطرناک''، ''بیمار ذہن''، ان کے ''پاگل پن'' اور ''اختلال'' کو بیان کرنا رہا ہے— لوئس مسلم دنیا کے حاضر مسئلے پر اظہار خیال کرتا ہے: ''اب تک یہ بات بالکل صاف ہو جانی چاہیے کہ ہمیں ایک ایسے رویے اور ایک ایسی صورت حال کا سامنا ہے جو مسائل اور پالیسیوں کی سطح سے اور ان حکومتوں سے، جو ان کی خبر رکھتی ہیں، کہیں بلند تر ہے— یہ تہذیبوں کے تصادم سے کم تر کوئی چیز نہیں— یہ شاید ایک قدیم حریف کا ہمارے یہودی۔ عیسائی ورثے، ہمارے سیکولر حال اور دونوں کے عالمی پھیلاؤ کے خلاف ایک نامعقول مگر بہرحال یقینی طور پر تاریخی ردعمل ہے۔ اب یہ حد درجہ ضروری ہے کہ اپنی طرف سے ہمیں اپنے حریف کے خلاف اُسی سطح کے تاریخی اور اتنے ہی نامعقول اشتعالی ردعمل کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔''(۲)

میں لوئس کی لمبی تقریر کے افسوس ناک خصائص پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے کسی جگہ اس کے طریقہ ہائے کار کا ذکر کیا ہے— ڈھیلی اور ست تعمیمات، تاریخ کی غیر محتاط تمسیخ، تہذیبوں کا نامعقول اور پر اشتعال مقولات کی شکل میں تنزل وغیرہ وغیرہ۔ آج شاید تھوڑا سا شعور رکھنے والے لوگ بھی ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں کے بارے میں، جو کم از کم پانچ براعظموں میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں، جو درجنوں مختلف زبانیں بولتے ہیں اور متعدد رنگا رنگ تواریخ و اقدار کے حامل ہیں، اس طرح کی جاروبی خصوصیات تجویز نہیں کرنا چاہیں گے۔ وہ ان کے بارے میں جو کچھ کہتا

ہے وہ صرف یہ ہے کہ یہ سب کے سب مغربی جدت پسندی پر مشتمل ہیں گویا یہ ایک ارب افراد صرف ایک فرد ہیں اور مغربی تہذیب کوئی پیچیدہ مسئلہ ہونے کے بجائے محض ایک سادہ اعلانیہ جملہ! لیکن میں اولاً جس چیز پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہنٹنگٹن نے لوئس سے یہ خیال کس طرح اخذ کیا ہے کہ تہذیبیں اکڈال اور متجانس ہوتی ہیں اور ثانیاً یہ کہ لوئس ہی کو اپنا ماخذ بناتے ہوئے وہ کیسے ''ہم'' اور ''وہ'' کے مابین ثنویت کا غیر متبدل کردار اپناتا ہے۔

بالفاظ دیگر اس بات پر زور دینا ازبس ضروری ہے کہ برنارڈ لوئس کی طرح سموئیل ہنٹنگٹن غیر جانبدار، بیانیہ اور معروضی نثر نہیں لکھتا بلکہ وہ ایک مناظرہ باز ہے جس کی خطابت نہ صرف 'سب کی جنگ سب کے ساتھ' جیسے پہلے سے پیش کردہ دلائل کو کثرت سے برتتی ہے بلکہ نتیجۃً انھیں تسلسل عطا کرتی ہے۔ گویا تہذیبوں کے مابین ثالث بالخیر بننے کے بجائے ہنٹنگٹن ایک جانبدار شخص نظر آتا ہے جو باقی تہذیبوں کے مقابلے میں صرف ایک نام نہاد تہذیب کا وکیل نظر آتا ہے۔ لوئس کی طرح ہنٹنگٹن بھی مسلم تہذیب کو تحقیقی انداز میں متعارف کراتا ہے گویا اس تہذیب کے متعلق جو چیز سب سے اہم ہے وہ ہے اس کی مفروضہ مغرب دشمنی! لوئس اپنے مؤقف کی تائید میں کم از کم دلائل تو پیش کرتا ہے مثلاً یہ کہ اسلام کبھی جدت سے آشنا نہیں ہوا، یہ کہ اس میں دین و سیاست کبھی علیحدہ نہیں ہوئے یا یہ کہ یہ دوسری تہذیبوں کی تفہیم کا اہل نہیں لیکن ہنٹنگٹن اس طرح کے کسی خرخشے میں نہیں پڑتا۔ اس کے نزدیک اسلام، کنفیوشنزم اور دوسری پانچ تہذیبیں (ہندو، جاپانی، ''سلاوی۔ راسخ العقیدہ''[۳]، لاطینی امریکی اور افریقی) جو اب تک باقی ہیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور نتیجۃً باطنی سطح پر ایک دوسرے سے تصادم کی صورت حال میں ہیں جسے دور کرنے کے بجائے ہنٹنگٹن اس کا اہتمام کرنا چاہتا ہے۔ وہ بحران کے ''مہتمم'' کے طور پر لکھتا ہے، تہذیبوں کے ایک طالب علم یا اُن کے مابین موافقت کار کے طور پر نہیں۔

۱ مقالے کے مرکز میں کارفرما طریقِ کار مثلاً غیر ضروری تفصیل سے صرفِ نظر،

علم و فضل کے ذخائر اور تجربے کے غیر معمولی سرمائے سے پہلو تہی اور انھیں ابال دے کر ایک دو آسان اور سہولت سے یاد رکھنے یا حوالہ دینے کے قابل خیالات میں مختصر کر دینے اور بعد ازاں انھیں نتیجہ خیز، عملی، معقول اور روشن تصورات کے طور پر پیش کرنے ہی کے باعث یہ مضمون سرد جنگ کے بعد کے پالیسی سازوں کی نگاہ میں بہت معتبر ٹھہرا۔ لیکن کیا یہ اس دنیا کو، جس میں ہم رہتے ہیں، سمجھنے کا بہترین طریق کار ہے؟ کیا بحیثیت ایک دانشور اور ماہر عالم کے یہ زیبا ہے کہ دنیا کا ایک سادہ اور سطحی سا نقشہ تیار کر کے اسے جرنیلوں اور غیر فوجی قانون سازوں کے ہاتھ میں ایک نسخے کے طور پر تھما دیا جائے تاکہ پہلے وہ اسے سمجھیں اور پھر اس پر عمل کریں؟ کیا یہ طریقِ کار درحقیقت تصادم کو طول دینے، اسے بدتر بنانے اور اسے گہرا بنانے کا باعث نہیں بنتا؟ یہ تہذیبوں کے تصادم کو کم کرنے میں کیا فرض بجا لاتا ہے؟ کیا ہم تہذیبوں کے تصادم کے آرزو مند ہیں؟ کیا مذکورہ طریقِ کار سے وطن پرستانہ جذبات کو اور نتیجۃً قوم پرستانہ قتل و غارت گری کو شہ نہیں ملتی؟ کیا ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب نہیں: کوئی شخص ایسا کیوں کر رہا ہے؟ سمجھنے بوجھنے کے لیے یا عمل کے لیے؟ تصادم کے امکان کو کم کرنے کے لیے یا بڑھانے کے لیے؟

میں عالمی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس رائے سے آغاز کروں گا کہ لوگوں میں اب مغرب یا جاپانی یا سلاوی ثقافت، اسلام یا کنفیوشنزم جیسی بڑی اور میری رائے میں غیر ضروری حد تک مبہم اور مہارت سے نپٹائے جانے کے لائق تجریدات پر گفتگو کرنے کی روش کس قدر عام ہو گئی ہے — یہ وہ لیبل ہیں جو مذاہب، نسلوں اور گروہوں کو توڑ پھوڑ کر تصوریوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ جو ایک سو پچاس برس پہلے کے گوبینو اور رینان کے نظریات سے کہیں زیادہ ناخوشگوار اور اشتعال انگیز ہوتے ہیں۔ گو بظاہر یہ عجیب سا لگتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ گروہی نفسیات کے شدید طرز عمل کی یہ کوئی نئی مثالیں نہیں اور یہ ہرگز ہرگز مصلحانہ نہیں۔ ایسی مثالیں گہرے عدم تحفظ کے زمانوں میں سامنے آتی ہیں یعنی اس وقت جب قومیں توسیع، جنگ، استعمار یا مہاجرت یا

کسی اچانک یا معمول کے خلاف تبدیلی کے ظہور میں آنے کے نتیجے میں خاص طور
ایک دوسرے کے قریب آتی ہیں یا ایک دوسرے پر مسلط کر دی جاتی ہیں۔

میں اس ضمن میں دو مثالیں پیش کروں گا: گروہی شناخت کی زبان کا انیسو
صدی کے وسط سے اس کے اختتام تک ایک بلند بانگ ظہور ہوتا ہے جو دراصل ا
اورافریقہ کے علاقوں پر قابض ہونے کے لیے بڑی یورپی اور امریکی طاقتوں کے ما
سالہا سال کی بین الاقوامی کشمکش کی معراج ہے۔ افریقہ یعنی تاریک براعظم کی خ
جگہوں پر قابض ہونے کے لیے فرانس اور برطانیہ نیز جرمنی اور بلجیم نہ صرف طاقت
بلکہ تصورات اور خطابیات کے اُس بڑے ذخیرے کا بھی سہارا لیتے ہیں جس کی مدد
وہ اپنی لوٹ مار کا جواز مہیا کرسکیں۔ اس طرح کے حربوں میں سب سے مشہور تہذ
سکھانے کا فرانسیسی تصور La mission Civilisatrice ہے جس کی تہ میں یہ خ
کارفرما ہے کہ بعض نسلوں اور ثقافتوں کا بمقابلہ دوسری قوموں کے کہیں ارفع مقصدِ حی
ہوتا ہے۔ اس خیال کو اپنانے کے نتیجے میں زیادہ طاقتور، زیادہ ترقی یافتہ، زیادہ مہذ
قوم کو دوسری قوموں کو غلام بنانے کا حق مل جاتا ہے۔ یہ سارا کھیل وحشی جبر یا خام لو
مار کے نام پر نہیں جو اس طرح کے استعماری عمل کے متعین عناصر ہیں بلکہ اعلیٰ نص
العین کے نام پر کھیلا جاتا ہے۔ جوزف کانرڈ کی سب سے مشہور کہانی ''قلبِ ظلما
(Heart of Darkness) اس نظریے کی خفطزیہ بلکہ خوفناک تمثیل ہے۔ اس کہا
ایک کردار مارلو کہتا ہے:

> ''دنیا کی تسخیر، جس کا زیادہ تر مطلب یہ ہے کہ یہ ان لوگوں
> سے چھین لی جائے جن کا رنگ ہم سے مختلف یا جن کی ناکیں
> ہماری نسبت پھدی ہیں، کوئی زیادہ خوشگوار عمل نہیں جب آپ
> ذرا گہرائی سے اس میں جھانکیں۔ جو شے اس امر کی تلافی
> کرتی ہے وہ ہے صرف خیال۔ اس کے پس پشت کارفرما
> خیال— کوئی جذباتی دکھاوا نہیں بلکہ خیال اور اس خیال پر ایک

بے غرض یقین ــــ یہی وہ شے ہے جسے آپ متعین کر سکتے ہیں،
جس کے آگے جھک سکتے ہیں اور جسے آپ بھینٹ دے سکتے
ہیں''۔

اس قسم کی منطق کے جواب میں دو چیزیں واقع ہوتی ہیں: ایک تو یہ کہ مقابلہ کار قوتیں ثقافتی اور تہذیبی تقدیر کا اپنا ایک الگ نظریہ وضع کر لیتی ہیں تاکہ دوسرے ممالک میں اپنے کرتوتوں کا جواز مہیا کر سکیں۔ برطانیہ کے پاس اسی طرح کا ایک نظریہ تھا، جرمنی کے پاس بھی تھا، بلجیم کے پاس بھی تھا اور واضح تقدیر کے تصور کے طور پر ایک نظریہ امریکہ کے پاس بھی تھا۔ اس طرح کے تلافی کار تصورات، جن کا اصل مقصد، جیسا کہ کانرڈ نے بالکل صحیح سمجھا ہے، خود غرضی، حصول اقتدار، تسخیر، دولت اور بے لگام احساس فخر ہے، مطابقت اور تصادم کی روش کو باوقار بنا دیتے ہیں۔ میں تو یہ تک کہنے کو تیار ہوں کہ جس چیز کو ہم آج تشخص کی خطابت کہتے ہیں اور جس کا سہارا لے کر کسی نسلی، مذہبی، قومی یا ثقافتی گروہ کا ایک فرد اُس گروہ کو دنیا کا مرکز قرار دے ڈالتا ہے دراصل انیسویں صدی کے آخر کی استعماری مطابقت کے عہد کی پیداوار ہے۔ نتیجتہً اس سے ''دنیائیں برسرِ جنگ'' کے تصور کو تحریک ہوتی ہے جو دراصل بہت واضح طور پر ہنٹنگٹن کے مقالے کی تہ میں موجود ہے۔ اس تصور کا ایک نہایت خوفناک مستقبلانہ اطلاق ایچ جی ویلز کی تمثیل ''دنیاؤں کی جنگ'' (The War of the Worlds) سے ملا جو اس تصور کو توسیع دے کر اس میں اس دنیا اور دور دراز کے ایک سیارے کے مابین جنگ کے تصور کو آمیز کر لیتا ہے۔ سیاسی اقتصادیات، جغرافیہ، بشریات اور تاریخ نویسی کے متعلقہ میدانوں میں اس نظریے کا اطلاق ہوتا ہے جس کی رو سے ہر ''دنیا'' اپنی مخصوص حدود میں بند ہے، اس کی اپنی سرحدیں ہوتی ہیں اور اس کا ایک مخصوص علاقہ ہوتا ہے، دنیا کے نقشے، تہذیبوں کی ساخت اور اس خیال پر کہ ہر نسل ایک مخصوص تقدیر، الگ نفسیات اور الگ ذہنی ماحول وغیرہ کی حامل ہوتی ہے۔ یہ تمام تصورات، کم و بیش بغیر کسی استثناء کے، کسی موافقت پر مبنی نہیں بلکہ دنیاؤں کے مابین آویزش اور تصادم پر مبنی ہیں۔ یہ

امر گستاولی بان (ملاحظہ ہو ''دنیا حالت بغاوت میں'' The World in Revolt) کی کتابوں اور بعض مقابلتاً فراموش کردہ کارناموں مثلاً ایف ایس ماروِن کی ''مغربی نسلیں اور دنیا'' "Western Races and the World" (۱۹۲۲ء) اور جارج ہنری لین فوکس پٹ ریورز کی ''ثقافت کا تصادم اور نسلوں کا رابطہ'' (The Clash of Cultures & the Contact of Races) (۱۹۲۷ء) وغیرہ میں بخوبی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ دوسری چیز جو واقع ہوتی ہے، جیسا کہ ہنٹنگٹن خود اعتراف کرتا ہے، یہ ہے کہ کمزور قومیں، جن پر گویا سامراج کی نظر ہوتی ہے، استعمار کے جابرانہ ہتھکنڈوں اور زبردستی اُن کی زمینوں پر آباد ہونے والوں کی مقاومت کر کے ان کا جواب دیتی ہیں۔ اب ہمیں معلوم ہے کہ سفید آدمی کے خلاف اُصولی مقاومت اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب اس نے الجزائر، مشرقی افریقہ، ہندوستان یا اسی طرح کے کسی مقام پر قدم رکھا۔ بعد ازاں اس مقامی مقاومت کی جگہ ثانوی مقاومت نے لے لی یعنی سیاسی اور ثقافتی تحریکوں کی تشکیل و تنظیم نے استعمار کے پنجے سے آزاد ہونے کا عزم صمیم کرلیا۔ انیسویں صدی کے عین اسی لمحے، جب تہذیبی عظمت کے زعم کے باعث یورپی اور امریکی طاقتوں میں وسیع پیمانے پر (استعمار کے لیے) جواز جوئی شروع ہوئی، اس کے مقابلے میں ایک جوابی خطابت ظہور میں آئی جو افریقی، ایشیائی اور عرب اتحاد، آزادی اور حق خود ارادیت کی اصطلاحات میں اظہار مطلب کرنے لگی۔ مثال کے طور پر برعظیم میں ۱۸۸۰ء میں کانگریس پارٹی کی تنظیم شروع ہوئی اور صدی کے ختم ہوتے ہی یہ ہندوستان کے خواص کو یقین دلا چکی تھی کہ صرف ہندوستانی زبانوں نیز صنعت اور تجارت کو ترقی دے کر ہی سیاسی آزادی کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ دلیل کا اگلا رخ یہ تھا کہ یہ سب ہماری اور صرف ہماری ہیں اور ان کی دنیا کے مقابلے میں اپنی دنیا (ذرا ''ہماری بمقابلہ ان کی'' کا کلمہ ملاحظہ ہو) کے معاون بن کر ہم آخرکار اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ جدید جاپان کے میجی عہد میں بھی اسی طرح کی منطق برسر کار نظر آتی ہے۔ احساس تعلق کی یہی خطابت ہر تحریک آزادی کی وطن پرستی کے قلب میں تپاں نظر آتی ہے اور دوسری جنگ

عظیم کے فوراً بعد اس نے نہ صرف کلاسیکی بادشاہتوں کے خاتمے کا مقصد حاصل کر لیا بلکہ اس کے بعد درجنوں ملکوں کے لیے آزادی کے حصول کا سامان کر دیا۔ ہندوستان، انڈونیشیا، متعدد عرب ممالک، ہند چینی، الجزائر، کینیا اور اسی طرح دیگر متعدد ممالک — یہ سب بعض اوقات امن کے ساتھ، بعض اوقات اندرونی صورت حالات (مثلاً جاپان کے ضمن میں) کے نتیجے کے طور پر یا مکروہ نو آبادیاتی لڑائیوں اور یا پھر وطن پرستانہ تحریک آزادی کے نتیجے میں دنیا کے منظر نامے پر ظاہر ہوئے۔

چنانچہ نوآبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی دونوں کے سیاق و سباق میں عمومی ثقافتی یا تہذیبی تخصیص کی خطابیات نے دو توانا سمتوں کا رخ کیا۔ ایک کا رخ یوٹو پیائی تھا جس نے تمام قوموں کے مابین اتحاد اور یگانگت کے مجموعی نمونے پر اصرار کیا۔ دوسرا رخ وہ تھا جس کے مطابق تمام تہذیبیں اتنی منفرد و متعین، حاسد اور وحدت پرست تھیں کہ وہ نتیجۃً باقی تمام کو رد کرنے اور ان کے خلاف جنگ پر آمادہ نظر آتی تھیں — پہلی شق کے ضمن میں اقوام متحدہ کی فرہنگ اور ادارے ہیں جو دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد وجود میں آئے اور اقوام متحدہ کے بطن سے پھوٹنے والی بعد کی کوششیں، جن کا مطمح نظر آفاقی حکومت کا قیام تھا اور جن کی بنیاد بقائے باہمی، اقتدار اعلیٰ کی رضا کارانہ تحدید اور قوموں اور ثقافتوں کے ہم آہنگ ارتباط پر رکھی جانا تھی۔ دوسری شق کے تناظر میں سرد جنگ کا نظریہ اور اس کی عملی صورت ہے اور تازہ تر صورت میں یہ خیال کہ تہذیبوں کا تصادم ایک ایسی دنیا کے لیے، جو مختلف حصوں بخروں میں بٹی ہوئی ہے، اگر لازمی نہیں تو یقینی ضرور ہے!! اس خیال کی رو سے ثقافتیں اور تہذیبیں بنیادی طور پر ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں۔ میں یہاں نفرت انگیز نہیں بننا چاہتا۔ دنیائے اسلام میں خطابیات اور تحریکوں کا ایک اُبال اٹھتا رہا ہے جو اسلام کے حریف مغرب ہونے پر زور دیتا رہا ہے، بالکل اسی طرح جیسے افریقہ، یورپ، ایشیا اور بعض اور جگہوں پر ایسی تحریکیں چلتی رہی ہیں جو بعض نشان زد دوسروں کو ناپسندیدہ قرار دے کر باہر رکھنے کی ضرورت پر زور دیتی رہی ہیں۔ جنوبی افریقہ میں گورا نسلی امتیاز (White Apartheid) ایک ایسی ہی

تحریک تھی جیسا کہ افریقی مرکزیت نامی تحریک اور افریقہ اور امریکہ میں بالترتیب ایک مکمل طور پر آزاد مغربی تہذیب کے پائے جانے کے ضمن میں حالیہ دلچسپی۔

تہذیبوں کے تصادم کے نظریے کی اس مختصر ثقافتی تاریخ کا نکتہ یہ ہے کہ ہنٹنگٹن جیسے لوگ اسی تاریخ کی پیداوار ہیں اور اسی سے وہ اپنی تحریر میں متشکل ہوتے ہیں۔ مزید برآں اس تصادم کو بیان کرنے والی زبان قوت کے امور کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اہل قوت اسے اسی لیے استعمال کرتے ہیں کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کا تحفظ کر سکیں۔ ناتواں اور کمزور اسے اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ وہ مساوات اور آزادی یا غالب قوت کے حوالے سے مقابلتہً فائدہ حاصل کر سکیں۔ حاصل کلام یہ کہ ''ہم بمقابلہ وہ'' کے نقطۂ نگاہ کے گرد ایک نظریاتی قالب کی بنت سے دراصل یہ باور کرانا مقصود ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ علمیاتی اور فطری ہے— یعنی ہماری تہذیب معروف اور مسلّم ہے، اُن کی مختلف اور عجیب و غریب ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ چوکھٹا، جو ہمیں ان سے علیحدہ کر رہا ہے، جنگ جو، معنی خیز اور ایک نازک صورت حال کا آئینہ دار ہے۔ ہر تہذیبی کیمپ میں ہمیں اس ثقافت یا تہذیب کے سرکاری ترجمان نظر آئیں گے جو اس کی وکالت کے لیے خود کو مامور سمجھتے ہیں، جو خود کو ''ہمارا'' یا پھر ''ان کا'' مؤقف بیان کرنے کی ذمہ داری سونپ دیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہمیشہ بہت کچھ دبانے، تخفیف کرنے یا بڑھانے چڑھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس پہلی اور فوری سطح پر یہ بیان کرنے کے لیے کہ ''ہماری'' ثقافت یا تہذیب کیا ہے یا کیسی ہونی چاہیے، ہمیں اس کی تعریف کے لیے لازماً ایک بحث مباحثے کو درمیان میں لانا ہوگا۔ یہ امر ہنٹنگٹن کے باب میں بالکل درست ہے جو اپنا مقالہ لکھنے کے لیے امریکی تاریخ میں ایک ایسا وقت چنتا ہے جب مغربی تہذیب کی تعریف کے باب میں گہری الجھن اور افراتفری پیدا ہو چکی ہے۔ ذرا یاد کیجیے کہ امریکہ میں بہت سے کالج کیمپسوں میں پچھلی دو دہائیوں میں مغربی تہذیب کا اصل اصول کیا ہے، کون سی کتابیں پڑھانی چاہییں، کون سی پڑھنی یا نہیں پڑھنی چاہییں، شامل نصاب ہونی چاہییں یا اُن کو زیادہ لائق توجہ نہیں سمجھنا

چاہیے جیسے سوالات پر ایک طوفان مچا ہوا ہے۔ سٹینفورڈ اور کولمبیا کی سطح کی یونیورسٹیوں نے ان سوالات پر بحث مباحثہ محض اس لیے نہیں کیا کہ یہ ایک عادی علمی تشویش کی وجہ سے ہے بلکہ اس لیے کہ مغرب کی اور نتیجتہً امریکہ کی اصطلاح داؤ پر لگی ہوئی تھی!

جس شخص کو اس امر کی ذرا سی بھی سوجھ بوجھ ہو کہ ثقافتوں کا طرز عمل کیا ہوتا ہے، جانتا ہے کہ ثقافت کی تعریف کرنا اور یہ کہنا کہ یہ ثقافت اس کے افراد کے لیے کیا معنی رکھتی ہے، ہمیشہ ایک بڑے اور حتیٰ کہ غیر جمہوری معاشروں میں بھی ایک جمہوری مناظرے کے مترادف ہوتا ہے۔ یہاں مسلمہ اور ثقہ حضرات کو منتخب کرنا اور باقاعدگی سے ان پر نظر ثانی کرنا، بحث و تمحیص سے کام لینا، دوبارہ منتخب کرنا یا موقوف کرنا ضروری ہے۔ یہاں خیر و شر اور وابستگی یا ناوابستگی (وہی یا مختلف) کے تصورات ہوتے ہیں، اقدار کے مراتب کی تخصیص، تمحیص، ان پر بارِ دگر بحث اور جیسی بھی صورت حالات ہو، اس کی روشنی میں ان کی تعین یا عدم تعین کرنا ہوتی ہے نیز ہر ثقافت اپنے دشمنوں کی تعین کرتی ہے یعنی یہ کہ اس کلچر سے باہر کیا ہے اور کس طرح اس کے وجود کے لیے خطرہ ہے۔ ہیروڈوٹس سے آغاز کریں تو یونانیوں کے نزدیک جو شخص یونانی زبان نہیں بولتا تھا اس کے وحشی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا تھا— ایک بیگانہ— جس سے نفرت کرنا اور جس کے خلاف لڑنا لازم تھا۔ حال ہی میں مشہور فرانسیسی کلاسیکی مصنف فرانسوائے ہارتوگ (Francois Hartog) کی ایک شائع ہونے والی کتاب ''ہیرو ڈوٹس کا آئینہ'' (The Mirror of Herodotus) کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ہیرو ڈوٹس کس قدر جان بوجھ کر اور کیسی ریاضت کے ساتھ ایرانیوں کی تصویر کشی سے بھی بڑھ کر سائیتھیا کے باسیوں کے باب میں ایک بیگانہ وحشی کی تصویر کشی کرتا ہے۔

سرکاری ثقافت مذہبی رہنماؤں، اکادمیوں اور ریاست (کی تثلیث) سے عبارت ہے۔ یہ حُبّ الوطنی، وفاداری، حدود اور وابستگی کی تعریفات مہیا کرتی ہے۔ یہ سرکاری ثقافت ہی ہے جو ''کل'' کے نام سے بات کرتی ہے، جو عمومی خواہش، عمومی قومی مزاج اور اس نقطۂ نظر کے، جو سرکاری ماضی میں جامع طور پر رائج رہا، بانی بزرگوں اور متون

اور زعماء اور اشرار کے گروہ وغیرہ وغیرہ کے اظہار کے لیے کوشاں ہوتی ہے اور ماضی میں جو چیز اجنبی، مختلف اور ناپسندیدہ ہوتی ہے، اس کو خارج کر ڈالتی ہے۔ یہیں سے وہ تعریفات ظہور میں آتی ہیں جن کی رُو سے لازم آتا ہے کہ کیا کہا اور کیا نہ کہا جائے۔ اسی میں وہ تحریمات اور مقاطعات شامل ہیں جو کسی بھی ثقافت کے لیے، اگر اسے اپنی علمداری کو قایم رکھنا ہے، لازمی ہیں۔

یہ بھی درست ہے کہ بڑے دھارے کی اس سرکاری، مصدقہ ثقافت کے ساتھ ساتھ بعض اختلافات رکھنے والی، متبادل، غیر مقلد اور آزادہ رو ثقافتیں بھی ہوتی ہیں جن میں اقتدار کو چیلنج کرنے والے بہت سے عناصر بھی ہوتے ہیں جو سرکاری ثقافت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ انھیں جوابی ثقافت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ ثقافت دراصل ان سرگرمیوں کا امتزاج ہوتی ہے جو مختلف قسم کے آزادہ رو لوگوں، غریبوں، مہاجروں، رند فنکاروں، مزدوروں، باغیوں اور فن کاروں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اسی جوابی ثقافت سے ہیئتِ مقتدرہ پر تنقید اور سرکاری اور مقلدانہ سوچ پر حملوں کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ عظیم معاصر عرب شاعر ایڈونس (Adonis) نے عربی ثقافت میں پائے جانے والے روایتی اور غیر مقلد آزادہ رو طرزِ احساس کے باہمی تعلق پر ان دونوں کے مابین پائے جانے والے مسلسل جدل اور تناؤ کے ضمن میں ایک ضخیم تحریر سپرد قلم کی ہے۔ تخلیقی اشتعال کے اس ہمہ وقت موجود سرچشمے کا تھوڑا سا شعور رکھے بغیر، جس کے ذریعے غیر سرکاری اور آزاد ثقافت، سرکاری ثقافت کے علم برداروں کو ٹھوکے دیتی ہے، کوئی کلچر قابل فہم نہیں ہو سکتا۔ ہر ثقافت کے باطن میں موجود احساس اضطراب سے صرف نظر کرنا اور یہ فرض کر لینا کہ ثقافت اور تشخص میں کامل ہم آہنگی ہے، اس عنصر سے محروم ہونے کے مترادف ہے جسے اہم اور حد درجہ تخلیقی کہا جاسکتا ہے۔

امریکہ میں یہ بحث، کہ کس شے کو امریکی کہا جاسکتا ہے، متعدد بڑی تبدیلیوں اور بعض صورتوں میں ڈرامائی تبدیلیوں سے دو چار ہے۔ جب میں جوانی کے حدود میں قدم زن تھا تو اس زمانے میں ویسٹرن فلم امریکہ کے اصلی باشندوں کو لعین ابلیسوں کی شکل

میں دکھاتی تھی جنھیں یا تو تہِ تیغ کرنا یا مطیع بنا لینا لازم تھا۔ انھیں ریڈ انڈینز کہا جاتا تھا اور چونکہ ثقافت میں ان کا کوئی ایسا رول نہیں تھا سو یہ فلموں کے بارے میں بھی اتنا ہی درست تھا جتنا علمی تاریخ لکھنے کے باب میں۔ مختصر یہ کہ یہ طرزِ عمل سفید تہذیب کی پیش قدمی میں مضمر خوبیوں کو روشن تر کرنے کا ذریعہ تھا۔ آج صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ اب مقامی امریکیوں کو بدمعاشوں کے روپ کے بجائے مظلوموں کی شکل میں دکھایا جاتا ہے۔ کولمبس کے مرتبے میں بھی تبدیلی آ چکی ہے۔ امریکی حبشیوں اور عورتوں کے بیان میں اور زیادہ ڈرامائی تبدیلیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ٹونی موریسن نے لکھا ہے کہ کلاسیکی امریکی ادب میں سفید رنگ سے مریضانہ حد تک وابستگی پائی جاتی ہے جیسا کہ میلول کی ''موبی ڈک'' اور پو کی ''آرتھر گورڈن پم'' سے بطریق احسن تصدیق ہوتی ہے۔ تاہم وہ کہتی ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے بڑے لکھنے والے مرد اور سفید رنگ مصنفین نے — وہ لوگ جنھوں نے اس ادب کے اصولی قوانین و اسالیب طے کیے جسے ہم امریکی ادب کا نام دیتے ہیں — اپنی تحریروں میں گورے پن (Whiteness) کو ہمارے معاشرے میں افریقی موجودگی سے بچنے، اس پر نقاب ڈالنے اور اسے غیر مرئی بنا ڈالنے کے لیے حربے کے طور پر استعمال کیا۔ صرف یہی امر کہ ٹونی موریسن اپنے ناول اور تنقید اس قدر کامیابی اور ذہانت کے ساتھ لکھتی ہے اب میلول اور ہیمنگوے کی دنیا سے دو بوائے (Du Bois)، بالڈون، لینگسٹن ہیوز اور ٹونی موریسن کی دنیا تک ہونے والی تبدیلی کو نمایاں کرتی ہے۔ کس زاویۂ نگاہ کو اصل امریکہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور کون شخص اس کی نمائندگی اور تعریف کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ یہ سوال بہت پیچیدہ اور نہایت گہرا ہے لیکن اس سارے مسئلے کو چند فرسودہ فقروں تک محدود کر کے حل نہیں کیا جا سکتا۔

ان ثقافتی مقابلوں میں، جن کا مقصد کسی تہذیب کی تعریف متعین کرنا ہوتا ہے، کیا کیا مشکلات حائل ہوتی ہیں، اس کا اندازہ آرتھر شلیسنگر کی حالیہ چھوٹی سی کتاب "The Disuniting of America" (امریکہ کی تحلیل) سے کیا جا سکتا ہے۔ سوادِ اعظم کے مؤرخ ہونے کی حیثیت سے شلیسنگر کی پریشانی سمجھ میں آنے والی

چیز ہے۔ اسے اس بات کی پریشانی ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہنگامی اور مہاجر گروہوں نے امریکہ کے اس سرکاری واحدانہ تصور کو معرض بحث میں ڈال دیا ہے جس کی نمائندگی اس ملک کے عظیم کلاسیکی مؤرخ مثلاً بینکرافٹ ، ہنری ایڈمز اور بالکل حال میں رچرڈ ہوفسٹیڈٹر کرتے رہے ہیں۔ یہ گروہ چاہتے ہیں کہ تاریخ اس طرح لکھی جانی چاہیے کہ اس سے نہ صرف اس امریکہ کے خدوخال واضح ہوں جس کا خواب دیکھنے والے اور جس پر حکومت کرنے والے امراء اور جاگیردار تھے بلکہ اس امریکہ کی بھی نمائندگی ہو جس میں غلاموں، خادموں، مزدوروں اور غریب مہاجرین نے اہم مگر اب تک غیر تسلیم شدہ رول ادا کیا۔ اس طرح کے لوگوں کے بیانات نے سرکاری داستان کی سست رفتار ترقی اور پرسکون تمکین کو تہ و بالا کرنا شروع کر دیا ہے جنھیں ان خطبات و مقالات کے ذریعے خاموش کر دیا گیا تھا جن کا منبع واشنگٹن، نیویارک کے سرمایہ کار بنک، امریکہ کی دانشگاہیں اور غرب اوسط (Middle West) کی بڑی صنعتی دولت تھی۔ وہ سوال اٹھاتے ہیں، معاشرے کے بدقسمت افراد کے تجربات کو بیچ میں لے آتے ہیں اور کم تر درجے کے افراد و اقوام مثلاً عورتوں، ایشیائیوں، افریقی امریکیوں اور متعدد دیگر اقلیتوں کے جنسی اور نسلی مطالبات کو آواز عطا کرتے ہیں۔ کوئی شخص خواہ شلیسنگر کی دل سے نکلی ہوئی چیخ سے اتفاق کرے یا نہ کرے، اس کے نسبتاً مخفی زاویۂ نظر سے اتفاق کیے بغیر چارہ نہیں کہ تاریخ نویسی کسی ملک کی تعریف کے ضمن میں شاہراہ کی حیثیت رکھتی ہے نیز یہ کہ کسی معاشرے کا تشخص بڑی حد تک تاریخی تعبیر کا فرض ہوتا ہے اور یہ تاریخی تعبیر بہت سے متقابل دعووں اور جوابی دعووں کے خطروں سے گھری ہوتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ آج کل ایسی ہی صورت حال سے دو چار ہے۔

آج کی اسلامی دنیا میں بھی اس قسم کے مباحث موجود ہیں جو عام طور پر خطرہ اسلام، اسلامی بنیاد پرستی اور دہشت گردی سے متعلق اٹھنے والے اس ہسٹیریائی شور و غوغا میں، جو مغربی ذرائع ابلاغ سے شدت سے سننے میں آتا ہے، اکثر مکمل طور پر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ کسی بھی دوسری بڑی عالمی ثقافت کی طرح اسلام کے اندر بھی مختلف

قسم کی حیران کن رویے اور مقابل رویے موجود ہیں جن میں سے بیشتر کا شعور واضح طور پر تعصب کا میلان رکھنے والے مستشرقین اور صحافیوں کو نہیں ہو پاتا کیونکہ مستشرقین کے نزدیک اسلام خوف اور دشمنی کا مذہب ہے اور صحافیوں کا حال یہ ہے کہ نہ انھیں اسلامی ممالک کی متعلقہ زبانوں کا علم ہے نہ ان کی تواریخ کا اور وہ ان تسلسل سے جاری فرسودہ باتوں پر تکیہ کرتے ہیں جو دسویں صدی سے مغرب میں چلی آرہی ہیں۔ آج ایران امریکہ کی سیاسی خودغرضی کے حملے کا ہدف بنا ہوا ہے جب کہ عالم یہ ہے کہ وہاں قانون، آزادی، انفرادی ذمہ داری اور روایت جیسے موضوعات پر حیران کن حد تک تند و تیز بحثیں چل رہی ہیں گو کہ مغربی رپورٹر ان کا نوٹس نہیں لیتے۔ کرشمہ کار ایرانی مقرر اور دانشور، خواہ وہ رسمی علماء ہوں یا ان کے برعکس، بڑی بے خوفی سے اقتدار اور تقلید کے مراکز کو چیلنج کرتے ہوئے، عوامی مقبولیت کے جلو میں شریعتی(۴) کی روایت کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مصر میں دائر ہونے والے دو بڑے دیوانی مقدمات نے، جن میں ایک دانشور اور ایک ممتاز فلم ساز کی زندگیوں میں مذہبی مداخلت کا سوال اٹھایا گیا تھا، بالآخر روایتی راسخ الاعتقادی پر فتح پائی (میری مراد ناصر ابوزید اور یوسف شاہین کے مقدمات سے ہے)۔ خود میں نے اپنی ایک حالیہ کتاب ''بے دخلی کی سیاست'' (The Politics of Dispossession, 1994) میں بحث کی ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی کے سیلاب کی بات تو ایک طرف رہی، جیسا کہ مغربی ذرائع ابلاغ اسے تخفیفی انداز میں بیان کرتے ہیں، قانون کے معاملات میں سنت کی تعبیر، ذاتی کردار، سیاسی فیصلہ کاری اور متعدد دیگر معاملات میں اس کی سیکولر سطح پر مخالفت کا زور بھی خاصا ہے۔ مزید برآں، جو بات عام طور پر بھلا دی جاتی ہے، یہ ہے کہ حماس اور اسلامی جہاد کی تحریکیں دراصل پی ایل او کی ہزیمت خوردہ پالیسیوں کے خلاف اور قبضے کی اسرائیلی کارروائیوں، زمینوں سے بے دخلی کی روش اور اس طرح کی دیگر حرکتوں کے خلاف احتجاجی تحریکیں ہیں۔

میرے لیے یہ بات تعجب کا باعث ہے کہ ہنٹنگٹن نے اپنے مقالے میں کہیں بھی یہ اشارہ نہیں دیا کہ وہ ان پیچیدہ جھگڑوں سے واقف ہے۔ نہ یہ لگتا ہے کہ اسے اس امر

کا احساس ہے کہ کسی تہذیب کی نوعیت اور تشخص کو اس کا ہر رکن غیر مسئول بدیہی صداقتوں کے طور پر قبول نہیں کر لیتا۔ سرد جنگ کو پچھلے چند دہوں کے فکری افق کو متعین کرنے والا عامل قرار دینے کے بجائے میں تو یہ کہوں گا کہ ایک عرصے سے چلی آنے والی ہیئت مقتدرہ کے باب میں یہ سوال اٹھانے اور تشکیک کی حد درجہ پھیل جانے والی روش ہے جو مشرق اور مغرب کی بعد از جنگ کی دنیا کے خدوخال متعین کرتی ہے۔ سفید سامراج کے رخصت ہونے کے بعد وطن پرستی اور نو آبادیاتی انخلا (Decolonization) نے تمام آبادیوں کو قومیت کے سوال پر غور کرنے پر آمادہ کیا۔ مثال کے طور پر الجزائر میں، جو ان دنوں اسلام کے علمبرداروں اور فرسودہ اور بے اعتبار حکومت کے مابین خونیں مقابلے کی سرزمین بن چکی ہے، بحث مباحثے نے ایک تشدد پسند شکل اختیار کرلی ہے۔ لیکن ہے یہ بے شک اصلی بحث مباحثہ اور شدید مقابلہ!

فرانس کو ۱۹۶۲ء میں شکست دینے کے بعد ''قومی محاذ برائے آزادی الجزائر'' (FLN) نے الجزائر، عرب اور مسلم تشخص کے علمبردار ہونے کا اعلان کیا۔ اس ملک کی جدید تاریخ میں پہلی بار عربی زبان ذریعہ تعلیم بنی، سوشلزم اس کا سیاسی مسلک اور ناوابستگی اس کی خارجہ پالیسی ٹھہری۔ ان تمام امور میں اپنی یک مجلسی صورت گری کر کے ایف ایل این ایک بڑی مفلوج بیورو کریسی میں تبدیل ہوگیا۔ اس کی معیشت شدید زوال کا شکار ہوگئی اور اس کے لیڈر ایک بے لچک چند سری حکومت میں تبدیل ہو کر بساند اور ٹھہراؤ کا شکار ہوگئے۔ نتیجتہً نہ صرف مسلم علماء اور زعماء میں سے بلکہ اس بربر اقلیت میں سے بھی ایک ایسی اپوزیشن نے ظہور کیا جو مفروضہ واحد الجزائری تشخص کی ہمہ مقصدی بحث میں دب کر رہ گئی تھی۔ یوں پچھلے چند برسوں کا سیاسی بحران حصول اقتدار کی کثیر الجہتی جدوجہد اور الجزائری تشخص کی نوعیت کے فیصلے کے حق کو ظاہر کرتا ہے یعنی یہ کہ اس کے اسلامی عناصر کیا ہیں، یہ اسلام کس نوعیت کا ہے، قوم پرست، عرب اور بربر ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔

ہنٹنگٹن جس شے کو ''تہذیبی تشخص'' کا نام دیتا ہے وہ اس کے نزدیک ایک

مستحکم اور مطمئن شے ہے گویا گھر کے عقب میں موجود فرنیچر سے بھرا کمرہ۔ یہ بات نہ صرف اسلامی دنیا میں بلکہ پورے کرہ ارض میں صداقت سے حد درجہ بعید ہے۔ ضمناً ثقافتوں اور تہذیبوں میں پائے جانے والے اختلافات پر زور دینے کے لیے اس کے استعمال کردہ ''ثقافت'' اور ''تہذیب'' کے الفاظ حد درجہ ڈھیلے ڈھالے نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے نزدیک یہ دو لفظ حرکی اور مسلسل مضطرب ہونے کے بجائے، جیسا کہ یہ اصلاً ہیں، متعین اور متشکل اشیاء کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایسا سوچنا ان اصطلاحات کی نامختتم لفظی بحث کو (مثلاً یہ کہ ان میں سے کون سا زیادہ متحرک اور قوی ہے) کہ ان تہذیبوں کے تناظر میں (بشمول مغربی تہذیبوں کے) ثقافت اور تہذیب کے کیا معنی ہیں، کلیتہً نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ یہ مباحث کسی بھی متعین تشخص کے تصور اور نتیجۃً تشخصات کے مابین رشتوں کے تصور کا استیصال کرتے ہیں جسے ہنٹنگٹن سیاسی نمود کی وجودیاتی حقیقت سمجھتا ہے یعنی تہذیبوں کا تصادم۔ یہ جاننے کے لیے آپ کا چین، جاپان، کوریا اور انڈیا کے امور کا ماہر ہونا ضروری نہیں۔ امریکہ کی مثال سامنے کی ہے جس کا میں پیچھے ذکر کر آیا ہوں۔ یا پھر جرمنی کی مثال لیجیے جہاں دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد سے یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ جرمن ثقافت کی نوعیت کیا ہے۔ کیا نازی ازم نے اسی کے بطن سے منطقی طور پر جنم لیا یا یہ ایک طرح کا انحراف تھا؟

لیکن تشخص کے باب میں ابھی اور بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ ثقافتی اور خطابیاتی مطالعات کے شعبے میں ہونے والے متعدد نئے انکشافات وترقیات نے ثقافتی تشخص کی حرکی اور مسابقتی نوعیت کا کہیں زیادہ واضح شعور عطا کیا ہے بلکہ اس حد کا بھی شعور دیا ہے جس تک خود تشخص کا تصور، تخیل، جوڑ توڑ، ایجاد اور تعمیر کا مرہون منت ہوتا ہے۔ آٹھویں عشرے میں ہیڈن وائٹ نے ایک نہایت مؤثر کتاب "Metahistory" (ماورائے تاریخ) شایع کی۔ یہ انیسویں صدی کے متعدد مؤرخین مثلاً مارکس، مشلیے (Michelet) اور نٹشے وغیرہ اور ان کے صنائع معنوی (Tropes) میں سے کسی ایک یا

اس کے پورے سلسلے پر تکیہ کرنے کے طریق کار کا، جو تاریخ کے بارے میں ان کے زاویۂ نگاہ کو متعین کرتا ہے، ایک تجزیہ فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر مارکس اپنی تحریروں میں ایک مخصوص بوطیقا سے متعہّد نظر آتا ہے جو اسے تاریخ میں ترقی اور بیگانگی کی نوعیت کی، ایک مخصوص بیانیہ ماڈل کی روشنی میں، معاشرے میں ہئیت اور مواد کے فرق پر زور دیتے ہوئے سمجھنے کی اجازت دیتا ہے۔ وائٹ کا مارکس اور دیگر مؤرخین کے حوالے سے صحیح اور فکر افروز تجزیہ بتاتا ہے کہ ان کی تاریخوں کی تفہیم کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ان تاریخوں کو ''واقعیت'' کے معیار پر نہیں بلکہ ان کی داخلی خطابیاتی اور تجزیاتی حکمت عملی کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ یہی وہ حکمت عملی ہے نہ کہ حقائق جس سے طوقویل یا کروچے یا مارکس کے نصب العین ایک نظام نامے کے طور پر عمل میں آتے ہیں۔ اس عمل میں نام نہاد حقیقی دنیا کے کسی خارجی مصدر کو دخل نہیں۔

مشیل فوکو کے مطالبات کی طرح وائٹ کی کتاب کا مقصد یہ ہے کہ فطری دنیا کی جانب سے خیالات کے لیے مہیا کردہ محسوساتی توثیقات کی موجودگی سے توجہ ہٹا کر اسے زبان کی اس نوع پر مرتکز کرنا چاہیے جو کسی لکھنے والے کے زاویۂ نگاہ کے عناصر کی تشکیل کرتی نظر آتی ہے مثلاً تصادم کے خیال کو دنیا میں ہونے والے اصل تصادم سے اخذ کرنے کے بجائے ہمیں اسے ہنٹنگٹن کی نثر کے جوڑ توڑ سے اخذ ہوتے دیکھنا ہوگا جو دراصل اس شے پر انحصار کرتی ہے جسے میں ''منتظمانہ بوطیقا'' (Managerial Poetics) کہوں گا — ایک ایسی حکمت عملی جس کے تحت ایک مستحکم اور علامتی طور پر متعین شے، مثلاً تہذیبوں کی موجودگی کا احساس دلا کر، مصنف بڑے جذباتی انداز میں جوڑ توڑ کر کے اس طرح کے جملے ترتیب دیتا ہے: ''ہلالی شکل کا اسلامی بلاک — افریقہ کے گولائی مائل ابھار سے وسط ایشیا تک — خونیں سرحدوں کا حامل ہے''۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہنٹنگٹن کی زبان جذبات کو تحریک دینے والی ہے اور اسے نہیں ہونا چاہیے بلکہ انکشاف خیز طور پر یہ اسی طرح کا اسلوب ہے جیسا زبان کے شاعرانہ استعمال کے نتیجے میں ہوتا ہے اور جس کا تجزیہ ہیڈن نے کیا ہے۔ ہنٹنگٹن کی زبان کا پیرایہ

استعاراتی ہے تاکہ وہ ''ہماری'' دنیا میں، جو متوازن، قابلِ قبول، مانوس اور منطقی ہے اور خاص طور پر ایک تحیر خیز مثال کے طور پر اسلامی دنیا میں، جس کی سرحدیں خونیں ہیں اور جس کے خط و خال ابھرے ہوئے ہیں وغیرہ، فرق کی شدت کو ظاہر کر سکے۔ اس سے ہنٹنگٹن کے تجزیے سے زیادہ اس سلسلہ در سلسلہ مجبوریوں کا احساس ہوتا ہے جو، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، خود اس تصادم کو پیدا کرنے والی ہیں جس کا انکشاف اور جس کی جانب اشارہ خود صاحب کتاب کرنا چاہ رہا ہے۔

ثقافتوں کے تصادم کی وضاحت اور اس کے اہتمام کی طرف حد سے زیادہ توجہ کے نتیجے میں تہذیبوں کے مابین جاری رہنے والے تبادلے اور مکالمے کی حقیقت برباد ہو جاتی ہے۔ آخر جاپانی، عرب، یورپی، کوریائی، چینی یا ہندوستانی ثقافت میں سے آج کون سی ایسی ہے جس کا دوسری ثقافتوں سے طویل، گہرا اور غیر معمولی تعلق نہیں رہا؟ اس باہمی تبادلے میں کوئی استثناء نہیں۔ جی چاہتا ہے کہ تصادم کے منتظمین نے مختلف موسیقیوں کی باہم آمیزش مثلاً اولیور مسائیں یا توروتا کیمتسو کے نظام موسیقی کی طرف توجہ کی ہوتی اور اس کے معانی کو سمجھا ہوتا! مختلف قومی دبستانوں کی قوت اور اثر کے باوجود معاصر موسیقی میں جو شے سب سے زیادہ توجہ کھینچتی ہے یہ ہے کہ کوئی شخص بھی ان کے مابین خط امتیاز نہیں کھینچ سکتا۔ جب ثقافتیں ایک دوسرے سے لین دین کرتی ہیں تو یہ عمل اکثر بڑی سہولت سے اور بڑے فطری انداز میں انجام پاتا ہے۔ یہی حال موسیقی کا ہے جس میں دوسرے معاشروں اور براعظموں میں ہونے والی ترقیات کو غیر معمولی طور پر اخذ و جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ کم و بیش یہی قصہ ادب کا ہے جہاں مثلاً گارشیا مارکیز، محفوظ یا اوئے (OE) کے قارئین ان حد بندیوں سے کہیں ماورا ہوتے ہیں جو زبان یا قوم کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں۔ خود میرے تقابلی ادب کے میدان میں قوی نظریاتی اور قومی حد بندیوں کے باوجود مختلف ادبوں کے درمیان باہمی تعلقات اور اتحاد و یگانگت کی ایک علمیاتی کومٹ منٹ موجود ہے۔ اس نوعیت کا باہمی تعاون کا حامل اجتماعی طرز عمل ہی تو وہ شے ہے جو ثقافتوں کے ابدی تصادم کے ان اعلانچیوں کے یہاں

ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ دراصل جدید معاشروں کے علماء، فنکاروں، موسیقاروں، خواب دیکھنے والوں اور پیغامبروں کے مابین پائی جانے والی وہ عمر بھر کی پراخلاص ریاضت قابل توجہ ٹھہرتی ہے جو بیگانے (The other) کے قریب آنے اور اس معاشرے یا ثقافت کی قربت حاصل کرنے کی کوشش سے عبارت ہے جو بظاہر ایک دوسرے سے بہت اجنبی اور ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں جوزف نیڈہام (Needham) اور فرانس کے لوئی ماسینون کی مثالیں ذہن میں آتی ہیں جنھوں نے بالترتیب چین کے عمر بھر مطالعے اور اسلام کے اندر مقدس سفر کا فرض انجام دیا۔ میرے نزدیک جب تک ہم آپسی تعاون اور انسان دوستی کی باہمی خیر سگالی کی روح پر زور دینے اور اس کی لَے تیز کرنے کی کوشش نہیں کرتے —— یاد رہے کہ میری مراد یہاں محض کسی نامانوس شے کے لیے انوکھی خوشی اور سطحی جوش و خروش سے نہیں بلکہ بیگانے کے باب میں ایک موجودیاتی تعہد اور ریاضت سے ہے —— ہمارا انجام یہی ہو گا کہ ہم تمام دوسری ثقافتوں کی مخالفت کرتے ہوئے، کم ظرفی کے ساتھ ''ہماری'' ثقافت کا زور شور سے ڈھول پیٹتے رہ جائیں گے۔

ثقافتی تجزیوں کے ضمن میں دو اور اہم کتب کا ذکر یہاں بے محل نہ ہو گا:

''روایت کی ایجاد'' نامی کتاب میں، جسے ٹیرنس رینجر اور ایرک ہوبزبام جیسے دو ممتاز معاصر مؤرخین نے مرتب کیا ہے، مرتبین کا کہنا ہے کہ روایت متوارث فکر و دانش اور عمل کا مستحکم نظام نامہ ہونے کے بجائے دراصل ساختہ اعمال و عقائد کے ایک مجموعے کا نام ہے جو کثیر آبادی کے معاشروں میں ایک ایسے وقت، جب وہاں نامیاتی واحدے مثلاً خاندان، گاؤں اور قبیلے بکھر چکے ہوں، احساس تشخص و وحدت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ انیسویں اور بیسویں صدی میں روایت پر زور دینا حاکموں کے نزدیک جواز رکھتا ہے گو کہ یہ جواز کم و بیش ساختہ اور مصنوعی ہو۔ ہندوستان کی مثال لے لیجیے۔ وہاں برطانوی حکام نے ۱۸۷۲ء میں ملکہ وکٹوریہ کے قیصرۂ ہند قرار دیے جانے پر جشن منانے کے لیے تقریبات کا ایک مؤثر پروگرام تیار کیا۔ ایسا کرتے

ہوئے اور یہ دعویٰ کر کے کہ جشن منانے کے لیے درباروں اور لمبے لمبے جلوسوں کی برعظیم میں ایک طویل تاریخ رہی ہے، برطانوی حکام ملکہ کی حکومت کو ہندوستان میں ایک ایسا شجرہ دینے میں کامیاب ہو گئے جس کا نئی صورتِ حال سے کوئی تعلق نہ تھا مگر ''خود ساختہ روایت'' کی شکل میں اس کا جواز بہرحال مہیا ہو گیا۔ ایک دوسرے تناظر میں کھیل کود مثلاً فٹ بال کے رواج کو لے لیجیے جو مقابلتاً ایک حالیہ سرگرمی ہے لیکن اس کا جواز یہ مہیا کیا جاتا ہے کہ یہ کھیل کود کے قدیم جشن کی تازہ معراج ہے حال آنکہ یہ کثیر تعداد میں افراد کی توجہ کو اصل ہدف سے ہٹانے کا ایک حالیہ طریق کار ہے۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شے کو کبھی ایک مسلمہ حقیقت یا روایت کا درجہ حاصل تھا، موجودہ عہد میں وسیع پیمانے پر استعمال کے لیے ایک گھڑی گھڑائی چیز ہے۔

اُن لوگوں کے نزدیک، جو محض تہذیبوں کے تصادم کی رٹ لگاتے ہیں، اس امکان کا کوئی شائبہ موجود نہیں۔ ان کے نزدیک ثقافتیں اور تہذیبیں بدل سکتی ہیں، ترقی یا تنزل کے عمل سے گزر کر غائب ہو سکتی ہیں لیکن وہ اپنے تشخص میں پراسرار طور پر متعین رہتی ہیں۔ ان کا جوہر پتھر پر کندہ ہونے کے مترادف ہے گویا مضمون کے آغاز میں ہنٹنگٹن جن چھے تہذیبوں کا ذکر کرتا ہے ان پر کوئی عالمی اتفاق رائے پایا جاتا ہے! میرا دعویٰ یہ ہے کہ ایسا کوئی اتفاق رائے نہیں پایا جاتا اور اگر ایسا ہے بھی تو یہ اس قسم کے تجزیوں کی تاب نہیں لاسکتا، جو ہوبز بام اور رینجر فراہم کرتے ہیں۔ چنانچہ تہذیبوں کے تصادم کے بارے میں پڑھ کر ہم تصادم کے تجزیے سے اتفاق کرنے کے بجائے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں: تم تہذیبوں کو ایک بے لچک معانقے میں کیوں جکڑتے ہو اور پھر تم ان کے تعلق کو ایک بنیادی تصادم کے رنگ میں کیوں پیش کرتے ہو گویا ان کے مابین اخذ و جذب اور شیر و شکر ہونے کا عمل زیادہ دلچسپ اور اہم نہیں؟

تہذیبوں کے تجزیے کے سلسلے میں جو تیسری اور آخری مثال دینا چاہتا ہوں یہ ہے کہ کسی تہذیب کو ماضی کی طرف لوٹا کر اس کی تخلیق نو کرنے اور پھر اس تخلیق کو ایک متحجر تعریف میں ڈھال دینے کے امکانات پائے جاتے ہیں، خواہ اس کی تشکیل میں

بہت سے عناصر اور آمیزش کی شہادتیں موجود ہوں۔ مثال کے طور پر کارنل سیاسی تجزیہ کار مارٹن برنال کی کتاب ''سیاہ اثینا[۵]'' (Black Athena) پیش کی جا سکتی ہے۔ برنال کہتا ہے کہ کلاسیکی یونان کے بارے میں آج ہمارا جو تصور ہے وہ اس تصور سے، جو اس عہد کے یونانی مصنف پیش کرتے ہیں، کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ انیسویں صدی کے آغاز سے یورپی اور امریکی، یونانی توازن اور وقار کے نصب العینی تصور کے ساتھ بالغ ہوئے ہیں۔ ان کی نگاہ میں ایتھنز ایک ایسی جگہ تھی جہاں افلاطون اور ارسطو جیسے روشن خیال مغربی فلسفی، دانش و فرہنگ پھیلاتے رہے، جہاں جمہوریت نے جنم لیا اور جہاں ہر ممکن اور اہم طریقے سے مغربی طرز زیست کا، جو ایشیا اور افریقہ سے کلیتہً مختلف تھا، غلبہ رہا۔ لیکن قدیم مصنفین کی ایک کثیر تعداد کو صحیح طریقے سے پڑھنے پر یہ پتا چلتا ہے کہ ان میں سے متعدد ایتھنز کی زندگی میں سامی اور افریقی عناصر کی موجودگی کا ذکر کرتے ہیں۔ برنال ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے نہایت مہارت کے ساتھ بہت سے منابع سے استفادہ کر کے یہ ثابت کرتا ہے کہ یونان اصلاً افریقہ بالخصوص مصر کی نوآبادی تھی اور یہ کہ فنیقی اور یہودی تاجر، ملاح اور اساتذہ نے اس ثقافت کی تشکیل میں گراں قدر حصہ لیا جسے آج ہم کلاسیکی یونانی ثقافت کا نام دیتے ہیں اور جو اس کے نزدیک افریقی، سامی اور بعد کے شمالی اثرات کے امتزاج سے عبارت ہے۔

''سیاہ اثینا'' کے نہایت مؤثر حصے میں برنال یہ دکھاتا ہے کہ کس طرح یورپی اور بالخصوص جرمن قومیت کے پھیلاؤ کے ساتھ ایتھنز کے خصائص کے حامل یونان کے اصل امتزاجی خدوخال سے جو، اٹھارویں صدی تک موجود تھے، بتدریج اس کے غیر آریائی عناصر کھرچ ڈالے گئے بالکل اسی طرح جیسے کئی برس بعد نازیوں نے ان تمام کتابوں کو جلا دینے اور ان تمام مصنفین پر پابندی لگانے کا فیصلہ کیا جو غیر جرمن یا غیر آریائی تھے۔ چنانچہ کلاسیکی یونان کو، جو اصل میں جنوب یعنی افریقہ کی جانب سے حملے کی پیداوار تھا، رفتہ رفتہ آریائی شمال کی جانب سے حملے کی پیداوار کے تصور سے بدل دیا گیا۔ اپنے پریشان کن غیر یورپی عناصر سے پاک کیے جانے کے بعد یونان، مغرب کی خود وضع کردہ

تعریف کے نتیجے میں، جو یقیناً اس کے مفید مطلب تھی، مغرب کا ''سرچشمہ و نقطہ آغاز'' اور مغرب کی روشنی و حلاوت کا منبع قرار پایا۔ برنال نے اس نکتے پر زور دیا ہے کہ کس طرح اور کس حد تک شجرے، خاندان اور آباؤ اجداد بعد کے زمانے کی سیاسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تبدیل کر دیے جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں خود ساختہ سفید آریائی یورپی تہذیب کے ظہور نے جو افسوسناک نتائج پیدا کیے ان کے بارے میں کسی کو بھی کچھ باور کرانے کی ضرورت نہیں۔

تہذیبوں کے تصادم کے اعلانچیوں کے ضمن میں میرے لیے یہ بات زیادہ پریشان کن ہے کہ وہ ان تمام باتوں سے بے خبر ہیں جو بحیثیت مؤرخین اور ثقافت کے تجزیہ کاروں کے اب ہمارے علم میں ہیں یعنی یہ کہ ان تہذیبوں کی تعریفیں کتنی متنازعہ فیہ ہیں۔ اس ناقابل یقین حد تک سادہ اور سوچے سمجھے تخفیف کردہ خیال سے اتفاق کر لینے کے بجائے، کہ تہذیبیں اپنی ہی ذات کا پرتو ہوتی ہیں اور یہی سب کچھ ہے، ہمیں ہمیشہ یہ سوال اٹھانا چاہیے کہ کون سی تہذیبوں کا منصوبہ بنایا جاتا ہے، ان کی تخلیق کی جاتی ہے اور کون ان کی تعریف متعین کرتا ہے اور کس لیے۔ معاصر تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جن میں یہودی، عیسائی اقدار کے دفاع کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ اختلاف اور ناپسندیدہ آراء کو ٹھنڈا کیا جاسکے اور ہمیں بے سوچے سمجھے یہ باور کرایا جائے کہ ''ہر شخص'' کو علم ہے کہ یہ اقدار کیا ہیں، ان کی کیا تعبیریں ہونی چاہئیں اور انھیں معاشرے میں کس طرح نافذ کرنا چاہیے اور کس طرح نہیں۔

بہت سے عرب یہ کہیں گے کہ ان کی تہذیب واقعی اسلام ہے۔ اس کے بالکل مقابل بعض اہل مغرب ـــــ یعنی آسٹریلوی، کینیڈین اور امریکی یہ نہیں چاہیں گے کہ انھیں ایک وسیع اور مبہم انداز میں تعریف کردہ زمرے یعنی مغربی (Western) میں شامل کیا جائے اور جب ہنٹنگٹن کی طرح کا آدمی ''مشترک معروضی عناصر'' کی بات کرتا ہے جو مفروضاتی طور پر ثقافت میں شامل ہوتے ہیں تو وہ تاریخی اور تجزیاتی دنیا کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے اور اس کے برعکس وسیع اور آخرکار بے معنی مقولات میں پناہ لینے کو ترجیح

دیتا ہے۔

جیسا کہ میں نے اپنی کئی کتابوں میں کہا ہے کہ آج کے یورپ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں جس شے کو ''اسلام'' کہا جاتا ہے وہ اصلاً ''استشراق'' کے مباحث سے تعلق رکھتا ہے— یہ وہ اصطلاح ہے جو دنیا کے ایک ایسے حصے کے خلاف، تعصب اور نفرت کے جذبات کو اُبھارنے کے لیے وضع کی گئی ہے جو اپنے تیل، عیسوی دنیا سے اپنی خوف انگیز جغرافیائی قربت و الحاق اور مغرب کے ساتھ مقابلے کی قابل لحاظ تاریخ کے باعث، بڑی عسکری اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن اسلام کی یہ تصویر اس تصویر سے بالکل مختلف ہے جو ان مسلمانوں کے نزدیک ہے جو اس کی اقلیم میں زندہ ہیں۔ انڈونیشیا کے اسلام اور مصر کے اسلام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔[۶] اسی لحاظ سے آج اسلام کے مفہوم و معانی پر مصر میں ہونے والی سرگرمی، جہاں معاشرے کی سیکولر قوتیں بعض اسلامی احتجاجی تحریکوں اور مصلحوں کے ساتھ اسلام کی نوعیت کے مسئلے پر متصادم ہیں، واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ ان حالات میں جو سب سے آسان مگر مشکل ہی سے صحیح بات کہی جاسکتی ہے، یہ ہے: ''وہ ہے دنیائے اسلام اور دیکھیں یہ سب دہشت گردوں اور بنیاد پرستوں کی دنیا ہے اور یہ بھی ملاحظہ کریں کہ ''وہ''، ''ہم'' سے کتنے مختلف ہیں!!''

لیکن تہذیبوں کے تصادم کا سب سے کمزور حصہ وہ غیر لچکدار علیحدگی ہے جو تہذیبوں کے مابین فرض کرلی گئی ہے اس زبردست ثبوت کے باوجود کہ آج کی دنیا درحقیقت باہمی ملاپ، مہاجرت اور ایک دوسرے کو جوڑنے والے پلوں کی دنیا ہے۔ ایک بڑا بحران، جس نے فرانس، برطانیہ اور امریکہ کو متاثر کیا ہے، اس احساس کے نتیجے میں اب ہر جگہ پیدا ہو رہا ہے کہ کوئی ثقافت یا معاشرہ بھی خالصتاً ایک شے نہیں ہوتا۔ اقلیتوں کا ایک قابل لحاظ حصہ مثلاً شمالی افریقیوں کا فرانس میں، افریقیوں، ہسپانویوں اور برعظیم کی آبادیوں کا برطانیہ میں ہونا اور ایشیائی اور افریقی عناصر کا امریکہ میں ہونا اس خیال کو متنازعہ بنا دیتا ہے کہ وہ تہذیبیں، جو وحدت اور یک رنگی پر نازاں تھیں، اسی ڈھرّے پر قائم رہ سکتی ہیں۔ محفوظ ثقافتیں اور تہذیبیں اب کہاں ہیں؟ ہنٹنگٹن کی طرح

ان کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کی کوئی بھی کوشش ان کے تنوع، ان کی کثیرالجہتی، ان کے عناصر کی کامل پیچیدگی اور ان کی سرتاپا مخلوط النسلی کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔ ہم ثقافتوں اور تہذیبوں کے الگ تھلگ ہونے پر جس قدر اصرار کریں گے اپنے اور دوسروں کے بارے میں اسی قدر غلطی پر ہوں گے۔ کسی الگ تھلگ تہذیب کا تصور میری نظر میں محالات میں سے ہے۔ چنانچہ اس مبحث کا آخری اور اصل سوال یہ ہے کہ کیا ہم تہذیبوں کے انفصال کے لیے کوشش کریں گے یا ایک زیادہ مربوط مگر شاید زیادہ مشکل طرزِ عمل کا انتخاب کر کے اس کوشش میں جت جائیں گے کہ ہم انھیں ایک وسیع کل میں ڈھال دیں — ایک ایسا کل جس کی صحیح حدود کا احاطہ ایک فرد کے لیے تو ناممکن ہے مگر ہم اس کے یقینی وجود کا وجدانی سطح پر تصور کر سکتے ہیں اور اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ سیاسی تجزیہ کاروں، ماہرین معاشیات اور ثقافتی تجزیہ کاروں کی ایک بڑی تعداد بہرحال چند برسوں سے ایک ایسے مربوط عالمی نظام کی، جو مانا کہ بیشتر معاشی نوعیت کا ہوگا، بات کر رہے ہیں۔ یہ نظام بلاشبہ آپس میں گندھا ہوگا اور یہ ان متعدد تصادموں پر حاوی ہوگا جن پر ہنٹنگٹن نے بڑی جلد بازی میں بے سوچے سمجھے گفتگو کی ہے۔

ہنٹنگٹن جس پہلو کو حیران کن حد تک نظر انداز کرتا ہے وہ ہے سرمایے کا عالمی نظام جس کی جانب ادب میں کثرت سے حوالے دیے جاتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں ولی برانٹ اور اس کے کچھ ہم کاروں نے ''شمال — جنوب — بقا کا ایک منصوبہ'' کے زیر عنوان ایک تحریر شائع کی۔ اس میں مصنفین نے اس امر کا اظہار کیا کہ دنیا اب دو وسیع اور ناہموار حصوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک طرف صنعتی ترقی کا حامل رقبے کے لحاظ سے چھوٹا شمالی حصہ ہے جو بڑی یورپی، امریکی اور ایشیائی معاشی قوتوں پر مشتمل ہے اور دوسری طرف ایک وسیع جنوبی حصہ ہے جو سابقہ تیسری دنیا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بڑی تعداد پر مشتمل نئی مگر انتہائی مفلس قوموں پر مشتمل ہے۔ مستقبل کا سیاسی مسئلہ یہ ہوگا کہ شمال اور جنوب کا باہمی رشتہ کس طرح متصور ہو کیونکہ شمالی حصہ امیر سے امیر تر ہوتا جائے گا اور جنوبی حصہ مفلس سے مفلس تر اور دنیا کو بحیثیت مجموعی پہلے سے زیادہ باہمی

طور پر ایک دوسرے پر انحصار کرنا پڑے گا۔ میں یہاں ڈیوک سیاسی تجزیہ کار ——— عارف درلک کے ایک مضمون کا حوالہ دوں گا جس میں اس سارے مبحث کو، جس کا احاطہ ہنٹنگٹن نے کیا ہے، زیادہ صحت اور قائل کن انداز میں سمیٹا گیا ہے:

''عالمی سرمایہ کاری کی پیدا کردہ صورتِ حال بعض ایسے واقعات کی توضیح میں مدد دیتی ہے جو پچھلی دو یا تین دہائیوں میں نمایاں ہوتے ہیں خاص طور پر اسّی کی دہائی میں: قوموں کا عالمی سطح پر تحرک (اور نتیجتہً ثقافتی تحرک و تبدیلی)، سرحدوں کی تضعیف (معاشروں میں بھی اور سماجی اکائیوں میں بھی)، معاشروں میں داخلی سطح پر عدم مساوات اور تناقضات کا پھر سے ظہور جسے کبھی نو آبادیاتی اختلافات سے منسوب کیا جاتا تھا، معاشروں کے اندر اور باہر بیک وقت باہمی یگانگت اور توڑ پھوڑ، مقامی اور عالمی عناصر کا باہمی اثر و نفوذ اور دنیائے واحد کا انتشار جسے تین دنیاؤں یا قومی ریاستوں کے روپ میں سوچا گیا تھا۔ ان میں سے بعض واقعات معاشروں کے اندر اور باہر اختلافات کو بظاہر برابر کی سطح پر لے آنے اور معاشروں کے اندر اور مابین، فروغِ جمہوریت میں مد ثابت ہوئے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس عالمی صورت حال کو منظم کرنے والے خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ (یا ان کی تنظیمیں) اب مقامی کو عالمی سطح کے لیے مختص کرنے، مختلف ثقافتوں کو سرمایے کی اقلیم میں داخل کرنے (تاکہ انہیں پارہ پارہ کر کے پیداوار اور صرف کی ضروریات کے مطابق دوبارہ ڈھالا جاسکے) بلکہ انفرادی میلانات کو نئے سرے سے تشکیل دے کر قومی حدود سے آگے لے جا کر ایسے پیداکار اور صارفین تخلیق کرنے پر، جو سرمایے کے عمل کے لیے زیادہ موزوں ہوں، قادر ہیں۔ جو اس عمل میں دلچسپی نہیں لیتے یا وہ اپاہج جن کے ہاتھ مدد لینے کے لیے پھیلے رہتے ہیں اور جو اس قسم کے معاشی اعمال کے لیے ضروری نہیں ہوتے ——— یعنی ''منتظمین'' کی گنتی کے مطابق عالمی آبادی کے 4/5 لوگ، اس کے اہل نہیں کہ انہیں اپنی نو آبادیاتی بنایا جاسکے، وہ تو فالتو لوگ ہیں۔ نئے لچکدار پیداواری نظام نے جس شے کو ممکن بنا دیا ہے یہ ہے کہ اب یہ ضروری نہیں رہا کہ مقامی طور پر یا غیر ملکی آبادیوں میں مزدوروں کے خلاف کھلے جبر کو استعمال

میں لایا جائے۔ وہ لوگ یا مقامات، جو سرمایے کی ضروریات (یا مطالبات) کو پورا نہیں کرتے یا پھر ''مستعدی'' سے جواب دینے سے حد درجہ بعید ہیں، وہ سرمایے کے ان رستوں سے بارہ پتھر باہر ہیں۔ اب سامراجی نو آباد کاری یا نظریہ جدید کاری کے بھلے دنوں کی نسبت تیقن انگیزی کے ساتھ یہ کہنا بہت آسان ہے: ''یہ ان کی غلطی ہے''۔ (کریٹکل انکوائری، سرما ۱۹۹۴ء ۳۵۱)۔

ان مایوس کن بلکہ تشویش انگیز حقائق کی روشنی میں یہ تجویز دینا مجھے شترمرغ کے سے طرزِ عمل کے مماثل لگتا ہے کہ ہم اہل یورپ اور اہل امریکہ کو چاہیے کہ دوسروں کو دور رکھ کر اپنی تہذیب کو قائم رکھیں اور دوسری قوموں کے درمیان اختلافات کو ہوا دے کر اپنی بالا دستی کو طول دیں۔ ہنٹنگٹن کی بحث کا خلاصہ یہی ہے اور یہ بات آسانی سے سمجھی جاسکتی ہے کہ آخر اس کا مضمون ''فارن افیرز'' نامی پرچے میں کیوں شائع ہوا اور کیوں بہت سے پالیسی ساز اس مضمون پر لپکے ہیں، امریکہ کو اشیرباد دیتے ہوئے، کہ وہ سرد جنگ کے سابقہ طرزِ عمل کو ایک مختلف نقطہ وقت میں نئے سامعین کے لیے توسیع دے۔ نیا عالمی ذہن ان خطرات کو، جن کا ہمیں سامنا ہے، پوری نسل انسانی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس اعتبار سے یہ کہیں زیادہ نتیجہ خیز اور مفید ہے۔ انھی میں عالمی آبادی کے بڑے حصے کی شدید غربت، زہریلے مقامی، قومی، نسلی اور مذہبی جذبے کا ظہور جیسا کہ بوسنیا، روانڈا، لبنان، چیچنیا اور بعض دیگر مقامات پر نظر آتا ہے، خواندگی کے زوال، الیکٹرانک ذرائع ابلاغ، ٹیلی ویژن اور نئی عالمی اطلاعاتی شاہراہ کی بنیاد پر پھیلنے والی نئی ناخواندگی، آزادی اور روشنی کے عظیم بیانیوں کی ٹوٹ پھوٹ اور اس کی گم شدگی کے امکانات جیسے خطرات شامل ہیں۔ روایت اور تاریخ کے اس شدید تحول کی صورت حال میں اجتماع، باہمی افہام و تفہیم، ہمدردی اور اُمید (جو ہنٹنگٹن کے مضمون سے پیدا ہونے والے جذبے کے بالکل برعکس ہے) جیسی مثبت قدروں کا ظہور ہمارا نہایت قیمتی اثاثہ ہے۔ میں یہاں عظیم مارٹینیقی شاعرایمی سیزر کے چند مصرعے نقل کرنا چاہوں گا جنھیں میں نے اپنی حالیہ کتاب 'ثقافت اور استعمار' میں برتا تھا:

لیکن انسان کے کام کا ابھی محض آغاز ہوا ہے
اور یہ اسی کے کرنے کا کام ہے کہ وہ
اس تمام تشدد کو، جو اس کے جذبات کے کونوں کھدروں میں چھپا ہے،
تسخیر کرلے
کوئی نسل حسن و جمال، ذہانت اور قوت کی
اجارہ دار نہیں
اور فتح کے متعین مقام پر سب کے لیے گنجائش ہے

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ ان میں بیان کردہ جذبات ثقافتی حد بندیوں اور تہذیبی فخر کو ملیامیٹ کرنے کا رستہ ہموار کرتے ہیں کیونکہ مذکورہ منفی رویے اس پر امن عالمی نظام کا راستہ روکتے ہیں جس کے خدوخال ہمیں مثال کے طور پر ماحولیاتی تحریک، سائنسی امور میں باہمی تعاون، حقوق انسانی پر عالمی تشویش، عالمی فکر کے تصورات جو اجتماع پر زور دیتے اور نسلی، جنسی یا گروہی بالا دستی [کے مسائل] میں حصہ داری میں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ میرے خیال میں تہذیبوں کے اجتماع کو وحشیانہ دور کی نرگسی جدوجہد کی طرف لوٹانے کے عمل کو ان بیانات کے طور پر نہیں لینا چاہیے، کہ یہ تہذیبیں اصلاً کس طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتی ہیں، بلکہ بیکار تصادم اور انہدامی شاوِنزم کو ہوا دینے کے عمل کے طور پر سمجھنا چاہیے اور ٹھیک یہی وہ چیز ہے، یعنی تصادم اور شاوِنزم، جس کی ہمیں ضرورت نہیں۔

✵ ✵ ✵

حواشی (از مترجم):

۱۔ یہ کتاب "Clash of Civilizations and the Remaking of World Order" کے زیرعنوان شائع ہوئی۔

۲۔ یہی اقتباس سعید نے اپنی کتاب "Covering Islam" کے Vintage Edition

(۱۹۹۷ء) کے دیباچے میں بھی نقل کیا ہے، ملاحظہ ہوں: xxxiii

۳۔ یعنی Slavic-Orthodox

۴۔ ڈاکٹر علی شریعتیؒ کا تعلق ایران کے ان سیاسی فلاسفہ سے تھا جو روایتی فلسفہ اسلام کے برعکس اسلام کی انقلابی تعبیرات کا مؤید تھا۔ علی شریعتی نے اسلام کے عمرانی تصورات پر، حج کے موضوع پر اور اقبال پر فکر افروز کتابیں لکھیں۔ روایتی اسلامی فقہ کے بعض تصورات کا ناقد ہونے کی وجہ سے شریعتی کو ایران کی موجودہ ہیئت حاکمہ میں پسند نہیں کیا جاتا۔

۵۔ یونانی دیومالا میں دانش، عملی مہارتوں اور جنگ و جدال کی کنواری دیوی۔ روایت ہے کہ یہ زئیس کے سر سے کلیتہً مسلح صورت میں پیدا ہوئی۔

۶۔ یہ فرق تہذیبی مظاہر اور فروعات کا ہے، اصلی اور حقیقی نہیں۔

رفاقت علی شاہد

قلمی معاونین کے کوائف/منتخب تصنیفات و تالیفات

ابو الکلام قاسمی : (پ : ۱۵/ دسمبر ۱۹۵۰ء)

[نقّاد، مترجم، صدرِ شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ]

تالیفات :

۱- مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت (نئی دہلی، ۱۹۹۲ء۔ لاہور۔ نئی دہلی)۔
۲- تخلیقی تجربہ (تنقیدی مضامین ۔علی گڑھ)
۳- مشرقی شعریات (// - علی گڑھ)
۴- ناول کا فن (انگریزی سے ترجمہ - علی گڑھ)
۵- شاعری کی تنقید (// - علی گڑھ، ۲۰۰۱ء)

اکرام چغتائی، محمد : (پ : ۱۹۴۱ء)

[محقّق، کتابیات ساز، مخطوطہ شناس، مرتّب]

سابق ڈائریکٹر اردو سائنس بورڈ، لاہور

تالیفات :

۱- شاہانِ اودھ کے کتب خانے (از اشپرنگر۔ ترجمہ و ترتیب۔ کراچی، ۱۹۷۳ء)

۲- تاریخ مشغلہ (واجد علی شاہ اختر کے خطوط۔ ترتیب و حواشی۔ لاہور، جون ۱۹۸۵ء)

۳- حزنِ اختر (واجد علی شاہ اختر کی مثنوی۔ ترتیب و مقدمہ۔ لاہور، جون ۱۹۹۹ء)

۴- آثار البیرونی (حیات و کتابیات۔ لاہور)

۵- اقبال اور گوئٹے (انتخاب مضامین- مرتب۔ لاہور و اسلام آباد، ۲۰۰۱ء)

۶- تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ (از یوسف خاں کمبل پوش۔ ترتیب و مقدمہ۔ لاہور، ۲۰۰۴ء)

۷- محمد حسین آزاد (نئے دریافت شدہ مآخذ کی روشنی میں۔ لاہور، ۲۰۰۵ء)

۸- جمال الدین افغانی (اتحاد عالم اسلامی کا نقیب۔ مجموعۂ مضامین۔ لاہور، ۲۰۰۵ء)

۹- پیر رومی و مرید ہندی/مولانا رومؒ اور اقبال کا تقابلی مطالعہ (لاہور، ۲۰۰۵ء)

۱۰- پنجاب میں اردو (حافظ محمود شیرانی ۱۹۲۸ء) مع اضافات (لاہور، ۲۰۰۵ء)

انصار اللہ، ڈاکٹر محمد : (پ : ۴رجنوری ۱۹۳۶ء)

[محقّق، مدوّن، ماہرِ لسانیات، قواعد نگار، لغت نگار]

[سابق اُستاد شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ]

تالیفات :

۱- غالبؔ ببلیو گرافی (علی گڑھ، ۱۹۷۲ء - نئی دہلی، ۱۹۹۸ء)

۲- شعرائے اردو کے اولین تذکرے (علی گڑھ، ۱۹۷۸ء)

۳- تاریخِ اقلیم ادب (علی گڑھ، دو جلدیں، ۱۹۷۹ء)

۴- پدماوت کی مختصر فرہنگ (علی گڑھ، ۱۹٧۸ء)

۵- اردو پر تمل کے اثرات (علی گڑھ، ۱۹۸۹ء- لاہور، ۱۹۹۴ء)

٦- چنداین (از ملا داؤد - تدوین - پٹنہ، ۱۹۹٦ء)

٧- تلخیصِ معلاّ (از کلب حسین نادر - تدوین - علی گڑھ - کراچی ۱۹٧۵ء)

۸- تذکرۂ قطعۂ منتخب (از عبدالغفور خاں نسّاخ - تدوین - علی گڑھ - کراچی ۱۹٧۴ء)

۹- زبانِ ریختہ (از عبدالغفور نسّاخ - تدوین - علی گڑھ، ۱۹٧٧ء)

۱۰- سنسکرت - اردو لغت (اسلام آباد، ۱۹۹۳ء)

جمیل احمد رضوی، سیّد : (پ : ۱۰/ اکتوبر ۱۹۴۱ء)

[کتابیات ساز، ماہرِ علومِ کتب خانہ]

[سابق چیف لائبریرین، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور]

تالیفات :

۱- لائبریری سائنس اور اصولِ تحقیق (مضامین - اسلام آباد، ۱۹۸٧ء، ۱۹۹۲ء)

۲- فہرستِ ذخیرۂ کتب حکیم محمد موسیٰ امرتسری (تین جلدیں - لاہور، ۱۹۸۹ء، ۱۹۹۰ء، ۱۹۹٦ء)

۳- معجم مصادرِ اسلامی - کتاب الحوالہ، فہرستِ کتابیاتِ اسلام (لاہور، ۱۹۸۳ء)

۴- ذخیرۂ شیرانی کے اردو مخطوطات (کتابچہ - اسلام آباد، ۱۹۸٦ء)

۵- ڈاکٹر سیّد عبداللہ - کتابیات (کتابچہ - اسلام آباد، ۱۹۸۹ء)

جی آر ملک : (پ : ۱۵/ اپریل ۱۹۴۵ء)

[اقبال شناس، ادیب]

[شعبۂ انگریزی، جموں یونیورسٹی، جموں، توی]

تالیفات :

1- Iqbal and English Romantics

2- Rasul Mir

3- The Bloody Horizon

4- سرودِ سحر آفریں

5- Southey and Moore

عارف نوشاہی، ڈاکٹر سیّد : (پ : ۲۷/ مارچ ۱۹۵۵ء)

[محقّق، مدوّن، مخطوطہ شناس، کتاب شناس، شاعر]

[صدرِ شعبۂ فارسی، گورڈن کالج، راولپنڈی]

تالیفات :

۱- فہرست نسخہ ہای خطی فارسی موزہ ملّی پاکستان، کراچی (فارسی - اسلام آباد، ۱۹۸۳ء)

۲- فہرست نسخہ ہای خطی فارسی انجمنِ ترقیِ اردو، کراچی (فارسی - اسلام آباد، ۱۹۸۴ء)

۳- فہرست کتاب ہای فارسی چاپ سنگی و کمیاب کتاب خانۂ گنج بخش (فارسی - دو جلدیں - اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ۱۹۹۰ء)

۴- فہرستِ مخطوطاتِ اردو کتاب خانۂ گنج بخش (لاہور، جولائی ۱۹۸۸ء)

۵- پاکستان میں مخطوطات کی فہرستیں - کتابیات (اسلام آباد، اکتوبر ۱۹۸۸ء)

۶- بھارت میں مخطوطات کی فہرستیں - کتابیات (لاہور، اگست ۱۹۸۸ء)

۷- ایران اور افغانستان میں مخطوطات کی فہرستیں - کتابیات (لاہور، ۱۹۹۳ء)

۸- فہرستِ مخطوطاتِ کتب خانۂ قریشی (لاہور ۱۹۹۳ء)

۹- اردو فارسی کا ایک قدیم لغت : کمالِ عترت (از میر محمد عترتؔ اکبر آبادی- ترتیب وتحشیہ- اسلام آباد، ۱۹۹۹ء)

۱۰- ثلاثہ غسّالہ (از حکیم حبیب الرحمٰن - تدوین وتعلیقات - لاہور ، ۱۹۹۵ء)

عطیہ سیّد :

[استادِ فلسفہ، نقّاد، افسانہ نگار، بنتِ ڈاکٹر سیّد عبداللہ]

[لاہور کالج فار ویمن، لاہور]

تالیفات :

۱- اقبال ؛ مسلم فکر کا ارتقا (لاہور ،۱۹۹۴ء)

۲- شہرِ ہول (افسانے - لاہور ، ۱۹۹۵ء)

۳- حکایاتِ جنوں (لاہور)

۴- فلسفیانہ مطالعے (تنقیدی و فلسفیانہ مضامین - لاہور-۲۰۰۰ء)

۵- غبار (ناول - لاہور ، ۱۹۹۷ء)

گیان چند جین، ڈاکٹر : (پ : ۱۹ر ستمبر ۱۹۲۳ء)

[محقّق، نقّاد، غالبؔ شناس، ماہرِ اقبالیات، ماہرِ لسانیات، مورّخِ ادب]

[سابق صدر شعبۂ ہائے اردو جامعاتِ بھوپال، علی گڑھ، لکھنؤ، سری نگر]

تالیفات:

۱۔ اردو کی نثری داستانیں (مقالہ پی ایچ ڈی - کراچی، ۱۹۵۴ء، ۱۹۶۹ء ۔ لکھنؤ ۱۹۸۷ء۔ نئی دہلی ۲۰۰۴ء)

۲۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں (مقالہ ڈی لٹ - علی گڑھ ۱۹۶۹ء۔ نئی دہلی، دو جلدیں، ۱۹۸۷ء)

۳۔ تحقیق کا فن (لکھنؤ، ۱۹۹۰ء - بہ ترمیم، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ۲۰۰۰ء)

۴۔ اردو کی ادبی تاریخیں (کراچی)

۵۔ اردو ادب کی تاریخ ۱۷۰۰ء تک (بہ اشتراک ڈاکٹر سیدہ جعفر - ۵ جلدیں، نئی دہلی)

۶۔ رموزِ غالبؔ (مضامین نئی دہلی، فروری ۱۹۷۶ء - بہ اضافہ کراچی ۱۹۹۹ء)

۷۔ تفسیرِ غالبؔ (منسوخ کلامِ غالبؔ کی تفسیر - سری نگر، ۷۲-۱۹۷۱ء، ۱۹۸۶ء)

۸۔ ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیبِ مہ و سال (حیدر آباد دکن، ۱۹۸۸ء - کراچی ۱۹۸۸ء - لاہور)

۹۔ شخصیات و تاثرات (شخصی خاکے - کراچی، ۲۰۰۰ء)

۱۰۔ ادبی اصناف (احمد آباد/گاندھی نگر، ۱۹۸۹ء)

لطیف اللہ، پروفیسر ایس ایم: (پ: ۱۵ر جولائی ۱۹۲۸ء)

[محقّق، مترجم، استادِ ادبیاتِ فارسی، ماہرِ علومِ تصوّف]

تالیفات:

۱۔ تصوّف اور سرّیت (لاہور)

۲۔ کلمات الصادقین (تذکرۂ بزرگانِ دہلی از شیخ صادق دہلوی - ترجمہ - کراچی، ۱۹۹۵ء)

۳۔ مطلوب الطالبین (سوانح حضرت نظام الدین اولیا از شیخ بلاق دہلوی - ترجمہ - کراچی)

۴۔ ملفوظاتِ شاہ مینا (ترجمہ - لاہور، ۱۹۹۴ء)

۵- کتابِ عشق (از امیر حسن علا سجزی - ترجمہ - کراچی، ستمبر ۲۰۰۰ء)

مختار الدّین احمد، ڈاکٹر : (پ : ۱۴ر نومبر ۱۹۲۴ء)

[محقّق، مدوّن، مخطوطہ شناس، ماہرِ ادبیاتِ عربی و اردو، ماہرِ غالبیات]

تالیفات :

۱- احوالِ غالبؔ (مضامین - ترتیب - علی گڑھ، ۱۹۵۳ء - نئی دہلی، ۱۹۸۶ء)

۲- نقدِ غالبؔ (مضامین - ترتیب - علی گڑھ، ۱۹۵۶ء - لاہور، ۱۹۹۵ء)

۳- تذکرۂ شعرائے فرخ آباد (از مفتی سیّد محمد ولی اللہ فرخ آبادی - ترتیب و تحشیہ - نئی دہلی، ۱۹۵۶ء)

۴- کربل کتھا (از فضل علی ـ تدوین بہ اشتراک مالک رام - پٹنہ، ۱۹۶۵ء)

۵- گلشنِ ہند (تذکرۂ شعرا - از سیّد حیدر بخش حیدریؔ - تدوین وتحشیہ - نئی دہلی، ۱۹۶۷ء)

۶- تذکرۂ آزردہؔ (از مفتی صدر الدین آزردہؔ - ترتیب وحواشی - نئی دہلی، ۱۹۷۰ء - کراچی، ۱۹۷۴ء)

۷- دیوانِ حضورؔ (از غلام یحییٰ حضورؔ عظیم آبادی - ترتیب و مقدمہ - نئی دہلی، ۱۹۷۷ء)

۸- عبدالحق (نئی دہلی، ۱۹۸۴ء)

۹- ذاکر صاحب کے خط - جلد سوم و چہارم (ترتیب وحواشی - پٹنہ، ۱۹۹۹ء، ۲۰۰۰ء)

۱۰- فہرستِ مخطوطاتِ فارسی مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (انگریزی ـ از اطہر عباس رضوی - نظر ثانی وترتیب - علی گڑھ)

مختارِ حق، محمد عالم : (پ : ۱۴ر شوال ۱۳۴۹ھ/ ۴ر مارچ ۱۹۳۱ء)

[کتابیات ساز، ماہر کتاب، مرتّب، ادیب]

۱- نقوشِ جمیل (والدِ ماجد الحاج میاں محمد حسین نقشبندی کے حالات- لاہور، ۱۹۵۹ء)

۲- خطباتِ یوم رضا (ترتیب- لاہور، ۱۹۸۰ء)

۳- مولانا ابوالکلام آزاد- ایک نادرِ روزگار شخصیت (ترتیب - لاہور، ۱۹۹۴ء)

۴- رودادِ حوزۂ نقشبندیہ (لاہور، ۲۰۰۴ء)

۵- نگارشاتِ ڈاکٹر حمید اللہ، جلد اول (ترتیب - لاہور، ۲۰۰۴ء)

معین الدین عقیل، ڈاکٹر : (پ : ۲۵ر جون ۱۹۴۷ء)

[محقق، نقاد، مخطوطہ شناس، مرتب]

[پروفیسر، شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی، کراچی]

تالیفات :

۱- تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ (مقالہ پی ایچ۔ ڈی. کراچی، ۱۹۷۶ء)

۲- پاکستان میں اردو تحقیق - موضوعات اور معیار (کراچی، ۱۹۸۷ء)

۳- کلامِ نیرنگ (از غلام بھیک نیرنگ - ترتیب و مقدمہ - کراچی، ۱۹۸۳ء)

۴- بیتی کہانی (از شہر بانو بیگم- ترتیب و مقدمہ - لاہور، ۲۰۰۲ء)

۵- امیر خسرو : فرد اور تاریخ (کراچی، ۱۹۹۷ء)

۶- اقبالؔ اور جدید دنیائے اسلام، مسائل، افکار اور تحریکات (لاہور، ۱۹۸۶ء)

۷- تحریکِ آزادی اور مملکتِ حیدر آباد (کراچی، ۱۹۹۰ء)

۸- نوادراتِ ادب، (مجموعۂ مضامین۔ لاہور، ۱۹۹۷ء)

۹- جہاتِ جہت آزادی، لاہور ۱۹۹۸ء

۱۰- پاکستانی زبان و ادب، لاہور ۱۹۹۹ء

ضیاء الحسن، ڈاکٹر: (پ: ۲۸/اکتوبر ۱۹۶۴ء)

[شاعر، نقاد، مترجم]

[استادِ شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور]

تالیفات:

۱- بارِ مسلسل (شاعری - لاہور)

۲- نئے آدمی کا خواب (ن م راشد کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ - لاہور، ۲۰۰۲ء)

۳- گمشدہ ستارہ (شبیر شاہد کی نظم و نثر کا مجموعہ - لاہور، نومبر ۲۰۰۲ء)

۴- آدھی بھوک اور پوری گالیاں (شاعری - لاہور، ۲۰۰۵ء)

۵- اردو تنقید کا عمرانی دبستان (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی۔ زیرِ طبع)

تحسین فراقی، ڈاکٹر: (پ: ۱۷/ستمبر ۱۹۵۰ء)

[محقق، نقاد، ماہرِ اقبالیات، غالب شناس، مترجم، شاعر]

[سابق صدرِ شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

[حال: استادِ زبان و ادبیاتِ اردو و پاکستان شناسی، دانشکدۂ زبانہای خارجی، دانشگاہ تہران، ایران]

تالیفات :

۱- عبدالماجد دریا بادی، احوال و آثار (مقالہ پی ایچ ڈی - لاہور، ۱۹۹۳ء)
۲- مطالعۂ بیدل فکرِ برگساں کی روشنی میں (از علامہ اقبال - ترتیب و ترجمہ - لاہور، ۱۹۸۸ء، ۱۹۹۸ء، ۲۰۰۳ء)
۳- عجائباتِ فرنگ (از یوسف خاں کمبل پوش۔ ترتیب و مقدمہ، لاہور، ۱۹۸۳ء)
۴- اقبال — چند نئے مباحث (مجموعۂ مضامین - لاہور، ۱۹۹۷ء، ۲۰۰۳ء) (قومی صدارتی اقبال ایوارڈ یافتہ)
۵- دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ — اصل حقائق (لاہور، ۲۰۰۰ء، بہ ترمیم و اضافہ، ۲۰۰۱ء)
۶- غالب — فکر و فرہنگ (مجموعۂ مضامین - لاہور، ۲۰۰۰ء)
۷- جستجو (مجموعۂ مضامین - لاہور، ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۷ء، ۱۹۹۷ء)
۸- معاصر اردو ادب — نثری مطالعات (مجموعۂ مضامین۔ لاہور، اکتوبر ۲۰۰۰ء)
۹- فکریات (منتخب دانش افروز مضامینؒ کے اردو تراجم - کراچی، دسمبر ۲۰۰۴ء)
۱۰- افادات — شعری مطالعات (مجموعۂ مضامین۔ لاہور، ۲۰۰۴)

We murder to dissect.

(Wordsworth)

If faith is sure why turn to feeble reason for support but that is what he does:

The child is father of the Man:
And I could wish my days to be
Bound each to each by natural piety.

Look at the helplessness in 'I could wish'. I could wish because whatever promise you show in your childhood, you realize it when you grow into manhood, but alas! This too is a delusion; human experience does not always or even generally support it — an instance of faith turning for vindication to flimsy rational props. Could cynicism go beyond the desperate cry:

Or let me die!

On these two divergent receptions of the poem, I am not going to raise any questions; I have asked too many of them. Enough is enough:

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

(Iqbal 1975:68)

Silence is my speech and tonguelessness my tongue.

◇—◇—◇

me but awakens me to the beauty and mystery of the phenomena, renovates me and restores me to an otherwise alien universe.

This is what the poem does to me. And here is what it will say to a postmodernist (I had almost said postmartemer).

The rainbow is projected in the poem as a connecting thread, the pivot, the centre that holds together man's relationship with the unknown. But let us see how stable is this supposed mainstay. It is dependent on rain (*rain bow*) and also on the appearance of the sun after the rain. As a symbol, therefore, it does not have an independent existence but is the projection of the poet's own pious wishes — a subterfuge for wishfulfilment. Indeed it is a cover for a lurking fear, an underlying feeling that his projected support is not, after all, so trustworthy:

So was it when my life began,
So is it now I am a man,
So be it when I shall grow old
Or let me die!

The fear that unmistakably proclaims itself is more real than the optimistic façade of the poem. Thus intuition is undependable and projected faith undermined by doubt and fear. In desperation the poet turns to poor reason which he otherwise calls 'the meddling intellect':

Sweet is the lore that nature brings;
Our meddling intellect
Misshapes the beauteous for ns of things;

The rainbow was one such rich phenomenon which represented nature in all its colourfulness, in all its plenty and variety. It also clearly symbolizes the bond between man and Nature as it connects the earth and the sky on either side. The Genesis, which must have been present in Wordsworth's mind, speaks of it as a token of God's covenant with man:

> I do set my bow in the cloud, and it shall be for a token of a covenant between me and the earth
>
> (IX:13).

This picturesque and mysterious phenomenon has charmed and absorbed the poet at all stages of his life, keeping him tied up to nature and bestowing on him a life-giving continuity. His heart would go out to the rainbow as a child and a boy and this bond of love remains unbroken now that he has stepped into manhood. His prayer that this love should continue unabated until the end of his days is therefore justified because the child's attitudes and behaviour tell us what sort of a man he would be. In other words man is potentially present in the child and clearly foreshadowed by him as a plant is potentially present in its seed. From this point of view the child could be regarded as father of the Man. His prayer, that love of nature (natural piety) should act as a connecting thread of the different phases of his life is devoutly sent up because the life of his spirit - the life that alone matters - depends on the continuance of this covenant otherwise death is preferable to life.

This is what the poem tells me and not merely tells

Roland Barthes was still plainer when he remarked that the choice which confronts us is between order and anarchy (of course order and anarchy from my point of view). Said Barthes:

> To refuse to fix meaning is, in the end, to refuse God and his hypostases — reason, science, law.

Finally I will look at a short poem known to all of us and dear to many, Wordsworth's Rainbow poem:

> My heart leaps up when I behold
> A rainbow in the sky:
> So was it when my life began,
> So is it now I am a man,
> So be it when I shall grow old
> Or let me die
> The child is father of the Man:
> And I could wish my days to be
> Bound each to each by natural piety.

This poem tells me that it is a typical Wordsworth poem — Wordsworth who diagnosed as one of the main causes of dehumanization (which had surely set in then though it was not so intense as it grew later and visible therefore only to the discerning eyes) man's fatal separation from the benign influences of Nature; Wordsworth who looked on phenomena not as mere objects but as symbolic of something beyond — the language of Eternity.

> utterly dull. Hope, politeness, the blowing of a nose, the squeak of a boot, all produce 'boum'
>
> (Forster 1936:145).

And again:

> 'Pathos, piety, courage — they exist but are identical, and so in filth. Everything exists, nothing has value. If one had spoken vileness in that place, or quoted lofty poetry, the comment would have been the same -ou-boum (Ibid:147)

The fact is that the postmodern critical method has no place in it for the question of value which has remained the central preoccupation of all literary criticism ever since Aristotle confronted Plato with catharsis. (Plato himself assigned a potent value to literature although in his view it was not salutary). On the postmodern view all art is self-legitimating, does not require any metanarrative to subsist on (in any case there is no metanarrative), and is non-utilitarian; it has no purpose other than to be. Now this is what as an Easterner creates a sense of revulsion in me. I just can't reconcile with something which is free of all parentage, *madder pider azad*. I believe that each of us has to make this hard choice because it has a vital bearing on life and is not merely an academic question. J. Hillis Miller before embracing poststructuralism had remarked very perceptively:

> A critic must choose either the tradition of presence or the tradition of difference, for their assumptions about language, about literature, about history, and about the mind cannot be made compatible.

In the postmodern wilderness we have often the feeling as if we are in a lunatic asylum where all lunatics have been let loose to appropriate wisdom. On one hand the author of even fictional writings is declared as dead as the author of the universe in Nietzsche's proclamation. On the other hand the author is resurrected and shown alive and kicking even in historical works as history is seen as an imaginative construction.

As pointed out above ,the postmodern critical perspective does not give us a criterion to judge and evaluate literature. Everything is a text and every reader an author-interpreter-free-player. Trash is of equal value with significant and lofty utterance. Barthes's distinction between the 'writerly' and 'readerly' texts — an after-effort to repair and rectify things — is so vague and arbitrary that it cannot help us out of the difficulty, unless he is understood to be recanting his earlier distinction between 'text' and 'work'. In the end sense and non-sense both remain texts of equal signification from the postmodern point of view. Forster's perceptive description of the nihilistic vision in the Marabar Caves in *A Passage to India* fits my purpose so squarely here that even a postmodernist will be forced to mark the distinction between the universal and the timeless literature on one hand and 'trash' on the other. I therefore borrow Forster's words committed to writing eighty years ago:

> Whatever is said, the same monotonous noise replies, and quivers up and down the walls until it is absorbed into the roof. 'Boum' is the sound as far as the human alphabet can express it, or 'bou-oum' or 'ou-boum', —

all categories of meaning and purpose, the postmodernist has landed in a hell of anarchy. Yeats seems to have foreseen all this:

> Turning and turning in the widening gyre
> The falcon cannot hear the falconer;
> Things fall apart; the centre cannot hold;
> Mere anarchy is loosed upon the world.

The postmodern critical method could be designated as absurdist criticism but it goes a step beyond because if you confront it with an absurdist text, it will embark on the wild goose chase of hunting for a meaning in meaninglessness. This is annoying sophistry. If you say two and two makes four, the reply is that it can be proved that two and two is five. You turn back and say "O.K, two and two is five". Your adversary turns round to mock you, "No sir, two and two is four and this is universally acknowledged." "But you do not believe in the universal and the timeless", you retort. The reply is: "How does that matter, when the need arises, any word, any category can be made use of."

The traces of meaning in 'word' — absolutely granted — but if the author is not conscious of them or all of them except the ones that suit his purpose — then? Or the author may use a word in a sense all his own. And if you deny this right to him, what happens to your process of trace formation? Aren't you caught up in your own mesh?

And pray what is the difference between logocentric and graphocentric as long as a centre is there? What is there in a name?

him as a medium; the obvious answer will be, language. Is the author, therefore, a mere medium, a mere *bachcha jamoora*?

If everything is a text, how to define literature? Definition implies marking things off, drawing convenient though not absolute boundaries, not blurring all marks of identification. Why at all should we let a bull into a china shop?

If the reader is himself the writer (because he writes his own text as he reads it) then how is he immune from death? Remember I am not indulging in Deconstruction but in childlike or, if you like it, childish (the-king-is-naked type) wonderment. And how is it different from reader-response theory except that the postmodern critical method lacks all balance?

If poststructural linguistic insights are combined with the Lacanian psycho-analytical ones with which they are intimately related, every reader is seen as diagnosing his own unknown diseases while reading a text. A text thus becomes a mirror and its reading a mirror image of the reader. Is reading then a narcissistic activity? Or, to be absolutely blunt, is reading, as James Strachey puts it, a corophagic activity?

Desperation is excusable for it cannot be helped but if it reaches a point where it questions truth, reality, meaning, knowledge — it cannot be excused because it is mad masochism. In Kashmiri, they say, that someone hit the ceiling (because it was too low) and hurt his head. In desperation he bit the ceiling with all the force of his teeth and broke his teeth as well. Having torn off his ties with

If meaning is not fixed but infinitely open; if it is produced through difference, through a free-play of signifiers, then why should we confine it to philosophy and literature, why not carry it over to natural sciences (say physics) and politics and the daily commerce of life? If it is to work havoc there, how unsuspect is the method? If you confine it to philosophy because it is merely speculative and if it is demolished no substantial damage will be done, then pray what is intellectual luxury? (should I use the forbidden word — masturbation; when postmodernism is the subject everything is allowed). And if it is applied to literature because it has the quality of plurisignation, of ambiguity — then pray what is new in it? How does ambiguity (or plurisignation) become different if we call it, as Roland Barthes does, stereographic plurality? What is intertextuality but a minuter examination of the phenomenon called 'influence' or what Eliot called the simultaneous existence of all literature — the tradition?

If all authors are dead (no Sophocles, no Shakespeare, no Hafiz, no Kalidas, no Ghâlib, no Iqbal) and only the texts exist, then what shall be my standard of evaluation? Whom to consider great masters? Which works to be rated as great and which ones as not great? Have concepts of universality and timelessness evaporated? The postmodernist will brush aside this question as irrelevant but how can he dodge the question as to why havn't all works (texts) survived, why only masterworks? If the author is a mere scriptor (e.g. of *Grammatology*, scriptor Jacques Derrida) then who uses

These were there with modernism also but whereas the modern writer tried to find some meaning through symbolism and formal complexity and cared for depth, the postmodern writer is surface-bound and receives absurdity and meaninglessness with cynical playfulness and farcical unconcern. Grand narratives (like the Marxist and liberal humanist interpretations of life and history) as Lyotard tells us are suspect and illusory because they undermine a pluralist view. "The cultural logic of the late capitalism" (Fredric Jameson's formulation) has ramified in many directions one of which is the explosion of information which like an irresistible deluge has swept away stability and eroded the basic infrastructure of many a concept. As Baudrillard argues in his book, *Simulations* (1983) the onslaught of the media (television, films, advertising) has led to the "loss of the real" as the distinction between the real and the imaginary stands totally blurred. In this process of misconstruction (or construction) the Western media play such a determining role that their constructs pass for the real particularly for what has been constructed as the Third World. The most marked feature of the transition from the modern to the postmodern is that in the postmodern situation faith in the basic postulates has been shaken further and in some areas totally shattered with no new set of postulates to take their place. Free interrogation of modernity's moorings goes on without any care to find fresh moorings.

So this postmodern scene is a wilderness and I, having blundered into it, feel flabbergasted and, with childlike curiosity, questions flow from me.

If 'centre' and 'essence' are mere fiction what are you left with but utter chaos and confusion — a chaos that does not have the potential to produce a cosmos for cosmos is order while disorder and panic characterize the postmodern scene. You have what Croker and Cook describe "panic book, panic sex, panic art, panic ideology, panic bodies, panic noise and panic theory."

Modernity rested on certain postulates, chief of them being progressive enlightenment and rationalism. It too had its nihilistic vision but it took them on and tried to make some sense of them. Some tried to tackle them through socio-political programming and its espousal in literary works; others sought order and meaning by creating new myths or manipulating the old ones; and still others chose to shrink into their individual shells to make peace with themselves but all had a feeling that all is not lost; amidst uncertainty one had a vague feeling of a peg of certainty to hold on to; amidst absurdity one could hope to probe for a substratum of purpose. But postmodernism has waged an all-out war on certainty, totality and absolutism in favour of fictionality, irony and contingency. Stability has departed making room for a self-conscious scepticism and indeterminacy. Knowledge of the world is seen as undissociable from living in the world so that one can adopt no position from outside for a transcendental view from nowhere; "implication is all". In such a situation how can one locate value and legitimate knowledge.

Paradoxically this implication has done little to assuage the agony of alienation and feeling of absurdity.

what was (indeed, what is) new about its? Existentialism (denial of the essence, the centre), Absurdism (absence of meaning) and ethical relativism (nay, every-cal relativism) — all these were there as the essential ingredients of modernism. Yet little would Toynbee know that his catchphrase will serve as a slogan for and a convenient rubric of a whole plethora of confusion.

Of course when I make use of the word 'confusion', I react as a typical Easterner otherwise what happened in the West was a logical — the only logical—culmination of a thought-process which began in ancient Greece and flourished there and later under the auspices of the Romans who succeeded the Greeks, and was revived with a renewed vigour and vitality after the Renaissance. The pivot of this thought-process — if you agree to ignore the feeble idealistic strain in the Western thought for it never had any formative influence on the individual and collective life of the West — was that there was no pivot, no centre, no referent for human thought and endeavour except the apparent. We students of literature more as an escape than for any genuine commitment to an ideal — generally luxuriate on idealism, on Plato, Kant, Fichte and Berkeley little bothering to see whether it is these names or men like Aristotle, Machiavelli, Bacon, Locke, Descartes, Adam Smith, Bentham, Karl Marx, Hitler and Bush who have ultimately determined the contours of the Western civilization. For these men who matter, what matters is the apparent, the real, the actual. Consequently they do not look beyond for any supposed 'essence' or 'centre'.

G. R. Malik

Postmodernism
Some Questions for Consideration

I am, because I affirm myself be; I affirm myself to be, because I am.

(S.T. Coleridge)

I think therefore I am. (*Cogito ergo sum*)

(Descartes)

I am where I think not.

(Jacques Lacan)

Wandering between two worlds, the one dead
The other powerless to be born,
With nowhere yet to rest my head.

(Arnold, *Stanzas from the Grand Chartreuse*)

When in 1947 Arnold Toynbee used the term postmodern for the first time to denote the current fourth and final phase of Western history characterized by anxiety, helplessness and irrationalism, he evidently used it as an extension, a heightened form, of the modern. For

467-473; also Preface by Mahmud Ilahi; *Garcin de Tassy,* op. cit. Vol. II, pp. 166-177, esp. 170, 171 (f.n.2).

53. "Dr. Alois Sprenger in Indien", No. 55, July 9, 1850, p.237 f.

54. *H.H. Wilson Collection. Correspondence* 1841. IOO, No. MSS. Eur. E 301/6.

55. See, *Lord Canning Papers,* in: Leeds Archives Department, Ref. HAR/Lord Canning 83/item 48.

56. Only the first volume of this *Catalogue* appeared in 1854, from Calcutta (Reprinted: Osnabrück: Biblio Verlag, 1979).

35. Vol.3 (1849), pp.344-347; Vol.4 (1850), pp. 116-117.
36. Altaf Hussain Hali: *Hayat-i-Javid,* Cawnpore: Nami Press, 1901, pp. 119-121 (in Urdu).
37. *Jam-i-Jahan Numa.* By Gurbachan Chandan, Dehli: Maktaba Jamia, 1992 (in Urdu).
38. *Dehli Urdu Akhbar.* Preface by Prof. Khwaja Ahmed Faruqi, Dehli: Urdu Department, Dehli, University 1972. (in Urdu).
39. Imdad Sabri: *Tarikh Sahafat-i-Urdu,* Vol.I, Dehli 1953, pp. 222-225. (in Urdu).
40. *General Report on Public Instruction in the Lower Provinces of the Bengal Presidency for 1843-1844,* Calcutta 1844. Appendix N: Minute by F. Boutros, Section V.
41. Vol.I, Berlin 1861, Preface, p.VI.
42. *Board's Collections* (1850-1851). Vol. 2418, Document No. 130.777. IOO, No. F/4/2418.
43. *The Penny Magazine,* Vols. 1-9 (New Series, Vols. 10-14. Edited by Charles Knight). 14 Vols. London 1832-1845; continues as: *Knight's Penny Magazine,* 2 Vols. London 1846. (No more published).
44. *Board's Collections,* (1850-51), Vol. 2418, op.cit. "Native Presses and Publications in the N.W. Provinces".
45. Ibid., *Dilli College Urdu Magazine,* op. cit. pp.43-44, *Subah Shimali wa Maghribi key Akhbarat wa Matbuat* (1848-1853). By Muhammad Atique Siddiqi, Aligarh, 1962, pp. 186-192. (in Urdu)
46. Vol. I (Berlin, 1861), Preface, p.VII, f.n.z.
47. Giessen 1857, p. 15, No.235.
48. New annotated edition in three volumes. Edited by Khaliq Anjum, op. cit, 1990.
49. *Fawa' id-ul-Afkar fi Amal-ul-Farjar, Delhi 1846 (See, Qaumi Zaban,* Karachi, 58/1 (January 1987), pp. 9-12).
50. Delhi, 1847. See, *Garcin de Tassy,* op. cit. Vol. I, p.410.
51. MS (copied in 1847), in: IOO, No. Urdu 153a.
52. *Tabaqat-i-Shu 'ara-i-Hind* (Anthology of Urdu Poets). By Karim-ud-Din, Reprinted: Lucknow 1983 (Delhi, 1847), pp.

(Mayor, Heidelberg) to Fallbesoner (Mayor, Nassereith), dated 24 May 1993.

27. (Weekly, Serampore), Nos. 483, 484, Vol. X (4 and 11 April, 1844), pp. 216-217, 232-233, under "Original Correspondence".

28. Mr. Thomason's Minute on Agra and Delhi Oriental Colleges, in: *J.Kerr,* op.cit., Appendix No.V.

29. III Sér, Tome XIII (1842), pp. 207-208. See also *General Report of the late General Committee of Public Instruction for 1840-1841 and 1841-1842,* Calcutta 1842 "Minute by F. Boutros, Delhi College, Ist July 1842"., Appendix No. XV, pp. CXIV-CXXXII; F. Boutros: *An inquiry into the system of education most likely to be generally popular and beneficial in Behar and the Upper Provinces,* Serampore Press, 1842; *The Friend of India* (Serampore), No. 386, Vol. VIII (26 May 1842), pp. 324-325. Editorial: "Mr. Boutros on Vernacular Education".

30. *Marhum Delhi College,* op.cit., pp.119-145; *Dilli College Urdu Magazine,* op.cit., pp.133-138 (article by Prem Pal Ashk).

31. These letters are still unpublished.

32. These letters are mostly concerned with the Society's *Biographical Dictionary* which never progressed beyond the volumes for names beginning with A. (See, *The Society for Diffusion of Useful Knowledge, 1826-1848.* A handlist of the Society's correspondence and papers, compiled by Janet Percival. The Library University College, London, 1978, p.10). The first four volumes of this *Dictionary* were published in London (1842-1844) under the editorship of George Long. (Two copies are available in IOO, London).

33. *Early Indian Imprints.* By Katharine Smith Diehl, assisted in the Oriental Languages by Hemendra Kumar Sircar, New York / London: The Scarecron Press, 1964, p.329.

34. Vol. XIV, pt. II (July-December, 1845). *Proceedings* (August, 1845), pp. LXXV-LXXIX.

Ashari Shi'is in India, Vol. II, New Delhi/Canberra, 1986, see index.

18. *Āmāl Namah* (An Autobiography). By Sayyid Raza Ali. Reprinted: Patna: Khuda Bakhsh Oriental Public Library, 1992 (Ist ed., Delhi, 1943), p. 137 (in Urdu).
19. Letter, dated 14 February 1975, No. F.5-11/74.
20. *Board's Collections* (1844-1845), Vol. 2090, Document No. 97.292, IOO, No. F/4/2090; *India and Bengal Despatches* (4 October 1848—29 December 1848). Vol. 59, IOO, No. E/4/798.
21. Vol. I (Berlin, 1861), Preface, p. "v".
22. *Proceedings. Bengal Education Consultations* (9 January 1844—15 April 1844). Document No. 139. IOO, No. P/15/31.
23. *Bengal Service Army Lists- Medical,* c. 1765-1858, Vol. 2. IOO, No. L/MIL/10/74; IOO, No. L/MIL/9/389, No. 496.
24. *The Complete Peerage, or a History of the House of Lords and all its Members from the earliest times.* By G.E.C. Res. And much enlarged. Edited by H.A. Doubleday and Lord Howard de Walden, Vol. IX, London 1936, pp. 429-430.
25. Lt. Colonel D.G. Crawford: *A History of the Indian Medical Service,* 1600-1913. London 1914, Vol. I, p.504, Vol. II, p. 159.
26. See for detail: Dr. August Haffner: *Aloys Sprenger. Ein Tiroler Orientalist. Zur Enthüllung des Sprenger*—Denkmals in Nasserith am 19. Oktober 1913, Innsbrück 1913; Johann Fück; *Die arabischen Studien in Europa,* Leipzig. 1955, pp.176-181; Annemarie Schimmel: *German Contributions to the Study of Pakistani Linguistics,* Hamburg, 1981, pp. 48-74; Norbert Mantl: *Aloys Sprenger. Der Orientalist und Islamhistoriker aus Nassereith in Tirol. Zum 100. Todestag am 19. Dezember 1993.* In Selbstverlag der Gemeinde Nassereith. 87 pp; Stephan Procházka: *Die Bedeutung der Werke Aloys Sprenger fuer die Arabistik und Islamkunde* (in: *Tilorer Heimatblätter,* Innsbruck, 69. Jg. 2/1994, pp. 38-42); For Sprenger's cremation see, Letter of Thomas Schaller

1846. "Delhi College. Establishment as on the 30th April 1845".

8. *Fara' id-ud-Dahr.* By Mawlawi Karim-ud-Din Panipati, Delhi 1847, pp-396-398 (in Urdu); *Asar-us-Sanadid.* By Sayyid Ahmad Khan. Edited by Khaliq Anjum, Delhi: Urdu Academy, Vol. II, 1990, pp. 60-79, 267-268 (for other sources).

9. *Asar-us-Sanadid,* op.cit, Vol.II, pp. 115-277 (for other sources); Garcin de Tassy: *Histoire de la Littérature Hindouie et Hindoustanie.* Reprinted: New York: Burt Franklin, Vol.II, 1968 (Paris, 1870), pp. 271-272; Mawlana Ubaidullah Sindhi. *Shah Waliullah Aur Unki Siyasi Tehrik* (in Urdu), 1942, pp. 181-182.

10. *Board's Collections* (1842-1843), Vol. 1982. Document No. 87. 231, IOO, No. F/4/1982; Ibid. (1844-1845), Vol.2093. Document No. 97.553, IOO, No. F/4/2093.

11. *The East-India Register and Directory for 1835; containing complete list of the Company's Servants.* Compiled by F. Clark, London 1835, p. 159.

12. *Bengal Civil Servants,* 1840, Vol. 23, IOO, No. L/F/10/23.

13. F. Boutors (Comp): *Principles of Legislation from Bentham and Dumont,* Serampore Press, 1842.

14. Ibid: *Principles of Public Revenue with a short abstract of the Revenue laws in the Bengal Presidency.* Serampore Press, 1844: pp. vi+166+6.

15. *The Ravi.* Special Issue. Government College, Lahore. 125 Anniversary Year.Vol. LXXVII, December 1989, pp. 145-146 and M. Ikram Chaghatai (Ed); *Writings of Dr. Leitner*, Lahore, 2002, preface.

16. *Board's Collections* (1856-1857), Vol. 2073. IOO, No. F/4/2073. Letter of F.Taylor to Director Public Instruction, dated 13 August 1855, paragraph 9.

17. *General Report of the late General Committee of Public Instruction for 1840-1841 and 1841-1842.* Calcutta 1842, p.319; S.A.A. Rizvi: *A socio-intellectual History of the Isna*

disposal of the Commander-in-Chief.[55] He was only allowed to complete the remaining volumes of his Catalogue of Kings of Oudh's Royal Libraries which disappeared afterwards and have not yet been found.[56]

NOTES

1. Michael H. Fisher: *Indirect Rule in India: Residents and the Residency System,* 1764-1857. Delhi: OUP, 1991.
2. From John H. Taylor, Secretary to the Local Agency, to H.H. Wilson, Secretary and Junior Member of Committee of Public Instruction, Fort William. Dated, Delhi Local Agency Office, the 17th January, 1824.
   In: *Board's Collections.* 25694-25696 (1826-1827), Vol. 909, No. F/4/909. Document No. 25694, paragraph 26 (British Library (London) India Office and Oriental IOO)
3. J.H. Taylor's list of Delhi Madrasas. Dated 8 January 1824, in: *Board's Collections,* op.cit.
4. J. Kerr: *A Review of Public Instruction in the Bengal Presidency, from 1835 to 1851,* Pt.II, London 1853, "Delhi College" (Ch. IX, pp. 190-206); *Marhum Delhi College.* By Mawlawi Abdul Haq, 2nd ed., Delhi 1945 (in Urdu); *Dilli College Urdu Magazine* (Qadim Dilli College Number), 1953. Ed. Khwaja Ahmad Faruqi (in Urdu).
5. *The Great Indian Education Debate. Documents relating to the Orientalist Anglicist Controversy, 1781-1843* Ed. By Lynn Zastoupil and Martin Moir, London: OUP, 1999.
6. J. H. Taylor's letter to H.H. Wilson, 17 January 1824, in: *Board's Collections,* op. cit., paragraph 26.
7. *General Report on Public Instruction in the North Western Provinces of the Bengal Presidency for 1844-1845.* Agra

cases a jealousy against foreigners",[54] but the situation was entirely different from what he presumed before coming to India. During his fourteen years stay in the Indian Subcontinent he held some very influential and high-ranking posts, such as those of the Extra-Assistant Resident in Lucknow and Head of the Calcutta Madrasa, Examiner of Junior Civil Officers and Persian Translator of the Fort William College in Calcutta, but, unfortunately, he was removed from all these civil appointments because he had supposedly repudiated a transaction with Fèlix Boutros, the ex-Principal of Delhi College, which was made when the latter had taken leave for two years because of ill-health. As claimed by Boutros in 1855, Sprenger had agreed to pay him two hundred Rupees from his salary of six hundred as the Principal of the College every month for a period of two and a half years. The first two years were to cover the period of the proposed absence. The remaining six months were those during which he was expected to wait for an appointment on his return. Boutros could not come back due to his decaying health and Sprenger did not honour his commitment. Eventually the matter was brought to the notice of Lord Canning, the Governor-General of India, who, with the approval of Court of Directors, made the decision on 29 July 1856. He declared that Sprenger's "conduct...had not been consistent with that character for integrity and honour which the Court hold to be essentially necessary in all those entrusted with high functions connected with Public Education", removed him from all his civil appointments and placed his services at the

during this period he was anxious to introduce a radical change, both in the system of instruction and in the courses of study. He ranked the literature of Indian Muslims amongst the greatest of the world and wished to preserve it at all costs. But at the same time he strongly recommended that drastic changes ought to be made in the prevalent syllabuses of madrasas so that the students could have an awareness of the political, social and educational conditions around them. This suggestion of his evoked severe reaction among both the students and the teachers, but he did not budge an inch from his stance and continued his efforts to modernise the courses.

Sprenger was an Orientalist of great originality and immense erudition. His meritorious services in the realm of Islamic studies in general and for enriching the Urdu language and literature in particular with the Western learning, were widely recognized by the eminent local scholars and influential government officials. He became so popular that one of his Tyrolean. friends, David R. Schönherr (1822-1897), highly praised him in an issue of *Tiroler Schuetzen-Zeitung* (Innsbruck), in 1850, when Sprenger was only 37. He wrote:

"Sprenger ist in ganz Indien ein bekannter Name. Briefe mit der einfachen adresse" "Dr. Alois Sprenger in India" treffen ihn, mag er sein wo er will".[53]

Sprenger wrote to H.H. Wilson in a letter of 1841 from Dresden, that "there is probably no hope to succeed in India as a civil practitioner without the assistance of government, since the English have a distrust and in many

preface of the book that he did it on the suggestion of Sprenger.[49]

Though Sprenger was primarily devoted to the dissemination of scientific knowledge in the local languages, he, by no means, neglected the other fields of human activity. Though not a devotee of Sufism, he was still carried away by the intrinsic beauty of the mystical poetry both in Urdu and Persian. It was this passion of his which promoted him to get the poetry of Mir Dard published. The work, at his request, was compiled and edited by Imam Bakhsh Sahbai (d.1857), a Persian teacher at the Delhi College.[50] In the same period a book on Urdu grammar, bearing the title *Faiz ka Chashma* was written by Mawlawi Ahmad 'Ali, another teacher of the College. In its preface the author states that Sprenger inspired him to work on this book.[51] Mawlawi Karim-ud-Din of Panipat, a brilliant student of the Delhi College who was subsequently appointed in Agra College, was also one of the close associates of Sprenger. He never published his writings without Sprenger's consent and approval. All the works that he authored during his stay at Delhi and Agra were undertaken on Sprenger's advice and encouragement and he has acknowledged his debt to Sprenger at the beginning or the end of each of his books.[52]

8

Sprenger remained Principal of the Delhi College for about three years (March 1845—December 1847) and

Indian history, literature and culture. Thus on the initiative and suggestions of Sprenger a number of significant books were written. It is not possible to enumerate all of them in this article, only a few of them can be mentioned in passing.

The most significant book among these was Sir Sayyid's *Asar-us-Sanadid*. In the introduction of his book *Das Leben und die Lehre des Mohammad* Sprenger emphatically claims that among other books, it was also written at his suggestion.[46] In the Catalogue of his personal collection known as *Bibliotheca Orientalis Sprengeriana* he repeats this claim.[47] When he reviewed the first edition of the book in 1851 in the *Journal of the Asiatic Society of Bengal* (Calcutta) he confidently declared that Sir Sayyid Ahmad Khan had undertaken this project at his behest.

Asar is one of the earliest works of Sir Sayyid Ahmad Khan. In a sense it is a "guidebook" of the main historical buildings and monuments of Delhi and even today it is considered a standard book on the subject. The convoluted and artificial, though sonorous, prose style of its first edition (1847) was beyond the ken of an average reader. However, in its considerably revised form in 1854 its verbosity was removed and a more natural plain style, which was to become the hallmark of Sir Sayyid's later writings, was adopted. This was, perhaps, done on the advice of Sprenger, who strongly believed in popularizing simple and easily understandable Urdu.[48] In 1846, Sir Sayyid Ahmad Khan also translated a Persian treatise on mathematics in Urdu. He himself acknowledges in the

company and most of the teachers of the College were its shareholders, who were thus enabled to increase their income because the profit earned from the annual sale of its publications was equally distributed among them. This printing press was installed at a time when there were very few presses in Delhi. However, when later on, many more printing machines were installed in the city, its business declined. Gradually the investment was withdrawn by the shareholders and eventually it almost stopped working. Besides, after Sprenger's transfer to Lucknow, its connection with the Delhi College was severed and it became a totally independent press. In 1852, Sayyid Ashraf 'Ali, in one of his Urdu letters written to Sprenger, stated the deteriorating condition of the press, and pointed out that owing to the competition it was not possible for the press to make substantial profits. At the end, he requested Sprenger to save this enterprise which was unique in the printing history of the Indian Subcontinent. Sayyid Ashraf 'Ali was so much disgusted with the rapidly decaying situation that he decided to hand it over to one Karim Bakhsh.[45]

7

Sprenger used to encourage the learned staff members of the Delhi College in their literary and scholarly pursuits and support them in every respect for the accomplishment of their mission. He had also close contacts with the *literati* of the city. This interaction inspired many persons to work on different aspects of

To this meager existing stock, we can add thirty-two issues of this Journal, which are lying in the "Nachlass Sprenger" of the Staatsbibliothek Preusischer Kulturbesitz (Berlin). Of these, the first one is of 11 May 1846. It was edited by Sayyid Qadir ʿAli. The remaining numbers, spreading over the years from 1846 to 1850, were printed under the editorship of Pandit Dharam Narain. When one compares the contents of this collection of "Qiran-us-Sa'dain" with other weekly newspapers like "Fawaid-un-Nazirin", "Muhibb-i-Hind" and "Khair-Kha-e-Hind" of the same period,[44] which were also brought out by the Delhi College, one can find a striking similarity of topics in all of them. All these periodicals gave prominence to the educational, social and literary activities of the local people and thus followed the policy and pattern set by Sprenger in 1845.

6

During his principalship, Sprenger also set up a printing press under the name of "Matba-'ul-'Ulum", in Delhi College. One of his close associates and one of the editors of 'Qiran-us-Sa'dain', Sayyid Ashraf 'Ali, was appointed its manager, who with only a skeleton staff at his disposal tried hard to make this first experiment of its kind successful. It was this printing press of the Delhi College where not only the magazines of the College but also the books of the Vernacular Translation Society were published. Though the press was nominally attached to the College, but, in reality, Sprenger had set it up as a limited

Shakespeare's note on Local Newspapers in the North-Western Provinces of the year 1848 considers "Qiran-us-Sa'dain" as "the highest in character and furnishes information of a more varied and valuable [nature] than any weekly in the native languages published in these provinces".[42]

Sprenger's goal of life for introducing the knowledge and wisdom of the West to the East and *vice versa* is very explicitly reflected in this Journal in which he tried to imitate the tone and spirit of *Penny Magazine*. (This magazine was a popular weekly periodical of the Society for the Diffusion of Useful Knowledge of London. It was begun in 1832 and was edited and published by Charles Knight. Though it gave preference to such articles which could help in disseminating "useful knowledge", it did not shun *belles lettres* altogether. It even published synopses of famous literary and artistic works. Side by side the written word, it also used woodcut illustrations which were especially popular. Monica C. Grobel in her afore-mentioned thesis on this Society discusses in detail the contents of this magazine (II, pp. 447-468) which are almost similar to "Qiran-as-Sa'dain").[43]

It would not be out of place to mention[43] here that the issues of the "Qiran-us-Sa'dain" are not easily available and only some scattered numbers, covering the period from 1848 to 1854, have been preserved in the National Archives of India (New Delhi), Idara Adabiyyat-i-Urdu (Hyderabad, Deccan), Library of Jami' Masjid (Bombay) and the private collection of Kasim Ali Sajan Lal (Hyderabad), Deccan).

degree be for the local public a substitute for the English periodicals".

But owing to some unknown reasons, this journal could not see the light of day. However, after two years Aloys Sprenger on his own initiative started publishing a weekly journal entitled, symbolically, "Qiran-us-Sa'dayn" ("The Conjunction of two (Fortunate) Planets"). Sprenger mentions it in the preface of his voluminous book on *Sira* entitled *Das Leben und die Lehre des Mohammad* in the following words:

> "Im Jahre 1845 zum Beispiel gründete ich zu Delhi eine illustrirte Zeitschrift im Geiste des Penny Magazine. Sie hatte den Title 'Ḳiran alsa 'dayn, d.h. die Conjunction der beiden Glücksplaneten Jupiter und Venus, worunter der Occident und Orient zu verstehen war. Es war dies der erste Versuch dieser Art. Elf Jahre später, als ich Indien verliess, hatte ich das Vergnügen, über ein Dutzend Nachahmungen zu sehen".[41]

Contrary to the contemporary journalistic norms, "Qiran-us-Sa'dain" opened new vistas for Urdu journalism and gave an intellectual tinge to it. Though like its contemporaries it, too, published political and literary news. Its real purpose was the introduction of Western ideas, specially the scientific progress of the West, to the Indian people. Sprenger wished that the gap between East and West, at the intellectual level, should be reduced and they would benefit from each other's cultural heritage. A.

language for many years. However, the latest researches have almost conclusively proved that the first Urdu newspaper came out on 27 March 1822 as an appendix of a Persian newspaper named "Jām-i-Jahān Numa" from Calcutta.[37] During the 1830s two independent Urdu weekly journals appeared from Delhi. One was "Delhi Urdu Akhbār".[38] It was edited by Muhammad Bāqir, the father of Muhammad Husain Āzād. The other was "Sayyid-ul-Akhbār". Its editor was Sayyid Muhammad, the elder brother of Sir Sayyid Ahmed Khan.[39] Urdu journalism of this early period mainly purported to be informative and most of the newspaper was devoted to the political events occurring in India and abroad. Polemical debates and writings were displayed prominently. Sometimes the literary activities of the Delhi citizens were also mentioned.

It was the Delhi College where not only pioneering but also innovative attempts were made to use journalism for educational purposes so that the mental outlook and intellectual horizon of the local people could be expanded. In 1843 the College authorities decided to start an Urdu weekly periodical entitled "Talib-ilmon kā Akhbār"[40] which was to contain political news, translations of good editorials, articles or parts of articles from Anglo-Indian papers or from English periodicals. As explained in the *General Report on Public Instruction in the North Western Provinces of the Bengal Presidency for 1843-44*, "this periodical would convey a great deal of useful information, would, in some measure, be a check on, and a model for common native newspapers and finally it would in some

abandoned. A few years later, in 1862 to be precise, Sir Sayyid Ahmed Khan (1817-1898) founded his Scientific Society in Ghazipur.[36] Its main object was to translate scientific and scholarly English books in Urdu so that Muslims as well as Hindus could be acquainted with Western literature and sciences. It also intended to create an atmosphere of friendship and amity among the rulers and the ruled. Some of Sir Sayyid's Urdu works indicate that his whole scheme was inspired by the Vernacular Translation Society of the Delhi College.

The tradition of translating scientific terms and works from English into Urdu, however, did not die with the Scientific Society of Sir Sayyid. It is still being followed by numerous organizations of both India and Pakistan. Dar-ul-Tarjama (Jamia Usmania, Hyderabad Deccan), Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (New Delhi and Karachi), Taraqq-i-Urdu Bureau (New Delhi), Idara Tasnif-o-Talif-o-Tarjama (Karachi), Idara Tansif-o-Tarjama (Lahore), Majlis Zaban-i-Daftari (Lahore) and National Language Authority (Islamabad) are a few examples of such organizations. The Scientific Society also made a pioneering effort for standardizing the scientific terms in Urdu. Though it did not completely succeed in its aim, it was still a trail blazer. Others are following it and trying to remove discrepancies in Urdu translations.

5

The origin of Urdu journalism remained a controversial topic among the literary historians of Urdu

books, mentioned mostly by their titles, without giving the names of their authors, progress regarding the translation work, and suggestions as to how the text could be made practicable for teaching purposes. The second report is undated. It contains general thoughts about book prices, punctuation, translators, printing office etc, and lists the books on natural history, medicine, grammars and dictionaries in preparation. It even mentions a large number of letters received from various quarters. It finally gives a financial statement for the second half of 1845, and inventory of text books.[33]

With the active support of local scholars and learned staff members of the College, Sprenger managed to have translated several books into Urdu within a short period of three years of his principalship. The speed, efficiency and devotion with which Sprenger did this work can be judged from the list of publications prepared by himself which appeared in the *Journal of the Asiatic Society of Bengal*[34] in 1845.The list includes all the books of the Society that had been published upto that year, were in press or had been approved for translation. He also introduced, in 1849 and 1850, these publications in the *Zeitschrift der Deutschen Morgenländischen Gesellschaft* under the heading "Litteraturbercht aus Ostindien".[35]

Though like many other institutions devoted to intellectual and literary activities, this short-lived Society, too, fell victim to the upheaval of 1857 and ceased to exist along with the Delhi College, the valuable principle of diffusing Western learning among the local people was not

full use of it and with the help of local scholars and learned staff members of the College translated several books into Urdu.

It will be rather interesting to mention here that Sprenger tried to run the Vernacular Translation Society on the pattern of "The Society for the Diffusion of Useful Knowledge" (London) which was founded in 1826, largely at the initiative of Henry Brougham (1778-1868), and whose object was "the imparting of useful information to all classes of the community, particularly to such as are unable to avail themselves of experienced teachers, or may prefer learning by themselves". The voluminous doctoral dissertation of Monica C. Grobel on this London-based Society in 1932 (available in the University of London, Senate House and Library) reveals many similarities it had with the general policy and functions of the Delhi Vernacular Translation Society. Moreover, Sprenger's hitherto unknown twelve letters of the period of 1842 and 1843, (still preserved in the University College London Library) provide new information about his close connections with this Society as its member and regular contributor to its scholarly projects.[32]

As Secretary of the Vernacular Translation Society, Sprenger used to submit a detailed semi-annual report to the Directors about its progress within the specified period. At present, two such reports are extant and these were printed at the Delhi Gazette Press by Kanhayya Lal in 1846. The first report was presented on 23 July 1845. It incorporates an inventory of acquired as well as translated

most of the translations were made only in Urdu. Probably, the work of translation into other languages was abandoned for want of resources.[30]

This Society was established as an autonomous body but subsequently it became an adjunct of the Delhi College and its Principal was made the Secretary of the Society. The main reason of this affiliation was that the objectives which led to the formation of this Society were already being fulfilled by the College. English Department was also operating for giving "to the students of the Madrasa an idea of the value of the knowledge contained in the English language, induce some to turn their thoughts to it from the comparatively unprofitable study of Arabic, Persian or Sanskrit, and impress them with better feelings towards us than their exclusive Oriental education is calculated to do". Both the Oriental and English departments of the Delhi College adopted Urdu as the medium of instruction for all the scientific subjects.

In 1845, Sprenger was appointed principal of the College. He also held the charge of the Secretary of the Society. He was very much pleased to get this job, as he describes it in one of his five German letters written to Hammer-Purgstall on 20 July 1845, still available in his ancestral home at Schloss Hainfeld (near Graz).[31] Soon he took numerous steps not only to improve the administration and teaching of College but also accelerated the translation work of the Society with great enthusiasm. For him it was a golden opportunity for implementing the ideas he had suggested in his above-mentioned article of 1844. He made

In 1839, Urdu replaced Persian officially in the judicial courts and at the end of the same year, James Thomason, the then Secretary of the Government of North-Western Provinces, was deputed by the Government to improve the functioning of the Delhi College. He made drastic changes in the administrative and academic fields of this College and took keen interest in launching a scheme for translating the scientific and historical English books into Urdu.[28] The newly-appointed Principal of the College, Félix Boutros, plunged himself into this project enthusiastically and employed twenty competent scholars for translating important Arabic, Persian, Sanskrit and English books relating to physics, economics, history, philosophy and law, as he mentioned in his letter of 19 December 1841 published in *Journal Asiatique* (1842). He proposed that eighty or ninety books should be translated within three or four years by all the *madrasas* of North-Western Provinces. He promised that fifteen or twenty books would be published by the Delhi College.[29]

In 1843, a new society by the name of "Society for the Promotion of Knowledge of India through the medium of Vernacular Languages" commonly known as "Delhi Vernacular Translation Society" was formed for accelerating the speed of translation work. Its main objectives were similar to those of Educational Committee but in its programme priority was given to the translation of important books of English, Sanskrit, Arabic and Persian into Urdu, Hindi and Bengali; but thanks to the widespread popularity of Urdu among the masses of Northern India,

be adopted to enlarge the scope of local languages and to remove their shortcomings so that they could become true vehicles of their culture and civilization. Thirdly, a deep linguistic study of those languages, living or dead, should be undertaken from which the local languages in vogue have borrowed their vocabulary. To elucidate his views Sprenger quoted several examples from the history of progress which rested on these three principles.

These main principles reflect Sprenger's views on education. They also incorporate the suggestions he offered for the advancement of Urdu language and literature. Through them he has outlined the measures he thought necessary for changes in the educational sphere and which he actually enforced when he headed various *madrasas*. The British officers in India certainly wanted to introduce Western sciences, especially the amazing scientific inventions and the resultant achievements to the people of India but the lack of suitable literature in Urdu and other local languages was a major hinderance in this enterprise. The School Book Society (founded in 1817) published many useful books in the local languages including Urdu, but those were mostly of elementary nature and could not fulfil the textual requirements of the students of different levels. In 1835, the Government formed an Educational Committee whose job was to provide Urdu translations of such books which could get a wide circle of readership outside the academic institutions, but the Committee's efforts in this respect remained largely fruitless.

debate dragged on and the people for and against were divided into two distinct groups. Those who insisted on making English the medium of instruction were labelled "Anglicists" while those, in favour of local languages, were called "Orientalists". Ultimately the Educational Report of Lord Macaulay (1835) gave the verdict in favour of the Anglicists. Favoured by majority and backed by the Government, English was included as an independent subject in schools, while the medium of instruction for other subjects remained the same, that is, the local languages. However, it was decided that these languages should be remolded to suit the requirements of modern times and gradually Western sciences be translated into them. It was hoped that these measures would enable the people of India to gain access to the real source of manifold Western advancement. The inclusion of these clauses in the Educational Policy was in fact the result of the Orientalists' endeavours

Sprenger belonged to the group that favoured the use of local languages for the medium of instruction. Soon after his arrival in India he began to support the Orientalists openly. A year after his arrival in India he contributed a detailed article entitled "Three Opinions on the Education of the Natives of India" to an English weekly *The Friend of India.*[27] The first opinion was that the people of India should be imparted education in their own mother tongues. In this way learning would come naturally to them. Their latent capabilities would develop and they will be able to progress as a nation. Secondly, all possible means should

at the disposal of the Lieutenant-Governor of the North-Western Provinces so that he might be appointed Principal of the Delhi College. He took charge of his new job on 6 March 1845. On 6 December, 1847, he was posted as temporary Extra-Assistant to the Resident at Lucknow for the purpose of preparing a catalogue of royal libraries of the Kings of Oudh. On 21 June, 1850, he was appointed Principal of the Calcutta Madrasa and ex-officio Visitor and Director of the Hugli Madrasa. On 20 September, 1850 he was made the Persian Translator under the Government of India, and Examiner of Candidates for the post of the Law Officer and ex-officio Examiner of the Fort William College. He travelled extensively in various Middle Eastern countries for two years and came back on 5 March 1856. Instead of joining a new job, he applied for three years leave and on 10 September 1856 left for Europe. He returned to Germany and settled in Weinheim near Heidelberg. After the expiry of his leave he accepted the honorary professorship of Arabic and 'Hindustani' (which means Urdu) languages in Bern University in 1859. He retired in 1881 and returned to Heidelberg where he died on 19 December 1893 and was cremated on 22 December.[26]

4

The debate as to what should be the medium of instruction in the educational institutions which were being set up under the supervision of the British Government in India was raging even before Sprenger arrived in India. The

Vienna University. He passed the examinations in mathematics, algebra, geometry, universal history, natural history, logic and moral philosophy. Encouraged by Hammer-Purgstall (1774-1856) and Vincenz von Rosenzweig-Schwannau (1791-1865) he devoted himself to oriental studies and acquired a critical knowledge of the oriental languages and literatures. He obtained a certificate of proficiency in Arabic, Persian and Turkish from the Oriental Academy (Vienna) in only six months. Then he went to Paris, studied Arabic under Silvestre de Sacy (1758-1838) and Étienne Quatremère (1782-1852). He was a restless soul and could not stay at one place. Hence he migrated. During his stay in England he helped the Earl of Munster (1794-1842), the eldest illegitimate son of King William IV and President of the Royal Astiatic Society,[24] in his mammoth but incomplete project of a history of the Mongol invasions of India which was later transformed into a history of Muslim art of warfare. In pursuit of an independent job he returned to Germany and undertook the study of medicine. He was awarded the degree of M.D. from the Leiden University on his dissertation in Latin on the origin of medicine under the Caliphate. During his stay in Germany he married Catharina Müller in Frankfurt a.M. and then came back to England. He was selected for the post of assistant surgeon in the Military Service of the East India Company and arrived at Fort William (Calcutta) on 2 September 1843. He was made the medical incharge[25] of the 21st North Infantry on a temporary basis on 12 December 1844. After some time his services were placed

accomplish, as he has stated in the preface of his book *Das Leben und die Lehre des Mohammad.*

"Ihm kam es vor, dass man auf die Kenntniss des klassischen Altherthums zu viel und auf die des Orients zu wenig Werth lege, und er hat sich daher schon in früher Jugend entschlossen, sich ganz asiatischen Studien zu widmen. Er machte es sich zum Lebensplan, das Morgenland zu besuchen, dort, so viel als es in seinen Kräften stünde, zur Einführung europäischer Kultur beizutragen und hinwieder eine richtigere Kenntniss des Orients und seiner Literatur nach Europa zurückzubringen."[21]

3

It would not be out of place to present here a brief sketch of Sprenger's life which is mainly based on the Proceedings of the Bengal Education Consultations[22] (1844) and the Bengal Military Records of the medical personnel, preserved in the British Library, London (India Office and Oriental).[23]

Aloys Sprenger was born on 3 September 1813 in Nassereith, a small village near Innsbruck in Tyrol. He was the ninth of ten children of Christopher Sprenger, an ex-Collector of Customs. He was initially taught by his two elder brothers, Joannes Petrus and Peter Paul who were Catholic priests in Brixon. Then he joined a gymnasium in Innsbruck and after graduating from there he attended four courses of lectures (each course of five month duration) in

theology in the relevant department.[18] After more than a century, the same pattern was adopted by the Pakistani Government in 1975 when the Curriculum Wing of the Federal Ministry of Education introduced separate text books for Sunni and Shiʻa students of high schools.[19]

iv) From the late 18th century onwards some educational institutions were established for the indigenous people in Calcutta, Hugli, Benaras and some other places. All these *madrasas* and Colleges played a significant role in educating the two major Indian communities, namely Muslims and Hindus, in their traditional set-up, but separately. In this context, the Delhi College was the first institution where all the local people were welcomed, irrespective of their religious persuasions and cultural and linguistic backgrounds. Thus, a secular environment was created, at least within its walls. As during the principalship of Aloys Sprenger (1845-1847) the Delhi College was shifted to the Residency Building,[20] once Dārā Shikoh's private library, this atmosphere proved more conducive to foster the friendly intercommunity relationship.

2

Sprenger, when he was still a young student of oriental studies in Vienna, had firmly decided to have a "goal of life" and later on persistently endeavoured to

University in Lahore and was the first Principal of the Government College in the same city.[15]

iii) In 1829, the Prime Minister of the King of Oudh, I'temad-ud-Dawlah Nawwāb Faẓl 'Ali Khan (d.1831), donated a handsome amount of one lakh and seventy thousand Rupees as an endowment to the Delhi College. After his death, his son-in-law, Nawwāb Ḥāmid 'Ali Khan, protested strongly against the use of the interest yielded by this amount on such things which the donor had not approved. As he claimed Nawwāb I'temad-ud-Dawlah had been of Shi'ite persuasion and had wanted the money to be used solely or largely for Shi'as in Delhi. The government disagreed with him because it was of the opinion that the dispensation of money in this way might create sectarian controversies in the College that would retard its growth.[16] In spite of the official and public opposition, in 1841, when the administrative reshuffling took place in the College, a new post of the First Shi'a Teacher was created and Qāri Ja'far 'Ali,[17] a Shi'a scholar of respectable attainments and a nominee of Hāmid 'Ali Khan, was appointed on Ist April 1841. In the same year, two separate classes were started for the Shi'a and Sunni students. This was the first example of its kind. Later on it was revived in the Mohammadan Anglo-Oriental College, Aligarh. Qāri 'Abbās Ḥusain (d.1926), was appointed as the Professor of Shi'ite

north of Calcutta.[11] Later he got himself employed in the Opium Department of Bengal, His immediate boss was a very influential person who later on, as a member of the Court of Directors, assisted him in his case against Aloys Sprenger. In 1840, he was appointed as the Deputy Collector and then Officiating Assistant in the Thuggee Department in Bihar.[12] Then a strange thing took place and on 10 February 1841, he was appointed as the first Principal of the College "for his intimate knowledge of European Literature and Sciences, together with a competent knowledge of the Oriental Languages". His two books entitled "Principles of Legislation"[13] and "Principles of Public Revenue"[14] were published during his principalship.

The second Principal was Aloys Sprenger. He was an Austrian by birth and like his intimate friend and promoter, H. H. Wilson, had come to India as an Assistant-Surgeon in the Military Service of Bengal. His brief life sketch and the details of his period of principalship will be given later.

In connection with the Delhi College, another name that can be mentioned is that of the famous orientalist and ethnologist, Gottlieb Wilhelm Leitner. He became indirectly involved with this College in 1877. He was a German-speaking Hungarian Jew and died in Bonn in 1899. He had an eventful carrer in India. Among other things, he founded the Oriental College and the Punjab

Mawlawi Mamlūk-ul-'Ali Nānotawi (d.1851) had already joined the College in 1825 as the first Arabic Teacher. He, too, was closely associated with the religious movement of Shah Waliullah.[9]

ii) It is worth mentioning that of all the three principals of the Delhi College, from its inception to 1857, none was of British extraction and had no experience of educational matters. As contemporary records show, J.H. Taylor was born in India of a native woman. Therefore he called himself an "East Indian". He served as an officer in the Marhatta army but was pensioned off. He was then employed as the Assistant Collector of Land Revenue (Delhi Division) and on promotion as Deputy Collector of the Delhi District. He had long been engaged in the settlement of lands in the Delhi District and investigation of the rent free tenure. He had, therefore, extensive knowledge of the localities and communities of Delhi and was fully conversant with the revenue system. In 1842, he was an uncovenanted assistant in the Commissioner's office, Delhi. Strangely enough, he had held all these posts when he was the Superintendent of the College and then the Head Master of its English Department.[10]

Félix Boutros (d.1864), the first Principal of the Delhi College, was a French man. He had come to India in 1824 when he was quite young. In official records his name first appears in 1830s as an indigo planter in Gurdwarrah factory in Purnea, 263 miles

still deserve a special attention. They are very briefly stated here:

i) From the very beginning, the Delhi College was dominated by its teachers, especially in the Oriental Department, who were staunch followers of Shah Waliullah's (1703-1762) school of religious thought. J.H. Taylor, in his afore-mentioned report (para 26) of January 1824, recommended the name of Shah 'Abdul 'Aziz (1746-1824), the eldest son of Shah Waliullah and a noted theologian, for the post of Head Teacher. Unfortunately the recommendation could not be carried out because of the sad demise of Shah 'Abdul 'Aziz in the same year. Consequently, his most distinguished pupil, Mawlawi Rashid-ud-Din Khan Dehlavi (d. 1833) was appointed in his place. His name, too, was proposed by Taylor with this comment that "The appearance of such a man would not only dissipate all that alarm, which the very name of an English School would undoubtedly create, but would conciliate all ranks of the inhabitants of the new institution."[6] His son, Sadid-ud-Din Khan, was also appointed in the College,[7] firstly as the third Arabic Teacher in 1830 and then promoted to the post of Arabic Professor in 1845. A close relative of Rashid-ud-Din, Mufti Ṣadar-ud-Din Azurda (d.1868), Ṣadr-us-Ṣudūr of Delhi, though formally not on the teaching staff, had an assertive role in the educational affairs of the Oriental Department.[8]

cities of Northern India. Secretary to the Local Agency of Delhi, John Henry Taylor, in his reply, dated 17 January 1824, spoke briefly about a variety of topics and appended an informative list of private *madrasas* in the city. According to this report, the Madrasa Nawwāb Ghāzi-ud-Din Khan (founded in 1792), later named as Delhi College, had only nine students and one teacher Mawlawi 'Abdullah whose monthly salary of 33 Rupees was paid by Nawwāb Amir Khan.[3]

Next year, in 1825, the Madrasa restarted under its new name, the Delhi College, and J.H. Taylor, its Secretary and Superintendent, with a staff of three senior Muslim teachers, began teaching Islamic sciences to forty-nine stipendiary students.

The history of the Delhi College (1825-1857) shows that it played a vital role in the educational, social and cultural life of the people in pre-Mutiny India.[4] It was the first institution where juxtaposition between Muslim and Western learning took place. The acrimonious debates between Orientalists and Anglicists culminated with the establishment of this College and the local people got an opportunity to be educated simultaneously in their traditional Islamic and modern Western learning.[5]

Many renowned scholars, local as well as the British, of the Subcontinent and its history, especially of the later Mughal period, have carried out painstaking research on this College and its activities. They have already thrown new light on its services in the fields of education and allied matters. Nevertheless, a few aspects

M. Ikram Chaghatai

Dr. Aloys Sprenger and Delhi College

1

In the beginning of the nineteenth century the political and administrative supremacy of the British in Northern India was established and almost all strings of power came in the hands of the Resident.[1] Immediately, any steps were taken to improve the overall functioning of the government, but the process for the betterment of the existing educational system was rather slow, even if the British Parliament in 1813 permitted the East India Company to patronize Indian education. It seems that the government was somewhat reluctant to establish any educational institution under the name of "British School" or "British College". Therefore it was ultimately decided to revive some of the old centers of Islamic learning, situated in Delhi, Agra and other places.[2]

On 12 September 1823, Secretary of the General Committee of Public Instruction (Calcutta), Horace Hayman Wilson (1786-1860), issued a printed circular, calling for information on the state of education in the big

ڈاکٹر سید عبداللہ اردو تنقید اور تحقیق کا ایک نہایت قابلِ احترام نام ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو کی تاسیس و تشکیل بھی ان کی شبانہ و روز سرگرمیوں کی گواہ ہے، اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقا میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اردو دائرۂ المعارف کی تدوین کے ضمن میں ان کی خدمات لائق تعریف ہیں۔ اُن کی علمی وجاہت کی گواہی، آج بھی اُن کے سیکڑوں شاگرد دیتے ہیں اور ان کی تصانیف اردو کے عالموں سے خراج تحسین پاتی ہیں۔

پیشِ نظر علمی ارمغان، جو اصلاً کتابوں کا سلسلہ ہے، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ کو خراج تحسین پیش کرنے کی ایک صورت ہے، اس کی پہلی کڑی ارمغان شیرانی کے عنوان سے شایع ہو چکی ہے اور اب یہ دوسری کتاب ڈاکٹر سید عبداللہ کی علمی خدمات کے اعتراف کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے۔

زیر نظر ارمغان کئی اعتبار سے معتبر ہے۔ اس میں اردو زبان و ادب کے متعدد مشاہیر نے قلم اٹھایا ہے، جیسے ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر انصار اللہ، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر معین الدین عقیل اور ڈاکٹر عارف نوشاہی۔ اسی طرح زبان و ادب کے کئی مسائل زیر بحث آئے ہیں، ادب کے کئی اوجھل گوشے روشنی میں لائے گئے ہیں اور کئی علمی شخصیات زیر بحث آئی ہیں۔ اسی طرح اردو تنقید کے کئی جدید مباحث بھی قارئین کے لیے استفادے کا باعث ہوں گے۔

اس ارمغان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اسے ڈاکٹر تحسین فراقی نے مرتب کیا ہے جو اردو تنقید اور اقبالیات میں لوہا منوا چکے ہیں اور اب تہران یونیورسٹی ایران میں اردو زبان و ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔ مرتبین میں ڈاکٹر ضیاء الحسن بھی شامل ہیں جو تحقیق و تنقید کے میدان میں مسلسل پیش قدمی کر رہے ہیں۔ ان کی مستعدی اور سرگرمی اس کتاب کو شرمندہ تکمیل کرنے میں بہت معاون رہی ہے۔

اردو کے مشاہیر کو خراج عقیدت پیش کرنے کا ہمارا یہ سلسلہ اگلے کئی برسوں کو محیط رہے گا۔

چیئر مین شعبہ اردو
پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج
لاہور، پاکستان

محمد سلیم ملک

۳۱ / مارچ ۲۰۰۶ء

ارمغانِ

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

مرتّبین

ڈاکٹر تحسین فراقی

ڈاکٹر ضیاء الحسن

UNIVERSITY OF THE PUNJAB

شعبۂ اردو

پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور